مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الانبیاء —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب الفرقان

فی

دروس القرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

سورۃ الانبیاء

پرویز

زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب الفرقان فی دروس القرآن
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	ستمبر 2005ء
مطبع	....	رمضان پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الانبیاء

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ

پہلا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 1 تا 9)

نظر اور بصر میں فرق 17
قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ سحر کا مفہوم 19
دوسروں سے بات کرنے کے انداز میں سحر سازی کا اثر 19
قرآنِ حکیم کی زبان کا خاصہ اور اس کی اہمیت 20
اہلِ عرب میں غیرت کا مادہ بدرجہ اتم تھا 22
عربوں کے ہاں اشعار اور شعراء کا مقام 23
قرآنِ حکیم کے نزدیک ایک داعیِ انقلاب اور ایک جذباتی انسان کی کیفیت میں فرق 24

دوسرا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 10 تا 20)

شاعری ایک نظریہ زندگی تھا اور ہے 30
''شیطان'' انسان کے وہ جذبات ہیں جو حقیقت پر مبنی نہ ہوں 31
دوسروں کی قسمت بتانے والے اور پوچھنے والوں کی ذہنی کیفیت 32
شاعری کے سلسلہ میں داد لینے اور دینے والوں کی نفسیاتی حالت 33
شاعری کا الہام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا 35
قابلِ ذکر بات نظریہ حیات ہے، اظہارِ خیال نہیں 36
شعر کہنے سے ظلم ختم نہیں ہوتا 38
علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعری کا مقام اور اس کی حقیقت 39
قرآنِ حکیم تو سراپا انسانی عظمت و رفعت کی داستان ہے 41
ذکر کے قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے ہاں ذکر کی کیفیت 42
تاریخ انسانی تو آج تک صدرِ اوّل کی مانند ذکرِ خداوندی کی کوئی مثال بھی پیش نہیں کر سکی 42
یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا؟ 44
اعراض کی صورت میں اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے سبق حاصل کرو 45
کوئی قوم بھی فوری یا بغیر کسی وقفے کے تباہ نہیں ہوتی 46
قانونِ مکافات کی تصویر کشی کا منظر 48
اقتدارِ مطلق یعنی Sovereignty کی حقیقت 49
انسانوں کے اس اقتدارِ مطلق کے برعکس قرآنِ حکیم کا دیا ہوا Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کا تصور 51
خدا تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو بھی تفویض نہیں کرتا 52
خلافت اور ملوکیت میں فرق 54
میری زندگی کی آخری دعوت 55
گردشِ افلاک کے نظریہ کی حقیقت 56
تخلیق کائنات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم 57
کائنات کے متعلق اہلِ تصوف کی تعلیم اور ہندوؤں کے تصورات 58

لَعِبِین کے لفظِ قرآنی کا مفہوم 59

تیسرا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 21 تا 24)

ذاتِ خداوندی کی دو حصوں میں تقسیم 62
ارض کا خدا الگ اور سماء کا خدا الگ ماننے کا نتیجہ 64
ہمارے ہاں خدا کو ایک ایکسٹرا کھلاڑی کے طریق پر رکھا جاتا ہے 64
مسلمانوں کے لیے Capitalist (سرمایہ دار) اقوام کی ایک چال 65
خارجی کائنات کے اصول و اقدار خدا کے مگر انسانی زندگی کے تمام تر ضوابط خود ساختہ 66
دوسروں کی طرح ہم نے بھی خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے 69
سیکولرازم کی تعریف 71
مسلمانوں سمیت آج ساری دنیا سیکولرازم پر عمل پیرا ہے 71
نظامِ کائنات میں تفریق روا رکھنے کی ایک محسوس مثال 72
اصل سوال خدا کی ذات پر ایمان کا نہیں بلکہ اس وحی کا ہے جو اس کی طرف سے ملتی ہے 74
آج مذاہبِ عالم میں قرآنِ کریم ہی واحد سچی کتاب ہے: تاریخ کی ایک شہادت 75
قرآنِ حکیم کے متعلق ہمارے ہاں کی ایک گہری سازش 76
مودودیؒ کا بیان کہ قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا: ایک اور سازش 76
قرآن حکیم تو دین کا 1/10 حصہ ہے: مودودیؒ کا فرمان 76
دین کے 9/10 حصے کے پرکھنے کا معیار مزاج شناس رسول ہونا ہے: مودودیؒ کا ایک اور فرمان 77
قوم کو کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا 78
آج کرّہ ارض پر مختلف خداؤں کی حاکمیت تسلیم کرنے کا نتیجہ 78
الہ الارض کے ماننے کا مقصد اور اطاعت خدا کا مفہوم 80
اقتدارِ مطلق کی Definition (تعریف) 81
اصل تہذیب تو انسانیت کا احترام ہے 84
کتاب اللہ کے مطابق حکومت نہ کرنا کفر ہے 84

چوتھا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 25 تا 33)

توحید کا نقطۂ ماسکہ 86
عالمِ امر اور عالمِ خلق کی وضاحت 88
مختلف عقائد کا مختصر سا ذکر 88
قرآنی تعلیم کا ایک نہایت اہم پہلو اور مختلف ادوار میں کائناتی تصورات 89
آج کی سائنسی رپورٹ اور 14 سو سال پہلے قرآن حکیم کا پیغام 94
مظاہر فطرت پہ غور و فکر نہ کرنا کفر ہے 96
قرآنِ حکیم کا اندازِ بیاں 97
شمس و قمر کا وجود میں آ کر اپنے اپنے مدار میں سرگرمِ عمل ہونا 99
زندگی کی نمود کا دار و مدار پانی پر ہے 99
زندگی صرف سانس لینے والوں تک ہی محدود نہیں 100
آیاتِ خداوندی کی اہمیت کے پیشِ نظر اُن پر غور و فکر کی ضرورت 101
ہماری کم مائیگی کی اصل وجہ کی ایک مثال 102
زمین کے متعلق ارشادِ خداوندی 103
خداوند تعالیٰ کی بے پناہ نوازشات کا ذکر خیر 105
کاش! ہم نے قرآنِ حکیم کی اس تعلیم پر غور کیا ہوتا 106
مومن اور کافر میں فرق 107
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھا جائے نہ کہ تراجم سے 107
کعبہ کو پاسباں مل گئے صنم خانے سے 108
قرآنِ حکیم کے حقائق پر کسی کی اجارہ داری نہیں 109
ہمارے ہاں تزکیۂ نفس کا مفہوم

پانچواں باب: سورۃ الانبیاء (حقائق کائنات)

خارجی کائنات کی ساخت کی حقیقت اور اس کے کنٹرول کا مقصد 111
ان کائناتی کلیات کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے 112
وارثِ کتاب امت کے خلاف ایک گہری سازش کا ذکر 112
آیات کے آخر میں صفاتِ خداوندی کے بیان کرنے کی اس کی حکمت 113
خارجی کائنات کے سلسلہ میں جماعت مومنین کا فریضہ 115
مغرب کے سائنسدانوں اور قرآنی سائنسدانوں میں ایک بنیادی فرق 115
خارجی کائنات کے برحق ہونے پر ایمان ہی خدا پر ایمان ہے 117
ہمارے ہاں متقی اور پرہیزگار کی تعریف 117
قرآنِ حکیم کا اعجاز شمس کے لیے ضیا اور قمر کے لیے نور کے لفظ کا استعمال 118
ہمارے ہاں پرانی شے مقصود و مطلوب تصور کی جاتی ہے 119
ذاتِ خداوندی کو دیکھنے کا طریق 120
سوچنے کی بجائے اپنے حال پر راضی ہو جانے اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ
جانے والوں کی حالت 121
یہی خدا کے سامنے جانا ہے 122
کائنات کے اندر ہر شے ء کا جوڑا پیدا کیا گیا 123
غور کرنے والے کے لیے گردشِ لیل و نہار میں بڑی نشانیاں ہیں 124
ہر مختلف شکل کا پھل اپنے اندر مختلف ذائقہ لیے ہوتا ہے 124
اہل تصوف کی حالت 125
ان ضربوں سے میری جسمانی صحت پر اثر 125
عقل کے بعد کی منزل 'الباب' ہے 125
امام غزالی کی فکر کا ماحصل 126
عقل کی نفی کے بعد وجدان کی منزل کا تصور 127
ہمارے ہاں علمائے کرام کا نصابِ تعلیم اور فکری کاوش 128
قرآنِ حکیم کے نزدیک حواسِ خمسہ کے تحت علم کی تعریف 129
کائنات کے ایک ایک ذرے پر غور و فکر کرنے کی تلقین 130
کائنات پر اس طریق سے غور کرنے والے علما کے سامنے خدا تعالیٰ بے
نقاب ہو جاتا ہے 131
لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ 131
جو قوم کائناتی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کے لیے اقدارِ خداوندی
چہ معنی دارد؟ 133
مومن کا فریضہ تسخیر کائنات تھا 134
تو کیا اہل مغرب کے سائنس دان مومن ہیں؟ 134
قوت کے استعمال میں مومن اور کافر میں فرق 135
مومن نوعِ انسانی کے امن کا ضامن ہوتا ہے 136
اقوامِ سابقہ کی بستیوں کے کھنڈرات نوحہ خواں ہیں 136
آج کے ترقی یافتہ دور کی زبوں حالی اور اندیشۂ فردا 137
عقل انسانی کو نیّرِ تاباں کی حاجت 137
اقوام کے تین مختلف درجات 138
مومن کبھی روٹی کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا 139
جس کا آج کل جیسا گزرا، وہ تباہ ہو گیا: قولِ رسولؐ 139

چھٹا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 34 تا 38)

مافوق الفطرت شے کا تقاضا 141
عالمِ مشیت اور عالمِ خلق کی وضاحت 142
اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کا کوئی Cause (سبب) نہ ہو 143
انسان کے لیے ہر Effect (نتیجے) کا Cause (سبب) معلوم کرنا
نہایت ضروری ہو جاتا ہے 143
نبوت کے بعد کوئی شخص خدا تعالیٰ سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا
دعویٰ نہیں کر سکتا 144
انسانوں کے لیے وحی خداوندی اب ایک کائناتی شے ہے 145

مذہب کی دنیا میں مقامِ نبوت کی حیثیت 145
آپؐ نے بھی انسانوں کی طرح موت کا ذائقہ چکھا 145
صرف خدا تعالیٰ ہی قانونِ فطرت سے بلند ہے 146
اِن دینی حقائق کے برعکس مذہبی تصورات اور عقائد کی دنیا 147
عیسائیت کے موجودہ مذہب میں سوائے طلاق کے کوئی قانون نہیں 147
دینِ خداوندی کے خلاف ایک گہری سازش 147
عیسائیت کے سامنے مسلمانوں کا سرِ تسلیم خم ہو گیا 148
ہمارے ہاں حیات النبی کا عقیدہ 149
زیرِ زمین سیکرٹریٹ کا تصور اور میری اپنی کیفیت 150
عقیدے کے سلسلہ میں دیوبندی اور بریلوی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے 150
''پرویز کافر ہے'' کی حقیقت 151
کفر اور ایمان کا فیصلہ تو خدا کے مقرر کردہ میزان کے مطابق ہو گا 151
میں خود تین پشتوں سے مسلمان ہوا ہوں 152
ہم میں سوائے نام کے ہر شے مشترک چلی آ رہی ہے: وہاں وہ سرتاپا
کفر تھا اور یہاں یہ عینِ اسلام ہے 152
ایک تاریخی واقعہ 153
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ بصیرت 153
آپ کی وفات کے بعد فوری طور پر جانشین کا انتخاب کیوں
ضروری تھا 154
یاد رکھو! یہ دینِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھا 155
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قرآنی بصیرت 156
ملت اسلامیہ کے تمام افراد سے ایک دردمندانہ اپیل 156
ختم نبوت کا عمل انسان کے لیے باعث شرف ہونے کی دلیل ہے 158
دینِ خداوندی کی عملی شکل امت واحدہ کی تشکیل ہے 158
امت واحدہ کا یہ شیرازہ کیونکر بکھرا 158
دنیاوی امور اور مذہبی امور کی ثنویت کفر ہے، دین نہیں 159
مذہب پرست قوم کبھی امت واحدہ نہیں بن سکتی 159
اسلامی سربراہی کانفرنس کا نتیجہ اور ایک مرکزی اتھارٹی کی اہمیت 160
خود ساختہ روایات نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا 161
جنگِ احزاب میں مجاہدین کی حالتِ زار مقامِ نبوت اور فتحِ حق 161
میدانِ جنگ میں غور و فکر کی اہمیت 162
اپنی تباہی پر یقین نہ کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت 163

ساتواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 39 تا 50)

قریش کی دینِ خداوندی سے ٹکراؤ کی وجہ جواز 166
ہجرت کا مقصد دینی پروگرام کی تشکیل کے لیے سازگار ماحول کی تلاش
ہوتا ہے 167
بڑی سے بڑی سلطنت کے نظام کو الٹ دینے والا نظامِ حیات 168
ہم نے ہر بات کو قیامت تک اٹھا رکھا ہے 170
ہر دور میں سابقہ قوموں کی تاریخ کو بطور شہادت سامنے رکھنا ہو گا 170
حالات کی زبوں حالی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تگ و تاز کی اہمیت 171
قرآنِ حکیم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں 172
صفت رحمانیت کے مفہوم کے لیے رحم مادر کی لازوال مثال 172
انسانی ذات کے لیے الرحمٰن علم القرآن کی نعمت عظمیٰ 173
اس کرۂ ارض پر نظامِ ربوبیت انسان کو خود ہی قائم کرنا ہو گا 174
نظامِ ربوبیت کے لیے خدائے رحیم کا عطا کردہ نظامِ حیات اور
اس پر کنٹرول 174
دنیا کا کوئی شخص اس نظامِ کائنات کا بدل پیدا نہیں کر سکتا 175
یہ پوری کی پوری کائنات ایک وحدت ہے 176
زندگی کا ایک ایک سانس قوانین خداوندی کا ہی محتاج ہے 176
باطل نظامِ حیات کا نتیجہ! جسم صحت مند اور زندگی جہنمی 177

قانون خداوندی کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے کون لوگ ہیں؟ 177
جاگیرداری نظام کے اثرات 177
قرآن حکیم تو اسی نظام کی بیخ کنی کرنے کے لیے آیا تھا 178
جاگیرداری نظام کے خاتمے کے سلسلے میں ایک غور طلب آیت 178
قرآن کی روشنی میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی مفتوحہ زمینوں کا فیصلہ 180
اسلامی مملکت میں ذرائع رزق کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوں گے 181
قرآنی نظامِ ربوبیت کی خصوصیت اور ربوٰ کی تعریف 181
کتاب 'مسئلہ ملکیت زمین پر ایک نظر 182
آخر کار قرآنی حقائق کو قبول کرنا ہی ہوگا 182
مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انصاف کے ترازو کی کیفیت 184
یہ دھرم کانٹا متعلقہ شخص کو دکھا بھی دیا جائے گا 186
نزولِ قرآن کا دن اور اس کی اہمیت 187

آٹھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 51 تا 68)

لفظ رشد کا مفہوم اور مقامِ ابراہیمی 190
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں مذہبی پیشوائیت کا مقام بلند 191
پیغامِ خداوندی کی دعوت گھر سے شروع کی 192
کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت کروائے 192
بھیڑوں کی مانند بغیر سوچے سمجھے ایک ہی طریق پر چلتے جانا انسانیت کی تذلیل 192
اسلاف کے مسلک پر تنقید کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے 193
کج بحثی کی ایک مثال کا توڑ 193
قوموں کی تباہی کی وجہ جواز 194
دین کے مقابلے میں اہل مذہب کا ایک دیرینہ جواب 195
زندوں سے نفرت بلکہ عناد اور مُردوں سے محبت 196
شاید آنے والا دَور میری اس آواز کو قبول کرے 197
خدا کسی دوسرے کے متعلق ہم سے پوچھے گا ہی نہیں 197
مغربی جمہوریت کے بت کی پوجا 198
آخر کار سند خدا کی کتاب کو ہی ماننا ہوگا 199
بغیر کسی مسالے کے پوری کائنات کو وجود میں لانے والی ذات اور قوت 199
لا علیٰ وجہ البصیرت رب کو رب ماننا شہادت پر مبنی ہے 200
مذہب انسانی سوچ اور فکر کو مغلوب کر دیتا ہے 201
تنہا علیحدگی میں اِن خداؤں کا خدا کے بندے سے مقابلہ 202
قرآنی حقائق باوَر کروانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے طریقِ کار کی بلاغت 204
اس سلطانی گواہ سے ہی پوچھ لو 205
حضرت ابراہیمؑ کے سامنے مذہبی پیشوائیت کی شرمندگی 206

نواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 69 تا 80)

حضرت ابراہیم کے سامنے مذہبی پیشوائیت کی بے بسی 208
حقائق کا برملا اعتراف کرنے کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار 209
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں جلائی جانے والی آگ کی حقیقت 210
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا انتظام 211
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا 212
یہ سارا سلسلہ ہی کفار کی آتش انتقام کا تھا 213

ہجرت کا عمل تقریباً ہر نبی کی زندگی کا حصہ رہا ہے 214
مذہب کی عملداری کے لیے خود مختار مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی 215
تحریک آزادی کی بنیاد تو نظامِ صلوٰۃ کا قیام تھا 215
نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم یا اشتراکیت کے نتائج کے بعد دنیا
ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے 216
قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات جنگوں کا محتاج نہیں ہوتا 217
مملکتِ پاکستان کی مخالفت کی اصل وجہ 218
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے رب کی طرف لوٹنے کے معنی 218
ہجرت صرف نقل مکانی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک طویل پروسیس (عمل) ہے 219
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین کی طرف ہجرت 220
خداتعالیٰ کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ بلند 221
ہمارے ہاں خیرات کا مروجہ مفہوم 222
مروجہ فقہ کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریق کار 223
انبیاء کی وساطت سے نظامِ رشد و ہدایت کا اصل مقصد 224
ایاک نعبد کا قرآنی مفہوم 224
اقامت صلوٰۃ کا مقصد ایتائے زکوٰۃ ہے یعنی نوع انسانی کی
حد تک سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا 225
ہجرت کے سلسلہ میں حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر 225
لفظ فاسق کا قرآنی مفہوم 226
حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت بھی احکام خداوندی کے تابع تھی 226
وحی کی بنیاد پر جماعت کی استواری اور ساتھی کا تصور 227
قوانین کے بغیر اقتدار تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے 229
نفشت فیہ غنم اور حکومت کے معنی 229
حضرت داؤد علیہ السلام کا اور سلیمان علیہ السلام کا دورِ حکومت 229
ہمارے ہاں تسبیح کے موجودہ عمل کی ابتدا اور اسلامی تصوف
کی آبیاری 230
سَبَّحَ کا قرآنی مفہوم 230
حضرت داؤد علیہ السلام کے نظام حکومت کے ثمرات 231
ہمارے ہاں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق تلوار سازی کے سلسلہ
میں بیان کردہ معجزے 232

دسواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 81 تا 88)

مذہب کی دنیا میں خدا کے مقرب بندوں کی زندگی بھر کی مصروفیات 234
انبیائے کرام مذہب کا نہیں بلکہ دین کا پروگرام لے کر آئے تھے 235
مملکت کے انتظامات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عملی کردار 235
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ نیز حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت
سلیمان علیہ السلام بطور ایک انقلابی حاکم 236
انبیائے کرام کی مخالفت کی اصل وجہ ان مخالفین کے خودساختہ
نظام کی بقا تھی 236
مذہب کی لغت، قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہی بدل دیتی ہے 237
دنیا میں ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور کوئی چیز بھی اتفاقیہ نہیں ہوتی 237
غور و فکر کی محنت اتفاقات کی گتھیوں کو سلجھا دیتی ہے 238
حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی ایجادات 239
حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہمارے ہاں کے وضع کردہ افسانے 240
حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہواؤں پر کنٹرول 240
خداتعالیٰ کے انسانی علم کو اپنی طرف منسوب کرنے کی حقیقت 241
حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع شیاطین کی ڈیوٹی 242
لغت میں شیاطین کا مفہوم اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ان پر گرفت 242
حضرت ایوب علیہ السلام کا شیطان کے ہاتھوں مغلوب ہونا؟ 244
حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی نوعیت 245
ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی علمی سطح 246

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری، بیوی کی خدمت اور اس کے ساتھ آپ علیہ السلام کا برتاؤ 247
مودودی صاحب کی زبانی فقہ کے بیان کردہ اصول کی تائید 248
سانپ کے ڈسے پر قرآن کی راہنمائی میں علاج 248
ابتدائی دور میں وحی کے نازل ہونے کی اہمیت 250
عابد یا عبادت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا انداز بیان 251
کچھ انبیاء کے متعلق تورات اور تاریخ کا بیان 252
حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ 253
ہجرت کا فیصلہ خود نبی کا اپنا ہوتا ہی نہیں 253
نبوت کے ۲۳ سالہ زندگی کی اہمیت 253
حج کے سلسلے میں نبی اکرم کے خواب کی تکمیل کا واقعہ 254
نبی کی اجتہادی غلطی کا مواخذہ اور خدا کی قدرت کا مفہوم 255
حضرت یونس کے متعلق ایک مشہور افسانے کی حقیقت 255
ہماری مساجد میں دی جانے والی تعلیم 256

گیارھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 89 تا 96)

نبوت کسی ذریت کے سہارے عطا نہیں ہوئی 258
انقلابِ نبوت ایک علیحدہ نوعیت کا انقلاب ہوتا ہے 259
دنیا بھر میں مروجہ مذہبی اور سیاسی سوچ کا ما حصل 260
آج کی انسانی دنیا میں دین خداوندی یا اسلامی نظام کے خدوخال کا نفاذ کیونکر ممکن ہے؟ 261
حضرت زکریا علیہ السلام کے زیر سایہ حضرت مریم علیہا السلام کی تعلیم وتربیت اور اس کے اثرات 261
حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں بڑھاپے میں بیٹے کا پیدا ہونا 262
خدا کا دین، دینِ فطرت ہے، اس میں کوئی بات خلافِ فطرت نہیں 264
خدا تعالیٰ بھی اپنے قانون کے خلاف کچھ نہیں کرتا 264
انبیاء کا کام اس قسم کے معجزات دکھانا نہیں تھا 264
انبیائے کرام کے نزدیک احساسِ ذمہ داری کی کیفیت 265
زندگی بھر انبیائے کرام کی مصروفیات کا جذبہ صادقہ 265
قانونِ خداوندی انسانی اختیارات میں وسعت پیدا کر دیتا ہے۔ 266
حاکم ومحکوم کے بلمقابل امیر المومنین کی اصطلاح کا مفہوم 267
انسانیت کی دنیا میں حاکم کا لفظ شرک ہے، اور انسان کی تذلیل بھی 267
نیکی کے تصور میں استحصال کا پہلو 268
ہمارے ہاں نیکی اور عبادت کا مروجہ تصور 268
مذہب دین کی تمام اصطلاحات وتصورات کو بدل کر رکھ دیتا ہے 268
مذہب کے خلاف حضرت مریم علیہا السلام کی بردباری اور جرأت کا کارنامہ 269
قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوگا 270
قرآنِ حکیم پوری نوعِ انسانی کو ایک امت کا تصور پیش کرتا ہے 270
قرآنِ حکیم ایک قانون کی اتباع ہی کو قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ 271
مملکت پاکستان کے خلاف ایک گہری سازش 271
قرآنِ حکیم کا پیغام نوعِ انسانی کے نام 272
آج کرہ ارض پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کی حالت زار اور اُن کی بے حسی 273
انسانیت کو آخرکار اسی صراطِ مستقیم پر آنا پڑے گا 275
انسانی زندگی کے لیے جذبہ محرکہ اور عقل وشعور کا معیار 275
قرآنِ حکیم کا بیان کردہ قانونِ مکافاتِ عمل 277
آخرکار ان تمام انبیاء کرام کا ذکر خیر کیوں؟ 277
دنیا کی کوئی قوم فوری طور پر تباہ نہیں ہوتی 278
ہلاک ہونے والی قوموں کی زبوں حال کیفیت 278
دورِ ہلاکت میں حیاتِ نو کے آثار 279
استحصال واستبداد کے خلاف خونِ اسرائیل کا جوش میں آنا 281

آخرکار حکمرانوں کی یہ ساحری قانونِ مکافات کے سامنے سرنگوں ہوگی 282
آخرکار یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی 282

بارھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 97 تا 102)

قرآنی معاشرے کی پہلی اور اہم خصوصیت 284
عذاب اور ہلاکت کے معنی اقتدار کا چھن جانا اور کسی نظام کا باطل ہو جانا ہے 285
نیکی اور بدی کے نتائج کو قیامت پر اٹھا رکھنے کے تصور کی سازش 286
قرآن جنت اور جہنم کی ابتدا اس زندگی سے کرتا ہے 287
دورِ اولیٰ کے بعد نظروں سے دین کا نظام اوجھل ہو جانے کا نتیجہ 287
دینِ خداوندی کا دوسرا نام نظامِ حیات ہے 288
الحق کے بنیادی معنی 288
پتھر کے بتوں کو جہنم کی سزا چہ معنی؟ 290
مذہب کی دنیا قرآن حکیم کی تعلیم کو پیش ہی نہیں کر سکتی 291
قرآن حکیم کے نزدیک عذاب جہنم کی نوعیت اور علامہ اقبال کا طرزِ بیان 291
غلط نظامِ زندگی کا ایک اور اہم پہلو 293
ہمارے ہاں کے غلط تراجم اور ان کا ازالہ 294
انسان کے لیے ابلیس کا سب سے خطرناک جبریت کا یا تقدیر کا تصور ہے 295
مذاہبِ عالم کو قرآن حکیم کا کھلا چیلنج 296
مجبور کی نیکی اور بدی کوئی اہمیت نہیں رکھتی 297
دین کے پانچ بنیادی اجزا میں جبریت کے عقیدے کا اضافہ 297
کمیونزم میں ایمان کے پانچ اجزاء کا انکار لیکن جبر اور تقدیر کا اقرار 298
کمیونزم کے فلسفے کی تمام تر حقیقت اور آج کے نوجوانوں کی سوچ 298
مذہب سے انکار کے باوجود اسی کی بنیاد پر محکم ایمان 299
جبریت کا یہ مسئلہ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے 300
سائیکالوجی کے تحت آج کے نوجوانوں کی سوچ کا رخ 301
کیا انسان اپنے نفسِ غیر شعوری کا غلام ہے 302
اقدارِ خداوندی کے تابع انسان کی Will Power (قوتِ ارادی) ایٹمی قوت کا درجہ رکھتی ہے 302
نفسِ غیر شعور یہ انسانی نفسیات پر کیونکر قابو پایا جا سکتا ہے؟ 303
ہمارے ہاں سائیکولوجی کے متعلق دی جانے والی تعلیم کے اثرات 304
قرآنِ حکیم کے نزدیک ابلیس و آدم کے تعارف کا انداز 305

تیرھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 103 تا اختتام)

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی جنت اور جہنم کے موجودہ تصور کی حقیقت 309
ان آیات کا مروجہ مفہوم 312
ان آیات کا ایک دوسرا مفہوم: قرآن حکیم کے الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت اور حقیقت 313
وجودِ کائنات کے متعلق ایک عظیم قرآنی آیت کا مفہوم 315
سب سے بڑی جنت کے حصول کا راز 316
آج کا انسان اپنی ابتدائی تمدنی زندگی کی تلاش میں ہی سرگرداں ہے 317
حجۃ الوداع کے موقع پر بیان کردہ خطبے کی گہرائی 318
قرآنِ حکیم انسان کو اس کے روشن مستقبل سے مایوس ہونے ہی نہیں دیتا 318
قرآنِ حکیم کی روشنی میں صالحین کا حقیقی مفہوم 319
مملکتِ اسلامیہ کو قائم اور دائم رکھنے کی تاکید 321
اجتماعی نظام ہمیشہ قانون پر عمل پیرائی کا رہینِ منت ہوتا ہے 321
قرآن حکیم اور شمشیر کا باہمی رابطہ 322
قرآن نے ہجرت کے عمل کو خدا کا احسان کہا ہے 329
مملکتِ پاکستان کی تاریخ بعینہٖ بنی اسرائیل کی تاریخ ہے 329
بلاغ کا قرآنی مفہوم 330
رحمت للعٰلمین کا قرآنی مفہوم 331
نبی اکرم ﷺ کا ایک سبق آموز فرمان 333

پیش لفظ

ہر صاحب علم و بصیرت اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ قوموں کی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار کرنے اور انہیں مستحکم رکھنے میں الفاظ و اصطلاحات کی دنیا کی حرمت ہر لحاظ سے پیش نظر رکھنے کا عمل یقینی طور پر ایک مؤثر انداز اختیار کیے ہوتا ہے۔ اور اگر ان حقائق کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر اس قوم کی سوچ کی بالیدگی باقی ہی نہیں رہتی اور پھر جس کے باعث افراد و اقوام کے باہمی تصورات اور تعلقات بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ صدیوں سے اسی مرض کہنہ میں مبتلا دکھائی دے گی' چنانچہ اس ذہنی پسماندگی اور ادراک کی مفلسی کے نتیجہ میں بحیثیت قوم دنیا کے کونے کونے اور گوشے گوشے میں انفرادی سطح پر ہم میں سے ہر کوئی یک نگہی کے آب حیات سے محروم' بے بسی کے تپتے ہوئے صحرا میں برلب جاں کراہ کراہ کر اپنی عمر رفتہ کو آوازیں دیتا دکھائی دے رہا ہے۔

اگر اِن حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس تمام تر تباہی و بربادی اور زبوں حالی کی اصل وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں ملوکیت کے دور میں فرقہ بندی کے تانے بانے میں الجھے ہوئے خود ساختہ مذہبی تصورات کی لغت نے قرآن حکیم کے مفہوم کی شکل و صورت کو ہی بدل کر رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین خداوندی جو ہر نوع غلامی کے لیے پیغام موت تھا اور جس کے مکمل اور غیر متبدل اصولِ حیات جو ہر آن اجتماعیت کی نوید لیے نہایت منزہ اور مشہود شکل میں قندیل آسمانی کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیئے گئے تھے انہیں بتدریج بڑی چابک دستی سے نظروں سے اوجھل کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی کشتی کو نظریاتی تفاوت کے گہرے گڑھے میں دھکیل دیا گیا چنانچہ سو جائیکہ اس نسخہ کیمیا کے تصدق سے ہم باہمی طور پر غور و فکر کی محنت سے اتفاقات کی گتھیاں سلجھانے کے قابل ہوتے ہماری حالت ایک کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے شعلہ کی مانند ہو کر رہ گئی اور پھر آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ''اِس آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی سخت اور درشت تہیں کچھ اس طرح جم گئیں کہ اس زنگ کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا۔''

چنانچہ اس کوتاہ نظری اور بدعملی سے پوری انسانیت کو قندیل آسمانی کی روشنی سے محروم ہو جانے کے باعث اس قدر خسارہ اٹھانا پڑا کہ جو نہ تو کسی ترازو میں تولا اور نہ ہی رات کے ماتھے پر دیکھے جانے والے ستاروں کی طرح گنا جا سکتا ہے۔ بقول شاعر؎

کون بھلا لکھ سکتا ہے یہ گنتی ہو مرقوم کہاں
اس گنتی کی گنتی ' گنتی والوں کو معلوم کہاں

چنانچہ اس قدر مادی ترقی کے حصول کے باوجود انسانیت کا یہ جم غفیر آج بھی اپنی ابتدائی مدنی زندگی کی ہی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن اس قدر ناگفتہ بہ حالات میں بھی ہم مایوس نہیں اور ہمیں امید واثق ہے کہ آنے والا دور عنقریب ان بدنما داغوں کو کھرچ کھرچ کر حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گا اور یہ زمین بالآخر اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

بہر حال یہی وہ حقائق تھے کہ جن کے پیش نظر محترم پرویز صاحبؒ سورۃ الانبیاء کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم حضراتِ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد یہ بیان کرتا ہے کہ قوموں کے خود ساختہ قائم کردہ نظام کی جگہ احکامِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کے لیے یہ قابلِ صداحترام شخصیات معاشرے میں ایک انقلاب لاتی تھیں۔

اس انقلاب کے نتیجہ میں افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ساتھ کے ساتھ ہوتی جاتی ہے۔طبعی زندگی کی نشوونما اور پرورش تو یوں کہیے کہ مفت میں ہو جاتی ہے اور اس میں یہ ایک مقدم چیز ہے کیونکہ اس کے بغیر تو زندگی کی سطح پر‘ جس پر ہم جی رہے ہیں‘ یعنی طبعی سطح Physical ground پر افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہوسکتی۔اس کے لیے تو اس جسم کی نشوونما نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر تو انسانی ذات کی بھی نشوونما نہیں ہوسکتی لہٰذا ان طبعی ضروریات کا پورا ہونا تو بالکل اس کی ابتدائی چیز ہے‘ اصل مقصد تو انسانی ذات کی خصوصیات کی نشوونما ہوتا ہے‘ اور وہ نشوونما ایک اجتماعی زندگی میں‘ ایک صحیح نظام کے اندر ہی ہوسکتی ہے‘ انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔چنانچہ انبیائے کرام کی آمد کا مقصد اور ان کی رسالت کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ ہمارے تصور کے مطابق ایک ایک فرد کا تزکیہ نفس کرتے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہاں ایک معاشرتی نظام‘ قائم کریں۔اس نظام میں تمدنی‘ سیاسی‘ معاشی‘ سب چیزیں آ جاتی ہیں۔وہ انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک صحیح نظام قائم کرتے تھے جس میں تمام ضروریاتِ زندگی از خود میسر آتی تھیں اور انسانوں کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ:’’جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں خدا کے مقرب بندوں‘ جنہیں متقی پرہیزگار کہتے ہیں‘ ان کی زندگی کا پروگرام یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت عبادت میں گزار دیتے ہیں اور عبادت کو اگر سمٹائیے یا اس کی تفصیل بھی پوچھیے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ صائم الدہر ہوتے ہیں‘ روزے رکھتے ہیں‘ روز مصلے پہ بیٹھے رہتے ہیں‘ نفل پڑھتے رہتے ہیں‘ نمازیں تو بہر حال یہی ہوتی ہیں‘ باقی اوقات میں وہ نوافل ادا کرتے رہتے ہیں‘ ورد وظیفے کرتے ہیں‘ تسبیح پھیرتے ہیں‘ اور اس سے ذرا آگے بڑھیں تو لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے رہتے ہیں۔آپ دیکھیں گے کہ خدا کے مقرب بندوں کا اس سے زیادہ کچھ تصور ہی ان کے ہاں نہیں ہوتا۔اسی طرح‘ صرف خدا کی عبادت کا‘ نیکی اور پرہیزگاری کا‘ تصور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام مومن یا خدا کے مقرب بندوں کی یہ علامات ہیں تو حضراتِ انبیائے کرامؑ کے متعلق تو پھر یہ ہے کہ ان کے نام اسی زمرے میں سرِفہرست آتے ہیں۔جو سب سے زیادہ مقرب ہونگے وہ اسی پیمانے‘ اندازے‘ اور معیار کے مطابق سب سے زیادہ خدا کے عبادت گزار ہونگے‘ زیادہ روزے رکھتے ہوں گے‘ ان لوگوں سے زیادہ نفل پڑھتے ہوں گے‘ زیادہ ورد وظیفہ کرتے ہوں گے‘ زیادہ مصلے پہ بیٹھتے ہوں گے‘ زیادہ تسبیح پھیرتے ہوں گے‘ اور پھر باقی وقت وعظ ونصیحت کرتے ہوں گے۔تو یہ ہے تصور جو دیا جاتا ہے۔‘‘

اس کے بعد پرویزؒ صاحب زندگی کے حقائق بیان کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں کہ:’’قرآن حکیم تندرست اور توانا بچے کو بھی صالح کہتا ہے‘ کسی کی بیماری کے بعد اس کا علاج کرنے کے بعد جو تندرست ہو جاتا ہے‘ وہ اسے بھی اصلحنا کہتا ہے۔اَصْلَحَ کے معنی ہوتے ہیں تمام قوتوں کے اعتدال کو لیے ہوئے قائم ہونا اور پھر ہر اعتبار سے اس کا تندرست وتوانا ہونا ہے یعنی یہ صلاحیتیں اور قوتیں بھرپور اور صحیح Proportion (تناسب) کو لیے ہوئے ہوں۔اس کے

پہلے معنی تو یہ ہوتے ہیں۔ با الفاظ دیگر وراثتِ ارض کے ابدی قانون میں پہلی شرط یہ ہے کہ اس قوم کے پاس مادی صلاحیتیں اور مادی قوتیں ہونی چاہئیں۔ اور یہ فطرت کا قانون چلا آ رہا ہے کہ زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت ہوتی ہے۔ جیسا میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ آگے وہ بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جہاں یہ قوت ختم ہوتی ہے' وہیں وہ قوم رک جاتی ہے اور رکنے کے بعد تباہ ہو جاتی ہے' فنا ہو جاتی ہے' آگے نہیں بڑھ سکتی' اپنے مقام پہ بھی نہیں کھڑی رہ سکتی۔ اگر قوت نہیں ہوتی تو ...... جہاں باز وسمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

لہٰذا پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے پاس وہ قوت ہونی چاہیے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

لیکن مذہب کا فریب اور روحانیت کی تلبیس' یہ کوشش کرتی ہے کہ قوم میں قوت نہ آنے پائے۔ اس میں ضعف وانکساری ہو۔ مسلمانوں کو قرآن سے برگشتہ کرنے کے لیے جو سازشیں ہوئی ہیں اُن کا تو پوچھو نہیں۔ ان کی تو ایک تاریخ ہے اور سب سے بڑی سازش یہ ہے کہ خدا کے مقرب بندوں کی نشانی اور خصوصیت ضعف وانکساری ہے۔ ناتوانی' بے کسی' بے بسی' مجبوری' ضعف' غریبی' یہ ساری جتنی بھی دنیا کی لعنتیں ہیں' اکٹھی کی جائیں تو اس کا مقام تقربِ بارگاہِ خداوندی ہوتا ہے۔ جی! نہ او کچھ کھاندا پیندا اے' نہ ایس قوم نوں کوئی لبھدا اے کھان پین نوں' نہ او کچھ کپڑے وپڑے پاندا اے' نہ ایناں نوں لبھدا ہیگا اے۔ [1] او وی لامکاں تے اے وی لامکاں' جناب! نہ گھر' نہ گھاٹ۔ مقربین بارگاہِ خداوندی کا نقشہ یہ دیا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ہزار سال سے آپ کے خلاف یہی سازش ہو رہی ہے۔

اس کے لیے وہ پہلے ان قوموں کو آگاہ کرتے تھے کہ تمہارے اس غلط نظام کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے اور اگر اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ تم اپنے ہاں نظامِ خداوندی کے مطابق معاشرہ متشکل کرو۔ اس معاشرے کا پہلا نتیجہ یا خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ: وہاں نہ تو کسی قسم کا کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ ہی حزن۔

عزیزانِ من! انبیائے کرام دین لے کر آتے تھے اور دین تو ایک انقلاب چاہتا ہے۔ انبیاء کرامؑ ایک نیا نظام دنیا میں قائم کرتے تھے' اس دین کا تمکن کرتے تھے۔ یہ وہ نظام تھا جو خدا کی وحی کے خطوط پر متشکل ہوتا تھا۔ وہ انسانی زندگی کے اندر ایک انقلاب لاتے تھے۔ انسانوں کو ایک دوسرے نہج پر زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھاتے تھے۔ یہ بہت بڑے آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔

قرآن حکیم نے اپنے ہاں اس انقلاب کی حفاظت کے سلسلہ میں جو شمشیر کا ذکر کیا ہے تو اس کے متعلق کتاب الفرقان کی روشنی میں پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ:

''قرآن بھی ایک قوت ہے' شمشیر بھی ایک قوت ہے۔ یہ دو قوتیں ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ شمشیر تو قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ کہیں یہ وعظ ونصیحت ہی بن کے نہ رہ جائے' یہ مملکت کا ضابطہ قانون ہو' شمشیر اس کی حفاظت کرتی ہے۔ قرآن شمشیر کی حفاظت کرتا ہے کہ کہیں ہلاکو اور چنگیز کی شمشیر نہ بن جائے بلکہ عمرؓ اور ابوبکرؓ کی شمشیر بن کے رہے۔ یہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔''

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

[1] جی نہ وہ کچھ کھاتا پیتا ہے' نہ اس قوم کو کچھ کھانے پینے کو ملتا ہے' نہ وہ کوئی لباس پہنتا ہے نہ انہیں ملتا ہے۔ وہ بھی لامکان اور یہ بھی لامکان۔

اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔

کائناتِ زندگی را محورند

لہٰذا قرآن حکیم نے اگر مومن کا فریضہ تسخیر کائنات قرار دیا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مومن کو نوعِ انسانی کے امن کا ضامن بھی بتایا ہے۔

برادران عزیز! زندگی کی ساری کائنات اس محور کے گرد گھومتی ہے...... ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند...... ایک مصرع پہ کتابوں کی کتابیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ سارا دین اس کے اندر آ جاتا ہے۔ قرآن کی آیت سامنے ہوتی ہے' اسی آیت کا یہ مفہوم ہے اور کتنے خوبصورت انداز میں ہے: ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند۔ عزیزان من! اس قسم کی آپ کو کہیں مثال بھی نہیں ملے گی۔ اس انداز سے بات کا کہنا' قرآن اور شمشیر حافظِ یک دیگرند۔ قرآن ہٹ جائے تو شمشیر ہلا کو ہو جاتی ہے اور رہ جاتی ہے چنگیزی۔ شمشیر ہٹ جائے تو قرآن صرف مُردوں کو بخشنے کے لیے' بغیر سوچے سمجھے تلاوت کرنے کے لیے رہ جاتا ہے:

کہ از یٰسین او آساں بمیری''

بہرحال قرآن حکیم نے سورۃ الانبیاء کے اندر انسان کی اس طبعی عمر کے علاوہ انسانی زندگی کی حقیقت' مقامِ کائنات اور جہانِ فردا کے رموز و اسرار کو بیان کرنے کے علاوہ نبوت سے سرفراز مختلف شخصیات کا ذکر اور ان کی بعثت کا مقصد جس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے وہ انسان کی معاشرتی' معاشی' سیاسی اور تمدنی زندگی کی راہ نمائی کے لیے ایک لازوال سرمایہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ تک انبیاء کرامؑ کا یہ نورانی قافلہ انسانی زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کی خاطر جہاد زندگی میں جس جس انداز سے مصروف کار رہا اس کے متعلق خدا تعالیٰ سے بڑھ کر کون اس کی شہادت دے سکتا ہے۔ انسانی لغت میں تو کوئی ایسا لفظ ہی نہیں جو انبیاء کرامؑ کے اس مقامِ بلند کو بیان کرنے کے لیے کافی متصور کیا جا سکے حقیقت تو یہ ہے کہ

چمن کی رنگیں فضاؤں کو آ کے رشکِ جنت بنا گئے تم
وہاں وہاں پر خزاں نہ آئی جہاں جہاں مسکرا گئے تم

برادران عزیز' ان عظیم شخصیات نے اپنے اس فریضۂ نبوت کو جس طریق سے انجام دیا اس کا روشن باب ہی یہ تھا کہ

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

آخر میں دیگر احباب کے علاوہ میں محترم ڈاکٹر پروفیسر منظور الحق صاحب اور محترم محمد علی فارق صاحب کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں کہ جن کے تعاون ہی کی بدولت اس عظیم تفسیری پراجیکٹ کے تحت سورۃ النحل، سورۂ بنی اسرائیل، سورۃ الکہف و مریم کے بعد سورۂ طٰہٰ، سورۃ الانبیاء اور سورۃ الحج نذر قارئین کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام' لاہور

پہلا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 1 تا 9)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا
اسۡتَمَعُوۡہُ وَ ہُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ لَاہِیَۃً قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ ہَلۡ ہٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ
مِّثۡلُکُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾ قٰلَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۫
وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۴﴾ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰىہُ بَلۡ ہُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡیَاۡتِنَا بِاٰیَۃٍ کَمَاۤ
اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۵﴾ مَاۤ اٰمَنَتۡ قَبۡلَہُمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا ۚ اَفَہُمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا
رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷﴾ وَ مَا جَعَلۡنٰہُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡکُلُوۡنَ
الطَّعَامَ وَ مَا کَانُوۡا خٰلِدِیۡنَ ﴿۸﴾ ثُمَّ صَدَقۡنٰہُمُ الۡوَعۡدَ فَاَنۡجَیۡنٰہُمۡ وَ مَنۡ نَّشَآءُ وَ اَہۡلَکۡنَا الۡمُسۡرِفِیۡنَ ﴿۹﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1976ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سترہویں پارہ کی 21 ویں سورۃ الانبیاء سے ہو رہا ہے: (21:1)۔

نظر اور بصر میں فرق

پچھلے درس میں کہا گیا تھا کہ ان سے کہو کہ ان بے کار باتوں سے کیا حاصل! تم اپنی راہ چلتے رہو میں اپنی راہ چلتا ہوں۔ کچھ تھوڑا سا انتظار کرو۔ نتائج بہت جلد سامنے آ جائیں گے۔ اب ربطِ آیت دیکھیے کہ نئی سورۃ شروع ہو رہی ہے اور پارہ بھی نیا ہے۔ پارے تو خیر، ہم لوگوں نے خود بنائے ہیں لیکن آیت تو نئی شروع ہو رہی ہے۔ یہ دیکھیے کہ کہاں سے شروع ہو رہی ہے! **اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ** (21:1)۔ یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے ہیں، اس کے نتائج سامنے آنے کا وقت سر پہ آ پہنچا ہے لیکن یہ ابھی تک اسی طرح خوابِ غفلت میں مدہوش، صحیح روشِ زندگی سے منہ موڑے غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ یعنی انہیں جھنجھوڑ کر کہا جا رہا ہے کہ اے غافلو! او بے خبرو! قیامت سر پہ آ گئی، سیلاب چڑھ آیا، تمہارے حساب کا وقت بڑا قریب آ گیا ہے اور تم ہو کہ اب بھی سو رہے ہو۔ پکار کے ان سے کہہ دو: آخری پکار کہ **الصلوٰۃ خیر من النوم** خوابِ غفلت میں مدہوش رہنے کے مقابلے میں فرائضِ منصبی کی ادائیگی

باعثِ وسعت اور وجہِ کشاد ہے اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ کیا کیا جائے' انسان کی روشِ حیات ہی اس قسم کی چلی آ رہی ہے کہ **مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ o لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ** (21:2-3)۔اس کی طرف' اس کے نشوونما دینے والے کی جانب سے' جب بھی کوئی قوانین وضوابط پہلی بار آئے' انہوں نے اُن پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ انہیں محض تفریحاً سنتے رہے (26:5) اور وہ بھی اس طرح کہ بظاہر کان ادھر لگے ہیں لیکن دل یکسر غافل ہیں۔ یعنی یہ کہا کہ جب کبھی بھی کوئی داعی انقلاب ان کے پاس آیا اور اس نے اس قسم کے استیصال پسندوں کے خلاف کوئی بات کہی تو ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ **اِسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ** (21:2) سنتے رہے لیکن ایسے ہی جیسے کسی کھیل کی داستان سن رہے ہوں' تماشا دیکھ رہے ہوں' تو جیسے اس معاملے کے متعلق کبھی سنجیدہ (Serious) ہی نہیں ہوئے کہ یہ جو کہہ رہا ہے وہ کتنا اہم معاملہ ہے' کتنا زندگی اور موت کا سوال ہے' کتنا قوموں کے عروج و زوال کا مسئلہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اِسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ** (21:2)۔انہوں نے ان پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا' محض تفریحاً سنتے رہے۔ یعنی سنتے تھے لیکن یوں جیسے کوئی تماشا دیکھ رہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ **لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ** (21:3)۔ کان کہیں ہیں' دل کہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے دوسرے مقامات میں بھی یہی کہا ہے جہاں نظر اور بصر میں فرق کیا ہے۔ ایک مقام پر ہے کہ **يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ** (7:198) تیری طرف دیکھ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! عربی زبان ہے' یہاں دو لفظ ہیں: ایک ''نظر'' ہے اور دوسرا ''بصر'' ہے۔ دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ **وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ** (36:9)۔ وہ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ اب میں اس کا اور کیا ترجمہ کروں۔ ایک مقام یہ ہے۔ اس میں تو **ینظرون** کہا ہے۔ ٹھیک ہے' ہمارے ہاں تو نظر اور بصر دونوں کے معنی دیکھنا آتا ہے مگر قرآن دونوں میں فرق کرتا ہے۔ جس میں ایک تو دیکھنا یہی ہے کہ آدمی یوں ہی بٹ بٹ تکتا جائے[1] وہ بھی اسی طرح کہ دل کہیں ہے' خیال کہیں' مگر دیکھ رہا ہے۔ روز یہ کچھ ہوتا ہے اور دوسرا دیکھنا وہ ہوتا ہے جس میں دل کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس طرح کے دیکھنے کے لیے ''بصر'' کا لفظ ہوتا ہے۔ اسی لیے ''سمع'' کے متعلق بھی یہی چیز ہے کہ ایسے سُن رہے ہیں جیسے کوئی تماشے کی بات سن رہے ہوں۔ دل کہیں ہے' کان کہیں ہیں' آنکھیں کہیں لگی ہوئی ہیں' اور اس کے بعد اگر کوئی چیز سامنے آتی ہے تو پھر کوئی خطرہ نظر آتا ہے اس لیے قرآن کریم نے اگلی ہی آیت میں کہا کہ **اَسَرُّوا النَّجْوٰی** (21:3)۔ ان میں سے جو زیادہ سرکش ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر مشورے کرتے ہیں (کہ کس طرح سے اس آواز کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے)۔ تو اس کے لیے تو پھر وہ چھپ چھپ کے اس کے متعلق سازشیں کرتے ہیں' مشورے کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ارے بھئی! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ کبھی یہ نہیں سوچتے۔ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی اور کی باتیں کر رہا ہے' مگر ہے یوں کہ اس

---

[1] ٹکٹکی باندھے دیکھتا جائے۔

کے خلاف کوئی سازش کرنی چاہیے۔ اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (21:3)۔ یہ ظالم لوگ ہیں۔ ان کی یہ صورت ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ ان سے سب کچھ چھن گیا ہے' مگر وہ اندر ہی اندر لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (21:3)۔ یہ تو تمہاری ہی طرح کا ایک عام انسان ہے۔ وہی پرانی بات جو شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے' یونہی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی آتی ہے' جبریل آتا ہے یا خدائی اقدار پیش کرتا ہوں اور کہتے ہیں کہ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (21:3)۔ کیا تم اس لیے وہاں جاتے ہو کہ اس کی خود ساختہ جھوٹی باتیں سنو؟ تم سب کچھ دیکھتے بھالتے اس کے فریب میں کیوں آ جاتے ہو؟ دیکھیے یہاں لفظ ''تبصرون'' آیا ہے جو ''بصر'' سے ہے۔ یہاں یہ ہے کہ دیکھتے بھالتے عقل وفکر کے مالک ہوتے ہوئے ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک جھوٹی بات ہے اور یہ ہیں کہ اس کو کرتے چلے جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک لفظ سحر کا مفہوم

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ عربی زبان میں سحر [1] بنیادی طور پہ ''کسی حقیقی چیز کو غیر حقیقی چیز بنا دینے یا غیر حقیقی چیز کو حقیقت بنا کے دکھا دینے کو کہتے ہیں''۔ عربی زبان میں اس ''قسم کے جھوٹ کے لیے'' سحر کا لفظ آتا ہے۔ ''یہ ایک بالکل جھوٹی بات ہوتی ہے جسے یوں سچی بات کہہ کے پکار رہا ہے۔ یہ اپنی طرف سے گھڑی ہوئی چیزوں کو سحر کہتے ہیں''۔ یہ اس فریب کو سحر کہتے ہیں جس میں کہا جاتا ہے کہ یہ کچھ خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزیں ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جسے کفر کہتے ہیں ورنہ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ جادو کر دیا جاتا ہے اور اس نسبت سے اسی آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ کیا تم جادو کو قبول کرتے ہو؟ او جادو کا تو اس نے پہلے ہی کہا ہے کہ یہ کرامات کی کوئی بات نہیں ہے' معجزے کی کوئی بات نہیں ہے۔ قرآن نے جادو کو تو وہاں کاٹ دیا' جادو تو ہوتا ہی Irrational ہے' اس میں تو دلیل کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا' اس کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ قرآن تو ''بینات'' دے رہا ہے' اور وہ ہیں کہ ''آیات'' کا تقاضا کرتے ہیں۔ اسکو جادو کہتے ہیں۔ قرآن تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ (2:11) کہتا ہے۔ یعنی کہتا ہے کہ دلائل و براہین سے بات کرو' جذبات سے الگ ہٹ کر علم و بصیرت کی روسے' بات کرو۔ اس کے برعکس سحر کے معنی یہ ہیں کہ بنیادی بات کچھ اور ہو اور بتایا کچھ اور ہی جائے۔ اب اس کے بعد آیا کہ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (21:3) تم تو عقل وفکر سے کام لے رہے ہو۔ تو یہاں لفظ تبصرون آیا ہے یعنی عقل وفکر سے کام لینے والا اس قسم کے فریب میں نہیں آئے گا۔

دوسروں سے بات کرنے کے انداز میں سحر سازی کا اثر

لوگ دوسروں سے جا کر اس طریق سے بات کرتے ہیں' جس میں سحر بیانی ہوتی ہے' جس میں ایک دکھتی ہوئی رگ بھی ہوتی ہے۔

---

[1] اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان۔ سورۃ طٰہٰ

جب دوسرے سے یہ کہا جائے کہ میاں تم تو عقل وفکر کے مالک ہو' بڑے ہوش مند ہو' سمجھدار آدمی ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس کی بات مانتے ہو۔ اس سے اس کے اندر تو ذرا تھوڑی سی انا بھی پھولتی ہے اور وہ اس کی بات کو صحیح خیال کرنے لگتا ہے اور اگر چھوٹتے ہی اسے کہا جائے کہ تُو تو بالکل ''الو کا پٹھا ہیگاں' تینوں گل ای ایہدی سمجھ اچ نئیں اوندی [1] تو اس سے اس کا ردِ عمل کچھ اور ہوگا۔ وہ کبھی آپ کی بات صحیح خیال نہیں کرے گا' ممکن ہے آپ سے الجھ بھی جائے' کافی حد تک اس کا ردعمل نفسیاتی ہوگا۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم کا تو ایک ایک لفظ عقل وہوش سے دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں **وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ** (21:3) کہہ کر کتنی دکھتی رگ پکڑی ہے۔ او! تم تو صاحبِ عقل وہوش ہو' دیدہ ور ہو' بینا ہو' دانا ہو' صاحبِ عقل ہو' تمہیں کیا ہو گیا ہے' تو کیا جانتے ہی نہیں کہ تمہیں ایسا دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ عجیب چیزیں ہیں' عجیب انداز ہے۔ اس کے جواب میں رسولِ خدا نے صرف اتنا ہی کہا تھا: **قَالَ رَبِّیۡ یَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِی السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ** (21:4)۔ ان کا رسول ان سے کہتا ہے کہ (میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں' وہ اُس خدا کی طرف سے ہے) جو زمین وآسمان کی سب باتیں جانتا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ اگر بات میری اپنی بشریت کی ہو تو میرے علم کی کوئی حدود ہوتی ہیں۔ نگاہ ان حدود سے آگے تو بہر حال جا ہی نہیں سکتی اور یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ تمہارے اس قدر بظاہر کامیاب پروگرام کے خلاف کہا جا رہا ہے کہ تباہی آئے گی تو کیا کوئی بشر بھی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ یہ تو غیب کی بات ہے جو کہہ رہا ہے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے کہ جو ارض وسما کے غیب کو بھی جانتا ہو۔ لہٰذا یہ تو اس کی طرف سے ہے جو **وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ** (21:4) ہے' یعنی وہ سمیع بھی ہے' وہ علیم بھی ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا بھی ہے' جاننے والا بھی ہے۔ تم خفیہ مشورے کرتے ہو وہ انہیں بھی سنتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے علم کی بنا پر کہتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی زبان کا خاصہ اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! عربی زبان کے الفاظ ان کے مادہ [2] (Root) سے بنتے ہیں اور ان کے صیغے [3] اوزان [4] پہ بنتے ہیں۔ سمیع اور علیم

---

[1] تم تو نرے الو ہو' احمق ہو' تمہیں تو اس کی بات ہی سمجھ نہیں آتی

[2] عربی زبان کا ہر لفظ الگ الگ مستقل حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جس طرح درخت کی شاخیں' پتے' پھول' پھل' اس کے بیج (Seed) یا جڑ (Root) سے نکلے ہوتے ہیں اسی طرح زبان کا ہر لفظ اپنی ایک جڑ یا اصل رکھتا ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ اس جڑ کو مادہ (Root) کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ایک مادہ سے سینکڑوں الفاظ (اسماء، افعال، صیغے وغیرہ) بنتے ہیں۔ ان الفاظ کی شکلیں مختلف ہوں گی لیکن ان میں سے ہر ایک میں اس جڑ (مادہ) کی خصوصیات ضرور ہوں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم ہو اور اُن قاعدوں سے واقفیت ہو جن کے مطابق اس مادہ سے مختلف الفاظ خاص شکلیں لیے ہوئے ابھرتے ہیں تو مادہ کے معنی معلوم ہو جانے سے ان تمام الفاظ کے معانی خود بخود سامنے آجائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی زبان میں مادہ ان اصل حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل (Verb) کی پہلی شکل وجود میں نہ آسکے۔ اس کے فعل کا مادہ کبھی تین حرف [باقی اگلے صفحے پر]

کے یہ الفاظ معین وزن پر بنے ہیں۔ یہ زبان عجیب چیز ہے اور قرآنِ کریم کا عربی زبان کا انتخاب اس سے کہیں زیادہ عجیب تر۔ عربوں کے ہاں یہ زبان بڑی ہی Scientific (سائنسی) ہے۔ عزیزانِ من! جو لفظ اس وزن پر آئے گا' اس میں ان کے قاعدے کی رو سے استمرار پایا جائے گا یعنی مستقلاً وہ ایسا کرنے والا ہوگا۔ اب ان اوزان اور ابواب کو دیکھیے۔ ان کے لحاظ سے ''عالم'' تو وہ ہوسکتا ہے جسے ایک وقت میں ایک بات کا علم ہو مگر دوسرے وقت میں اسے دوسری بات کا علم نہ ہو لیکن جب یہ لفظ ''عالم'' دوسرے باب میں ایک وزن پر ''علیم'' بنتا ہے تو یہ ''علیم'' ایسا نہیں ہوسکتا جیسا ''عالم'' ہے کہ ایک وقت میں تو اسے ایک بات کا علم ہو مگر دوسرے وقت میں اسے دوسری بات کا علم نہ ہو۔ اس باب میں ''علیم'' وہاں آئے گا جہاں استمراراً وہ چیز کہی جاتی ہے۔ اسی طرح سے ''سمع'' ہے کہ کبھی ایک وقت میں سن لیا مگر کسی دوسرے وقت میں نہیں سنا۔ اس کے برعکس جب یہ دوسرے باب میں ''سمیع'' بنتا ہے تو اس کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ کبھی تمہاری کوئی بات سن لی' کبھی نہ سنی۔ اسی طرح ''علیم'' کے لحاظ سے یہ حالت نہیں ہے کہ کبھی کچھ جان لیا' کبھی نہ جانا۔ عزیزانِ من! یہ زبان عجیب واقع ہوئی ہے۔ اگلی آیت میں کہا ہے کہ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ (21:5) یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اس رسول کے اپنے ہی خیالاتِ پریشان ہیں جو اسے خواب میں وحی بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ کہتا ہے کہ مجھے وحی ہوتی ہے اور جبریل آتا ہے' دراصل یہ کوئی خواب دیکھتا ہے تو اِس کے متعلق یہی کہتا ہے کہ میری طرف جبریل آتا ہے۔ یہ اس کے خواب ہیں اور وہ بھی خوابِ پریشان۔ ان

[گزشتہ سے پیوستہ]

کا ہوتا ہے اور کبھی چار کا۔ اسماء (Nouns) کے مادہ میں پانچ اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں۔ تین حرفی مادہ کو ثلاثی کہتے ہیں۔ یہ ثلاثہ ہے جس کے معنی ''تین'' ہیں۔ عربی زبان میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں۔ چار حرفی مادہ کو رباعی کہتے ہیں۔ یہ اربعۃ سے بنا ہے جس کے معنی چار ہیں۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص ص۔ 2-3,46)۔

❸ وہ مشتق اور متصرف کلمہ جو کسی اصل لفظ سے نکالا گیا ہو' صیغہ کہلاتا ہے۔

❹ عربی زبان میں ہر مادہ سے معین اوزان پر افعال (Verbs) اور اسماء (Nouns) بنا لیے جاتے ہیں۔ انہیں اس مادہ کے مشتقات (Derivatives) کہتے ہیں (مگر) حروف (Particles) مادہ سے نہیں بنتے۔ اس طرح فعل' جمع' اسم صفت کے اوزان مقرر ہیں' ان کے ابواب بھی مقرر ہیں۔ مختلف ابواب' مختلف اوزان پر آتے ہیں۔ ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال (Verbs) جن میں اصل حروف تو تین ہی ہوں لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں' ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف اوزان پر آتے ہیں۔ جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآن مجید میں بارہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی فعل (Verb) کا ایک باب سے دوسرے باب میں تبدیل ہونے سے بالآخر مقصود کیا ہے؟ یاد رکھیے! ان تبدیلیوں سے مقصود معانی میں وسعت اور ان کے درمیان معنوی فرق و اختلاف پیدا کرنا ہے۔ یعنی ایک ہی فعل (Verb) جب (مثلاً) بابِ تفعیل میں ہو تو اس کے معنے اور ہوتے ہیں اور باب افعال میں ہو تو اور۔ ان ابواب کی یہ خصوصیت (یعنی خاص معنی) مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ عربی زبان کی وہ خصوصیت ہے جو کہیں اور نہیں ملتی یعنی ہر باب کے خواص بھی مقرر ہیں اور جب وہ فعل (Verb) دوسرے ابواب میں منتقل ہوتا ہے تو اس کے وہ بنیادی خواص اس کے اندر موجود رہتے ہیں۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' جلد اول' باب اول 1960' ص ص۔ 5-70)

میں کوئی تک نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے یہ سب چیز غلط ہے۔ کچھ لوگ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں! **بَلِ افْتَرٰهُ** (21:5) یہ شخص یہ سب کچھ خود وضع کرتا ہے اور پھر خدا کی منسوب کر دیتا ہے مگر یہ لوگ اس کے متعلق یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ بڑا سمجھدار ہے' جب اس سے عام باتیں کہو تو دلائل لاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ خوامخواہ اس کی پریشاں خوابیں ہیں تو پھر کہا جائے گا کہ ویسے تو تم اس کی عام باتیں سوچو' سنو' تو سمجھو گے کہ یہ کتنی علم و عقل کی باتیں کرتا ہے تو پھر یہ چیز پریشاں خوابی تو نہیں ہو سکتی۔ یہ خوابیں تو نہیں' تو کیا یہ **اِفْتَرٰهُ** (21:5) ہے؟ ذرا سوچو تو! اس پر بعض کہتے ہیں کہ یہ افتراہ نہیں۔ بات یہ نہیں ہے صاحب! قرآن کی ان چیزوں پر مختلف گوشوں سے مختلف قسم کے اعتراضات آتے تھے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ معاشرے میں تو ذہن و فکر کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں چنانچہ ہر سطح کی طرف سے اپنی اپنی سطح کے مطابق اعتراض آتا ہے۔ اب یہاں بات یہ ہے کہ کوئی کہتا تھا کہ یہ پریشاں خوابی نہیں ہے' یوں ہی خوابیں دیکھتا ہے' یہ ایسا ہی کوئی جھوٹا ووٹا نہیں ہے کیونکہ ان کا کیریکٹر تو ان کے سامنے ہے کہ یہ جھوٹ تو بولتا نہیں۔ دوسرے کہتے تھے: نہیں' او نہیں' تمہیں پتہ نہیں ہے' یہ سب کچھ جو تمہیں نظر آ رہا ہے یہ اس کا وضع کردہ ہے' یہ بڑا کایاں ہے' افتراہ ہے' خود وضع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ تیسری طرف سے آواز آئی کہ **بَلْ هُوَ شَاعِرٌ** (21:5)۔ یہ شاعر ہے اور اپنے وجدان کو خدا کی وحی سمجھتا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ او چھوڑ بھئی! اس کو یونہی چھوڑ دو۔ شاعری کرتا ہے' تم اس کے متعلق خوامخواہ کے لیے اپنے آپ پہ کڑھ رہے ہو اور اسے Seriously (سنجیدگی سے) لے رہے ہو مگر یہ فی الواقعہ خدا کا رسول ہے تو **فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ** (21:5)۔ جس طرح ہم سنتے ہیں کہ پہلے رسولوں کو معجزات دیئے جاتے تھے اسی طرح یہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ کیا بات تھی اس قوم کی! اور کیا بات ہے قرآن کی! ایک شاعر کے متعلق اس قوم میں یہ کچھ ہے۔ ان کے ہاں شاعر کا بڑا اونچا درجہ تھا۔ شاعر کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اسے Intuition یعنی وجدان ہوتا ہے' اُسے الہام ہوتا ہے۔ یونان کے زمانے سے یہ تصور تھا کہ میوز (Muse) ایک دیوی ہے اور شاعر کے سلسلہ میں یہ اس بات کے قائل تھے کہ اس دیوی کا شاعر سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کے ذریعے شاعروں کو الہام ہوتا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ شاعروں سے بڑا کام لیتے تھے۔ ان کے ہاں تو قبائلی عصبیت انتہاء تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہ ایک دوسرے قبیلے کے خلاف تلوار سے تو جنگ بہت کم کرتے تھے' مگر بدنام کرنا ان کا بڑا اشعار تھا اور اس کے لیے وہ شاعر کو استعمال کرتے تھے۔

اہلِ عرب میں غیرت کا مادہ بدرجہ اتم تھا

عزیزانِ من! عربوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر چیز برداشت کر لیتے تھے مگر عزت کی بدنامی نہیں۔ یہ بڑی غیور قوم تھی۔ عزت کی بدنامی کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے' مثلاً ان کے ہاں ''الکریم'' ہونا یعنی متواضع ہونا بڑی چیز تھی۔ وہ اس بات

سے ہر وقت ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ کوئی راہ چلنے والا آئے اور ہم اس کی خاطر مدارت نہ کر سکیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں راستے بھی کون سے تھے۔ کوئی جرنیلی سڑک تو بنی ہوئی تھی نہیں۔ وہ لوگ صحراؤں کے اندر رہتے تھے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے والے یہ لوگ تھے بس جس طرف کوئی خیمہ نظر آیا وہ وہاں آ گئے۔ کوئی ابن السبیل آ گیا تو پوچھنا ہی نہیں کہ ''تم کس کے بیٹے ہو۔'' وہ تو مانا ہی راستے کا بیٹا جاتا تھا' آ یا کیتھوں ہیگا توں سوال ہی نہیں ہیگا'' ❶ بس وہ ابن السبیل ہوتا تھا۔ اگر کہیں کسی شخص کے متعلق' کوئی ابن السبیل یہ کہہ دے کہ بھئی! اس نے کھانا نہیں دیا تھا تو میں نے دیکھا ہے کہ اس کے ماتھے پہ کچھ شکن پڑے ہوئے تھے یعنی اگر اتنی سی بات بھی صرف کسی ایک کے لیے کہی تو پورا قبیلہ شرم و حیا سے ڈوب مرتا تھا اور اسے بدنام کرنے کا یہ کام وہ شاعروں سے لیتے تھے۔ اُف میرے اللہ! جو اُن کی لکھنی تھی' یہ ہی بھلی' بلکہ نہیں' ان کے ہاں تو وہاں کے اسلاف میں اس کا شجرہ نسب چلتا تھا۔ ان کے اسلاف میں اس کے متعلق اگر کسی نے اتنی سی کوئی بات بھی کسی شعر میں لکھ دی کہ اس کے ہاں سے فلاں مہمان بھوکا گیا تھا تو وہ اسے ختم کر دیتا تھا۔ پھر اُسے ختم ہی کر دینے کی یہ چیز چلتی تھی۔

عربوں کے ہاں اشعار اور شعراء کا مقام

عزیزانِ من! شعر تو زبانی یاد ہو جاتا ہے' نثر کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ ان کے ہاں نہ تو Literary (لکھی ہوئی) کوئی کتاب تھی' نہ اس قوم کے اندر لکھنا پڑھنا تھا لیکن ان میں سے ہر شخص کو ہزار ہا شعر یاد ہوتے تھے اور ایسے شعر کہ پوچھو نہیں کہ وہ کیسے ڈھونڈتے تھے۔ تو شاعروں سے وہ یہ کام بھی لیتے تھے۔ اُن کے ہاں شاعروں کے متعلق یہ عقیدہ بھی تھا کہ میوز (Muse) بھی آتی ہے' ابھی اذن بھی ہوتا ہے لیکن عزیزانِ من! میں تو کہتا ہوں کہ مجھے تو اس قوم پہ وجد آ جاتا ہے۔ وہ فیض ❷ کا کیا خوب شعر فٹ آتا ہے:

وہ تو وہ ہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

کہیں میرے محبوب نظر کو دیکھو تو سہی' اس کے ساتھ تو ایک طرف' تمہیں مجھ سے بھی محبت ہو جائے گی کہ واقعی تمہارا انتخاب بڑا عجیب ہے۔ ان عربوں پر جب بھی نظر ڈالتے ہیں تو وہ قرآن کے ماننے والے عرب تو ایک طرف رہے' یہ جاہلیت کے عرب بھی محبوب بن بیٹھتے ہیں۔ ان کے ہاں شاعر کی اتنی عظمت و اہمیت ہے لیکن اس کے باوجود وہ حقیقت کو نہیں بھولتے۔ کہتے ہیں کہ **اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ** (52:30)۔ یہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں' یہ بھی شاعر ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ **نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيۡبَ الۡمَنُوۡنِ** (52:30)

---

❶ تم کہاں سے آئے ہو؟ یہ پوچھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔
❷ فیض احمد فیض (1984-1914)

تھوڑا سا انتظار کرو، زمانے کی گردشیں اسے خود بخود ختم کر دیں گی، تم کیوں پرواہ کرتے ہو، زمانہ اسے مٹا دے گا۔ شعر میں تو خود کوئی اپنی قوت ہوتی نہیں ہے کہ زمانے کی گردشوں کا مقابلہ کر جائے۔ تمہیں یا ہمیں تو اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، یعنی آپ اندازہ لگایئے کہ شاعر کی عظمت اتنی ہے، اہمیت اتنی ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اسے الہام ہوتا ہے، اس سے کام اتنا لیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ اس میں پائیداری نہیں ہوتی۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ نَتَرَبَّصُ ❶ بِهٖ رَيْبَ ❷ الْمَنُوْنِ (522:30)۔ زمانے کی گردشیں اسے خود بخود مٹا دیں گی۔ Don't worry about him، کیوں پرواہ کرتے ہو؟ کیوں ان کے اس قسم کے مشورے سے گھلے جاتے ہو، پروگرام بناتے ہو، اسکیمیں قائم کرتے ہو، کا ہے کے لیے؟ ارے! وہ شاعر ہے اور ظاہر ہے کہ شاعر کو تو زمانے کی گردش آپ مٹا دیتی ہے۔ عزیزانِ من! زمانے کی گردش سے مٹانے کا مسئلہ آیا ہے تو اب ایک بات سامنے آ گئی ہے۔ اسے بھی سن لیجیے۔ شاعر کے متعلق قرآن نے سورۃ الشعراء میں پہلے تو یہ کہا کہ وہ خالص جذباتی ہوتا ہے، اس کا کوئی متعین مقصد یا منزل نہیں ہوتی اور شاعری کے متعلق یہ کہا کہ شاعری جذبات پر مبنی ہوتی ہے اور جذبات حقائق کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے شاعر کی بساط ہی کیا ہوتی ہے۔ اس کے بعد عزیزانِ من! اس کے ہاں تخیل کا تضاد دیکھیے کہ ایک ہی غزل میں، ایک شعر میں، پہلے تو یہ فراق کے رونے رو رہا ہے کہ ہماری ساری عمر اسی میں گزر گئی، یہ سب کچھ ہوا اور اگلے ہی شعر میں وصال کی لذتیں نچھاور کی جا رہی ہیں۔ خود بھی ان لذتوں سے حظ اٹھا رہے ہیں۔ آپ کو کیا بتائیں کہ یہ کچھ دو مختلف زمانوں کی غزلوں میں نہیں ہے۔ ایک ہی غزل کے دو شعروں میں یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی اس رقیبِ روسیاہ کے تھپڑ مارتے ہیں اور کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو ❸

قرآنِ حکیم کے نزدیک ایک داعیِ انقلاب اور ایک جذباتی انسان کی کیفیت میں فرق

عزیزانِ من! ایک داعیٔ انقلاب کے سامنے ایک نصب العین اور منزل متعین ہوتی ہے اس کے برعکس ایک جذباتی انسان وہ ہوتا

---

❶ تَرَبَّصَ ۔ انتظار کرنا، کسی پر خیر یا شر واقع ہونے کا انتظار کرنا، سودے وغیرہ کے سستا یا مہنگا ہونے کا انتظار کرنا یا کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960، ص۔ 717)

❷ رَيْبٌ. یہ اصل میں نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس کے معنوں میں آتا ہے۔ نیز شک و شبہ اور بے چینی کو بھی ریب کہہ دیتے ہیں۔ اور ریب المنون کے معنی ہیں ''حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کر سکتے ہیں، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کر سکتی۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960، ص۔ 796)

❸ غالب، مرزا اسد اللہ خان (1797-1869): دیوان غالب، 2002، ص۔ 124

ہے جو گھڑی اچ تولا' گھڑی اچ ماشا۔ہن ہسن ڈیا' ہن ای اے رون ڈیا' گالیاں دین ڈیا اے' تعریف کردا پیا اے [1] کبھی اِدھر کو چل پڑے' کبھی اُدھر کو چل پڑے۔کیسے چل پڑے؟ قرآن کہتا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (26:225)۔(شاعروں کی) حالت اُس اونٹ کی سی ہوتی ہے جو جھوٹی پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کی وجہ سے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرے اور اس کی پیاس کہیں بجھنے نہ پائے۔ساری عمر جذبات کا پرستار اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے: اونٹوں کو ایک بیماری ہو جاتی تھی' اسے جھوٹی پیاس کہتے تھے۔ان کو پانی پینے کی پیاس لگی ہوئی ہے لیکن پیاس ایسی ہے کہ وہ پانی ان کی پیاس بجھا ہی نہیں سکتا۔عرب اسے اَلْاَهْيَمُ کہتے تھے یعنی ایسا اونٹ جس کو جھوٹی پیاس کی بیماری لگی ہوئی ہو اور وہ پانی کی تلاش میں ہر وادی میں' ہر بیاباں میں' بھٹکتا پھر رہا ہو۔پانی ہے پیا بھی ہے مگر پیاس بجھتی نہیں اور وہ ہے کہ بس فِيْ كُلِّ وَادٍ (26:225) ہے۔وہ مختلف وادیوں اور بیابانوں میں پھر رہا ہے' یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی متعین وادی ہے: کبھی اقرار کی وادیاں' کبھی انکار کی وادیاں' کبھی الحاد کی وادیاں' کبھی ایمان کی وادیاں' اور وہ ہے کہ بس پھر رہا ہے اور وہ پیاس ہے کہ بجھتی ہی نہیں ہے۔

اسے ساری عمر دیکھو اسی حالت و کیفیت میں رہتا ہے۔کیا بات ہے قرآن کریم کی! دو لفظوں میں سب کچھ کہہ گیا کہ فِيْ كُلِّ وَادٍ (26:225)۔ہر وادی اور ہر بیابان میں اس کی یہی کیفیت ہے۔کہا کہ وہ کیا بات ہے جو اس شخص کو فریب میں رکھتی ہے؟ جواب دیا کہ معاشرے میں ان کے لیے ''واہ واہ' سبحان اللہ' کیا بات ہے' اوہو ہو' مشاعرہ لوٹ لیا'' کی ہاؤ ہو ہے۔کہتے ہیں کہ انہوں نے ''او مشاعرہ لٹ لیا سی'' [2] مگر مشاعرہ لوٹنے کے بعد جب گھر لوٹا تو پاؤں میں جوتا ہی نہیں تھا۔ہوا یہ تھا کہ ''جوتی ہی کوئی ہور چک کے لے گیا' اے پچھوں تائیں بیٹھے ہوئے نیں'' [3] چاندنی کا فرش تھا۔اس پر جوتے سمیت تو آنا نہیں تھا۔وہ اپنا جوتا لبِ فرش اتار کے چلے آئے۔ شرافت کا تقاضا تھا یا شاعر کی مت ماری ہوئی تھی۔''اے شریف بندا بنیا پھردا اے۔'' [4] انہوں نے مشاعرہ تو لوٹ لیا اور جب گئے ہیں تو جوتا چوری ہو گیا اور خود ننگے پاؤں گھر پہنچے۔پوچھ لو جو میں جھوٹ کہوں۔عزیز صاحب سامنے بیٹھے ہیں۔پوچھا جاتا ہے کہ جی! اسے کونسی بات فریب میں رکھتی ہے؟ کہتا ہے کہ جی! یہ جو پیچھے واہ واہ کہنے والے ہوتے ہیں' وہ فریب میں رکھتے ہیں۔ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ''بس اینوں چڑھ ہوندے نیں' تے اے مست ہو جاندا جذبات اچ'' [5]۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (26:224)۔شاعروں کے

---

[1] غیر مستقل مزاج' کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ابھی ہنس رہا ہے' دوسرے ہی لمحے رو رہا ہے' ابھی گالیاں بک رہا ہے' اور دوسرے ہی لمحے تعریف کر رہا ہے۔

[2] انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا تھا۔

[3] ان کا جوتا کوئی چوری کر کے لے گیا۔یہ آخر تک بیٹھے ہوئے ہیں۔

[4] یہ شریف آدمی بنا پھرتا تھا۔

[5] وہ اسے بے جا تعریف و توصیف سے اونچا دکھاتے چلے جاتے ہیں تو یہ جذبات میں مست ہو جاتا ہے' جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

پیچھے چلنے والے وہ فریب خوردہ لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں اور کبھی حقائق کا سامنا نہیں کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو ٹڈی دل کی طرح بے شمار، لیکن نتیجہ کے اعتبار سے دیکھو تو غریب ہی غریب۔ اس آیت میں یہ واضح کر کے سمجھا دیا کہ تمہیں پتہ ہے کہ ان کے پیچھے لگنے والے یہ کون ہیں؟ یہ ٹڈی دَل ہیں، کمبخت کروڑوں کی تعداد میں آئیں گے، اڑ کے جائیں گے تو جہاں جہاں بھی سبزی ہوگی ساری چاٹ کے لے جائیں گے۔ صاحب ایہد ابیڑا غرق کر کے رکھ دیندے۔ ❶ اس میں سبزی کا نشان تک نہیں رہنے دیتے، یعنی صاحب! اس کے پیچھے چلنے والوں کے متعلق یہ بات کہی ہے اور شاعر کے متعلق یہ کہا کہ جھوٹے جذبات اس کو لیے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ شاعر تو یہ ہوتا ہے، اس لیے تم اسے شاعر کہتے ہو۔ یہ ایک رسول ہے، ایک داعیِ انقلاب ہے اور تم اسے کہتے ہو کہ شاعر ہے۔ کیا بات ہے! قرآن نے یہ کہہ دیا کہ **وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ** (36:69)۔ ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی۔ کہنے کی یہ اتنی ہی بات بڑی تھی۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ** (36:69)۔ ایک داعیِ انقلاب کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتا کہ وہ شاعری کر سکے۔ وہ شاعری نہیں کرتا۔ اس کے سامنے ایک متعین نصب العین ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اس تک پہنچنے کے لیے، اس کے حصول کی تڑپ سچی ہوتی ہے۔ جھوٹی پیاس نہیں ہوتی۔ اس کا ہر قدم اس کی طرف اٹھتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی میں تم ایک لفظ ایسا نہیں سنو گے جو اس سے ہٹ کے دوسری طرف ہو۔ اس کے ساتھ چلنے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ جان تک دیدیں گے اور تم ہو کہ کہتے ہو کہ **بَلْ هُوَ شَاعِرٌ** (21:5)۔ یہ شاعر ہے، کیا شاعر یہ کچھ کیا کرتے ہیں؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ ایک رسول، خدا کا انقلاب آفریں پیغام لے کر آتا ہے۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانونِ خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کا مالک ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے، کبھی جذبات کی وادیوں میں، اور کبھی تخیلات کی جولانگاہوں میں۔ اس کے سفر کی راہیں تاریک ہوتی ہیں جن میں راستہ دکھانے والے ستارے کہیں نہیں ہوتے۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں۔ اور تم ہو کہ تمہارا پھر وہی تقاضا ہے کہ **فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ** (21:5)۔ جس طرح ہم سنتے آئے ہیں کہ پہلے رسولوں کو معجزات دیئے جاتے تھے، یہ بھی اُسی طرح کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتا؟ جب بھی کوئی ماننے کی بات آتی ہے تو مطالبہ ہوتا ہے کہ معجزہ دکھاؤ۔ اب آخر میں قرآن نے مقصد کی بات خود ہی کہہ دی کہ **مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ** (21:6)۔ یہ باتیں جو ان لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہیں، کچھ نئی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے جتنی قومیں تباہ ہوئیں ان کی ضد اور سرکشی کا یہی عالم تھا۔ (ہلاکت ان کے دروازہ پر دستک دیتی تھی لیکن وہ اس پر بھی) ایمان نہیں لاتے تھے۔ (لہٰذا ان لوگوں کے سامنے ہزار دلائل پیش کرو اور

---

❶ جناب! وہ اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیتے ہیں، اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

انہیں ان کی روش کے تباہ کن نتائج سے لاکھ آگاہ کرو) یہ کبھی ایمان نہیں لانے کے۔ (یہ بھی اسی طرح تباہ ہو کر رہیں گے جس طرح ان جیسی اقوام سابقہ تباہ ہوئی تھیں)۔ وضاحت سے' اے رسول! ان اقوامِ سابقہ کی لٹی ہوئی بستیوں کو دیکھو تو تمہارے ہی جیسے رسول ان میں بھی آئے تھے۔ وہ بھی عمر بھر جھگڑتے رہے' یہ سارا کچھ ان کو بھی بتاتے رہے' لیکن جن کے مفاد پہ زد پڑتی ہے وہ ان باتوں پہ ایمان لاتے نہیں' یہ نہیں لایا کرتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ ایمان لے آئیں گے؟ اسی لیے تو قرآن نے کہا ہے کہ رسولوں کے ساتھ ہم نے کتاب بھیجی: **وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ** (57:25)۔ اور پھر اس کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی دی۔ آخر میں یہ مخالفین مختلف حربوں پہ اتر آیا کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ اس جماعت کو ختم کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں آ جایا کرتے ہیں۔ وہاں حق اور صداقت کے فیصلے بھی ہوتے ہیں اور جہاں ان کی یہ صورت نہیں ہوتی تو پھر آخر کار یہ قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ یہ بھی اسی طرح سے تباہ ہونگے۔

باقی رہا ان کا یہ کہنا کہ یہ رسول ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے۔ سوائے رسول! ان سے کہہ دو کہ **وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ** (21:7)۔ ہم نے اس سے پہلے بھی' جو پیغمبر بھیجے تھے' وہ آدمی ہی تھے۔ اگر تمہیں اس کا علم نہ ہو تو اُن لوگوں سے دریافت کر لو جنہیں اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی (12:109;16:43)۔ یہ بار بار رٹ لگائے چلے جاتے ہیں کہ داعیٔ انقلاب انسان کیوں ہیں' مافوق الفطرت کیوں نہیں ہیں' معجزے کیوں نہیں دکھاتے؟ انہیں بتا دو کہ اس سے پیشتر بھی جتنے رسول آئے ہیں' وہ سارے کے سارے انسان تھے' انہیں قرآن نے ''رجال'' بھی کہا ہے۔ کہا کہ ان سے یہ کہو تو یہ کہتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ یہ اہلِ کتاب تو یہاں موجود ہیں' ان کے پاس عیسائی بھی موجود ہیں' یہودی بھی موجود ہیں۔ ان سے پوچھو کہ ان کی طرف جو رسول آئے تھے' کیا وہ انسان تھے یا فرشتے تھے؟ وہ تمہارے خلاف بھی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اعتراض کا جواب دو کہ **وَمَا جَعَلۡنٰہُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوۡا خٰلِدِیۡنَ** (21:8)۔ کوئی بھی ایسا رسول نہیں آیا تھا کہ وہ اس قسم کے انسانی پیکر میں نہ آیا ہو کہ اسے کھانے پینے کی بھی احتیاج نہ ہو' یہ بھی صورت ہو کہ ہمیشہ یہاں بیٹھا ہوا ہے' موت بھی نہ آتی ہو' وہ طبعی جسم کے ساتھ آئے' طبعی قوانین کے تابع جیئے' طبعی قوانین کے تابع ان پہ موت طاری ہوگئی۔ سوال تو اس فرد کا اور اس کے جسم کا نہیں ہے۔ سوال تو اس بات کا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' یہ انہیں سمجھاؤ۔ یہ تصور ہی غلط ہے کہ رسول کو عام انسانوں سے الگ' کوئی مافوق الفطرت ہستی ہونا چاہیے۔ وہ رسول انہی جیسے انسان تھے اور انہی کے ہاتھوں **ثُمَّ صَدَقۡنٰہُمُ الۡوَعۡدَ فَاَنۡجَیۡنٰہُمۡ وَ مَنۡ نَّشَآءُ وَ اَہۡلَکۡنَا الۡمُسۡرِفِیۡنَ** (21:9)۔ ہم نے ان باتوں کو سچا کر دکھایا جو ان کے مخالفین سے کہی جاتی تھیں۔ (ان میں سے جنہوں نے اپنے رسول کی باتوں کو مان لیا) انہیں ہم نے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ہلاکت سے بچا لیا۔ جنہوں نے سرکشی اور حدود فراموشی اختیار کی انہیں تباہ کر دیا۔ یہ تھا وہ جو ہم نے ان سے کہا تھا' برملا کہا تھا' دہرا کر کہا تھا کہ ان سے پھر کہو کہ انہی سے یہ داستانیں بھی پوچھیں

جنہوں نے اس قسم کی ہٹ دھرمیاں اختیار کی تھیں اور صداقت کی بات نہیں مانی تھی کہ کس طرح اُن کے لیے ہمارے وعدے پورے ہوئے جنہوں نے ہماری بات مانی تھی اور کیسے اُنہیں ان مشکلات سے نجات ملی مگران کے برعکس جنہوں نے اسراف برتا تھا تو پھر کس طرح وہ تباہ ہوئے۔ان سے کہو کہ کیا تمہارے ہاں ایسا نہیں ہوا؟ اُن سے پوچھو جو اس کے شاہد ہیں۔ایک شاہد تاریخی سرگزشتیں بھی ہے جو صاف صاف بتا دیں گی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الانبیا کی آیت 9 تک پہنچ گئے۔دسویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 10 تا 20)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ﴿۱۱﴾فَلَمَّآ اَحَسُّوْا
بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ﴿۱۲﴾لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ
وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴿۱۳﴾قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴿۱۴﴾فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ
دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ﴿۱۵﴾وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا
بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴿۱۶﴾لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴿۱۷﴾بَلْ
نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ﴿۱۸﴾وَلَهٗ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا
يَسْتَحْسِرُوْنَ﴿۱۹﴾ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴿۲۰﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1976 کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 10 سے ہو رہا ہے: (21:10)۔

درس کا تسلسل تو اسی آیت سے ہوگا لیکن سابقہ درس میں غلطی سے میں کچھ شاعروں کی بات چھیڑ بیٹھا تو سارا ہفتہ اسی کے متعلق استفسارات ہوتے رہے۔ یہ شعروشاعری تذکرہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک چیز ہوتی ہے جسے داد ❶ کہتے ہیں۔ جب وہ نکل آتی ہے تو اس سے بڑی خارش ہوتی رہتی ہے۔ ذرا سی خارش کیجیے تو پھر وہ چھوڑتی ہی نہیں، آگے ہی آگے بڑھتی ہے تو اس شعرو شاعری سے یہ سلسلہ آگے چلا۔ وہ آیات سورۃ الشعراء کی ہیں۔ انہی میں وہ تفصیل سے دیا ہوا ہے۔ ان کا اصلی مقام تو وہیں تھا لیکن چونکہ بات چھڑ گئی تھی اس لیے اب وہ ناتمام نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔

---

❶ داد۔ پھنسیوں کے وہ چھتے جو فسادِ خون کے باعث جسم پر ظاہر ہوجاتے ہیں اور ان میں کھجلی ہوتی ہے۔

شاعری ایک نظریہ زندگی تھا اور ہے

میں نے مناسب سمجھا ہے کہ آج اس کی ذرا سی وضاحت کر دوں کہ شاعری کیا ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ ایک آسمانی انقلاب کے داعی کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ آگے چل کے ہم دیکھیں گے کہ یہ ایمان کے متضاد ایک نظریہ حیات ہے۔ اس طرح یہ تو بڑی اہم بات ہو جاتی ہے۔ اگر ہم نے شاعری کا یہی مفہوم لیا کہ یہ بات کو موزون یعنی وزن کے ساتھ بیان کرنا ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ وہ کفر کیسے ہوگئی جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ رسول کے شایان شان نہیں ہے اور نہ ہی مومنین کو زیب دینے والی بات ہے۔ عزیزانِ من! قرآن یہ تو نہیں کہتا کہ اگر کوئی اپنے موضوع کو' اپنے مافی الضمیر کو' اپنی فکر کو' اپنے پیغام کو' منظوم الفاظ میں ادا کرے تو اسے جہنم میں بھیج دیا جائے۔ میں نے سابقہ درس میں جاتے جاتے بات وہیں چھوڑ دی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات اس پیرائے میں بیان نہیں کی ہے۔ یہ تو ایک نظریہ زندگی تھا اور آج بھی ایک نظریہ زندگی ہے۔ اس زمانے میں اس نظریئے کو شاعری سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ وہ ان ہی کا نظریہ زندگی تھا۔ ایمان تو اس زمانے میں اس قوم میں تھا نہیں۔ عربوں کے اندر اس تصور کے تحت فالیں نکالنے والے' نجومی' اور قرعہ انداز موجود تھے۔ انہی میں سے ان کے ہاں کی پرستش گاہوں میں بیٹھے ہوئے کاہن تھے' ساحر تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انہیں الہام ہوتا ہے۔ قدیم یونان کے زمانے سے یہ تصور چلا آ رہا تھا کہ میوز (Muse) ایک دیوی ہے۔ اس کے ساتھ ان فالیں نکالنے والوں' نجومیوں' قرعہ اندازوں' کاہنوں اور ساحروں کا تعلق ہوتا ہے اور انہیں الہام ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو الہامی مانتے تھے۔ اسی زمرے میں ان کے ہاں شاعر بھی آتے تھے۔ [1] انہیں بھی وہ یہ کہتے تھے کہ انہیں الہام ہوتا ہے۔ رسولِ خدا نے آکر جب وحی کا دعویٰ کیا تو انہوں نے سمجھا کہ یہ بھی اسی قبیل [2] کی ایک چیز ہے اور اس نے آکر اس کا نام وحی رکھ دیا ہے۔ وہ کبھی اسے وجدان کہا کرتے تھے' کبھی الہام کہا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بھی اسی زمرے کی ایک بات ہے' تو قرآن کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بتائے کہ یہ غلط ہے۔ یہ کچھ جسے تم نے گِنا دیا ہے یہ اس قبیل [2] میں سے نہیں ہے۔ اس نے بات یہ بتائی تھی کہ یہ ایک منفرد الگ چیز ہے' بلکہ اس سے بالکل متضاد ہے۔ میں نے یہ جتنے نجومی اور فال والے' کاہن' ساحر' اور مندروں والے گنائے ہیں ان کے متعلق قرآن نے اپنے ہاں یہ سب کچھ کہہ رکھا ہے۔ لہٰذا میں اس وقت الہام یا وجدانیت کی Scientific (سائنسی) تعبیر میں نہیں جانا چاہتا ورنہ یہ بات دوسری طرف

---

[1] عربوں میں اور دیگر اقوام میں یہ عقیدہ عام تھا کہ شاعر کو الہام ہوتا ہے۔ ''نوائے سروش'' اور ''صدائے ہاتف'' جیسے تصورات اسی عقیدہ کے مظاہر ہیں۔ اسی کو اب وجدان (Intution) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ وحی ان تمام چیزوں سے بالکل الگ شے ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور' ص۔ 858)

[2] قبیل: قسم' جنس' نوع

چلی جائے گی۔

''شیطان'' انسان کے وہ جذبات ہیں جو حقیقت پر مبنی نہ ہوں

عزیزانِ من! قسمت کا حال معلوم کرنے والی بات اس زمانے میں بھی مانی جاتی تھی اور آج بھی مانی جاتی ہے۔ سڑکوں کے کنارے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے والے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی قسمتیں بتانے والے ہوتے ہیں۔ یا ان کے پاس طوطے ہوتے ہیں۔ ان طوطوں سے انسان کی قسمتیں پوچھی جاتی ہیں۔ یہ چیز اب بھی چلی آ رہی ہے گو کہ یہ جہالت کے زمانے کی چیز تھی۔ قرآن نے ان دونوں یعنی وحی اور ان کے تصورِ الہام و وجدان میں امتیاز پیدا کرنا تھا۔ اس امتیاز پیدا کرنے کے لیے اس کے ہاں ایک اصطلاح ہے' جسے وہ شیطان یا شیاطین کہتا ہے' یعنی یہ انسان کے اپنے وہ جذبات ہیں جو کسی حقیقت وصداقت پر مبنی نہ ہوں۔ وہ انہیں شیطان کہتا ہے۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے الہامات' نجوم اور کہانت وغیرہ ہیں' یہ اُسی زمرے (Category) میں آتے ہیں اور انسان کے نفسِ غیر شعوری کی کارفرمائیاں ہیں۔ یہ Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کے اندر کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ چیزیں بجائے خویش کذب ہوتی ہیں' افترا ہوتی ہیں۔ قرآن نے اس چیز کو اسی ضمن میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں کے ان سب کاہنوں' قسمت کا حال بتانے والوں اور ساحروں میں شاعروں کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان کے ہاں تو سوائے کعبہ کے اور کوئی مندر ہی نہیں ہوتے تھے' کوئی پرستش گاہیں نہیں تھیں۔ ان کے ہاں کہانت ہوتی تھی' قسمت کے لیے فالیں نکالنے والے بھی موجود ہوتے تھے' لیکن سب سے بڑی اہمیت شعرا کو ہوتی تھی اس لیے انہوں نے نبی کے متعلق بھی سب کچھ یہی کہا کہ یہ ساحر بھی ہے' کاہن بھی ہے جس کی قرآن برابر تردید کرتا گیا۔ حالانکہ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے قرآنِ کریم کے متعلق ان کے بڑے بڑے شعرا نے جب دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ بلند درجے کی ایک شاعری ہے جس کی مثال ہم نہیں پیش کر سکتے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ نہیں' اس کا شمار ان میں بھی نہیں ہو سکتا۔ شاعری کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ سورۃ الشعرا 26 ویں سورت ہے' وہاں یہ بات ہوتی ہے کہ **وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ** (26:210)۔ یہ قرآن اس قسم کی چیز نہیں جسے ان کے کاہن اور نجومی پیش کیا کرتے ہیں۔ وہ تو انسانی شعبدہ بازیوں کے کرشمے ہوتے ہیں۔ وحی اس سے بالکل الگ چیز ہے۔ وحی ان شیاطین پہ نازل نہیں ہوتی۔ یہاں کاہنوں' فال نکالنے والوں اور ساحروں کی نفی کر دی اور کہا کہ یہ بات ہی کچھ اور قبیل کی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ جتنے بھی ساحر' کاہن' شاعر اور نجومی گنا رہے ہو' جو اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں' یہ بہکے ہوئے خیالات ہیں' قیاسات ہیں جسے انہوں نے وجدان کہہ دیا ہے۔ یہ شیطان کا عمل ہوتا ہے۔ وحی ان پہ نازل نہیں ہوتی۔ اور آگے آیت 221 میں اسی ضمن میں یہ بات چلی آ رہی ہے کہ **هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ** (26:221) آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ شیطان کن کی طرف الہام کیا کرتے ہیں' آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ قوتیں کس کس قسم کے

انسانوں تک کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ کہا کہ **تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ** (26:222) یہ ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں جو فریب کار اور کذب باف ہوتے ہیں، جو جھوٹ بولتے ہیں اور مکاریاں کرتے ہیں، ان کو بھی جن کی انسانی صلاحیتیں بُری طرح سے مضمحل ہو چکی ہوتی ہیں (45:78)۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ یہ دو چیزیں ہیں: **یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ** (26:223)۔ وہ اِدھر اُدھر کان لگائے رہتے ہیں، کچھ قیاس سے کام لیتے ہیں، کچھ فریب سے۔ اکثر ان میں سے دانستہ جھوٹ بولتے ہیں۔ بعض خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو شیطانی الہامات ہیں یہ ان کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ **یُلْقُوْنَ السَّمْعَ** عجیب الفاظ ہیں ''جنوں کیندے کن سوئیاں لیندے پھر دے نیں، سونگھدے پھر دے نیں''،[1] یہ **یُلْقُوْنَ السَّمْعَ** وہ چیز ہے۔ مثلاً یوں کہا ہے ''اچھا ہی ہوا آپ تشریف لے آئے، آج یہ چیز تو ہونے کی تھی۔'' ان کی کیفیت یہ ہے، یہ کچھ یہ کرتے ہیں اور پھر اپنے دل سے باتیں گھڑتے ہیں، یہ ان کی مضامین آفرینی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ سارا، جتنا بھی کچھ قصہ ہے، افاک کے لیے ہے۔ اس میں افک ہوتا ہے، گھڑی ہوئی باتیں ہوتی ہیں، بنائی ہوئی باتیں ہوتی ہیں، اس میں حقیقت نہیں ہوتی بلکہ بعض تو ان میں سے کٰذبون ہیں۔ وہ دانستہ جھوٹ بھی ساتھ بولتے ہیں یعنی کچھ تو وہ ہیں کہ وہ جہالت کی بناء پہ یہ کچھ کرتے ہیں، کچھ وہ ہیں کہ کوئی چیزیں ان کا نفسِ غیر شعوری (Unconscious Mind) گھڑتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں الہام یا وجدان ہو رہا ہے، یہ Intuitional ہے۔ ایک یہ گروہ ہوتا ہے۔

دوسروں کی قسمت بتانے والے اور پوچھنے والوں کی ذہنی کیفیت

عزیزانِ من! دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جنہوں نے یونہی قیاسی، سنی سنائی چیزیں، اِدھر اُدھر سے لیں اور اس کے بعد دانستہ جھوٹ بول کے، مرصع انداز سے، لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ سب کچھ کس لیے کیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں ایک لفظ ہے، عزیزانِ من! اور وہ ہے **اثیم** (20:222) کہ انسان کے اندر عمل کی قوت مفقود ہو جائے، حرکت نہ رہے، جمود طاری ہو جائے، سکون طاری ہو جائے۔ بس یوں سمجھو کہ ان کو افیون دی جائے۔ 'کیا بات ہے!' آپ ایک ایک کو لے لیجیے، عزیزانِ من! قسمتیں بتانے والوں کے پاس جاتا ہی وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ میری قسمت میرے ہاتھ میں نہیں ہے، میں خود اپنی قسمت نہیں بنا سکتا۔ ان کے پاس جاتا ہی وہ ہے جو اپنے کسی پروگرام میں ناکام ہوتا ہے، ہمیشہ شکست خوردہ جاتا ہے۔ جو اپنے پروگرام میں کامیاب ہوتا چلا جا رہا ہوتا ہے وہ تو کبھی قسمت بتانے والے کے پاس جاتا ہی نہیں ہے۔ وہ کسی نجومی سے نہیں پوچھتا، کہیں سے فال نہیں لیتا، وہ تو کہتا ہے Nothing succeeds like success وہ تو بڑھتا چلا جاتا ہے، کامیابیاں خود اس کے راستے روشن کرتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے پاس جاتا ہی وہ ہے جس میں قوتِ

---

[1] جسے کہتے ہیں کہ یہ ہر سو شنید میں رہتے ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے معاملات کو سونگھتے پھر رہے ہیں۔

عمل مفقود ہے' افیون کھالی ہو اور پھر اس میں حرکت نہ ہو' اضمحلال ہو اور یہ پھر اس اضمحلال کو' افسردگی کو یوں تقویت دیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے' ہو جائے گا' تیری قسمت میں لکھا ہوا ہے' اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس طرح تو جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ کوئی ٹال ہی نہیں سکتا' یہ تو مل کے رہے گا تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی' پھر ان کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت' کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے ❶

شاعری کے سلسلہ میں داد لینے اور دینے والوں کی نفسیاتی حالت

قرآن کریم نے ❷ اثیم (26:222) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ شاعری کو دیکھیے گا کہ قرآن کریم نے' اسے جن معنی میں لیا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کن سوئیں لیتے ❸ پھرتے ہیں: کوئی جہالت کی بناء پر مضامین آفرینی کرتا ہے' کوئی سچ مچ اپنے دل سے گھڑتا ہے' جھوٹ بولتا ہے اور ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوتِ عمل مفقود ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ **اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ** (26:222) یہ وہ لوگ ہیں جن کی انسانی صلاحتیں بری طرح سے مضمل ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور اگلی ایک ہی آیت چھوڑ کر شعراء کا لفظ استعمال کرتے ہوئے' ان کے پیچھے چلنے والوں کے متعلق کہا کہ **وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ** (26:224)۔ یہ ان کے پیچھے چلنے والے وہ فریب خوردہ لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کی روش بہے چلے جاتے ہیں اور کبھی حقائق کا سامنا نہیں کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو ٹڈی دَل کی طرح ہیں' لیکن نتیجہ کے اعتبار سے دیکھو تو تخریب ہی تخریب۔ یہ تو لوگوں کو تباہ کرنے کے لیے اٹھے ہیں اور یہ سارے جو' اُن کے پیچھے ہیں وہ انہیں داد و ستائش دینے والے ہیں' وہ انہیں بہکاتے ہیں۔ انہی کے زور پر ان کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ اگر کسی ایک مشاعرے میں کوئی بھی کسی کو کوئی داد نہ دے تو آپ دیکھیے کہ ان کا دیا وہیں گل ہو جاتا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ انہیں بھی انہوں نے قوتِ عمل و حرکت سے محروم کیا ہوا ہوتا ہے' ان کے دیئے بجھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے لاکھوں انہیں بہکاوا دیدیتے ہیں اور کیفیت ٹڈی دَل

---

❶ غالب' مرزا اسد اللہ خاں: دیوان غالب' جہانگیر بک ڈپو لاہور' 2002ء ص۔ 189

❷ یہ لفظ ''ا ث م'' سے بنا ہے۔ الاثمۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تکان کی وجہ سے مضمل ہو چکی ہو اور اسلیے بہت آہستہ آہستہ چلے اور المؤاثم وہ اونٹ جو اضمحلال کی وجہ سے چلتے ہوئے جواب دے جائے (تاج العروس) لہٰذا اثم کے بنیادی معنوں میں اضمحلال' افسردگی' توانائی کا کم ہو جانا سست روی اور شکستگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام اعمال آجاتے ہیں جن سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے' جن سے اس کی قوتِ عمل میں کمزوری واقع ہو جائے' جن سے وہ سفرِ حیات طے کرنے میں سست گام ہو جائے' جن سے وہ دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے (پرویز: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص 201۔

❸ کن سوئیاں لینا: چھپ کر باتیں سننا' ٹوہ رکھنا' جاسوسی کرنا۔

کی ہے۔ جب وہ آ کر اڑ جاتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ زندگی کی جتنی بھی نمی' خوشحالی' سرسبزی تھی' وہ اُسے بھی چٹ کر کے چلی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں جو اس شاعری میں گرفتار ہوتی ہیں۔ اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو اس عمل کی تاریخ بتاتا کہ اس شاعری نے قوموں کے ساتھ کیا کچھ کیا۔ اگلی بات یہ ہے کہ اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِىۡ كُلِّ وَادٍ يَّهِيۡمُوۡنَ (26:225)۔ خود شاعر (جو سمجھتے ہیں کہ ان کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے) کی حالت اس اونٹ کی سی ہوتی ہے جو جھوٹی پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کی وجہ سے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرے اور اس کی پیاس کہیں بجھنے نہ پائے۔ ساری عمر جذبات کا پرستار اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔ شاعر کی کیفیت یہ کہ جھوٹی پیاس کا مریض ہے اور اس اونٹ کی طرح ہے جسے جھوٹی پیاس ہے۔ اس کے کوئی سچے جذبات نہیں ہوتے ہیں۔ جھوٹے جذبات' جھوٹی پیاس کی طرح ہوتے ہیں جو اسے وادیوں اور بیابانوں میں لیے لیے پھرتے ہیں۔ کچھ یوں ہوتا ہے کہ یہ ساری عمر عشق کا راگ گا رہے ہوتے ہیں جبکہ ان کے ہاں کوئی محبوب بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح فِىۡ كُلِّ وَادٍ يَّهِيۡمُوۡنَ (26:225) ہے۔ ہر وادی اور ہر بیابان میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کی یہ ساری پیاس جھوٹی پیاس ہے۔ یہ **یھیمون** ❶ میں ہیں۔ اب سن لیجیے کہ قرآنِ کریم نے کس چیز کو شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں ایک تو یہ ہے کہ وہ کن سوئیں لیتا پھرتا ہے' سونگھدا پھردا ہیگا' ❷ پھر دانستہ مضامین آفرینی کرتا ہے۔ کوئی زندگی کا متعین نصب العین نہیں' کوئی پروگرام نہیں' جدھر منہ اٹھایا چل پڑے۔ یہ کچھ کرتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ یہ بڑی بلند درجے کی الہامی چیز ہے۔ وہ ہر وادی میں آوارہ جذبات کی رو میں پھرتا ہے۔ جب مذہب میں کوئی چیز بیان کرتا ہے تو اس میں ایک چیز ہوتی ہے: افسردگی اور اضمحلال۔ یہ بڑی کمبخت چیز ہے۔ اگر یہاں کہنے کو دو چار شعر سنا دیئے تو سارا معاملہ ہی ٹھپ ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! یوں اس شاعری سے قوموں کی حرکت مبدل بہ اضمحلال ہو جاتی ہیں۔ شاعری کے ذکر سے تو یہ کچھ ہو گیا۔ اب اگلی چیز یہ بتائی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے ❸

---

❶ الھیام۔ سخت ترین پیاس۔ ایک بیماری جس کی وجہ سے اونٹ اس طرح پیاسا ہوتا ہے کہ اسے سیرابی نہیں ہوتی (تاج العروس اور محیط المحیط)۔ قرآن نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ (26:225) وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح ہے جسے شدتِ پیاس مارے مارے پھرا رہی ہو۔ کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولانگاہوں میں جانکلتا ہے۔ اس کا یہ مارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کہیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ (پرویز: لغات القرآن جلد چہارم' 1961، ص 1780-1779)

❷ جاسوسی کرتا پھر رہا ہے۔ ٹوہ میں ہے۔

❸ غالب: مرزا اسد اللہ خاں: دیوان غالب، جھانگیر بک ڈپو لاہور 2002' ص 162۔

شاعر اپنے آپ کو ہم دوشِ جبریل بتا رہا ہوتا ہے مگر خود فریب میں مبتلا ہوتا ہے' مست ہے۔ ساری عمر یہی کچھ کہتا چلا جا رہا ہے' کبھی کر کے نہیں دکھاتا۔ کوئی شاعر ایسا نہیں نظر آئے گا جو کہے اور پھر اس کے بعد وہ کر کے بھی دکھا دے۔ ساری قوم کو میدانِ جہاد میں جانے کے لیے کہتا رہے گا' آپ پیچھے بیٹھا رہے گا۔ اُنہیں پوچھا کہ جی! آپ کیوں نہیں جاتے؟ کہنے لگے کہ جی ''اسیں ریکروٹنگ افسر ہیگے اں۔ ❶ یہ میں نے نہیں کہا یہ مولانا ظفر علی ❷ نے کہا تھا۔

شاعری کا الہام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا

عزیزانِ من! شاعری کا الہام یا وجدان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ **یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ** (26:226)۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں' کرتے نہیں ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو وہ کہتے ہیں ان کی اپنی زندگی اس کے مطابق نہیں ہوتی۔ ان کے قال اور حال۔ قول اور عمل۔ میں مطابقت نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے یہ واضح طور پر کہا کہ یاد رکھیے! شاعری ایک اسلوبِ بیان نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک نظریہ بیان کیا جا رہا ہے' ایک نہجِ حیات بیان کیا جا رہا ہے' ایک پروگرام' ایک طرز' ایک فکر بیان کی جا رہی ہے کہ یہ اس فکر کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں اس قسم کے لوگوں کو وہ شاعر کہتے تھے۔ قرآن نے انہی کو سامنے رکھ کے کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ کہا کہ یہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ الہامی چیز ہے' یہ الہام نہیں ہے بلکہ یہ شیطانی چیز ہے۔ کہیں پیغمبر کی وحی کے ساتھ ان تینوں (الہام' وجدان' کہانت) کو نتھی نہ کر دینا' اسے اس کے ساتھ منسلک نہ کر دینا۔ وحی بالکل متعین چیز ہوتی ہے۔ پیغمبر کی وحی تو ایک طرف رہی' اس وحی کے ماننے والے بھی ایک متعین نصب العین رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ **اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (26:227)۔ یہ ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ عزیزانِ من! یہاں پر یہ ''الا'' بڑے زور کا ہے۔ ہمارے ہاں ان چیزوں پہ اس طریق سے غور نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس آیت کے عجیب معنی کر لیے گئے۔ اس سے یہ ہوا کہ شاعروں پر مصیبت آ گئی۔ ان کے سامنے جھٹ سے قرآن کی یہ آیتیں پیش کی جانے لگیں کہ رسول کے متعلق یہ کہا ہے کہ ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی' شاعری پیغمبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ یعنی یوں کیا جانے لگا کہ

---

❶ ہم تو بھرتی کرنے والے افسر ہیں۔

❷ مولانا ظفر علی خاں (1956-1873)۔ جب 1909 میں ان کے والد کا انتقال ہوا تو انہوں نے والد کے ہفت روزہ کو روزنامہ بنا دیا اور اسے کرم آباد (تحصیل وزیر آباد) سے لاہور لے آئے۔ یہ اخبار ''زمیندار'' تھا۔ ظفر علی خاں اور ''زمیندار'' لازم ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ اسی کی بدولت وہ کل ہند سطح کے سیاسی رہنماؤں میں آئے۔ ان کی شاعری اردو میں وقتی اور ہلکے پھلکے' مگر شگفتہ' ادب کی بڑی اچھی مثال ہے۔ وہ بڑے بدیہہ گو تھے۔ ان کے کلام میں ایسی نظموں کی کثرت ہے جو انہوں نے وقتی اور ہنگامی جذبات کی رو میں بہہ کر لکھیں۔ (آسی ضیا' طاہر شادانی اور حفیظ احسن: تحسین اردو، 1992، ص ص 119-121)

شاعروں کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے۔ جب یہ جھینپنے لگے تو انہوں نے بھی کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' ہمیں قرآن آتا ہے۔ کہا کہ **اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (26:227) میں جو غیر مسلم شاعر ہیں ان کی بات ہو رہی ہے' مسلمانوں کی تو بات ہی نہیں ہو رہی۔ لؤ شرابی کی بات ہو تو وہ کہے گا کہ نہیں نہیں صاحب! اس میں فرق کیا گیا ہے: ہندو شرابی اور ہوتا ہے' مسلمان شرابی اور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا تھا کہ یہ مسلمان شاعروں کے متعلق نہیں کہا گیا۔ یہ ہری چند کے متعلق کہا گیا ہے' یہ عبدالرشید تبسم کے متعلق نہیں کہا گیا۔ قرآن تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کرتا' یہ شاعری نہیں ہے۔

قابلِ ذکر بات نظریہ حیات ہے' اظہارِ خیال نہیں

عزیزانِ من! قرآن کریم نے دو متعین نظریاتِ حیات بیان کیے ہیں: ایک تو شاعری سے متعلق یہ نظریہ زندگی' یہ نہج حیات ہے۔ اور اس کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظریہ حیات ہے جسے مومن کا نظریہ حیات کہا جاتا ہے۔ الا کے معنی یہ ہیں کہ مومنین کا نہج زندگی' نظریہ حیات' نصب العینِ زندگی' یہ نہیں ہوتا۔ یہ ہیں اس الا کے معنی۔ یعنی یہ کہ مومن کا یہ نظریہ حیات نہیں ہوتا۔ وہ اپنی فکر کو' اپنے پیغام کو' اپنے خیالات کو' نظم میں بھی بیان کیوں نہ کرے' بات تو نظریہ حیات کی ہے۔ مومن کی یہ کیفیت کب ہوتی ہے کہ وہ **اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہوں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وہاں کہا تھا کہ ''وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔'' پہلی چیز تو یہاں اٰمنوا کہہ کے اُس **فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ** (26:225) کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ایمان کے تو معنی ہیں: کسی ایک نصب العین حیات کو اس طرح مرکزِ زندگی بنانا کہ ایک ہی نکتہ پہ جا کے نگاہ ٹکے اور صرف ایک ہی کی نہ ٹکے بلکہ سب کا نقطہ ماسکہ (Focal Point) ایک ہی ہو:

لا الــــــــــہ سرمایۂ اسرار ما

رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

ہمارے رموز و اسرار اور نظریات و تصورات کی متاعِ گراں بہا لا الہ ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جس سے ہمارے افکار کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد ہماری فکر و دانش گردش کرتی ہے۔ یہی وہ وحدت ہے جس سے وابستگی ہماری پریشان خیالی کو ایک مرکز پر مرکوز کر دیتی ہے۔ اس طرح لاکھوں ہزاروں آنکھوں کے باوجود یک نگہی' ایک نصب العین' ایک مرکز رکھنا ہوتا ہے۔ اسی عمل سے اسے مومن کہتے ہیں' اسے ایمان والا کہتے ہیں۔ اسے قرآن نے **الذین اٰمنوا** کہا ہے' یعنی ایک نصب العین حیات رکھنا۔ اس سے **فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ** (26:225) کا قصہ ختم ہوا۔ اٰمنوا یعنی جس چیز پہ ایمان لائے۔ تو یہ چیز سمع نہیں' کن سوئیاں لینا نہیں' وہ تو فکر و تدبر' غور و فکر' دلائل و براہین' سمجھ سوچ کے بعد' کسی ایک صداقت پر دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے یقین لے آنا ہے۔ یہ ایمان ہوا

صاحب! تو یہ شاعری نہیں ہوئی۔ جن کے ہاں نصب العین حیات ایک ہو‘ ان کی زندگی میں کبھی تضاد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ یَقُولُونَ مَا لَا یَفْعَلُونَ (26:226)۔ ان کے قول اور فعل میں ہم آہنگی نہیں ❶ ہوتی۔ اس کے برعکس عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (26:227) وہ چیز ہے جس پر مومنین یقین رکھتے ہیں‘ وہ اُسے کر کے بھی دکھاتے ہیں‘ جب کہ (26:222) میں کہا تھا کہ کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ وہاں افسردگیاں اور اضمحلال ہے اور یہاں (26:227) میں کہا ہے کہ ان کے ہاں صالحات ہیں۔ یہ کیفیت ہوتی ہے مومن کی۔ وہ اپنے آپ کو سنوارتے ہیں‘ معاشرے کو سنوارتے ہیں‘ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برعکس گروہ کے اعمال یہ ہوتے ہیں: بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے۔ یہ مومنین کا مسلک نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ مومنین کیا کرتے ہیں؟ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا (26:227) وہ قوانینِ خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ زندگی کا کوئی معاملہ سامنے آئے‘ وہ قیاسات کی رو سے اس کا حل نہیں دریافت کرتے۔ یہاں لفظ کثیرًا آیا ہے یعنی ہر مقام پہ یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں مومنین اس طرز حیات کے خلاف ایک اور ذہنیت‘ طرزِ زندگی‘ نہجِ حیات‘ بیان ہو رہی ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ شاعر ہوتے اور شاعری مقصود با اوزان کلام ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ کہتا تو آگے الا کے بعد اسے یہ کہنا چاہیے تھا‘ کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ نثر نگار کیا ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور کی جا رہی ہے۔ قرآنِ کریم کے خلاف نظریہ زندگی کی بات کی جا رہی ہے‘ خواہ وہ اسے نثر میں کچھ لکھے‘ خواہ اسے نظم میں لکھے۔ یہاں بات اس کے خلاف نظریہ زندگی کی ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا (26:227)۔ زندگی کے ہر گوشے میں قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

---

❶ زبان‘ اظہارِ مدعا کا ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لیے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہارِ مدعا کے لیے انسانوں نے دو انداز اختیار کیے ہیں۔ ایک تو وہ جسمیں ہم روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں‘ دوسرے شعر۔ شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب سے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نثر اور نظم الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآنِ کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نچلی سطح پر نہیں اُتر سکتا کہ ان دو اسالیب میں سے ایک کی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایانِ شان ہی نہ رہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا کہ شاعری رسول کے شایان شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں ہیں جس سے شعر موزوں ہو جاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے جسے اس نے شاعری سے تعبیر کیا۔ اس نفسیاتی کیفیت میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے‘ نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک میں نکیل ڈالے اُسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر ادھر اُدھر لیے پھرتے ہیں‘ کبھی تصورات کی ان حسین وادیوں میں‘ کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف۔ چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لیے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں‘ کل کچھ۔ اور جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لیے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لیے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔
(پرویز: معراج انسانیت‘ 1949ء ص ص۔ 308-307)

شعر کہنے سے ظلم ختم نہیں ہوتا

عزیزانِ من! قرآن نے کہا تھا کہ کُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيمٍ (26:222)۔ ان کی انسانی صلاحیتیں بری طرح مضمحل ہو چکی ہیں، جھوٹ بولتے اور مکاریاں کرتے ہیں اور اب اس قدر مضمحل ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہیں، اٹھتے نہیں ہیں، اگر کوئی دو اور مار جائے تو کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، اللہ تیرا بھلا کرے گا۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وَانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (26:227)۔ جب ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرتا ہے (تو شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ) اس سے زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی ان پر ذرا زیادتی کرتا ہے تو طمانچہ مار کر جبڑا توڑ دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں، شاعر یہ نہیں کرتا۔ کیا کبھی آج تک اسے یہ کرتے دیکھا ہے؟ نہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ وہ کچھ شعر لکھ دے گا اور اپنے ہاں بیٹھ کے خوش ہو جائے گا کہ ''ہم نے تو وہ شعر لکھ دیا ہے جو ان کے تالو سے چپک کر رہ گیا ہے۔ قیامت تک دھوتے رہیں گے، اس کے آنے والی آل اولاد بھی تو وہ نہیں بھول سکے گی۔''

مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ اٹھ کر ظلم کرنے والے کی کلائی مروڑ دیتے ہیں۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (26:227)۔ اور اس نظام میں ایسے ظلم کرنے والے لوگوں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش سے لوٹا کر کس مقام کی طرف لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانا کونسا ہوگا۔ اس طرح مومنین کی جماعت ظالموں کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے اور ظلم کرنے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے، کہ انہیں یہ کس کھونٹے سے باندھ دے گی، ان کا ٹھکانہ کیا ہوگا، انہیں کہاں لے جائے گی؟ قرآن نے بتایا ہے کہ ایمان اور عمل صالح سے، خدا کے قانون کو ہر وقت سامنے رکھنے سے، ظالم کی کلائی مروڑ دینے سے، ظلم کرنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے ان کا ٹھکانہ کیا ہوگا۔ قرآن کے يَنْقَلِبُوْنَ (26:227) کہا ہے یعنی انقلاب وہ لاتے ہیں جو زندگی کے ہر گوشے میں قانون خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ آپ نے دیکھا کہ ان کے علی الرغم ایک نظریہ حیات ہے جس کے متعلق قرآن بیان کر رہا ہے۔ یہ نثر اور نظم کا آپس کا تضاد یا تقابل نہیں ہے کہ نظم میں کہنے والا جہنم رسید ہوگا اور نثر میں کہنے والا سیدھا جنت میں جانے والا ہے۔ عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے۔ شاعری کا Anti-thesis (متضاد) انگریزی زبان کا لفظ سائنس ہے، نثر نہیں ہے۔ یہ بات انگریزی زبان کے معروف نقاد (Critic) کالرج (Coleridge 1772-1834) نے کہی ہے۔ اس نے بڑے فلسفے کی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ

The anti-thesis of poetry is not prose but science

شاعری کی ضد نثر نہیں، سائنس ہے یعنی سائنس اور شاعری متضاد ہیں، نثر اور شعر متضاد نہیں ہیں عزیزانِ من! خالی فکر سے بھی یہ لوگ کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سائنس کیا ہے؟ دو اور دو چار، ہر Cause (سبب) کا ایک Effect (معلول)، اگر یہ ہوگا تو یہ ہوگا۔ یہ بڑی چیز ہے۔

شاعری میں تو اس علت و معلول (Cause and Effect) کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا' شاعری میں کوئی چیز قانون کے تحت آتی ہی نہیں ہے۔ وہاں تو ہر قانون شکنی ہوتی ہے۔ اسی لیے کالرج نے کہا تھا کہ یہ Poetry (نظم) کی Anti thesis (ضد) 'Prose' (نثر) نہیں ہے' سائنس ہے۔ یہی چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے کہ Poetry (نظم) کی Antithesis (ضد) نثر نہیں ہے' ایمان (Conviction) ہے۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک شاعری کا مقام اور اس کی حقیقت

عزیزانِ من! شروع میں علامہ اقبالؒ (1877-1938) کے Prose (نثر) میں لے دے کر چھ لیکچر [1] ہی ان کی ساری متاعِ حیات ہے۔ وہ ساری عمر شاعری کرتے رہے۔ آج بھی جہاں کوئی چیز کلائمکس کی آتی ہے تو آپ اقبالؒ کا ایک شعر لے آتے ہیں۔ اس نے قرآن کے حقائق اپنی بصیرت کے مطابق سمجھے۔ فطرت نے اسے ایک نہایت حسین اندازِ بیان عطا کیا تھا اور وہ انداز بڑا ہی مؤثر تھا اور بڑا ہی دقیق۔ اس نے اپنی بات پہنچانے کے لیے یہ انداز اختیار کیا۔ میں پھر یوں کہوں گا کہ اقبالؒ (1877-1938) ساری عمر شعر کہتا رہا' لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانے سے سخت اجتناب کرتا رہا حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی کہہ گیا کہ

من اے میرِ اُممؐ داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

وہ رسول اللہؐ سے فریاد کر رہا ہے کہ حضورؐ میری فریاد کو پہنچیے کیونکہ یہ لوگ مجھے شاعر کہتے ہیں۔ [2] مجھ پہ تہمتِ شعر و سخن دھرتے ہیں۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ وہ تو ساری عمر شاعری کرتا گیا' اس کی ساری زندگی شعر و سخن میں گزر گئی اور اب کہہ رہا ہے کہ مجھ پہ شاعر ہونے کی تہمت دھری جا رہی ہے۔ یہاں اس شعر و سخن سے مراد اظہارِ جذبات سے اس نہج زندگی کا اظہار مراد ہے۔ جسے قرآن Condemn (مذمت) کر رہا ہے یعنی قرآن جس کی مذمت کر رہا ہے۔ اقبالؒ کے سامنے تو قرآن کا دیا ہوا ایک متعین نصب العین تھا اور

---

[1] انہوں نے یہ چھ لیکچر 1928 میں مدراس میں دیئے۔ ایک لیکچر کا اضافہ بعد میں کیا تھا۔ آج ان کے 7 لیکچر ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھئے:
Allama Muhammad Iqbal: The Reconstruction of Religious Thought in Islam (Edited and Annotated by M. Saeed Sheikh), Iqbal Academy, Lahore, 1989.

[2] آپ (اقبالؒ) کے سامنے زندگی کا ایک متعین نصب العین ہے۔ آپ کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھتا ہے اور آپ اُس کی طرف ہر ایک کو دعوت دیتے ہیں پھر آپ کی یہ دعوت علم و بصیرت' دلائل و براہین اور عقل و فکر پر مبنی ہوتی ہے جس میں آپ حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔ اپنے جذبات کو ہمیشہ حقائق کے تابع رکھتے ہیں اور آپ کے قول و عمل میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ قرآن اُسے پیغمبرانہ اسلوب اور جماعت مومنین کی خصوصیت قرار دیتا ہے۔ (پرویزؒ: مجلس اقبال 1996' ص ص۔ 70,72-73)

آپ دیکھیے کہ وہ ساری عمر اس متعین نصب العین کا پیغام دیتے رہے۔ پہلے تھوڑے سے دَور کی شاعری کو چھوڑ دیجیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی نیشنلزم کا اثر ابھی باقی تھا۔ جب وہ یورپ سے واپس آئے ہیں تو پہلی چیز اس نے یہ کہی کہ اب میں نے یہ سب کچھ قرآن سے سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی کتاب ''اسرار و رموز'' کے آخر میں جو دعا کی ہے اس میں یہ چیز بدرجہ اتم موجود ہے کہ ''اگر میں نے قرآن کے خلاف کہیں ایک لفظ بھی دانستہ کہا ہو تو میری شاعری تباہ ہو جائے' میری عمر ختم ہو جائے'' اور آخر میں اپنے متعلق وہ کچھ ہے جو کسی بددعا کی انتہا ہو سکتی ہے:

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

''اگر میں نے قرآن کے خلاف کچھ کہا ہو تو یا رسول اللہؐ! مجھے تو محشر کے دن ذلیل و خوار کر دے اور اتنا ہی نہیں بلکہ مجھے اپنے پاؤں کے بوسے کی سعادت سے محروم کر دے۔'' اف! میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ شدید قسم کی کوئی آرزو اپنے خلاف کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ جیسا شخص جسے ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ساری عمر شاعری کرتا رہا اور شاعروں کے متعلق تو قرآن یہ کہتا ہے مگر اس نے جماعت مومنین کا وہ اسلوب اپنایا جو قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ شاعری کے سلسلہ میں قرآن کے اس بیان کردہ تصور کے برعکس جو کچھ بھی پیش کیا جاتا ہے یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں یہ ملکہ نصیب نہیں ہوتا۔ دراصل یہ لوگ خود ہی اس ذوقِ سلیم سے محروم ہوتے ہیں اور جنہیں قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم کا یہ ملکہ عطا ہوتا ہے یہ ان کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ وہ حیوان کی سطح پہ زندگی بسر کرتے ہیں' وہ اس ملکہ سے محروم ہوتے ہیں اور خاص طور پہ یہ جو مُلّا بنتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جو قرآن کے تصورِ حیات سے محروم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنہیں یہ ملکہ عطا ہوتا ہے' وہ ملا بن ہی نہیں سکتے۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کے نزدیک شاعری کا اسلوبِ بیان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک نصب العین حیات ہے' ایک طرز زندگی ہے' ایک نظریہ زندگی ہے' ایک منہاج زندگی ہے' جو ایمان اور عملِ صالحہ کے بالکل متضاد ہے۔ وہ شخص جو ساری عمر کچھ بھی نہ کہے مگر اپنی زندگی اسلوب قرآن کے خلاف گزارے تو وہ بھی اس زمرے میں شامل ہو جائے گا اور اگر وہ شاعر ہے اور شاعری میں کچھ کہے یا نہ کہے مگر اپنی زندگی قرآن کے اسلوب و نہج کے خلاف گزارے تو وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ یہاں اندازِ بیان کا تو بالکل سوال نہیں ہے' بات طرزِ حیات کی ہے۔ عزیزانِ من! میں نے یہ ضروری سمجھا کہ پچھلی دفعہ جو بات چھڑ گئی تھی اب اس کی وضاحت کر دوں ورنہ اس سے خلش رہتی ہے' ذہن میں کھٹک رہتی ہے۔ سورۃ الشعرآء تو ابھی بہت بعد میں آئے گی مگر ''کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔'' بات آ گئی تھی تو اچھا ہی کیا کہ اسے یہیں صاف کر دیا۔

عزیزانِ من! آج سورۃ الانبیاء کی آیت 10 زیرِ درس ہے۔ پہلے سے بات یہ چلی آ رہی تھی کہ ان لوگوں سے پوچھو جن کی نگاہیں

تاریخ پڑھیں کہ جن اقوام نے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تو ان کا انجام کیا ہوا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ (21:9) جنہوں نے سرکشی اور حدود فراموشی اختیار کی' انہیں تباہ کر دیا گیا۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ کہا کہ کیا تمہیں پتہ ہے یہ کس چیز کی مخالفت کر رہے ہیں؟ بڑے غور سے سنو کہ یہ کس بات کی مخالفت کر رہے ہیں؟ پھر سنو! یہ قرآن کی مخالفت کر رہے' یہ حضور ﷺ کی وحی کے پیغام کی مخالفت کر رہے تھے۔

قرآنِ حکیم تو سراپا انسانی عظمت و رفعت کی داستان ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ [1] اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (21:10)۔ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔اگر تم ذرا عقل و بصیرت سے کام لے کر سمجھنے کی کوشش کرو (تو یہ حقیقت تم پر واشگاف ہو جائے گی کہ یہ ضابطہ قوانین تمہیں بلندیاں اور سرفرازیاں عطا کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔اس سے خدا نے اپنا کوئی مقصد حاصل نہیں کرنا) اس کے لیے مزید دیکھیے: (21:24, 23:77)۔ یہاں یہ بات واضح طور پر کہہ دی کہ یہ جو کچھ تمہیں وحی کے ذریعے دیا جاتا ہے کم بختو! اس میں تو تمہارے ہی شرف' عظمت' مجد اور رفعت کا بیان بھی ہے اور راز بھی۔ مگر تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اپنے ہی شرف اور عظمت کی مخالفت کیے چلے جا رہے ہو۔اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (21:10) بڑے ہی جاہل واقع ہوئے ہو کہ "عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے ہو۔" او! یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں' اس میں تو تمہاری سرفرازیوں کا راز ہے' تمہاری عظمتوں کا راز ہے تمہاری رفعتوں کا راز ہے' یہ پروگرام ہے کہ دنیا میں تم وہاں جا پہنچو جہاں:

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرت اُو برنتابد ہمسرے [2]

مومن کا ہر بلند سے بلند تر مقام ہوتا ہے' کسی کا اس سے آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن تو اسے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ راہِ حیات میں کوئی دوسرا اس کے دوش بدوش چلے۔عزیزانِ من! ہم نے قرآن سے مقامِ آدم کو تو کبھی متعین ہی نہیں کیا ہے ورنہ پتہ چلتا کہ قرآن کہتا کیا ہے' مقامِ آدم کو کہاں لے جاتا ہے اور پھر مقامِ مومن تو اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے اَنْزَلْنَآ

---

[1] تاج العروس میں دوسرے معانی کے علاوہ ذکر کے ایک معنی "شرف و عزت اور عبرت و موعظمت" کے بھی ہیں' عظمت و سطوت عطا کرنے کے بھی ہیں۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960' ص۔ 699)

[2] دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اسی کا ہمدوش ہو جائے۔ (پرویزؒ: مجلس اقبال، 1996، ص 495)

اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے۔ اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (23:71) ہم ان کے پاس، ان کی بڑائی اور عظمت، شرف ومجد، سرفرازی وسربلندی کا سامان لے کر آئے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اس عظمت وسرفرازی سے منہ موڑ رہے ہیں۔ یہ بڑا ہی خوب انداز ہے! قرآن کہتا ہے کہ یہ دیکھیے ہم ان کی عزت وتکریم اور شرف ومجد کی باتیں کر رہے ہیں، ہم انہیں یہ چیزیں دے رہے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنی ہی عظمت اور عزت سے اعراض برت رہے ہیں، روگردانی کر رہے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ اس سے زیادہ جاہل کوئی اور بھی ہوگا؟ کہ کوئی شخص عزت دے، شرف بخشے، تکریم وتعظیم کی بات کرے کہ یہ کرو تو یہ ہوگا اور وہ ہیں کہ اس سے گریز کی راہیں نکالیں، منہ پھیر کے چلدیں، اعراض برتیں، مخالفت برتیں۔ پھر کہا کہ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (21:10) ان سے پوچھو کہ کیا تمہاری عقل وفکر بھی ہے؟ کیا تم عقل وبصیرت سے کام لے کر سمجھنے کی بھی کوشش کرتے ہو؟ ذرا سوچو تو!

ذکر کے قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے ہاں ذکر کی کیفیت

عزیزانِ من! ایک اور مقام پہ بھی ''ذکر'' کا لفظ آیا ہے۔ وہاں کہا کہ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (43:44) یہ قرآن، جس کے متعین کردہ راستے پر تو چل رہا ہے، یہ تیرے اور تیری قوم کے لیے بڑے شرف اور عظمت کا موجب ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ اے رسول! جو کچھ یہ تمہیں دیا جا رہا ہے، اس میں تمہارے شرف اور عظمت کا راز پنہاں ہے۔ یہاں ''لک'' کا لفظ آیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! پھر ہمیں اس سے کیا؟ ٹھیک ہے تیرا خدا تمہیں یہ چیزیں دیتا ہے، تیرے لیے تیرا ذکر ہے۔ ہمارے ہاں تو ''ذکر'' کے معنی وہ ''ذکر'' ہوتا ہے جو مسجد میں ہوتا ہے اور رات بھر مریضوں کو سونے نہیں دیتا۔ عربی زبان میں ''ذکر'' کے معنی عظمت اور شرف اور رفعت اور بلندیاں ہیں، یعنی جسے ہم کہتے ہیں وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (94:4) تیرے ''ذکر'' کو ہم نے بلندی دی ہے۔ ''ذکر'' کے معنی ہیں: ''تمہارا جو شرف ہے ہم نے اس میں رفعتیں بخشی ہیں۔'' یہاں کہا ہے کہ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (43:44) اس میں تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے بڑا شرف اور عظمت ہے۔ اور یہ مخاطب جو تمہاری اتنی مخالفت کر رہے ہیں اس میں تو ان کی سرفرازیوں کا راز پوشیدہ ہے۔ تم اپنے مخالفین سے کہہ دو کہ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (43:44) تم سے عنقریب پوچھا جائے گا (کہ تم نے اس قسم کے عزوشرف کے حامل ضابطۂ حیات سے کس بنا پر انکار کیا تھا؟ ان لوگوں کی عزوشرف سے محروی خود یہ سوال بن جائے گی)۔ یہ چیز عنقریب سامنے آ جائے گی بس یوں کہو کہ عنقریب پوچھ لی جائے گی۔

تاریخ انسانی تو آج تک صدرِ اوّل کی مانند ذکرِ خداوندی کی کوئی مثال بھی پیش نہیں کر سکی

عزیزانِ من! تاریخ کے صفحات پر یہ جہانِ نو تو کچھ یوں لگتا ہے کہ گویا نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں

تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل ❶ کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا' جس میں علم کے متلاشی سیاسی مدبرین سے بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک قافلہ تجارت' بقول ڈورسے (Dorsey)' جہاں ریشم اور سوتی کپڑے لاد کر لاتا تھا' اس کے ساتھ ہی اس کے اونٹوں پر ہندوستان اور بازنطین کی کتابوں کے مسودے اور اقصائے عالم سے معدنیات اور نباتات کے نمونے بھی لدے تھے۔ کتب خانے اور رسدگاہیں (Laboratories) زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ انہی عربوں کے ہاتھوں یورپ نے زندگی کی ابتدا پائی اور انہی سے اس نے فلکیات' نباتات' کیمیا' قانون' ریاضی' طب (Medicine) اور فلسفہ کا پہلا سبق لیا ❷۔ اور پھر یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ قوموں کی تاریخوں میں اتنے قلیل عرصے کے اندر یہ کچھ ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ انقلاب آیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دو سال کے اندر اندر' اسلام عملاً اور اعتقاداً تمام عرب پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس لیے خدا کے نام پر ایران' خراسان' مغربی ہندوستان' شام' مصر' حبش' شمالی افریقہ کا تمام وہ علاقہ جو اس وقت تک معلوم ہو سکا تھا' بحر روم کے متعدد جزائر اور ہسپانیہ تک کو فتح کر لیا تھا۔ یہ اس قسم کی عرب قوم تھی جو اونٹنیوں کا دودھ پیتی تھی' بڑے بڑے کانٹوں والی جسے گوہ کہتے ہیں' اسے بڑا سا جنگل کا چوہا سمجھ لیجیے' کھاتی تھی۔ دیکھو اس قوم کی کیفیت یہ تھی کہ کھجوریں بھی نہیں' کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو پر گزارہ کرتی تھی۔ اس قوم نے صدیوں کا عرصہ نہیں' چند ہی سالوں کے عرصے کے اندر دنیا کی عظیم ترین دو تہذیبوں' ایران کی تہذیب اور روما کی تہذیب' کو الٹ کر رکھ دیا۔ عزیزانِ من! تاریخ میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ ان دونوں تہذیبوں کو اس قوم نے اپنے پاؤں تلے روند دیا۔ دیکھا' تمہارے لیے کہا ہے کہ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡهِ ذِکۡرُکُمۡ (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔ اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

آج تک تاریخ کے اوراقِ درخشاں میں وہ کارنامے موجود ہیں جو اس قوم نے اس زمانے میں اور ان حالات میں سرانجام دیئے' جنکی طرف کہا ہے کہ یہ کتاب نازل کی جس میں تمہارا ذکر ہے' جب کہ آج بھی ہمارے ذہن میں تو یہی ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور اس میں خدا نے اپنے متعلق کچھ باتیں کی ہیں حالانکہ خدا کہتا ہے کہ اس کتاب میں تمہاری اپنی بات ہے۔ باقی رہے ہم لوگ تو ہمارے متعلق تو اس نے بس یہ کہہ دیا ہے کہ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ (51:56) اس حقیقت کو یاد رکھو کہ انسان' خواہ وہ مہذب شہری ہوں یا صحرا کے خانہ بدوش غیر مہذب قبائل' ان کی تخلیق کی غرض و غایت اسی صورت میں پوری ہو سکے گی کہ یہ قوانین خداوندی کی

---

❶ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

❷ جارج اے ڈورسے George A. Dorsey کی اپنی کتاب Civilisation کا ص 45-644 ملاحظہ کیجیے۔ وہ اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے:
میں خوش ہوں کہ میں زندہ ہوں' مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے لیکن مجھے اس سے بھی زیادہ فخر ایک انسان ہونے پر ہے (اس لیے کہ) آج ہماری قومیت پرستی' نوعِ انسانی کی بدترین دشمن اور تہذیب کے لیے خطرہ ہے۔ ص۔ 958

اطاعت سے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کریں اور انہیں نوعِ انسان کی پرورشِ عامہ کے لیے وقف کر کے عالمگیر نظامِ ربوبیت متشکل کر دیں۔ افسوس یہ ہے کہ اب ہمارے ہاں تو اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے جن اور (جن کو تو چھوڑ دیجیے) انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری پرستش کرتے رہا کریں' یعنی ہم نے اس لیے انہیں پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری بارگاہ میں آئیں' ہماری شان میں قصیدے پڑھتے رہا کریں' جھک جھک کر فرشی سلام کیا کریں' یعنی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے: **مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (51:56)۔ بس اسی کے لیے ہماری زندگی ہے۔ آیتوں ہٹ کے جو روٹی وی اسے کھاندے پئے ہیگے' اووی گناہ ہوندا [1] کیونکہ یہ **مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** کے خلاف ہے۔ پھر اس کے بعد تاویلیں ہونے لگیں کہ نہیں جی! ایک مومن کی زندگی میں اس کا کھانا کھانا بھی عبادت ہی ہے' پرستش ہے۔ لیکن یہ تصور دیکھیے کہ انسانوں کو پیدا کیا کہ وہ ہماری پرستش کرتے رہا کریں۔ پیدا اس لیے کیا ہے' تو کوئی سچ کہتا کہ پیدا کرتے وقت تو آپ نے ہم سے پوچھا نہیں۔ یا تو پوچھ لیا ہوتا کہ تمہارا دنیا میں بھیجنے کا یہ مقصد ہے' کیا تم اسے پورا کرتے ہو؟ کیا اس سے متفق ہو؟ اتفاق کر کے بھیج دیتے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہم سے تو یہ کرتے وقت پوچھا ہی نہیں' ہمیں تو پیدا کر دیا تاکہ تمہاری پرستش کرتے رہا کریں۔ وائے افسوس! کہ اس آیت کے غلط مفہوم نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔

یہ حرفِ شیریں [2] ترجمان تیرا ہے یا میرا؟

عزیزانِ من! کیا پوچھتے ہو کہ قرآن انسان کو کہاں لے جاتا ہے! کہا کہ تمہارا جو مقصدِ زندگی ہے اس قرآن کریم نے اس منزل کی نشان دہی کی ہے' اس میں تمہیں شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں پہ پہنچانے کا ذکر ہے۔ اسی کے لیے ہم نے تمہیں یہ کتاب دی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم اس انتہائی بلند مقام پہ کیسے پہنچو گے؟ اس کے لیے کہا کہ اس کا عمل تو یعبدون [3] ہے۔ یعنی اگر اس کتاب کی اطاعت اختیار کرو گے' اس کی محکومیت اختیار کرو گے' تو پھر یہ ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ اس سے کچھ خدا کی بڑائی ہو جائے گی' خدا کو کسی سے اپنی بڑائی کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ احتیاج تمہیں ہے۔ وہ تو جس دن یہ کائنات بنی تھی اسی دن Sovereign (حاکم مطلق) تھا۔ انسان تو ایک طرف رہا' اُسے تو جو رفعت و عظمت اور بلندی اس دن حاصل تھی' وہی کائنات کی تخلیق کے بعد' وہی انسانوں کی تخلیق کے بعد' حاصل ہے۔ اگر ایک انسان بھی اس کو سجدہ نہ کرے تو اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا' اگر ساری دنیا اس کو سجدے کرنے لگ جائے تو اس کی کوئی اک پوڑی اتاں نئیں کر سکدا [4]۔ وہ تو اپنی ذات کے اندر یہ سب کچھ لیے ہوئے ہے' اس کو اس چیز کی احتیاج ہی نہیں ہے' یہ جو کچھ ہم نے اسے

---

1. اس مقصد کو ترک کر کے جو کھانا بھی تم کھاتے ہو وہ بھی گناہ ہے۔
2. اقبالؒ نے اسے قرآن کریم سے تعبیر کیا ہے۔
3. صرف اسی کی محکومیت اختیار کرنا
4. اس کی کبریائی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔

بنا دیا ہے: اسے عرش پہ بٹھا دیا' اور اس کی پرستش میں' اس کے حضور میں' جا کے سجدے شروع کر دیئے ہیں' یہ ہمارا کیا دھرا ہے۔ اور پھر وہی ہمارے ہاں عام تصور بن گیا ہے کہ خدا کے حضور کھڑے ہو گئے۔ کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (1:1) سب تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ ان کے حضور میں جیسے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ہم نے یہ تصور قائم کر دیا ہوا ہے۔ یہ وہی مذہب کا تصور ہے: پرستش' پوجا' قصیدے خوانی۔ حالانکہ قرآن کریم نے یہ تصور بالکل نہیں دیا۔ وہاں تو صورت یہ ہے کہ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ (21:10) ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔ اس میں خود تمہارے شرف اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ اس میں ہماری کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں تو تمہاری ہی بات ہے اور بات وہ ہے جو تمہیں شرف اور عظمت کی بلندیوں پہ پہنچا دے۔ ہماری بات نہیں ہے۔ یہی بات تھی جسے اس ❶ نے کہا تھا کہ

محمدؐ بھی ترا' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

فِیْهِ ذِکْرُکُمْ یہ قرآن حکیم کہہ رہا ہے' اقبالؒ نے کیا کہنا تھا۔ اقبالؒ تو کہتا ہے کہ "میرا سرچشمہ فکر قرآن ہے۔" اب اس شعر میں کہہ رہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ میرا ایمان ہے کہ محمدؐ بھی' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا ہے۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ یہ قرآن نہ محمد ﷺ کا بنایا ہوا ہے' نہ محمد ﷺ کی ذات نے خود اس قسم کا کوئی دعویٰ کیا تھا' نہ جبریل نے یہ بات کہی تھی کہ اُسے کہیں لے جانا تھا سو وہ لے گیا جیسے یہودی کہتے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ یہ سب کچھ تیرا ہے' اس سب کچھ کے بعد' میں صرف اتنی بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ بتا دو کہ یہ حرفِ شیریں یعنی قرآن کریم کس کا ترجمان ہے: تیرا یا میرا؟ اس کے جواب میں کہا کہ فِیْهِ ذِکْرُکُمْ (21:10) اس میں تمہارے شرف اور عظمت کا راز ہے۔ اب بتاؤ کہ جس کی کیفیت یہ ہو کہ یہ کتاب' جو میری کتاب ہے' اس میں میرا کچھ نہیں' اس میں تمہارا ہی سب کچھ میں نے بیان کیا ہے' تمہارا ہی شرف' تمہاری ہی عظمتیں اور تمہاری ہی رفعتیں بیان کی گئی ہیں۔ او کم بختو! ذرا سوچ سے تو کام لو کہ یہ سب کچھ تمہارا اور تم میرے۔ یہ تمہارے لیے کتنا بڑا اعزاز ہے۔ او! اس سے اعراض برتتے ہو! خود ذلتوں کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو! ہم تو تمہیں اس قرآن کے ذریعے آسمان کی بلندیوں پہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن تو زمین کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا۔ (7:176)

اعراض کی صورت میں اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے سبق حاصل کرو

عزیزانِ من! اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں۔ اگر یہ ہماری عبدیت اختیار نہیں کرتے' ہماری اطاعت نہیں کرتے' ہمارے قوانین

---

❶ علامہ محمد اقبالؒ (1877-1938): بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' 1996' ص 32

کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے' تو پھر ہم سے نہ پوچھو۔ جاؤ' جا کے ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے پوچھو کہ کیا ہوا کرتا ہے؟ پھر بتایا کہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح: **كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً** (21:11) ہم نے (تم سے پہلے) کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ یہاں **قصمنا** کا لفظ آیا ہے۔ اگر کوئی سخت چٹان ہو اور اسے ریزہ ریزہ کر کے ریت بنا دی جائے تو **قصمنا** کا یہ لفظ اس کے لیے آتا ہے۔ کہا کہ چٹان کی طرح محکم قومیں' ہم نے ریت کے ذروں کی طرح' بکھیر کے رکھ دیں اور اس کے بعد کہا کہ پھر ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں' یعنی **وَاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ** (21:11) اور پھر اُن کے بعد اُن کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا یعنی ان کی جگہ دوسری قوم نے لے لی۔ عزیزانِ من! ان کی جگہ لینے والی دوسری قوم کے متعلق قرآن نے دوسری جگہ کہا کہ وہ قوم پھر تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ اس سے بہتر کوئی اور دوسرا لفظ مل نہیں سکتا: تہاڈے ورگی نئی ہوے گی [1] وہ الفاظ ہیں **وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ** (47:38) اگر تم اس نظام سے روگردانی کرو گے اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ اس طرح یہ واضح کر دیا کہ اگر تم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتو گے تو پھر تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ لہٰذا تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ اگر ہمارے ہی جیسی قوم کو بدل کر لاتا ہے تو ہمیں ہی کیوں نہ رہنے دیا جائے۔ کہا کہ **لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ** (47:38) وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوموں کی موت وحیات' اور استخلاف واستبدال [2] کا قانون یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظامِ زندگی کی حامل ہو' وہ باقی رہتی ہے۔ جو غلط نظام رائج کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت وحیات کے فیصلے' زندگی کے متعلق اُن کے نظریات اور عملی نظام کی رو سے ہوتے ہیں۔ اسی لیے کہا کہ **اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ** (21:11) پھر اُن کے بعد' اُن کی جگہ دوسری قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔

کوئی قوم بھی فوری یا بغیر کسی وقفے کے تباہ نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اب وہ Process (عمل) دیکھیے جس کے تحت یہ استخلاف واستبدال ہوتا ہے' یہ عذاب آتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اُن کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں کہا تھا کہ اس ضابطہ حیات (قرآن) میں تمہارا ''ذکر'' ہے۔ اب اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ اس ضابطہ کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں رفعت وعظمت

---

[1] وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

[2] Law of Succession and substitution

حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اب جب وہ استخلاف واستبدال کا عمل ہوا تو فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ (21:12) وہ نتائج محسوس طور پر سامنے آ گئے۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے! قرآن بتاتا یہ ہے کہ قوموں کی تباہیاں یونہی Overnight (شباشب) نہیں آ جاتیں۔ تباہی کے اسباب بہت پہلے سے جمع ہونے شروع ہو گئے ہوتے ہیں۔ وہ غیر محسوس طور پر Accumulate (جمع) ہونا شروع ہو جاتے ہیں' یہ Accumulate انگریزی کا لفظ ہے۔ اسے کہتے ہیں: ''آہستہ آہستہ تباہیوں کی چیزوں کا جمع ہوتے چلے جانا''۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جائیے' اسے کہیے کہ ڈاکٹر صاحب! اچھا بھلا رات کو سویا تھا' آپ دیکھیے' صبح ایسا بخار آیا کہ ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ڈاکٹر دیکھنے کے بعد یا خون کے Examine (جانچ پڑتال) کرنے کے بعد کہتا ہے کہ صاحب! یہ ایسا نہیں ہے کہ رات آپ اچھے بھلے سوئے تھے' آپ تو برس دو برس سے اس مرض میں مبتلا چلے آتے ہیں۔ یہ تو کینسر ہے' ایک رات میں کینسر Develope (پیدا) نہیں ہوتا' اس میں عرصہ لگتا ہے۔ اسی لیے بار بار کہا جاتا ہے کہ (اپنا خون) کا ٹیسٹ کراتے رہو' وقتاً فوقتاً چیک اپ (Check-up) کراتے رہا کرو۔ وہ اس لیے کہ یہ جو تباہیاں ہیں وہ پہلے ہی دن محسوس نہیں ہو جاتیں۔ اس سلسلۂ عمل میں دو ایک آیتیں اور بھی ہمارے سامنے آتی ہیں' گو کہ آیتیں تو اس موضوع پر بہت ہیں۔ آپ سائنس کی دنیا میں دیکھیں گے کہ Physical World (طبعی دنیا) کے اندر تباہی ایک دن میں نہیں آتی۔ گھن لکڑی کھاتا ہے تو وہ یہ نہیں ہوتا کہ کل تو بڑی اچھی تھی اور آج یہ شہتیر نیچے گر گیا ہے۔ پتہ نہیں کب سے گھن لگا ہوا ہوتا ہے۔ 7:182 میں دیکھیں کہ کیا الفاظ ہیں! کہا کہ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (7:182) جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں کہ نہیں صاحب! اس کے خلاف کرنے سے کیا ہوگا' بددیانتی سے کیا بنتا ہے' بے ایمانی سے کیا ہوتا ہے یا جھوٹ سے کیا بنتا ہے' ظلم کا کیا ہے' پنپتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (7:182) ہم انہیں آہستہ آہستہ بتدریج تباہی و بربادی کے مقام تک لے آتے ہیں۔ اب یہاں لفظ دیکھیے! اس لفظ کو بولیے۔ آپ اس کا تلفظ جلدی نہیں ادا کر سکتے۔ معنوی اعتبار سے بھی اس کے معنی ہیں: ''درجہ بہ درجہ' سیڑھی بہ سیڑھی' قدم بہ بقدم' تدریجاً لے جانا''۔ اور یہ لفظ ہے زبان عربی کا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یوں تدریجاً' درجہ بہ درجہ' منزل بہ منزل' قدم بہ قدم' وہ تباہی کی طرف یوں چلتا ہے۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (7:182) ہم انہیں آہستہ آہستہ' بتدریج' تباہی و بربادی کے اُس مقام تک لے آتے ہیں جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ تباہی ان راستوں سے آتی ہے جو اُن کی عقل و فکر میں بھی نہیں آتے۔ ایک اور آیت لے لیجیے۔ عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اپنے معاشرے اپنے نظام' اور اپنی ذات کا احتسابِ خویش کرتے رہو۔ یہ وہی ہے جسے آپ چیک اپ کہتے ہیں۔ یہ چیک اپ بڑا ہی ضروری ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ تپ دق کی تشخیص (Diagnosis) شروع میں مشکل ہوتی ہے' علاج بڑا آسان ہوتا ہے اور آخر میں تشخیص بڑی آسان ہوتی ہے مگر علاج بڑا مشکل ہو جاتا ہے' بس یوں سمجھو کہ تباہی اس طرح سے آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (16:26) ان سے پہلی قوموں نے بھی اسی قسم کی ڈپلومیسی اختیار کی تھی۔ وہ تو خدا کو بھی فریب دینا چاہتی تھیں۔ قرآن کیا بات کہہ

گیا ہے! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَتَی اللّٰہُ بُنۡیَانَھُمۡ مِّنَ الۡقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیۡھِمُ السَّقۡفُ مِنۡ فَوۡقِھِمۡ (16:26) قوانینِ خداوندی نے ان کے خودساختہ نظام کی عمارت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا اور اس نظام کی چھتیں ان پر آ گریں۔ یہ نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے دیکھا تو چھت میں کچھ دراڑیں پڑ گئیں تھیں۔ ایسا ہوتا تو جھٹ سے پتہ چل جاتا۔ دراصل ان کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں، تو پھر ایک دن یہ ہوا کہ وہ جو اچھی بھلی دیواریں نظر آتی تھیں، وہ جو اچھی بھلی چھت نظر آ رہی تھی، اس کے نیچے جو بنیادیں تھیں وہ اتنی کھوکھلی ہوئیں کہ وہ چھت نیچے آ گری اور وہ اس کے نیچے آ کے تباہ ہو گئے۔ قومیں یوں تباہ ہوتی ہیں: اپنی ہی چھت کے بوجھ کے نیچے آ کے تباہ ہو جاتی ہیں اور ہوتی اس طرح سے ہیں کہ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ (16:26) یہ بات ان کے شعور تک میں نہیں ہوتی۔ یہ تباہی اس انداز و طریق سے آتی ہے کہ ان کے عقل و شعور میں بھی یہ بات نہیں ہوتی۔ یہ جتنے بھی صاحب اقتدار ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی دانست میں تباہیوں کے راستے ایسے بند کر لیے ہوتے ہیں کہ وہ مطمئن ہوتے ہیں کہ نہیں، صاحب! تباہی آ ہی نہیں سکتی، ہم نے سب راستے بند کر دیئے ہیں، جہاں کسی خدشے کا ذرا سا، تھوڑا سا، امکان بھی ہو، وہاں بھی وہ راستہ بند کر دیتے ہیں بلکہ اس بند کرنے میں تو انہیں اطمینان ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ (16:26) یہ تباہی غیر محسوس طور پر ان راستوں سے آتی ہے جو تمہارے شعور میں بھی نہیں ہوتے۔ اب یہاں یہ الفاظ آئے ہیں: فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ (21:12) جب وہ تباہی، وہ نتائج محسوس طور پر سامنے آ گئے۔ یہاں لفظ احسوا آیا ہے یعنی جب وہ غیر محسوس اور غیر مرئی تباہی محسوس شکل میں سامنے آئی تو کیا ہوا؟ کہا کہ اِذَا ھُمۡ مِّنۡھَا یَرۡکُضُوۡنَ (21:12) تو پھر وہ وہاں سے لگے بھاگنے۔ یہاں اس ''بھاگنے'' کے لیے قرآن نے لفظ یرکضوا استعمال کیا ہے، یرکضون ❶ ہوتا ہے: ''فوری کسی خطرے کو دیکھ کر اٹھنا اور اس سے حواس باختہ ❷ ہو کر بھاگنا''۔ کہا کہ یہ محسوس شکل میں فوری تو سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ تو فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ (21:12) تھا۔ یعنی غیر محسوس طور پر تھا۔ پتہ نہیں کہ کب سے چلا آ رہا تھا۔ اب جب وہ آ کر محسوس طور پر سامنے آیا ہے تو پھر وہ لگے بھاگنے۔

قانونِ مکافات کی تصویر کشی کا منظر

عزیزانِ من! نقشہ کھینچ دینے، پوری کی پوری تصویر کھینچ دینے، کو منظر کشی کہتے ہیں۔ قرآن نے بھی تباہی کی تصویر کشی کا ایک منظر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ دیکھو! یہ اٹھے، بدحواس بھاگے، پیچھے سے ہمارے قانونِ مکافات نے آواز دی: لَا تَرۡکُضُوۡا (21:12) تم بھاگ کر

---

❶ الترکض۔ گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لیے ایڑھ (ہمیز، ایڑی) لگانا، تیز دوڑنا، پرندے کا اڑنے کے لیے پروں کو متحرک کرنا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960ء، ص 777)

❷ بے اوسان، گھبرایا ہوا، مخبوط الحواس۔

کہیں نہیں جا سکتے۔ نہیں' کہیں نہیں جا سکتے۔ تو کیا یہ کہا کہ کھڑے ہو جاؤ؟ کہا: نہیں' وہیں کھڑے کر دینا نہیں ہے بلکہ یہ کہا کہ **وَارْجِعُوْٓا اِلٰی مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ** (21:13) اب الٹے پاؤں اپنی عیش سامانیوں کی طرف چلو جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کیے تھیں۔ لوٹ کے انہی بڑے بڑے شاہی محلات کے اندر جاؤ' انہی اقتدار کی کرسیوں کے اندر چلو جہاں بیٹھ کر تم نے اس قدر ظلم اور استبداد کی اپنی حکمرانی کی۔ اب وہیں موقع پہ واپس چلو۔ وہاں تمہارا مقدمہ چلے گا' چلو واپس' وہاں چلو۔ پھر وہاں کیا کیا جائیگا؟ کہا کہ جی' **لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ** (21:13) تا کہ وہاں تم سے پوچھا جائے کہ یہ سب سامانِ عیش ونشاط کس کی محنت کا صدقہ تھا' کس کی محنت سے بنا تھا؟ کیا یہ سارا کچھ تم نے بنایا ہوا تھا؟ اب جواب دہی کے لیے وہاں چلو۔ دیکھا۔ عزیزانِ من! قانونِ مکافاتِ عمل کسے کہتے ہیں! دیکھا اعمال نامہ کیا ہوتا ہے! کہا کہ وہاں چلو' تا کہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ جتنی بھی یہاں محرومیاں نظر آتی ہیں' وہ کن کے خون کی سرخیاں تھیں' کن کی ہڈیوں کا چورا تھا جن سے یہ اس قدر تمہارے دیدہ زیب محلات تعمیر ہوئے۔ چلو' تا کہ تم سے پوچھا جائے۔ یہ بڑا عجیب وقت ہے! یہ پوچھا جائے والی بات تو قرآنِ کریم نے بڑے مقامات پہ کہی ہے۔ ایک دوسرے مقام پہ کہا کہ **ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ** (102:8) اُس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ خدا کی ان نعمتوں کو' جنہیں اس نے تمام نوع انسانی کی پرورش کے لیے عطا کیا تھا' تم محض اپنی ہوس کی خاطر سمیٹتے کیوں چلے جاتے تھے؟ تم سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے قصرِ تعیش کی رنگینیوں میں کس کس کے خون کی سرخی شامل تھی' جو کچھ تم نے سمیٹا تھا' وہ کس کی محنت کا ماحصل تھا اور تمہیں اسے غصب کر لینے کا کیا حق حاصل تھا؟ یہاں قرآن کریم نے لفظ ''نعیم'' استعمال کیا ہے۔ اس میں وہ ساری آسائشیں' زیبائشیں' آرائشیں آجاتی ہیں جن کے لیے کہا جا رہا ہے کہ تم نے یہاں جمع کی ہوئی تھیں اور اب جواب دہی (Accountability) کے لیے یہاں لفظ **لتسئلن** آیا ہے تا کہ تم سے ان کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اقتدارِ مطلق یعنی Sovereignty کی حقیقت

عزیزانِ من! یہ پوچھا جائے والی بات بڑی عجیب ہے! Political Science ❶ (علم سیاسیات) میں جسے ہم Sovereignty ❷ کہتے ہیں' اس کا ترجمہ اقتدارِ مطلق کیا گیا ہے۔ لیکن Sovereignty کو انگریزی میں' Sovereign State

---

❶ سیاست یا Politics سے مراد ہے وہ شعبۂ علم (سائنس) جو انسانی نظام باہمی سے متعلق ہے۔ اسے پولیٹیکل سائنس یا پولیٹکل فلاسفی بھی کہتے ہیں۔ مملکت یا ریاست (State) وہ بلندترین معاشرتی ادارہ جو انسان کے تمدنی معاملات کو قانون اور ضابطہ کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے' مملکت کہلاتا ہے' مملکت کے کم از کم اجزائے ترکیبی (ا) آبادی، (ب) علاقہ، (ج) وحدتِ نظام اور (د) اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) ہیں۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ 1955' ص۔ 170)

❷ دنیائے سیاست میں اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) کا تصور سب سے پہلے فرانسیسی مفکر بوڈن (Bodin 1530-1596) نے پیش کیا۔ اس کے نزدیک اقتدارِ اعلیٰ سے مفہوم وہ ''مرکز'' ہے جو مملکت کی تمام قوتوں کا سرچشمہ اور سارے اختیارات کا منبع ہے' [باقی اگلے صفحے پر]

بھی کہتے ہیں۔اس کا عام ترجمہ ''خودمختار ریاست'' کیا جاتا ہے یعنی ایک ایسی ریاست جس میں Sovereignty ہو۔اب سوال یہ ہے کہ Sovereignty کسے حاصل ہے؟ ملوکیت کے زمانہ میں بہرحال ایک فرد ہوتا تھا جسے Sovereignty (اقتدارِ مطلق) حاصل تھا۔ اسے ڈکٹیٹر شپ بھی کہتے ہیں۔ ڈیماکریسی (جمہوریت) کے زمانے کے اندر افراد کے جو نمائندے ہیں انہیں مطلق اقتدار (Sovereignty) حاصل ہوتا ہے۔سمجھنے کے لیے انہیں آخری اتھارٹی کہا جاتا ہے اور اب جو یہ دَور چلا ہے' یہ روس وغیرہ کی طرف سے ایک جھکڑ چلا ہے' تو اس میں عوام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں سے چند خاص خاص افراد کو یہ حق حاصل ہے۔اس طرح Sovereignty (مطلق اقتدار) انسانوں کے اندر ہی اندر پھرتی ہے۔ برادرانِ عزیز!اس کی کوئی شکل بھی کیوں نہ رکھ لی جائے' یہ رہتی عوام ہی میں ہے۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ Political Science (علم سیاسیاتِ) میں اس کی Definition (تعریف) کیا ہے۔میریٹین (Jacques Maritain 1882-1973) نے اپنی کتاب Man and the State میں Sovereignty کی تعریب یوں لکھی کہ ❶

The power to do all things without accountability

یہ اقتدار وہ اقتدار ہے کہ جو کچھ جی میں آئے میں کروں' کوئی مجھ سے پوچھنے والا نہ ہو۔اس کو Sovereignty کہتے ہیں' یہ ایسا اقتدار ہے جس میں Accountibility جواب دہی نہ ہو۔ یہ ہوتا ہے Accountable to None کسی کے آگے جواب دہ نہ ہو۔ یہ ہمارے Constitution (آئین) میں بھی ہوتا ہے کہ

The Minister is accountable to the Chief Minister, and the Chief Minister to the Prime Minister , and the Prime Minister to the President

(وزیر' وزیراعلیٰ کے سامنے' وزیراعلیٰ' وزیراعظم کے سامنے اور وزیراعظم صدر کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔)

یا جیسا بھی اس میں رکھا گیا ہو اور وہ Accountableto the Parliament یعنی انہوں نے اس کا حساب پارلیمنٹ کو دینا ہوتا ہے' جو ذمہ داری ہے اس کے متعلق جا کے بتانا ہوتا ہے۔وہ اس سے پوچھ سکتا ہے اور Sovereign آخری اتھارٹی ہوتی ہے کہ وہ

[گزشتہ سے پیوستہ]
دیگر قوائے مملکت ذاتی قوت نہیں رکھتے۔ان کے پاس اقتدار اعلیٰ کی تفویض کردہ قوت ہوتی ہے۔اقتدار اعلیٰ اپنے اختیارات کسی سے نہیں لیتا' نہ ہی اس کے فیصلوں کی کہیں اپیل ہوسکتی ہے۔(پرویزؒ:انسان نے کیا سوچا؟1955' ص178-177)۔

❶ Sovereignty (اقتدار اعلیٰ) کی تعریف (Definition) رابرٹ لینزنگ نے Notes on Sovereignty کے صفحہ 3 پر یوں کی گئی ہے:
The Power to do all things without accountability (Quoted by Jacques Maritain (1882-1973),in "Man and the State" P.51

Without Accountability (بغیر جواب دہی کے) ہے۔ اس کے اوپر کوئی ایسا نہ ہو جو اس سے پوچھ سکے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ یہ ہوتی ہے جی! Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ)۔

انسانوں کے اس اقتدارِ مطلق کے برعکس قرآنِ حکیم کا دیا ہوا Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کا تصور

عزیزانِ من! اقتدارِ اعلیٰ کے تصور نے انسانی نظامِ سیاست میں جتنے بھی پیکر بدلے' یہ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کسی نہ کسی شکل میں انسانوں کے ہی پاس رہا' لیکن قرآنِ حکیم کے دیئے گئے نظامِ سیاست میں یہ چیز نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ پھر اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ یہ جاننے کے لیے آپ اس سورۃ کی آیت 13 کی بجائے آیت 23 پہ آ جایئے۔ وہاں چار لفظ ہیں جی! یعنی **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ** (21:23) اُس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اُس نے اس سلسلہ کائنات کو ایسا کیوں بنایا ہے اور اس کے لیے اس قسم کے قوانین کیوں نافذ کیے ہیں۔ (اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کے لیے ہے) یعنی اسے یوں سمجھو کہ اس کارگہ کائنات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے' کہ جو کچھ وہ کرے' اس کے متعلق ہم اس سے یہ کہیں' کہ تم ہماری Accountability (جواب دہی) کے دائرے سے باہر ہو۔

اس کائنات کے اندر کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو یہ سمجھے کہ مجھ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ یہ ہے **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ** (21:23) یعنی ''جو کچھ وہ کرتا ہے اُس کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا جائے گا''۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اس سے اس کے کیے کی باز پرس ہوگی۔ کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کے کیے کی باز پرس نہ ہو۔ صرف ایک خدا ہے جس سے نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے یہ کچھ کیوں کیا۔ اس کے برعکس **وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** (21:23) اور سب سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اپنے لیے جداگانہ نظام کیوں وضع کر رکھا ہے۔ کائنات میں جتنے بھی ہیں ان سب سے پوچھا جائے گا **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ** (21:23) صرف خدا کی ذات ایسی ہے کہ وہ جو کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ پوچھنے والا تو اس سے اوپر کی اتھارٹی ہونی چاہیے۔ اس کے اوپر اتھارٹی نہیں ہے' اس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ **يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ** (22:14) وہ اپنے ارادے سے' قانونِ مشیت سے' جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ اس کے برعکس **وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** (21:23) اور اس کے علاوہ جو کوئی بھی ہے انہیں حساب دینا پڑے گا۔ ان سے پوچھا[1] جا سکے گا' یہ طے کر دیا گیا ہے۔

---

[1] ''پوچھے جانے'' سے مطلب یہ ہے کہ کوئی اور نظامِ زندگی' کارگہ کائنات کے کلی پروگرام میں فِٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا' نہ ہی کسی کو اس کا حق اور اختیار (Authority) دیا گیا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 732)

خدا تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو بھی تفویض نہیں کرتا

عزیزانِ من! قرآن نے Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کے لیے کہا کہ Sovereignty Belongs to Allah یعنی اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے۔ یہی الفاظ ہم مسجدوں میں جا کر دہرا لیتے ہیں' ایوانِ حکومت میں دہرا لیتے ہیں۔ الفاظ یہی ہیں۔ اب خدا نے یہ بتا دیا ہے کہ Sovereignty Belongs to Allah یعنی اقتدار اعلیٰ کا مالک خدا ہے۔ تو اب وہ چھپکلی حلق میں پھنس گئی۔ اب کیا کریں؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے وہ اقتدارِ مطلق تفویض کر دیا ہے۔

He has Delegated his powers to the representatives of the People

اس نے اپنا اقتدارِ مطلق Sovereignty ہم عاجز بندوں کو تفویض (Delegate) کر دیا ہے۔

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ جو اپنی کوئی پاور (Power) دوسرے کو Delegate (تفویض) کر دیتا ہے تو پھر خود تو وہ اس پاور سے محروم ہو جاتا ہے اور اس وقت تک محروم رہتا ہے جب تک یہ پاور واپس نہ لے لے۔ اب یہ جو اختیارِ مطلق Sovereignty ہے وہ تو Belongs to Allah (اللہ کو حاصل ہے)۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تفویض کر دیا اور آپ خود بیٹھ گیا ہے کیونکہ اس نے یہ اقتدارِ مطلق تفویض جو کر دیا۔ کیا باتیں ہیں صاحب! یہ اتنا سا ٹکڑا ہے جس کے لیے' عزیزانِ من! (پھر وہ ''میں'' والی بات آ جاتی ہے) مجھے یہ کہتے ہوئے شاید بیس برس لگ گئے کہ بابا! وہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض (Delegate) نہیں کرتا۔ اگر کر دے تو پھر وہ ان اختیارات سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ **لَا يُسْـَٔلُ عَـمَّا يَفْعَلُ** (21:23) ہم سے کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ اس کے برعکس **وَ هُـمْ يُسْـَٔلُوْنَ** (21:23) تم سے پوچھا جا سکتا ہے۔ اگر اس نے Sovereignty (اقتدار اعلیٰ) تمہیں دے دی ہوئی ہے تو پھر پوچھا کیسے جا سکتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ نیابت کا تصور ہے۔ عزیزانِ من! یہ نیابت یا تفویض کا تصور بڑا ہی غلط ہے۔ انسان اپنے آپ کو یا دوسری دنیا کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس کے برعکس سیکولر والے (Secularists) کھلے بندوں کہتے ہیں کہ Sovereignty (اقتدار اعلیٰ) تو State (مملکت) کی ہوتی ہے۔ جو سٹیٹ (مملکت) کے Representatives (نمائندے) ہوتے ہیں وہ اسے Exercise (نافذ) کرتے ہیں۔ اب یہ بات آپ کے ہاں مذہب کے گلے میں آ کے پھنس گئی ہے۔ ہمارے ہاں دین تو ہے نہیں۔ دین میں تو بات سیدھی سی ہے۔ دین کی بات تو پاکستان کے معمار [1] نے کی تھی۔ یہ بات تھی اقبال اور قائداعظم کی جو انہوں نے قرآن سے سیکھا تھا' میں ذاتی طور پہ عزیزانِ من! اس کا گواہ ہوں۔ دس سال تک ان کے ساتھ رہا ہوں۔ انہوں نے جب یہ بات کہی تھی تو وہ اتنی عظیم بات ہے کہ کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

---

[1] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948ء)

قائداعظمؒ نے حیدرآباد دکن میں کہا تھا کہ اسلامی مملکت کی امتیازی خصوصیت اور انفرادیت Individuality یہ ہے کہ اس میں اختیاراتِ مطلق خدا کو حاصل ہوتے ہیں لیکن ان اختیارات پر عمل اس کتاب کی رو سے یعنی قرآنِ کریم کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ شخص، کس قدر Practicale تھا۔ آپ نے دیکھا کہ محض نظریئے اور عقیدے کی بات نہیں رہنے دی کہ Sovereignty belongs to Allah (اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے)۔ تے ایہدے بعد اسیں جو کچھ وی کریئے ❶ کیونکہ اختیارات تو Delegated to us، ہیں۔ یعنی ہمیں تفویض کیے گئے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ قطعاً نہیں، حقِ حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اب سوال ہے کہ خدا تو ایک نظری سا عقیدہ ہے۔ عالم بالا پہ ہے۔ وہ تو خود حکومت کرنے کے لیے آتا نہیں ہے۔ عقیدے کے لحاظ سے آپ یہ کہہ دیجیے تو اس کے بعد پھر خوش ہو جایئے اور جو جی میں آیئے کرتے رہیئے۔ عزیزانِ من! مذہب میں دین کے ساتھ مذاق ہوتا ہے، فریب ہوتا ہے۔ **يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ** (2:9) یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اس کے قائم کرنے والی جماعت مومنین سے دورخی چالیں چلتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں فریب دے رہے ہیں حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں تو گویا قرآن نے کہا کہ خدا کو فریب دیتے ہو، مومنوں کو فریب دیتے ہو، اپنے آپ کو فریب دیتے ہو۔ معاشی نظام میں، انہوں نے، فریب کہا کہ یہ سارا کچھ خدا کو Belong کرتا ہے، میرٹ وہی حقیقی ہے، مگر یہ کہتے ہیں کہ میرے پاس تو یہ ''امانت'' ہے۔ وہ اس نظامِ سیاسی میں ''امانت'' کو کٹ کے رکھ جاندا اوس نوں، ❷ کہ ٹھیک ہے، صاحب اختیارِ مطلق تو وہ خدا ہے۔ Sovereignty belongs to Allah ❸ (اقتدارِ مطلق خدا کو حاصل ہے) مگر اس نے یہ اختیار ہمیں تفویض (Delegate) کر دیا۔ بالکل وہی چیز ہے کہ اسے اس نے امانت دے دی تھی، اس کو تفویض کر دیا تھا، اب جو جی میں آئے کرتا رہے۔ ان سے اوپر پوچھنے والا وہ خود تھا۔ اب اس نے یہ انہیں تفویض (Delegate) کر دیا۔ چلیے صاحب! اب راوی عیش لکھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، عزیزانِ من! یہ آیت عظیم آیت ہے کہ **لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ** (21:23) صرف اس کی ذات ایسی ہے کہ جو کچھ وہ کرے اس سے نہیں پوچھا جا سکتا۔ اس کے برعکس **وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ** (21:23) ان سے جواب پرسی کی جائے گی اور اس کے علاوہ جو بھی ہے ''ھم'' میں سب آ گئے صاحب! ان سے پوچھا جا سکتا ہے، وہ Accountable (جواب دہ) ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے جداگانہ نظامِ زندگی کیوں وضع کر رکھا ہے۔

----

❶ اس کے بعد ہم جو بھی چاہیں کریں۔

❷ سیاسی نظام میں وہ امین، اس امانت کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

❸ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کسے کہتے ہیں؟ اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ النحل، 2003، ص ص۔ 67-66۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

عزیزانِ من! اقتدارِ اعلیٰ کی اسی Definition (تعریف) کے متعلق حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا کہ حکومت اور خلافت میں کیا فرق ہے؟ آپؓ نے کہا تھا کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ خلافت کی صورت یہ ہے کہ ''مجھ سے پوچھا جائے گا کہ' کہاں سے لیا اور کس کو دیا۔ ان لوگوں کی کیا بات تھی۔ انہوں نے قرآن سے نظریئے اور تصورات سیکھے تھے۔ ذہن یوں تھا کہ چار چار لفظ ہوتے تھے' جس میں یہ بات کر جاتے تھے کہ میں تو یہ سمجھا ہوں کہ خلافت یہ ہے کہ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ''کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا''۔ مجھ سے پوچھا جائے گا' میں Accountable (جواب دہ) ہوں۔ مجھے اس اعتبار سے Sovereignty (اقتدارِ مطلق) حاصل نہیں ہے' مجھ سے پوچھا جائے گا: کہاں سے لیا اور کسے دیا تھا۔ اتنی سی بات ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (102:8) اس دن تم سے پوچھیں گے کہ یہ ساری آسائشیں' یہ ساری زیبائشیں' اور یہ سارا مال' کیسے حاصل کیا تھا۔ کس طرح اس کی تقسیم کی گئی۔ اس وقت یہ سب کچھ تم سے پوچھیں گے۔ یہاں وہی کہا کہ وہ بھاگیں گے اور ہمارا قانونِ مکافات پیچھے سے یہ آواز دے گا کہ لَا تَـرْكُضُوا (21:13) اب کہاں بھاگ کر جا سکتے ہو؟ مت بھاگو۔ کھڑے ہو جاؤ' مت بھاگو' اس پیچھے سے پکارنے والے کی کتنی قوت ہو گی! ورنہ وہ جو آگے بھاگ رہا ہے اس کو اور تیز بھاگنا چاہیے۔ کہا کہ اب اس کے بعد' تم بھاگ نہیں سکتے۔ وَارْجِـعُـوٓا اِلٰـى مَـآ اُتْـرِفْتُمْ فِيهِ (21:13)۔ اب الٹے پاؤں اپنی عیش سامانیوں کی طرف لوٹ چلو (جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کیے تھیں)۔ عزیزانِ من! یہاں اتــرفتم کا لفظ آیا ہے۔ یہ کیا لفظ ہے: ت ر ف۔ ''دوسروں کی کمائی کے اوپر عیش کی زندگی بسر کرنا۔'' یہ اس کے معنی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ چلو واپس' تم سے پوچھا جائے گا۔ عزیزانِ من! غلط معاشرے میں ہوتا یہ ہے کہ لوگ مستقل اقدار کو چھوڑ کر' جن سے معاشرہ جنتی خوشگواریوں کا حامل بنتا ہے' اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور اس طرح معاشرے کو جہنم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان مفاد پرستوں سے' ان مترفین (دوسروں کی کمائی پر عیش کرنے والوں) سے کہا: (18:50) لوٹ آؤ۔ اب یہ پکڑے باندھے گئے' کھڑا کر دیا' تفتیش شروع ہوئی: قَـالُـوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) اس وقت انہیں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے اور اپنے کیے پر سخت متاسف۔ اس لیے پکار اٹھے: ہم نے ظلم کیا۔ ایک لفظ میں سوال ہے اور ایک ہی لفظ میں جواب ہے: ''یہ سب کچھ ہم نے ظلم سے حاصل کیا''۔ فوراً اعتراف کر لیا۔ اس اعتراف کے لیے انہیں ضرورت ہی نہیں کہ پولیس کا سا (Torture) (تشدد) کیا جائے۔ یہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ سارا کچھ' جو کچھ تم کر رہے ہو' آج یہ لپٹا ہوا ہے' اس عدالت میں کھڑے ہو کے اس کو ہم نے کھول دینا ہے اور تم سے کہنا ہے اِقْـرَاْ كِتٰـبَكَ (17:14) آپ ہی پڑھ لے۔ لو' اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لو۔ كَـفٰـى بِـنَـفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14) تمہارا حساب کرنے کے لیے باہر سے کسی محاسب کے بلانے کی ضرورت نہیں۔ خود تمہاری اپنی ذات تمہارے خلاف محاسبہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ بس آج تیرا حساب لینے کے لیے تو خود

اپنے لیے کافی ہے۔ اسی لیے کہا کہ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:14) کہیں گے ہائے افسوس! واقعی ہم ظالم تھے۔کوئی معذرت نہیں، کوئی جھوٹ بولنے کا سوال ہی نہیں ہے۔اعتراف کرلیں گے کہ ہاں! یہ سب کچھ ظلم واستبداد سے، استحصال سے، اور سلب و نہب سے، ہم نے حاصل کیا تھا لیکن اس وقت اس تاسف سے کیا ہوسکتا تھا؟ جب نتائج مرتب ہوکر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ (21:15) چنانچہ وہ برملا چلاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں، ان پر وہ بے حد متاسف ہیں، اب تو بس وہ یہ کہتے چلے جائیں گے۔تو کیا اس وقت یہ کہہ دینا کہ ہم نے سب ظلم وستم سے لیا تھا تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ ''اچھا اچھا چار جتیاں فیر لے ہور ظلم کردے رہو۔ ❶ کہا کہ وہ یہ کچھ کہتے چلے جائیں گے کہ ہم نے یہ سب کچھ ظلم واستبداد سے حاصل کیا تھا۔

میری زندگی کی آخری دعوت

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ خدا کے لیے اتنی سی عربی ضرر سیکھ لیجیے۔میری طبعی زندگی کا کچھ پتہ نہیں کہ کتنی ہے۔میری اس زندگی کی آخری دعوت یہ ہے کہ قرآن سمجھیے، یہ تو بڑا ہی آسان ہے لیکن اس کی لذت تو اس کے الفاظ میں ہے۔اب دیکھیے یہاں کہا ہے کہ وہ یہ تاسفانہ کلمات کہتے چلے گئے۔ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا ❷ خٰمِدِيْنَ (21:15) یہاں تک کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، جس میں نشو ونما کی صلاحیت باقی نہ رہے یا جیسے بجھا ہوا شعلہ جس میں زندگی کی حرارت ختم ہو جائے۔یہاں دو لفظ آئے ہیں: حصیدًا اور خـمـدین. بس یوں کہو کہ، وہ کہتے چلے جائیں گے تا آنکہ ان کی کیفیت یہ ہوگی جیسے کٹا ہوا کھیت ہوتا ہے، جیسے بجھا ہوا۔ شعلہ۔اگر شاعری کسی چیز کو محاکات میں یوں ادا کرنے کا نام ہے کہ کم از کم الفاظ میں پوری کی پوری حقیقت سامنے آجائے، تو عزیزانِ من! بتایئے کہ اس سے بڑی شاعری بھی کوئی اور ہے۔یہ کہتے چلے جائیں گے کہ ہم نے ظلم کیا لیکن وہ وقت تو اب ختم ہوگیا کیونکہ جب یہ عذاب مرئی طور پہ سامنے آجاتا ہے تو اس وقت توبہ کا چانس ختم ہوجاتا ہے اسی لیے کہ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا ❷ خٰمِدِيْنَ (21:15) یہاں تک کہ ہمارے قانونِ مکافات سے وہ قومیں کٹے ہوئے کھیت کی طرح، بجھے ہوئے شعلے کی طرح، راکھ ہو گئیں۔ذرا کھیت کو دیکھو ''تہانوں پتہ لگے۔ اے صرف اوہی پنڈ والے جاننے اوہدی کیفیت کی ہوندی اے، اس کھیت دی۔تے بجھیا ہویا شعلہ، راکھ۔''❸ کیا خوب کہا تھا اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہ مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے:

---

❶ بہت اچھا، تو پھر چار جوتے اور کھاؤ اور ظلم کرتے رہو۔

❷ یہ ''ح ص د'' سے ہے۔حصد۔کھیتی یا پودوں کو درانتی سے کاٹنا (تاج العروس اور محیط المحیط) قرآن کریم نے ہلاک شدہ قوموں کی بربادی اور زندگی کی حرارت سے محرومی کا عبرت انگیز نقشہ حصیدا خامدین کہہ کر کھینچا ہے۔

❸ ذرا کھیت کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہو (مگر) یہ تو صرف دیہات کے رہنے والے ہی جانتے ہیں کہ اس کھیت کی کیفیت کیا ہوتی ہے بس وہ تو بجھا ہوا شعلہ ہوتا ہے: راکھ کا ڈھیر۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

خٰمِدِیۡنَ ❶ راکھ کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔تو کہا کہ یہ چیز ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ پہلے کہا تھا کہ انہوں نے تو تباہیوں کے سارے رخنے بند کر لیے تھے کہ یہ تباہی و بربادی یہاں سے بھی نہ آئے' وہاں سے بھی نہ آئے۔ پھر یہ کیسے ہو گیا؟ کیا ہو گیا؟ قرآن نے مختلف مقامات پہ عزیزانِ من! اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ بڑی عظیم حقیقت ہے۔قرآن کہتا ہے۔ **وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَا لٰعِبِیۡنَ** (21:16) اس کارگہہ کائنات کو محض کھیل تماشے کے طور پر پیدا کر رکھا ہے! بالکل نہیں؟ اسے ہم نے تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔اس کا ایک عظیم مقصد ہے۔اور وہ مقصد یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔افراد ہوں یا اقوام' سب کے اعمال صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر کے رہیں۔[11.7.45.22.53.31] انہیں پتہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ سلسلۂ کائنات یونہی کھیل کود کی بناء پر نہیں بنایا ہوا' مذاق نہیں ہے' یہ کائنات کوئی کھیل نہیں ہے۔ابھی میں دوسری جگہ وہ آیت لاتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ کائنات کا یہ سلسلہ اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ ہر فرد کو اس کے عمل کا بدلہ مل جائے۔ ہمیں تو ابھی پتہ ہی نہیں ہے کیونکہ ہماری سائنس وہاں نہیں پہنچی جس سے ہمیں معلوم ہو سکے کہ یہ کائنات کا سلسلہ انسان کے اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں کیا پارٹ ادا کر رہا ہے' کیا رول ادا کر رہا ہے۔کہا: ان کی بجائے ان کی نگاہ صرف ان چیزوں پر پڑتی ہے کہ مثلاً یہ قوم' یہ فرد دشمن ہے اور یہ کہ یہ سازش' ہے یا یہ سازش کرتا ہے لیکن انہیں پتہ نہیں ہے اگر یہی کچھ ہو تو پھر تو یہ قانونِ مکافات کو شکست دے لیں' یہاں کے انتظامات یہ اس طرح گرفت کر لیں لیکن یہ چیز ان کے بس کی نہیں ہے۔ہم نے نظامِ کائنات اسے کہا ہے جس میں اقتدارِ مطلق ہمارا ہے۔

گردشِ افلاک کے نظریہ کی حقیقت

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آئی تھی جنہوں نے یہ کہا تھا کہ:

نو آسماں بہ گردش ما برمیانہ ایم

غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

---

❶ یہ ''خ م د'' سے ہے۔اس کے بنیادی معنی ''آگ کا ساکن ہونا' حرکت کا ساکن ہونا'' کے ہیں۔قوم خامدون: وہ لوگ جن کی تم کوئی آہٹ تک نہ سن سکو (تاج العروس)۔تباہ ہونے والی قوموں کے خون سے حرارت سلب ہو جاتی ہے اور ان کے پیکر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں۔یہی ان کا خمود ہے۔ بجھے ہوئے انگارے۔ نیز ان کی حیاتِ ملی کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کٹ جاتی ہیں اور ان کے صرف نشانات باقی رہ جاتے ہیں (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' ۱۹۶۰ء ص ص۔619-618)

بات یہ ہے کہ باطل کا نظام ہو یا حق کا نظام ہو' یہ سلسلۂ کائنات نتائج مرتب کرنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ انسانوں کے اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں یہ کائناتی قوتیں کام کر رہی ہیں۔ انسان انہیں بروئے کار لائے یا نہ لائے' یہ کائناتی مشینری اپنا کام کرتی چلی جارہی ہے۔ ان معنی میں اگر آپ لیں تو یہ گردشِ افلاک ایک معنی رکھتی ہے۔ اور اگر آپ یہ سمجھیں کہ ہر فرد کی قسمت کا ایک ستارہ ہوتا ہے اور اس کی قسمت اس ستارے سے وابستہ ہوتی ہے جو اس کا مقدر کہلاتی ہے تو یہ ان کی غلط نگہی ہے۔ ❶ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا، غالب ❷ نے کہا تھا:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کُچھ نہ کُچھ گھبرائیں کیا

یہ آسمان اور زمین گردش میں ہے۔ یہاں اس اعتبار سے گردش کی بات نہیں ہے۔ اس سے تو پھر دوسری بات کہی جائے گی۔ ہاں' البتہ مجوسیوں کا ایک تصور تھا کہ انسان اپنے مقدرات کا آپ مالک نہیں ہے' اس کی قسمت آسمان اور اجرامِ فلکی کی رو سے متعین ہوتی ہے۔ ستارہ شناس' نجومی' ستاروں کی گردش بتانے والے' آپ کے ہاں کے رمل اور اسی قبیل کے سارے قصے اور ہندوؤں کے ہاں کا یہ سارا چکر' انسانی قسمت کو ستاروں کے تابع کرنا ہی تو ہے۔ یہ کہتے ہیں۔ ''برج حمل میں ہے اور اب اس میں چلا گیا ہے اور تمہارا ستارا آج یہ کہہ رہا ہے۔'' یہ مجوسیوں کا تصور تھا۔ یہ ایران کا تصورِ تقلید ہے جو یہ بتاتا ہے کہ انسان مجبور ہے۔ ان کے ہاں آسمان اور زمین کی گردش کا یہ تصور تھا لیکن میں نے یہ کہا ہے کہ وہ یہ چیز کہتے ہیں مگر بات یہ نہیں ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم

قرآنِ کریم نے یہ چیز کہی ہے کہ اگر اعمال کے نتائج مرتب کرنے کا کام انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا تو جابر اور ظالم ایسا انتظام کر لیتے ہیں کہ کوئی ان کے خلاف آواز تک نہ بلند کر پاتا۔ قرآن کریم نے سورۃ الجاثیہ میں بڑی وضاحت سے اس کی بات کی ہے۔ کہا ہے کہ **وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ** (45:22) ہم نے سلسلہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار اور تخریبی نتائج کو مرتب کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا۔ اسے بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے کاہے کے لیے پیدا کیا ہے؟ کہا کہ **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ** (45:22) تاکہ ہر فرد کو اس کے عمل کا صحیح بدلا ملے اور کسی سے کچھ زیادتی نہ ہو۔ اس طرح خدا نے نتائج مرتب کرنے کا کام انسانوں کے اوپر چھوڑا ہی نہیں کہ یہ جس قسم کا چاہیں انتظام کریں اور پھر اس

---

❶ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورۃ النحل' 2003ء، ص ص، 147-146۔

❷ غالب' مرزا اسداللہ خاں: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو لاہور' 2002' ص۔ 58۔

کے مطابق ان کے اعمال کے نتائج برآمد ہوجایا کریں۔ یہ کہتا ہے کہ ہم سلسلہ کائنات اس لیے وجود میں لائے ہیں تاکہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا صحیح صحیح نتیجہ مل جائے اور کسی سے کوئی زیادتی نہ ہو۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو لٰعبین پیدا نہیں کیا' کھیل کود کے طریقے سے پیدا نہیں کیا۔ لٰعبین کے معنی ہوتا ہے: مشغلے کے طور پر' بیٹھے بیٹھے یہ کچھ کر لینا جیسے بچے صبح کو اٹھ کے مٹی کا گھروندا بنایا کرتے ہیں' سارا وقت اس کو بنانے میں صرف ہو جاتا ہے' پاؤں بیچ میں دے دوا کے وہ گھروندا بن جاتا ہے' اس کے بعد پیچھے سے آواز آتی ہے: ''نی ننھی آ' دودھ دا وقت ہو گیا۔ تے اوہدے تے پیر مار کے تر جاندی ننھی''۔ ❶ او صاحب! شاعروں نے تو ہمارے ہاں یہی کچھ کیا ہوا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ کھیل تماشا ہے۔

کائنات کے متعلق اہلِ تصوف کی تعلیم اور ہندوؤں کے تصورات

عزیزانِ من! اس کھیل تماشا کے تصورِ کائنات میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ تو کوئی اور ہے ہی نہیں۔ یہ آپ ہی آپ ہے ''او بھلے شاہ جیہڑا کچھ کیندا ہیگا: آوندا آپ' تے ناں رکھدا تاپ'' ❷۔ آپ ہی یہ کجا ❸ آپ ہی یہ مٹی' آپ ہی یہ کمہار' آپ ہی یہ برتن' آپ ہی نے وہ گھر بنایا' پیالہ بنایا اور پھر خود ہی پینے والا ہوا' اور خود ہی اس کا بنانے والا' شراب کا خود ہی خریدار اور آخر میں یہ شکستِ رواں خود۔ ''پیر مار کے توڑ کے چلدا بنیا ہے۔ آ اللہ میاں کم کردا پھردا جے''۔ ❹ کیا بات ہے ہماری شاعری کی بھی! اس میں شاعر ساری عمر جذبات کا پرستار رہتا ہے اور جذبات بھی وہ ہوتے ہیں جو جھوٹے اور بناوٹی ہیں۔ یہاں قرآن کریم نے کہا کہ ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو لٰعبین نہیں پیدا کیا۔ عزیزانِ من! لٰعبین کی اتنی سی بات بس یونہی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ فلسفہ ہے۔ خدا کے جو نام ہیں ان میں اس کا نام نٹ راجن ہے یعنی نٹوں کا راجہ' Chief of Actor۔ تو یہ سارا کچھ ایشور ❺ کی لیلا ❻ ہے۔ آپ لوگوں نے تو اب یہ لفظ بھی نہیں سنے ہوں گے۔ ہم تو ہندوؤں میں رہے ہوئے ہیں۔ آپ نے رام لیلا لفظ تو سنیا ہونا۔ ❼ یہ لیلا ہوتا ہے ڈرامہ اور رام لیلا ❽ جو تھی وہ صرف وہی دسہرے کے دنوں میں رامائن کا ❾ ڈرامہ کیا کرتے تھے۔ رامائن کا اس کے بعد یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ساری کائنات ایشور کی

---

❶ اے ننھی! تمہارا دودھ پینے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب آ جاؤ۔ وہ اس گھروندے پہ پاؤں مار کر چلی جاتی ہے۔

❷ یہ وہی ہے جو (صوفی بزرگ) بھلے شاہ کہتا ہے: ہر طرف وہ ''آپ ہی آپ'' ہے' وہ ''آپ'' ہی ہر قبیل میں ہے۔

❸ ایک قسم کا مٹی کا برتن۔

❹ پاؤں مارا' توڑا اور چلتا بنا۔ اللہ تعالیٰ یہ کام کرتا پھر رہا ہے۔

❺ بھگوان ❻ لیلا: کھیل' سیر و تماشا' لہو و لعب

❼ سنا ہوگا۔ ❽ دسہرے کا میلا۔ رام چندر جی کی فتوحات کی نقل جو ہندو دسہرے کے موقع پر کرتے تھے۔

❾ رامائن: وہ رزمیہ نظم جو پہلے بالمیک جی نے سنسکرت میں اور پھر تلسی داس نے ہندی میں رام چندر جی کے حالات میں لکھی

لیلا رچائی ہوئی ہے اور اس کے اندر یہ ہم سب چھوٹے چھوٹے ایکٹر ہیں۔ نہ بادشاہ بادشاہ ہے نہ وزیر وزیر ہے نہ قاتل قاتل ہے نہ مقتول مقتول ہے یہ سارا کچھ ایک ڈرامہ ہے۔ اس میں Chief Actor یعنی نٹ راجن ہے۔ وہ خود سب سے بڑا نٹ راجن ہے۔ ہندو فلسفہ میں یہ تصور تھا۔ ان کے ہاں اس چیز پر فلسفہ کی کتابیں ہیں۔

لٰعبین کے لفظِ قرآنی کا مفہوم

عزیزانِ من! آپ قرآن کا لٰعبین کا ایک لفظ دیکھیے لٰعبین کے لفظ میں ان کا یہ سارا فلسفہ رد ہوا۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کر کے رکھ دی کہ وہ نٹ راجن نہیں ہے۔ اس نے لیلا نہیں رچا رکھی۔ بلکہ یہ سلسلۂ کائنات بالحق پیدا کیا ہوا ہے۔ واضح الفاظ میں کہا کہ **لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَهۡوًا لَّاتَّخَذۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّاۤ اِنۡ كُنَّا فٰعِلِيۡنَ** (21:17) اگر ہمارا یہ ارادہ ہوتا کہ سلسلۂ کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد رہے تو ہم اسے اپنی طرف سے ایسا ہی بنا دیتے لیکن ہم نے اسے ایسا نہیں بنایا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اگر کھیل رچانا ہوتا لیلا کرنی ہوتی تو ہم وہ بھی کر سکتے تھے۔ ہمارے امکان میں یہ تھا ہم وہ کر دکھاتے پھر یہ اس قسم کی لیلا نہ ہوتی جیسی تم یہ کہتے ہو۔ یہ بالکل غلط تصور ہے جو تم کہتے ہو کہ لیلا رچا رکھی ہے: **بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (21:18) حق کی تعمیری قوتیں باطل کی تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہے اور اس طرح ان کا سر کچل کر رکھ دیتی ہے اور باطل شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ یہ ہمارا کائناتی پروگرام ہے۔ اسی طرح یہاں تو کیفیت ہی کچھ اور ہے۔ یہاں حق اور باطل کی ایک کشمکش ہے۔ ہم باطل کے مغز پہ حق کا ہتھوڑا مارتے رہتے ہیں۔ **فَيَدۡمَغُهٗ** (21:18) اس طرح اس کا بھیجا نکال کے رکھ دیتے ہیں۔ **فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (21:18) وہ میدان چھوڑ کے بھاگ جاتا ہے. اس کے برعکس: **وَلَـكُمُ الۡوَيۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ** (21:18) یہ جو تم کہتے ہو (کہ یہ محض کھیل تماشے کے طور پر وجود میں آ گیا ہے اور یہاں کوئی نظام ایسا نہیں جس سے انسانی اعمال پر گرفت ہو سکے اور غلط روش اپنا تباہ کن نتیجہ مرتب کر کے رہے) یہ یکسر غلط ہے اور قابلِ صد افسوس اور موجبِ ہزار تباہی۔ اس طرح جو کچھ تم خدا کو سمجھے بیٹھے ہو تمہارے لیے تباہی ہے۔ تمہارے ایسے خدا کے لیے ہماری عبادتوں کی پرستشوں کی اسے کیا فکر **وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسۡتَحۡسِرُوۡنَ** (21:19) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے۔ کائنات کی کوئی قوت اس کے قانون کی اطاعت سے سرتابی اختیار نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ کبھی اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے تھکتی ہے۔ اس طرح جو قوتیں ان چیزوں کے اوپر اس نے متعین کی ہیں وہ **لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ** (21:19) اطاعت سے کبھی بھی سرکشی نہیں برتیں کبھی ایک سجدے سے بھی گریز و سرکشی نہیں کرتیں۔ **عَنۡ عِبَادَتِهٖ** (21:19) یہاں دیکھیے عبادت کا لفظ ہے یعنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی ذرا سی بھی کوتاہی برتے چلو جی مانا کہ کسی چیز نے سرکشی نہ

برتی، یہ کچھ سہی، آدمی کام کرتے کرتے تھک بھی تو جاتا ہے۔ کہا کہ **وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ** (21:19) وہ تھکتے بھی نہیں ہیں۔ اور اس طرح **یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ** (21:20) وہ سب، رات دن، خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگراں رہتے ہین اور ان کی سرگرمیِ عمل میں کبھی سستی نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! یہ وہ ہیں جو تمہارے اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے پروگرام کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یوں نتائج مرتب ہوتے ہیں، بات آگے بھی چلتی ہے۔ مگر درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الانبیا کی آیت 20 تک آ گئے۔ اکیسویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀……❀……❀

تیسرا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 21 تا 24)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ
فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَمِ
اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٤﴾

عزیزانِ من! آج جولائی 1976 کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 21 سے ہو رہا ہے:(21:21)۔

یوں تو قرآنِ کریم کا کونسا مقام ایسا ہے جس پر ذرا غیر جانبدارانہ طور پر غور وفکر کیا جائے تو انسان اس نتیجہ پہ نہ پہنچے کہ یہ واقعی کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا بالخصوص اس لحاظ سے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے زمانے میں جہاں علمِ انسانی، عام فکر اور مذاہب عالم جس مقام پہ کھڑے تھے اُس میں ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا بلند و بالا محل جس کی تعمیر میں چار ہزار سال لگے تھے وہ گرنے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اُس دور میں کوئی ایسی بات کہنا کہ آج بھی یہ چیز نظر آئے کہ عام انسان اور عام مفکر تو رہا ایک طرف، آج کے علوم وفنون پر مہارت رکھنے والے عظیم سائنسدان بھی اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتے، تو یہی بات اس کی ایک بڑی دلیل ہوسکتی ہے کہ قرآن کریم واقعی کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

آپ ذرا اس نکتے پہ غور کیجیے کہ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ I believe in God (میں خدا کو مانتا ہوں)۔ صبح سے شام تک ہم بھی یہی کہتے ہیں؛ ساری دنیا سوائے روس اور چین کے، یہی کہتی ہے۔ کیا کبھی آپ نے سوچا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نہیں مانتا۔ سوال یہ ہے کہ اس سے کیا فرق پڑا؟ ''مانتا ہوں'' دو ایسے الفاظ ہیں جو ہم میں سے ہر شخص بولتا ہے اور ''میں مانتا ہوں'' کہہ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتنا بڑا کارِنمایاں کر دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص یہ کہہ کر کہ وہ خدا کو نہیں مانتا نہایت ذلیل وخوار ہو گیا اور آپ بہت بڑے نمبردار بن گئے۔ ٹھیک ہے بات میں نے یونہی کہہ دی تو یہ ذہن میں آیا، ورنہ ''مانتا ہوں''

کہنے والے تو اس کے بعد کبھی سوچتے ہی نہیں کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ کیا یہ کہنے سے اتنی سی بات ہوگی کہ میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ہے' یہ کہتا ہے کہ نہیں ہے تو اس سے کیا فرق پڑا جی؟ نہ خدا کو کچھ فرق پڑا' نہ آپ کو کچھ فرق پڑا' ہاں البتہ آپ کو اتنا بڑا اطمینان ہو گیا کہ یہ باقی نہ ماننے والے جہنم کے کندے ❶ ہیں' یہ خدا ہی کو نہیں مانتے۔ ہم خدا کو مانتے ہیں۔ یورپ کی تمام عیسائی قومیں خدا کو مانتی ہیں' روس اور چین والے خدا کو نہیں مانتے۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ ان دونوں اقوام میں کیا فرق ہے؟ بس یہ ایک اطمینان ہے جو ہم نے اپنے آپ کو دلا لیا کہ ہم ان سے منفرد ہیں اور یہ ساری دنیا کے سامنے ذلیل وخوار ہیں اور ہم بڑے معتبر! کیا ہم میں اور اُن نہ ماننے والوں میں عملی طور پر کوئی فرق ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

ذاتِ خداوندی کی دو حصوں میں تقسیم

عزیزانِ من! یورپ کے بڑے بڑے Scientists (سائنسدانوں) نے بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ مستثنیات کو چھوڑ کر کائنات کے متعلق ان میں سے ہر ایک یہ کہتا ہے کہ واقعی یہ کائنات خدا کی تخلیق ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فطرت کے قوانین واقعی اٹل ہیں اور نہایت حسنِ تدبر سے کارفرما ہیں' یقیناً خدا ہے' انہیں بنانے والا۔ اور ایسے Scientists (سائنسدان) بھی ہیں' جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ کائنات کسی نہ کسی عمل سے ازخود وجود میں آ گئی اور اب جیسے گھڑی کو چابی دے دیجاتی ہے تو وہ چوبیس گھنٹے یا ہفتہ بھر تک بغیر کسی قسم کے تردد وفکر کے چلتی رہتی ہے' اسی طرح سے یہ کائنات نہایت قاعدے کے مطابق' گھڑی کی طرح چل رہی ہے۔ عزیزانِ من! کبھی سوچیے گا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ خدا کا جو ''ماننا ہے'' اس کے معنی کیا ہیں' ماننے اور نہ ماننے سے فرق کیا پڑتا ہے؟ کیا یہ محض اپنا ذہنی اطمینان اور تسکین ہے؟ وہ تو نہ ماننے والا بھی اسی طرح حاصل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے تم سے بھی زیادہ تسکین اور اطمینان حاصل ہے۔ اگر اپنا ہی اطمینان مقصود ہے تو اُسے تو آپ جھٹلا بھی نہیں سکتے کہ نہیں' تمہیں اطمینان حاصل نہیں ہے' تم کیسے کہتے ہو کہ مجھے تو تم سے بھی زیادہ اطمینان حاصل ہے۔

عزیزانِ من! بات یوں نہیں ہے۔ دراصل ایمان باللہ یعنی خدا کا ماننا اور کفر یعنی خدا کا نہ ماننا ہی تو امتیازی چیز ہے' یہی تو انسان اور انسان میں خطِ امتیاز ہے' اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ سوچنے کے بعد آپ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ فرق نظر نہیں آ رہا۔ اس وقت تک بھی کسی نے اس پر غور نہیں کیا: نہ مذہب کی دنیا میں' نہ عالمِ فکر کی دنیا میں۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ قرآن نے کیا بات کہہ دی۔ اس حد تک تو یہ لوگ' یہ سائنسدان' سوائے سوشلسٹ بلاک کے' یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور یہ اُسی کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ

---

❶ لکڑی کے ٹکڑے یعنی ایندھن

يُنشِرُوْنَ (21:21) یہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کی اپنی حیاتِ ارضی، معاشی اور معاشرتی، بھی اسی کے قوانین کے تابع رہنی چاہیے۔ یہ اپنی حیاتِ ارضی کے لیے اور معبود تراشتے ہیں یعنی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی، ان کے اپنے، یا دوسرے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے ماتحت رہنی چاہیے اور انہی کے مطابق اس زندگی کو پھیلنا اور آگے بڑھنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر آسمانوں کا خدا اور ہونا چاہیے اور زمین کا خدا اور...... آسمانوں میں خدا کی بادشاہت ہونی چاہیے اور زمین پر انسانوں کی۔ یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ اب میں دوسری آیت آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ اس سے آپ دیکھیے گا کہ قرآنِ کریم نے کیا تفریق کی ہے۔ کہا کہ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ (6:3)۔ یہ نہ سمجھ لو کہ خدا کا قانون، خارجی کائنات تک محدود ہے۔ انسانوں کی زندگی اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے باہر ہے۔ کائنات میں بھی اسی کا قانون نافذ العمل ہے اور تمہاری تمدنی اور معاشی زندگی میں بھی اسی کا قانون ہے، یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ کہا کہ میں خدا کو مانتا ہوں تو پھر اس کے بعد خدا تو ہے۔ قرآن یہ امتیاز و تفریق کیوں کر رہا ہے کہ ارض میں بھی وہی الٰہ ہے، سما میں بھی وہی الٰہ ہے۔ ایک آیت اور دیکھ لیں۔ کہا کہ یاد رکھو وَهُوَ الَّذِیْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)۔ خدا کا قانون خارجی کائنات میں بھی کارفرما ہے اور خود انسانی زندگی میں بھی۔ ساری کائنات کی زمامِ اقتدار اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس طرح وہی سما میں بھی الٰہ ہے، وہی ارض میں بھی الٰہ ہے۔ یہ بڑی غور طلب آیت ہے۔ خدا کو نہ ماننے والوں کو تو چھوڑ دیجیے، یہ جتنے خدا کو ماننے والے مذاہب ہیں ان کی مبینہ آسمانی مقدس کتابیں ایک ایک میری دیکھی ہوئی ہیں۔ میری ان پر تحقیق موجود ہے جو میں نے اپنی کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں''[1] میں دی ہے۔ میں نے ان کتب کو خود پڑھا ہے۔ ان میں کسی کتاب میں، کسی جگہ اِلٰهٌ اسماء اور اله الارض کی تفریق نہیں ہے۔ آج کی فکری دنیا میں بھی جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''خدا کو مانتا ہوں'' تو کبھی یہ فرق نہیں کیا جاتا کہ ''کونسے خدا کو مانتا ہوں''۔ یہاں ان آیات میں وہ ''کونسا خدا کہہ رہا ہے۔'' اس نے تفریق کی ہے کہ تم الہ السماء کو مانتے ہو لیکن الہ الارض کو نہیں مانتے حالانکہ حقیقت یہ کہ وَهُوَ الَّذِیْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)۔ سما میں بھی وہی الٰہ ہے، ارض میں بھی وہی الٰہ ہے، تو گویا یہ ایک چیز تھی جو ذہنِ انسانی نے تخلیق کی تھی۔ اس نے دو قسم کے الٰہ تجویز کیے تھے: ارض کا الٰہ اور ہے، اور سما کا الٰہ اور۔ قرآن نے اس کی تردید کی ہے حالانکہ جیسا میں نے کہا ہے، اس دَور کے اندر اس قسم کی تفریق کرنے والے ذہن کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس تفریق میں ایک بڑی عظیم بنیادی حقیقت بیان کر دی ہے کہ جب بھی کوئی اس پہ غور کرے گا تو بات سمجھ میں آئے گی کہ الٰہ یعنی خدا کے ماننے کے معنی کیا ہیں؟ معنی یہ ہوئے کہ الہ الارض بھی وہی ہے، الہ السماء بھی وہی ہے۔ جب ساری کائنات کا وہ خدا ہے تو کائنات میں تو سما اور

---

[1] ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں''، جس میں مستند تاریخی شواہد کی رو سے بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے سوا، کسی مذہب کی آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1966 میں الگ کتابی شکل میں منصہ شہود پر آیا تھا۔ 1966 سے 1996 تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

ارض دونوں ہی آ گئے۔ قرآن خاص طور پہ یہ چیز کہہ رہا ہے کہ خدا کو ماننا ہے تو تمہیں اس طرح سے ماننا ہوگا: الہ السماء بھی وہی ہے' الہ الارض بھی وہی ہے۔

ارض کا خدا الگ اور سماء کا خدا الگ ماننے کا نتیجہ

عزیزانِ من! آج جو آیت ہمارے زیرِنظر ہے' اس میں یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ ارض میں اپنی زندگی کے لیے اور الہ تجویز کر رکھتے ہیں تو گویا یہاں فرق پیدا کر دیا کہ الہ السماء کو مانتے ہیں مگر یہ ان لوگوں نے الہ الارض اور تجویز کر رکھے ہیں۔ یورپ کی ساری قومیں جو خدا کو ماننے والی ہیں جن میں بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) بھی موجود ہیں آپ دیکھیے گا کہ ان کی کتابوں پہ کتابیں شائع ہوتی ہیں جنہیں ہمارے ہاں بھی بڑے فخر سے پھیلایا جاتا ہے' حوالے دیئے جاتے ہیں' ترجمے کیے جاتے ہیں' اور ایسا کہا جاتا ہے کہ دیکھیے صاحب! خدا کے ماننے کی کتنی بڑی سند حاصل ہوگئی' اور وہ ساری کتابیں یہ کہتی ہیں کہ یہ سلسلہ کائنات جو خدا نے پیدا کیا ہے' اسی کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلتا ہے' یعنی ان ساری کتابوں میں' ساری تگ و تاز' الہ السماء کے متعلق ہوتی ہیں۔ اُن میں سارا یورپ' سارے یورپ کے ماننے والی قومیں' اور آج کے سارے مسلمان بھی شامل ہیں۔ کبھی غور کیجیے گا کہ ان کی جو زمین کی زندگی ہے' جو ہماری تمدنی' معاشی' معاشرتی' سیاسی زندگی ہے' کیا اس میں بھی ہم اسے الہ مانتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں اتنے سے ہی بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔ یہ آج کا سیاسی نظام' معاشی اور معاشرتی نظام ہمارا اپنا وضع کردہ ہے' تمدن و تہذیب بھی ہماری اپنی پیدا کردہ ہے۔ آپ سوچیے کہ ان تمام شعبوں میں کہیں الہ الارض بھی اس کے اندر آتا ہے یعنی ان نظامہائے زندگی میں کہیں بھی خدا آتا ہے۔ وہ سب قومیں جو میں نے گنائی ہیں' جو خدا کو مانتی ہیں' ملحدین کو چھوڑ دیجیے کہ جنہیں آپ کہتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہم خدا کو نہیں مانتے' وہ نہیں مانتے اور یہ جو مانتے ہیں کیا ان دونوں کی سیاسی' معاشرتی' معاشی اور تمدنی زندگی میں کوئی فرق ہے؟ تو اس طرح خدا کے ماننے اور نہ ماننے سے تو کوئی فرق ہی پیدا نہیں کیا' انہوں نے مان لیا تو کیا؟ اور انہوں نے نہ مانا تو کیا؟ یہ ماننے والے کبھی کبھی خدا کو نظری طور پر استعمال کر لیتے ہیں' حالانکہ خدا کے متعلق یہ لفظ تو بڑی جرأت والی بات ہے لیکن یقینی بات یہی ہے کہ یہ کبھی کبھی خدا کو استعمال کر لیتے ہیں۔

ہمارے ہاں خدا کو ایک ایکسٹرا کھلاڑی کے طریق پر رکھا جاتا ہے

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے' قرآن کی ایک آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم لوگوں نے خدا کو 'ظِهْـرِيًّـا'' [1] (11:92) بنا رکھا ہے۔ ایک ٹیم گئی ہے اُس میں کھیلنے کے لیے گیارہ تو کھلاڑی ہوتے ہی ہیں اور ساتھ کچھ ایکسٹرا رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی پہلے ہی میچ

---

[1] واتـخـذ تموہ ورآء کم ظهريا (11:92)۔ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو' وہ محض برائے وزنِ بیت ہے۔ تم نے اُسے بطور Extra اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے' کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اُس سے کام لے لیا جائے' ورنہ مدد اور سہارے کے لیے تمہاری نگاہیں اور ہی طرف اٹھتی ہیں۔

میں کہتے ہیں کہ فلاں زخمی ہوگیا ہے۔ وہ جو ساتھ ایکسٹرا رکھا ہوا ہوتا ہے اُسے اس کی جگہ لگا دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو اصلی کھلاڑی ہے اگر وہ کسی وقت ایسے حادثے کا شکار ہو جائے تو یہ اس وقت کے لیے سنبھال رکھنا۔ ''پنجابی اچ اینوں فالتو کیندے ہوندے نیں''❶۔ یہ کھلاڑی اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ ''برہمن روٹیاں پکا ریا سی بیٹھا ہویا۔ اوپکا کے' دو روٹیاں اونے رکھیاں۔ کتا آیا۔ اونے دو روٹیاں منہ اچ لیاں تے نٹھا۔ ایدھر ادھر اونے تکیا۔ کچھ نظر نہ پیا۔ ایک پتھر دی مورتی رکھی ہوئی ہیگی سی۔ چک کے زور تے دبا ماری۔ اوہدے بتھاڑے تے وجی۔ او چوں چوں کر کے نٹھ گیا۔ کہنے لگا: ساری عمر تیری پوجا کیتی' تے کم توں اج آیاں ایں❷۔ عزیزانِ من! اسے کہتے ہیں خدا کو استعمال کرنا۔

مسلمانوں کے لیے Capitalist (سرمایہ دار) اقوام کی ایک چال

جب روسی کمیونسٹوں کا زور پڑا تھا تو مغرب کی سرمایہ دار اقوام میں مصیبت پڑ گئی تھی۔ جب ان اشتراکیوں نے دیکھا کہ یہ طوفان اٹھ رہا ہے تو انہوں نے یہ فقرہ کہا تھا:

Workers of the world! unite together, you won't loose any thing but your chains.

عزیزانِ من! یہ بات سمجھنے والی تھی کہ دنیا کے محنت کشو! اٹھو' متحد ہو جاؤ؛ تمہارے اتحاد سے تمہارا کچھ نہیں جائے گا؛ یہ جو سرمایہ داروں نے تمہارے ان ہاتھوں اور پاؤں میں یہ زنجیریں پہنا رکھی ہیں یہ ٹوٹ جائیں گی۔ ''گل ہوئی نا''❸ اس کے جواب میں ان سرمایہ داروں نے کہا تھا Believers in God unite together. ' (اے خدا کے ماننے والو! اٹھو' متحد ہو جاؤ)۔ انہیں Believers in God (اے خدا کے ماننے والو!) یاد آ گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ کی قومیں تو سیاسی طور پہ مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ انہیں خطرہ یہ تھا کہ یہ جو مسلمانوں کا اتنا بڑا ابلاک ہے' کہیں یہ ان کے ساتھ نہ مل جائے۔ اس بلاک کو' ان اشتراکیوں سے ورغلانے کے لیے' الگ رکھنے کے لئے' گنیش ❹ کی یہ مورتی کام آئی' اس وقت انہیں خدا یاد آیا اور مخاطب کر کے کہا کہ Believers in God' اس کا مقصد

---

❶ اسے پنجابی میں ''فالتو'' کہتے ہیں۔

❷ برہمن بیٹھا ہوا روٹیاں پکا رہا تھا۔ اس نے دو روٹیاں پکا کر رکھیں۔ ایک کتا آیا' اس نے یہ دونوں ہی روٹیاں منہ میں دبائیں اور یہ جا اور وہ جا۔ برہمن نے ادھر اُدھر دیکھا' اُسے کوئی چیز پڑی ہوئی نظر نہ آئی۔ ایک پتھر کی مورتی رکھی ہوتی تھی۔ اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ' اُسے اٹھایا اور دے مارا۔ وہ مورتی کتے کے جبڑے پہ لگی۔ وہ چوں چوں' چانچاں چانچاں' کرتا ہوا یہ جا اور وہ جا۔ برہمن کہنے لگا: میں ساری عمر تیری پرستش کرتا رہا' مگر تو کام آج آیا۔

❸ یہ تو بات ہوئی!

❹ گنیش [سنسکرت۔ اسم۔ مذکر] شو جی اور پاربتی کا بیٹا' جسے ہندو دانائی اور مشکل کشائی کا دیوتا مانتے ہیں۔ ہندوؤں میں برہما' [باقی اگلے صفحے پر]

ومدعا یہ تھا کہ کہیں یہ سارا مسلمانوں کا بلاک رشیا' یعنی یو ایس ایس آر ❶ کے ساتھ نہ مل جائے۔ یہ ان کا ایک خالص سیاسی مقصد تھا جس کے لیے ان سرمایہ دار اقوام نے Believers in God کا ایک نعرہ دیا اور ساری دنیا کے مسلمانوں نے' بڑے فخر سے یہ کہا کہ آؤ خدا کے ماننے والو! ان ملحدین کے خلاف' ان منکرین خدا کے خلاف' ان دہریوں کے خلاف' ایک متحدہ محاذ بناؤ۔ یورپ کی قومیں اپنی سیاست' اپنی سرمایہ داری کے نظام کے تحفظ کے لیے ایک متحدہ محاذ بنا رہی تھیں اور مسلمانوں کو یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ روس کے خلاف ہمارا ساتھ دو۔ اسی طرح عزیزانِ من! ایکسٹرا خدا یعنی ظہریا کام آیا۔ اس وقت تو کہا کہ

Believers in God unite together

اے خدا کے ماننے والو! آؤ اکٹھے ہو جاؤ۔ یہ الہ السماء کا ماننا ہے۔ یہ اس بات کا ماننا ہے کہ کائنات اس نے بنائی۔ اسی کے قوانین فطرت کی رو سے' یہ سب کچھ چل رہا ہے۔ یہ سارے کا سارا آسمان کا وہ اوپر کا حصہ ہے جہاں اس کی خدائی کارفرما ہے اور اب اس سے نیچے آیئے Believers in God کے ہاں آیئے۔ وہاں ان کی اپنی سیاست' اپنی معیشت' اپنی معاشرت ہے اور بالکل اسی طرح ہے جس طرح Non--Believers (خدا کو نہ ماننے والوں) کے ہاں اپنی سیاست' اپنی معاشرت' اپنی معیشت ہے۔ خدا نہ وہاں ہے اور نہ یہاں۔

خارجی کائنات کے اصول واقدار خدا کے مگر انسانی زندگی کے تمام تر ضوابط خودساختہ

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا جو یہ قرآن نے کہا کہ تم الہ السماء کو تو مانتے ہو مگر الہ الارض کو کیوں نہیں مانتے۔ اس کائناتی زندگی میں تم مانتے ہو کہ خدا کے قوانین رائج ہیں تو پھر تمہاری اپنی زندگی کے اندر خدا کے قوانین کیوں نہ رائج ہوں۔ یہ تو تم مانتے ہو کہ یہ عظیم کُرّے جو اتنے بڑے بڑے سماوات کے ہیں' وہ تو اس کے قوانین کے تابع چل رہے ہیں۔ تو پھر تمہاری اپنی زندگی اس کے قوانین کے تابع کیوں نہ چلے۔ آسمانی کروں پہ تو خدا کی خدائی ہو مگر تمہاری زمینی زندگی کے اندر اس کی خدائی نہ ہو' آخر کیوں؟

آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من! کہ جسے ہم ''خدا کو ماننا'' کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ ہم سب آسمانی خدا کو مانتے ہیں مگر الہ الارض پہ کسی کا ایمان نہیں ہے۔ اگر اسی طرح سے ہم خدا کو مانیں جیسے سورج خدا کو مانتا ہے کہ اس کے قانون کے خلاف وہ کہیں آنکھ بھی نہیں جھپک سکتا' اگر ہم اس الہ السماء کو اسی طرح سے الہ الارض مانیں کہ جیسے اس سماء کے اندر اس کے قوانین کارفرما ہیں اُسی طرح

[گزشتہ سے پیوستہ]

شوا اور وشنو تین خدا مانے جاتے ہیں۔ آج کل اس کا یہ مفہوم بتایا جاتا ہے کہ یہ تینوں مستقل خدا نہیں ہیں بلکہ پرماتما کی تین صفتوں کے مظہر ہیں: برہما (پیدا کرنے والا)' شوجی (سلسلہ کو آگے بڑھانے والا) اور وشنو (ہلاک کرنے والا)۔ ان میں سے شوجی کی پرستش (لنگ کے توسط سے) عام ہوتی ہے لیکن مسٹر گووند داس کی تحقیق یہ ہے کہ برہما' شوؤ شنو کا نام ویدوں میں تو ایک طرف' رامائن و مہابھارت تک میں کہیں نہیں ملتا۔ (پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' 1996' ص 96)

❶ یہ 1976ء کی بات ہے۔

ہماری زندگی میں اس کے قوانین نافذ العمل ہیں تو یہ ہے جو صحیح معنوں میں خدا کو ماننا ہے۔اب پہلی آیتیں سمجھ لیجیے۔ اس نے کہا تھا کہ وَ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (21:19)۔کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ارض وسما کا سارے کا سارا نظام اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔وَ مَنۡ عِنۡدَہٗ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ لَا یَسۡتَحۡسِرُوۡنَ یُسَبِّحُوۡنَ الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ لَا یَفۡتُرُوۡنَ (21:19-20)۔اور کائنات کی کوئی قوت اس کے قانون کی اطاعت سے سرتابی اختیار نہیں کرسکتی اور نہ ہی وہ کبھی اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے تھکتی ہے۔وہ سب رات دن خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔اس تکمیل میں ان کی کوئی سستی نہیں ہوتی۔ان آسمانی کرّوں' کائناتی قوتوں' نیچر کی قوتوں' جنہیں وہ ملائکہ کہتا ہے' کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کبھی خدا کے قوانین سے سرتابی نہیں کرتیں' وہ تمام قوتیں اس کے مرتب کردہ قوانین کو تکمیل تک پہنچانے میں ہر آن سرگرم عمل رہتی ہیں کبھی تھکتی نہیں ہیں' سست نہیں پڑتیں' ماند نہیں پڑتیں۔یہ ہوئے الہ السماء میں' خدا کے اقرار کے معنی۔یعنی یہ اقرار کہ یہ ساری سماوی قوتیں خدا کو مانتی ہیں' Believers in God ہیں' یعنی خدا کو مانتی ہیں۔اس طرح Believe in God (خدا کو ماننا) کے معنی سمجھ میں آ گئے۔اب رہے Non-Believers in God (خدا کو نہ ماننے والے)۔انہیں ابلیس کہتے ہیں۔اصل یہ ہے کہ Non Believer بھی خدا کو تو مانتا ہے۔قرآن میں دیکھیے۔وہ جب چیلنج دیتا ہے تو قَالَ فَبِعِزَّتِکَ (38:82)۔وہ کہتا ہے کہ تیرے غلبہ وتسلط کی قسم! تیری عزت اور جلال کی قسم! لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ (38:82)۔تو دیکھ کہ میں ان انسانوں کو کس طرح تیرے صحیح راستے سے بہکاتا ہوں۔میں یہ کچھ کر کے دکھاؤنگا۔وہ تو الہ السماء مانتا ہے' لیکن ارض میں یہ الہ نہیں مانتا۔وہ کہتا ہے کہ ملائکہ تک تو بات ٹھیک ہے لیکن یہ جو تو نے اپنی ارض میں انسان بنایا ہے' یہ تجھے الہ نہیں مانے گا۔اب یہ ہے جو میں Believers (ماننے والوں میں) کرونگا اور یہی کچھ Non Believers (نہ ماننے والوں) میں کروں گا۔اس میں یہ دونوں شامل ہونگے۔حکم سے سرکشی کرنے کے باوجود میں Believer in God ہوں (میں خدا کو مانتا ہوں)۔عزیزانِ من! اس نے خدا سے انکار نہیں کیا۔کہا یہ ہے کہ میں انہیں ایسا بنادونگا کہ وہ صرف تمہیں زبانی کلامی ''مانتے'' رہیں گے اور اس ''ماننے'' کے لفظ کے معنی پر کبھی غور نہیں کریں گے۔اصل تو یہ ہے کہ میں انہیں یہ کرنے ہی نہیں دونگا۔یہاں ماننا کہا ہے۔عربی میں اٰمنت باللہ کہا' اردو میں ''ہم خدا کو مانتے ہیں'' اور انگریزی میں We believe in God کہا۔ اس کے بعد آدم ❶ سے یہ کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں حیاتِ ابدی کیسے حاصل ہوگی۔ایسی مملکت کا پتہ نشان بتاتا ہوں جس میں کبھی اضمحلال اور زوال واقع نہ ہو۔وہ یہ ہے کہ ''الہ السماء اور الہ الارض مان لینا لیکن ماننا صرف نظری طور پر اور پھر اپنی تمدنی' معاشی ومعاشرتی زندگی میں اپنے وضع کردہ قوانین چلانا''۔عزیزانِ من!

---

❶ انسانی ممکنات اور انسانی نفسیاتی کشمکش کا ذکر قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کیا بات ہوئی۔ یورپ کے Scientists (سائنسدانوں) کی طرف آ جائیے' ہماری طرف بھی آ جائیے اور اس سورۃ کی طرف بھی آ جائیے' جس کا نام ہی سورۃ مؤمنون یعنی ایمان والے ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ Believers بھی کیا جاتا ہے. اس میں کہا کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ط قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (23:84)۔ ان سے پوچھو کہ اگر تم جانتے ہو تو یہ بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ زور دے کر کہا کہ ان سے کہو کہ یہ زمین جو اس طرح گردش کر رہی ہے' اس میں نباتات اگتی ہیں' ہوائیں چلتی ہیں' مگر یہ بتاؤ کہ یہ سارا نظم و نسق کس کا کیا ہوا ہے؟ جواب میں کہا کہ یہ کہہ دیں گے کہ یہ سارا خدا کا کیا ہوا ہے۔ یہ اسے مان تو رہے ہیں۔ تو ان سے کہو کہ کیا اس سے تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ جو کچھ اللہ کا ہے اُسے اللہ ہی کے لیے رہنا چاہیے۔ اُسے انسان کو اپنی ملکیت نہیں بنالینا چاہیے۔ خارجی کائنات میں آفاقی قوتیں' آفاقی قوانین' خدا کے Laws of Nature (قوانینِ فطرت) وغیرہ سرگرمِ عمل ہیں۔ عزیزانِ من! اسے دیکھتے جائیے' چودہ سو سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔ پھر کہا کہ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ ❶ السَّبْعِ ❷ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (23:86)۔ ان سے پوچھو کہ ان مختلف اجرام فلکی (اور ان کے اندر جو کچھ ہے' ان) کا نشو و نما دینے والا کون ہے اور وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کی مرکزی ربوبیت کا کنٹرول ہے۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:87)۔ یہ اعتراف کریں گے کہ یہ بھی خدا ہی کرتا ہے۔ اور ہر شے پر اُسی کا کنٹرول ہے۔ عزیزانِ من! یہ کہیں گے کہ یہ بھی خدا کرتا ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ چودہ سو سال پہلے بات ہو رہی ہے۔ ہم تو صرف اندھے ایمان کی بنا پر کہیں گے کہ یہ بھی خدا ہی کرتا ہے۔ اگر آپ' یورپ کے سارے Scientists (سائنسدانوں) سے یہ بات کریں تو وہ دو اور دو چار کی طرح آپ کو بتا دیں گے کہ واقعی یہ خدا کے قوانین ہیں۔ قُلْ مَنْ ۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (23:88)۔ پوچھو ان سے کہ ذرا علم کی بارگاہ سے پوچھ کے بتاؤ کہ اس پوری کائنات کا اقتدار مرکزی

---

❶ سماء (جمع سموات) لفظی معنی آسمان ہیں کیونکہ وہ زمین پر بلند اور سایہ فگن ہے۔ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سماء کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے ارض۔ قرآن کریم میں ارض و سماء بے شمار مقامات پر آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی جس پر ہم رہتے ہیں ارض کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر بلندی کو (پستی کی نسبت سے) سماء اور پستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) ارض کہتے ہیں' اس لیے ارض و سماء کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہوں گی۔ اور جب ارض کو سماء کے مقابل لایا جائیگا تو سماء سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا نظام بھی ہوگا' اور ارض سے مراد انسان کی معاشرتی' معاشی اور تمدنی زندگی۔ نیز سماء یا سموٰت سے مراد محض اجرام فلکی ہی نہیں ہوں گے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ بھی ہوں گے۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے۔ (پرویز: لغات القرآن' 1960ء ص ص۔ 904-903)۔

❷ سبع سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ لین نے (بیضاوی کے حوالے سے) لکھا ہے کہ عربوں میں سبعہ سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ ان معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں کہ ''کئی ایک'' (Several) یا متعدد۔

کنٹرول، ملکیت، کس کی ہے؟ اس کے اندر کس کا حکم چلتا ہے، وہ کون ہے جو ان تمام چیزوں کی حفاظت کر رہا ہے جبکہ خود اسے کسی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ (23:85)۔ کہیں گے کہ خدا کا ہے۔ کہا کہ جب تم یہ سارا کچھ یہاں مان رہے ہو تو جب میں یہ کہتا ہوں کہ اسی خدا کے قوانین تمہاری اپنی زندگی میں بھی نافذ ہونے چاہئیں۔ آگے کہا کہ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (23:89)۔ اب ان سے پوچھو کہ ان حقائق کے تسلیم کر لینے کے بعد وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ حق نہیں۔ میں اس کے سوا کیا کہتا ہوں کہ سامانِ زیست، جسے خدا نے تمام انسانوں کی پرورش کے لیے عطا کیا ہے، اُسے انسانوں کی پرورش کے لیے کھلا رہنا چاہیے اور کسی انسان کو اس کا حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنا اقتدار قائم کرے اور اُن سے اپنا حکم منوائے۔ اقتدار اور حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو کھل کر کہا کہ یہاں آ کے کیا تمہیں موت پڑ جاتی ہے۔ یہاں کونسی چیز ہے جس سے تمہیں Confusion (الجھن) ہو جاتی ہے، کونسی چیز ہے جو تمہیں جھٹلانے پہ آمادہ کر دیتی ہے۔ یہاں آ کے تمہیں کیا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے تمہیں دھوکا لگتا ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ حق نہیں۔

دوسروں کی طرح ہم نے بھی خدا کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے

عزیزانِ من! یہ کچھ صرف اسی ایک مقام پہ نہیں ہے بلکہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ یہ آیا ہے کہ ان سے پوچھو کہ الہ السماء کون ہے؟ یہ سب اقرار کریں گے کہ خدا ہی الہ السماء ہے، تو پھر ان سے کہو کہ انہیں اسے الہ الارض ماننے میں کونسی چیز مانع آ رہی ہے؟ یہاں لفظ **تسحرون** آیا ہے یعنی کونسی بات تمہیں فریب دے جاتی ہے، تمہیں مغالطے میں رکھتی ہے۔ تمہیں کنفیوژن سے دوچار کرتی ہے؟ یہ بتاؤ کہ تم نے خدا کو حصوں میں کیوں تقسیم کر رکھا ہے۔ اسے ہی تو Dualism (ثنویت) کہتے ہیں۔ ایک حصے کے متعلق تم مانتے ہو کہ وہاں خدا کا قانون چلتا ہے اور اس پر کتابوں پہ کتابیں لکھتے چلے جاتے ہو، ہستیٔ باری تعالیٰ کے ثبوت میں آپ کے ہاں بیشمار دلائل ہیں۔ ان اہلِ مغرب کے ہاں بھی آپ انگریزی کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ ان میں یہ کچھ لکھا ہوتا ہے۔ اب تو انگریزی پڑھے ہوئے، ہمارے ہاں کے یہ ملّا بھی ترجمے کرنے لگ گئے ہیں اور بڑے فخر سے پیش کر رہے ہیں کہ دیکھیے، خدا کا اقرار کس طرح سے ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے یہ ترجمے ہو رہے ہیں؟ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کہیں روس کا نظام نہ آ جائے کیونکہ وہ خدا کو ''نہ ماننے والے ہیں'' اور جو خدا کے ''ماننے والے'' ہیں یہ ان کی طرف سے کتابیں آ رہی ہیں۔ قرآن ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ماننے والا نہیں ہے۔ وہ الہ السماء کو ماننے کی کہتا ہے مگر تم ہو کہ تمہاری اپنی زندگی پہ اس کا کچھ اثر ہی نہیں پڑتا۔ خدا کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہو: ایک الہ السماء اور دوسرا الہ الارض۔ اس کے بعد دعویٰ یہ ہے کہ ہم مومن ہیں۔ We believe in God (ہم خدا کو مانتے ہیں)۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو کہا تھا کہ تمہیں کہاں **تسحرون** ہوتا ہے۔ کتنا صحیح تھا۔ آج ہم خدا کو صرف الہ السماء ہی مانتے ہیں۔ عزیزانِ من!

آج کون ہے جو یہ کہے کہ میں اسے الہ الارض بھی مانتا ہوں ۔ یہ ہے وہ چیز جسے قرآن لے کر آیا۔اس نے کہا کہ خدا کو ماننا ہے تو اسے الہ السما کے ساتھ الہ الارض بھی ماننا پڑے گا۔آج جس کو آپ سیکولر ملک کہتے ہیں اس پر بڑی بحثیں چل رہی ہیں۔لیکن آپ کو یاد ہے کہ میں کہا کرتا ہوں کہ کسی مسئلہ کے حل کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ اس ٹرم یعنی اصطلاح کو Define کرو'اس کی حدود متعین کرو'اس کی تعریف کرو۔ ہمارے ہاں Definition کا ترجمہ کچھ اچھا نہیں ہے۔اس کا ترجمہ ''تعریف'' کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے تو سہی' لیکن یہ Define نہیں ہے۔اصل میں اس کے معنی ''تعارف'' کے ہیں۔اس کے برعکس ہمارے ہاں تعریف کے معنی Praise (ستائش) کے ہیں' اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔اس لیے بس تعریف اس کا صحیح ترجمہ نہیں ہے لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے کوئی دوسری ٹرم بھی نہیں ہے۔بس وہی ہے کہ Define کرو۔پہلی چیز یہ ہے کہ آپ جو ٹرم استعمال کر رہے ہیں' پہلے اسے Define کیجیے۔اب یہ جملہ دیکھیے' آپ کہتے ہیں: I believe in God (میں خدا کو مانتا ہوں) تو پہلے آپ ''مانتا ہوں'' کو Define کیجیے۔ہم سب کہتے ہیں کہ We believe in God (ہم خدا کو مانتے ہیں)۔اب اگر وہ ''مانتا ہوں'' کی اصطلاح Defined ہے تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔اگر ہم نے قرآن کی رو سے اُسے Define کر دیا۔یعنی اُس کے حدود کار کو متعین کر دیا' تو اگر ہم ایماندار ہیں' تو اس تصور کے تحت I believe in God (میں خدا کو مانتا ہوں) میں یہ بات نہیں ہوگی کہ ہم الہ السماء تو مانیں مگر الہ الارض کو رد کر دیں۔ایسا کچھ نہیں ہوگا۔وہاں تو اگر میں' الہ الارض نہیں مانتا تو وہ جو اس طرح خدا کا ''ماننا ہے'' اسے تو قرآن ماننا ہی نہیں۔وہ تو اگر آپ 99% بھی مانیں گے' صرف ایک فیصد بھی خدا کا انکار کر دیں گے' تب بھی وہ اسے کفر کہے گا کیونکہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (2:85)۔تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ضابطۂ خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو(حالانکہ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے اُسی طرح اس ضابطۂ خداوندی کو بھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا۔اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار کیا جائے گا۔جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے یہ چیز کی تو یاد رکھو' اس کا نتیجہ خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (2:85)۔اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت اور رسوائیاں ہیں اور يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2:85)۔قیامت میں اشد العذاب ہے یعنی تمہارے لیے وہ عذاب کافروں اور ملحدوں سے بھی زیادہ شدت والا عذاب ہے' کیونکہ تم یہ کہہ کر دھوکہ دے رہے ہو کہ I believe in God' (میں خدا کو مانتا ہوں)۔سوال یہ ہے کہ تم صرف الہ السماء کو ہی کیوں مانتے ہو' الہ الارض کو کیوں نہیں مان رہے؟

سیکولرازم کی تعریف

عزیزانِ من! سیکولرازم ❶ کے معنی میں ایک چیز قدرے مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اس ارضی زندگی کے اپنے معاملات کے لیے انسان کی اپنی عقل، اپنی فکر، اپنے مشورے کافی ہیں؛ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے، مذہب کو دخیل نہیں ہونا چاہیے؛ خدا کو دخل نہیں دینا چاہیے؛ خدا کی بادشاہت آسمانوں کے اوپر برحق ہے۔ اُس کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں وہ بہت بڑا خدا ہے مگر اپنی عملی زندگی کے معاملات کے حل کے لیے ہم خدا سے عملی طور پر کہتے ہیں کہ اے خدا! تم آسمانوں پر، اپنے گھر رہو، تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ ہے سیکولرازم، یعنی یہ کہ انسانی زندگی کے معاملات انسان خود بغیر کسی قسم کی خارجی راہنمائی کے خود حل کر سکتا ہے اور حل کرے گا۔ اب اس سیکولرازم کے اندر یہ ایک مشترک قدر ہے۔ اس میں وہ بھی آجائیں گے جو اعلانیہ کہتے ہیں کہ ہم سرے سے خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں، جنہیں آپ Non-believers (نہ ماننے والے) کہتے ہیں اور پھر وہ بھی سب آجائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں لیکن وہ صرف الہ السماء کو مانتے ہیں، الہ الارض کو نہیں مانتے۔ یہ سارے Believers in God، (خدا کو ماننے والے) آج کے مسلمانوں سمیت ساری دنیا میں براجمان ہیں۔ یہی تو آج سیکولرازم ہے۔

مسلمانوں سمیت آج ساری دنیا سیکولرازم پر عمل پیرا ہے

عزیزانِ من! آج اس ارضی زندگی میں تو کہیں بھی خدا کی حکومت نہیں ہے۔ الہ الارض کہیں بھی نہیں تسلیم کیا گیا۔ البتہ بعض جگہ وہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے خط کے اوپر 786 لکھ کے نیچے لکھ دیتے ہیں کہ بتایئے آج کل تمہارا شراب کا کاروبار کس قسم کا چل رہا ہے۔ ایسے ہی کچھ یورپ والے ہیں۔ ان کے ہاں بھی گو ایسے الفاظ میں نہ سہی، دوسرے الفاظ میں ہی سہی ہے تو یہی۔ وہ Believers in God (خدا پر ایمان والوں) کے لیے (Defenders of Faith) (محافظ ایمان) لکھ دیتے ہیں۔ وہ Protectors of Faith (محافظ ایمان) بھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ تو انگلستان کے بادشاہ کا لقب ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اتنے بڑے سیکولر Faith (ایمان) کے محافظ ہیں۔ ہمارے ہاں بھی یہی کچھ Constitution (آئین) کے اندر ہے کہ اوپر 786 لکھا ہوا ہوتا ہے اور بزمِ خویش سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ خدا کی حکومت کے تابع ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ پھر اس نے ہم سب کو اختیارات تفویض کر دیئے، اب وہ الہ السما رہا اور اس نے ہمیں الہ الارض بنا دیا۔ صاحب! یہ اپنے آپ نہیں بنے ہوئے، انہیں اس نے بنا دیا ہے، اب تفویضِ اختیارات کی بانٹ ایسی ہوگئی کہ اس کو کہیں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ ہماری حیاتِ ارضی میں آنہیں سکتا۔ یونہی ذرا سی بات آپ نے کہیں کہی تو فوراً یہ چیز آئی کہ

---

❶ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل، ادارہ طلوع اسلام لاہور، اکتوبر 2003ء دوسرا اور تیسرا باب (اور خاص طور پر یہ سیکولرازم کا مفہوم ص۔ 65 تا 66) ص ص۔ 26 تا 70

یہ تو رجعت پسند ہے' ترقی پسند نہیں ہے کیونکہ یہ خدا کا نام لیتا ہے۔ یہ دراصل سیکولرازم ہی کی ایک فارم تھی جس نے آپ کے ہاں یہ ملاازّم ایجاد کیا کہ دنیاوی معاملات جتنے تھے وہ تو حکومت کے سپرد ہوئے اور یہ جو خدا کے سامنے سجدہ کرنا' وضو کرنا' نیت باندھنا' نمازیں پڑھنا' نکاح پڑھنا' طلاق دینا' جنازہ پڑھنا تھا' یہ سب خدا کے سپرد ہوا اور اس کا نام ہوا خدا کا ماننا۔ اس میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اعتقادات و عبادات ہیں' ان کو بھی ارض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور وہ چیزیں جن کا آپ تحفظ چاہتے ہیں' وہ تو ارض کی زندگی ہے۔ وہ آپ کی سیاسی' معاشرتی' معاشی' تمدنی' تہذیبی زندگی ہے' یہ زندگی تو حکومت کے سپرد کر دیجیے۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی انسانوں کے سپرد۔ الہ الارض تو پھر وہی انسان ہی رہا۔ اسی کو آپ نے بنیاد بنایا۔ اصل میں یہ الہ السماء نہیں ہے' یہ الہ الارض ہے۔ مگر اسے پتہ ہی نہیں کہ یہ ہے کیا۔ یہ نماز روزہ حج زکوٰۃ' یہ عبادات' اور یہ اعتقادات' یہ رسوم اور یہ ساری چیزیں' وہ ہیں جن کا آپ کی ارضی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سب سے زیادہ نمازیں پڑھنے والا اور ایک بے نمازی دونوں پارلیمنٹ میں جا کے بیٹھ جاتے ہیں' تو وہاں قانون سازی خود الہ بن کے ہی ہو رہی ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں بڑے سے بڑے جو بھی عبادت گزار ہیں' جو خدا کے ماننے والے ہیں' وہ بھی دراصل عملاً دکھانے والے ہیں کہ ''دیکھیے ہم اس کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں'' عملاً ساری دنیا میں یہ سجدہ کرنے والے بھی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ الہ الارض تو یہ اسے پھر بھی نہیں مانتے۔ پہلی قسم یہ تھی کہ وہ اعلانیہ انکار کرنے والے تھے' ہم نے اپنے آپ کو ان سے الگ کیا اور اس طرح کہہ دیا کہ We believe and he does not believe in God (1)' یہ اس لیے کیا کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ اس طرح ہم نے اپنے آپ میں پہلے تو یہ ایک فخر کی بات پیدا کی۔ اور پھر یہ فرق پیدا کیا کہ یہ نمازی پرہیزگار ہے' یہ خدا کو ماننے والا ہے اور یہ بے نمازی ہے۔ ان میں آپس میں دیکھیے کہ نماز پڑھنے والے کے چہرے پہ اس وقت کتنے نقشے بنا کرتے ہیں جب وہ کہتا ہے کہ صاحب! یہ بے نمازی ہے جب کہ ان سب کا ایمان وہی ہے کہ الہ السماء تو ہے اور جو یہاں الہ الارض ہے' اس کا انسانی تمدن' معاشرت' معاش اور سیاست پر کوئی دخل نہیں ہے۔

نظامِ کائنات میں تفریق روا رکھنے کی ایک محسوس مثال

عزیزانِ من! نظامِ کائنات میں تفریق روا رکھنے کی ایک محسوس مثال ان دو بھائیوں کا قصہ ہے جنہیں آپس میں جائیداد کا حصہ بانٹنا تھا۔ ان کا ایک ہی مکان تھا' اُس میں دو بھائی شریک تھے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی! سر پھٹول اچھا نہیں ہے' بیٹھ کے طے کر لیتے ہیں' تصفیہ کر لو۔ بہت اچھا جی! بڑے بھائی نے کہا کہ بات سیدھی سی ہے کہ...... از صحنِ خانہ تا بہ لب بام یعنی مکان کے فرش سے چھت تک یہ میرا حصہ ہے اور از بامِ خانہ تا بہ ثریا یعنی چھت سے لے کے آسمان تک تجھے دیا۔ وہ اس لیے کہ تو چھوٹا ہے' تیرا بہتا حصہ ہونا چھیدا۔ میرے

---

(1) ہم تو خدا کو مانتے ہیں مگر وہ نہیں مانتا۔

لیے تے پتر برابر ہیگا ایں باپ دے مرن دے بعد۔ تے آ گل جیہڑی ہیگی اے، ہن دس پئی ہے قابل اعتراض گل کوئی ❶۔عزیزانِ من! ہم نے خدا کی بھی یہی تقسیم کی ہوئی ہے کہ وہ بہت بڑا ہے اس لیے اس کا حصہ بھی بہت بڑا ہے۔اُس کے مقابلے میں ہم تو عاجز کمزور سے ہیں۔اس لیے یہ جو ہماری زمین کی یہاں رہنے سہنے کی طبعی زندگی ہے۔ یہ ہمارے حصے میں ہے۔اس میں تو ہمارا قانون چلے گا' آپ دخل نہیں دے سکتے۔ہم نے یہ کیا ہے۔بس اتنی سی زمین' اتنا سا حصہ' بقیہ لامتناہی کائنات''بامِ خانہ تابہ ثریا'❷ بلکہ اس سے بھی کہیں آگے' The Expanding Universe' ❸ یہ ساری ہم آپ کو دے رہے ہیں۔تو اتنا سا ٹکڑا ہم لے رہے ہیں۔لو جی! یہ تقسیم ہے' عزیزانِ من!

میرے عزیزو! سوچیے تو سہی۔یہ بات چھوڑ دیجیے کہ آج میں یہ بات کہہ رہا ہوں اور آج کی Terms (اصطلاحات) میں یہ بات کتنی آسانی سے سمجھ میں آ رہی ہے مگر چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہی کہ اے خدا کے ماننے والو! خدا کی تقسیم نہیں کی جا سکتی۔قرآن کریم نے کس قدر آسانی سے یہ بات سمجھا دی۔قرآن نے کہا تھا کہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ (3:163) یہ خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ یہ رسول تمہی میں سے تمہاری طرف آیا اور اس نے یہ باتیں تمہیں بتائیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں' یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے قرآن جیسی چیز' عزیزانِ من! ہمارے حوالے کی:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تری مہربانی

یہ ہے قَدْ مَنَّ اللّٰهُ (3:163)۔خدا کا بہت بڑا احسان۔تیری مہربانی اے ذاتِ رسالت مآب! یہ تیری نوازش کا صدقہ ہے۔ کہاں ہم' اور کہاں یہ نکہت! گل اے نسیمِ صبح تیری مہربانی! عزیزانِ من! نہ اہلِ مذاہب کے ہاں یہ بات آج تک کبھی کسی نے کہی' نہ فکر کی دنیا کے اندر آج تک کسی نے یہ بات کہی۔کتنی عظیم بات ہے۔یہ اُسے ❹ تو قرآن کریم کی صورت میں یہ وحی خدا نے دی تھی۔یہ ہم تک جو پہنچی ہے تو یہ اسی ذاتِ عالی مرتبت کے توسط سے پہنچی ہے۔خدا نے تو یہ کہا تھا کہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے یہ رسول دیا۔رسول کا احسان یہ ہے کہ اس نے یہ قرآن کریم ہمیں دے دیا' ورنہ اگر وہ بھی آپ کے ہاں کا کوئی بہت بڑا صوفی ہوتا تو وہ ''یہ چیز کہہ دیتا کہ یہ وہ

---

❶ تمہارا حصہ زیادہ ہونا چاہیے۔باپ کے مرنے کے بعد میرے لیے تو تو ایسا ہی ہے جیسے میرا اپنا بیٹا۔اب یہ معاملہ یوں آیا ہے۔اب بتاؤ کہ اس بات میں کوئی قابل اعتراض شے ہے۔

❷ چھت سے آسمان تک

❸ یہ مارک اے گارلک (Mark A Garlick) کی کتاب کا نام ہے۔

❹ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

چیزیں ہیں جو ہمارے سینے میں مستور رہتی ہیں؛ یہ بات باہر سے کرنے کی نہیں ہے‘‘۔ اگر وہ بھی یہ کہہ کے چلا جاتا تو ہم کیا کر لیتے اور وحی وہ شے ہے جو کسی کو بھی کسب و ہنر سے نہیں مل سکتی۔

اصل سوال خدا کی ذات پر ایمان کا نہیں بلکہ اس وحی کا ہے جو اس کی طرف سے ملتی ہے

عزیزانِ من! چودہ سو سال کے بعد آج دنیا کے عظیم مفکر اور Scientists (سائنسدان) یہ کہنے پہ مجبور ہوگئے ہیں کہ اصل سوال خدا کی ذات پر ایمان کا نہیں ہے بلکہ اس وحی کا ہے جو انسانوں کی رہنمائی کے لیے خدا دیتا ہے۔ فزکس (علم طبیعات) میں اس دَور میں شاید ہی اس ❶ کے مقام کا کوئی اور سائنسدان ہو۔ اُس کی کتاب ہے: The Nature of Physical World ❷۔ میرا خیال ہے کہ سائنس کی دنیا میں بھی اس کتاب کا مقابلہ نہیں۔ اسے تمام سائنسدان مانتے ہیں۔ اس نے ایک دوسری کتاب لکھی تھی۔ اس کا نام ہے: Science and the Unseen World

اس کتاب میں وہ جو چیز کہتا ہے، اُسے سنیے اور پھر سوچیے کہ چودہ سو سال کے بعد اب اعتراف کہاں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے؛ جو یہ مانتا ہے ’’وہ خدا کو مانتا ہے‘‘ جو یہ نہیں مانتا وہ خدا کو نہیں مانتا❸۔ چودہ سو سال پہلے ایک امی ❹ یہ چیز کہتا ہے۔ ایڈنگٹن کہتا یہ ہے کہ صرف سماء کی دنیا میں الہ السماء کا ماننا خدا کا

---

❶ Eddington, Sir Arthur Stanley (1882-1944)

❷ اس کتاب میں ایڈنگٹن مادی دنیا کے ڈانڈے کسی ماوراء المادہ (Immaterial) دنیا سے جا کر ملا دیتا ہے۔ وہ اسی کتاب میں کہتا ہے کہ ’’خود طبعی سائنسدان اب اپنی خارجی دنیا کا تصور کچھ اس قسم کا پیش کرتا ہے جسے ہم ’باطنی دنیا‘ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ تصور اُس تصور سے یکسر خلاف ہے جو سائنسدانوں کی طرف سے کچھ عرصہ پہلے پیش کیا جایا کرتا تھا اور جس کی رو سے کہا یہ جاتا تھا کہ وہی چیز مبنی پر حقیقت ہو سکتی ہے جس کا ماڈل ایک انجینئر بنا دے‘‘۔ ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتا ہے کہ ’’اب طبعی سائنس نے اپنے دائرے کو اس حد تک محدود کر لیا ہے کہ اس کے پس منظر کو روحانی تصور کے ساتھ ہی پُر کیا جا سکتا ہے‘‘۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ جدید تحقیقات کی رو سے زندگی مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ زندگی مادہ سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ 1955، ص ص۔ 62-61)۔

❸ اسے ذہن میں رکھیے کہ شعور انسانی کے مرکز کو نفس (Mind) یا انا (Self) یا ایغو (Ego) کہتے ہیں۔ اب تحقیقات جدیدہ کی رو سے نفس انسانی (Mind) مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ یہ اس سے کچھ الگ سے اور چونکہ مادہ کی دنیا کو دنیائے محسوسات (World of Concrete) کہتے ہیں، اس لیے جب نفس انسانی مادی دنیا کی پیداوار نہیں تو اس کے لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا تعلق کسی ایسی دنیا سے ہے جو مادی دنیا سے ماوراء ہے۔ چنانچہ جس طرح مادی اشیاء کے متعلق تحقیق جدید یہ ہے کہ ان کا Basis (بنیاد) مادی نہیں، ماورائے مادیت ہے، اسی طرح شعور کی بنیاد بھی کسی اور دنیا سے متعلق ہے۔ یہ دنیا کس قسم کی ہے؟ اس کے متعلق ہمارے سائنسدان کچھ نہیں کہہ سکتے حتیٰ کہ اس کا کوئی متعین نام بھی نہیں رکھ سکتے۔ ایڈنگٹن اسے ’’غیب کی دنیا‘‘ (Un-seen World) کہہ کر پکارتا ہے۔ اس موضوع پر اس کی کتاب کا نام ہی Science and Un-seen World ہے۔

❹ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

ماننا نہیں ہے۔اس شخص کی (Researches) تحقیقات تو پوچھو نہیں کہ کہاں پہنچی ہوئی ہیں۔وہ یہ کہتا ہے کہ الہ السماء مان لینا ہی خدا کا ماننا نہیں ہے' الہ الارض ماننا ہی خدا کا ماننا ہے۔اگر وہ یہاں تک آ جائیں تو پھر ہم کہیں گے کہ جسے تم خود کہتے ہو کہ وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہے تو خدا کا ماننا یہ ہے۔آؤ اب دیکھیں کہ وہ وحی کی راہنمائی کہاں ہے؟ یہ جو چیزیں میں نے ابھی عرض کی ہیں' عزیزانِ من! صرف آپ احباب کی معلومات کیلئے میں یہ کہہ دیا کرتا ہوں۔''میں'' درمیان میں آتی ہے ورنہ جو میری کتاب ہے ''انسان نے کیا سوچا ہے؟'' وہ اس اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے۔اس میں گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں سقراط (Socrates C. 469-399 B.C.) سے لے کر اقبالؒ (1877-1938) تک دنیا بھر کے جتنے بڑے بڑے مفکرین' Scientists (سائنسدان) اور مورخین ہیں' ان کی تمام اوریجنل کتابوں کے حوالوں سے' بغیر کچھ کہے ہوئے' نہایت دلنشین پیرایہ میں' اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر قاری (Reader) اسے غیر محسوس طور پر پڑھتا چلا جائے تو آخر میں اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے کہ صرف الہ السماء ماننا خدا کا ماننا نہیں ہے' اس کا الہ الارض ماننا بھی ضروری ہے ❶۔

آج مذاہبِ عالم میں قرآنِ کریم ہی واحد سچی کتاب ہے: تاریخ کی ایک شہادت

عزیزانِ من! اب آپ مذہب کی دنیا میں آ جایئے۔خود اہلِ مذاہب کی کتابوں اور ان مذاہب کے ماننے والے مستند علمبرداروں کی کتابوں کے حوالوں سے میں نے اپنی ایک کتاب مرتب کی ہے۔یہ کتاب مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی یا تاریخ ہے۔اس میں مستند تاریخی شواہد اور ان مبینہ آسمانی کتابوں کے شواہد کی رو سے بتایا گیا ہے کہ آج قرآن کریم کے سوا کسی مذہب کی آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں ہے۔اس کتاب کا نام ہے: ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں۔'' اس کتاب میں' اپنی طرف سے' میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ان سب کی شہادات ہیں' اعترافات ہیں کہ ہمارے پاس وہ وحی' وہ کتاب' اپنی اس اصلی شکل میں نہیں ہے جو ہمارے بانی مذہب کو ملی تھی۔ اب ان سے اگلی بات یہ کرنے کی ہوگی کہ آپ نے یہ مان لیا کہ وحی کی ضرورت ہے۔یہ بھی آپ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اصلی آسمانی کتاب نہیں ہے۔آؤ پھر اس کے متعلق ایک بات Define (متعین) کرلیں کہ وہ راہنمائی کیا ہوگی؟ کس قسم کی ہوگی؟ پھر تلاش کرتے ہیں۔عزیزانِ من! اب آپ انہیں اس انداز اور اس طریق سے لے آئیں تو زندگی کی تا حال کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔بجز اس کے کہ اس اعتراف پہ سوچنے والا مجبور ہو جائے کہ اس کائنات میں' اس آسمان کے نیچے' اب صرف قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جو اس شرط پہ پورا اترتی ہے۔اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔الہ السماء کو مان کر فکر کی دنیا تو یوں کٹ گئی۔صرف الہ السماء مان رہا تھا اور ارض کی دنیا یوں کٹ گئی کہ ان کے ہاں وحی کی راہنمائی کہیں اور ہے ہی نہیں۔یہ مقام بڑا ہی غور طلب ہے۔

---

❶ اور دوسرا یہ کہ اس کتاب کی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے متعلق ہمارے ہاں کی ایک گہری سازش

عزیزانِ من! آپ ان اہل مغرب کو کیونکر منوائیں گے کہ آج مذاہب عالم میں قرآن کریم ہی واحد سچی کتاب ہے۔ آپ کے اپنے ہاں یہ چیزیں موجود ہیں جو آپ کے دشمن نے پہچائی ہیں۔ ان کا تو پوچھو نہیں کہ یہ کہاں تک پہنچ چکے ہوئے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جب بھی دنیا سمٹ کے یہاں آئی تو باقی صرف ایک قرآن رہ جائے گا۔ یہاں انسان قرآن کی طرف آئے گا۔ اس لیے اسے روکنے کے لیے قرآن کے متعلق شروع سے یہ چیزیں آنی شروع ہوگئیں کہ یہ تو محفوظ تھا ہی نہیں' انہوں نے پہلے خلیفہ ❶ کے زمانے میں ٹھیکریوں سے' پتوں سے' کھجوروں سے' ہڈیوں سے' یادداشتوں سے' قرآن جمع کیا۔ اس کام کے لیے اکٹھے ہو کے میٹنگ بلائی اور اس میٹنگ میں بیٹھ کے' کسی نہ کسی طرح سے' یہ ہر ٹکڑا صبح صبح اٹھ کے' گلی گلی' کوچے کوچے' مانگتے پھرے' کسی کو قرآن یاد ہو تو بتا دو (معاذ اللہ معاذ اللہ) کہ جی! یہ قرآن اس طرح سے نازل ہوا تھا' پھر اس قرآن کے اندر پانچ سو آیتیں ہیں' جو منسوخ ہوگئی ہیں اور خدا نے کہیں نہیں لکھا کہ یہ آیتیں منسوخ ہیں' صاحب! پانچ سو تو یوں چلی گئیں۔ اس کے بعد' آگے چلئے' ایک سازش اور آگئی جو اس سے بھی کہیں زیادہ گھناؤنی ہے۔

مودودیؒ کا بیان کہ قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا: ایک اور سازش

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے اب دورِ جدید کے مفسر مودودی صاحب (1903-1978) نے اگلے دنوں لکھا ہے کہ خدا کی طرف سے قرآن شریف سات (سبع) زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ سوچیے کہ قرآن شریف خدا کی طرف سے ہے۔ یہ قرآن کریم رسول اللہ نے دیا تھا۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے باقی چھ زبانوں کے قرآن تلف کر دیئے اور اپنی صوابدید سے ایک زبان والا قرآن رہنے دیا (یا اللہ! یہ کہاں تک پہنچے!) جی' کرو چیلنج تم ان کو کہ تمہارے ہاں وحی نہیں ہے' اور دنیا بھر میں انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس تفسیر کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ آپ سوچتے ہیں یہ سازش ملحدین ہی آپ کے خلاف نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے فریب میں تو آدمی بہت کم آ سکتا ہے۔ فریب میں تو اُن کے ہی آ سکتا ہے جو تفسیروں کے انبار اٹھائے چلے آ رہے ہوں اور پھر یہ چیزیں درمیان میں رکھے ہوئے ہوں کہ قرآن کریم تو دین کا 1/10 حصہ ہے۔

قرآن حکیم تو دین کا 1/10 حصہ ہے: مودودیؒ کا فرمان

عزیزانِ من! یہیں تک ہی نہ رکیے اور آگے بڑھیے۔ مودودیؒ کہتے ہیں قرآن میں تو دین کا 1/10 حصہ ہے۔ (یا اللہ! اس نشتر کی زد کہاں تک پہنچی!) مودودیؒ صاحب کا ارشاد ہے کہ دین کا 9/10 حصہ تو قرآن کے باہر ہے جب کہ قرآن بتاتا ہے کہ تَمَّتْ كَلِمَتُ

---

❶ حضرت ابوبکرؓ کا دورِ خلافت

رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:116)۔اس قرآن میں خدا کا ضابطۂ قوانین تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، مکمل ہو چکا ہے۔اس طرح واضح طور پر بتا دیا کہ جو کچھ بھی دین میں دینا مقصود تھا وہ ہم نے اس میں مکمل کر دیا۔مگر مودودیؒ کہنے لگے کہ اس قرآن میں دین کا تو صرف 1/10 ہے' دسواں حصہ ہے بقیہ 9/10 حصہ تو باہر ہے۔پوچھا کہ وہ 9/10 حصہ کہاں ہے؟ کہنے لگے کہ یہ حدیث کی کتابیں' روایات کی ساری کتابیں ہیں' ان میں موجود ہے۔انہیں کہا کہ' بھئی یہ تو کچھ انسانوں کی مرتب کردہ ہیں۔اس پر کہا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں ایک تو قرآن کے اندر آ گئی یہ کل دین کا 1/10 حصہ ہے باقی کی 9/10 وحی جو تھی' وہ باہر رہی۔ بہت اچھا جی۔آپ یہی تو مان رہے ہیں کہ یہ جنہیں آپ صحاح ستہ ❶ کہتے ہیں یا اہل حدیث کے نزدیک یہ صحیح بخاری اور مسلم ہیں' اس طرح وہ 9/10 حصہ انہی میں تو ہے۔انہوں نے کہا کہ یہ جتنا انبار ہے یہ دوسری وحی کا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس سارے انبار کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟

دین کے 9/10 حصے کے پرکھنے کا معیار مزاج شناس رسول ہونا ہے: مودودیؒ کا ایک اور فرمان

عزیزانِ من! سوچیے کہ یہ آپ کو کہاں لے جا رہے ہیں۔ان کے قول کے مطابق یہ وحی ہے' اور دین کا 9/10 حصہ ان میں

---

❶ فرقہ اہل سنت کے پاس ''صحاح ستہ'' ہیں اور فرقہ جعفریہ کے پاس ''صحاح اربعہ'' ہیں۔دونوں کی کتابوں میں موجود روایتیں صحابہ کرامؓ اور رسولؐ تک پہنچتی ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے کی کتابوں کو تسلیم نہیں کرتے۔(از ہراز ہری: قرآن اور حدیث' 2004' ص۔19)۔سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ یعنی صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔اسی طرح شیعہ حضرات کی احادیث کی چار کتابیں ہیں جنہیں ''صحاح اربعہ'' کہا جاتا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کے لیے اجتماعی طور پر ''صحیحین'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔جامعین حدیث سب ایرانی تھے۔درج ذیل جدول میں یہ تفصیل دی گئی ہے:

نام جامع حدیث	نام مجموعہ	عرصہ حیات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	ان میں کتنی اپنے مجموعہ میں درج کیں۔
امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ	صحیح بخاری	260یا256-194ھ	بخارا	چھ لاکھ	2762 (مکررات حذف کرنے کے بعد)
امام مسلم بن حجاجؒ	صحیح مسلم	261-204ھ	نیشا پور	تین لاکھ	4348
امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ	جامع ترمذی	279-209ھ	ترمذ	تین لاکھ	3115
امام ابوداؤدؒ	سنن ابی داؤد	279-203ھ	سیستان	پانچ لاکھ	4800
ابوعبداللہ ابن ماجہؒ	سنن ابن ماجہ	273......ھ	قزوین	چار لاکھ	4000
امام عبداللہ نسائیؒ	سنن نسائی	303......ھ	صوبہ خراسان کا گاؤں نسا	دو لاکھ	4321

(پرویزؒ: شاہکار رسالت' 1987' ص 502 اور از ہراز ہری: قرآن اور حدیث 2004' ص ص 70-67)

ہے نیز یہ وحی مثلہ معہ ہے یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے۔ پوچھا کہ کیا یہ ساری دین کا حصہ ہے؟ کہنے لگے: نہیں' ساری کی ساری نہیں۔ پوچھا کہ جی! اس میں وہ وحی کونسی ہے جو یہ مان رہے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں' یہ بھی غلط ہے۔ ان کے ماننے کا معیار ہی غلط ہے۔ پوچھا کہ وہ معیار کیا ہے؟ کہنے لگے: مزاج شناس رسول کی نگہ بصیرت بتا سکتی ہے کہ اسمیں سے کونسی چیز وحی ہے اور کونسی غیر وحی ہے۔ لو جی! 9/10 حصہ دین کا مزاج شناس رسول کی نگہ کے اوپر آ کر رہ گیا! بس اس نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا۔ جی' مزاج شناس رسول بننا ضروری ہے۔ منیر کمیٹی ❶ میں شہادت امین احسن اصلاحی نے دی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو مودودی صاحب کو مزاج شناس رسول ہی نہیں مانتے اور دو ہی سال پہلے تو انہوں نے انہیں اللہ کا شاہکار قرار دیا تھا۔ تو عزیزانِ من! آپ کے ہاں کا یہ وحی کا 1/10 حصہ قرآن میں ہے' اس کی پانچ سو آیتیں منسوخ ہیں' یہ سات زبانوں میں ملا تھا جس میں سے چھ جلا دی گئیں' تلف کر دی گئیں' صرف ایک باقی رہی' اس ایک میں پانچ سو آیات منسوخ ہو گئیں' جو باقی رہ گئی' یہ دین کا 1/10 حصہ ہے' 9/10 اس سے باہر ہے' جو باہر ہے اس میں سے کسے دین کہیں' کسے دین نہ کہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہم آپ کو بتائیں گے۔ کر لیجیے چیلنج آپ دنیا کو!

قوم کو کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا

عزیزانِ من! قوم تو جذباتی ہو گئی۔ اس نے کبھی کھڑے ہو کر سوچا نہیں کہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ صرف ایک آواز ایسی ہے' جو قرآنِ خالص کو' دینِ خالص کو' پیش کرے گی۔ انہوں نے کہا کہ اسے ایسا بنا دیا جائے کہ کوئی شخص اس کی آواز سننے نہ پائے۔ تو انہوں نے میرے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ شخص دین کے خلاف سازش ہے۔ راز یہ تھا کہ کہیں میں ان کے فریب کو بے نقاب نہ کر دوں۔ آج قوم کو کھڑے ہو کر سوچنا ہوگا۔

آج کرّہ ارض پر مختلف خداؤں کی حاکمیت تسلیم کرنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! ہمارے ہاں الہ السماء اور الہ الارض کا مسئلہ یہ ہے۔ یہ جو میں نے الہ الارض کے ماننے والے کہا ہے' ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ پہلے تو صرف اعتقادات' عبادات اور رسوم و مناسک تک ہی الہ الارض کو مانتے ہیں' باقی معاملات میں ان کا بھی جو' الہ الارض ہے' وہ دنیاوی الہ ہے۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم کلی اقامتِ دین کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں' ان کے نزدیک قرآن کی یہ حیثیت ہے کہ وہ اسے رسوم و مناسک اور اعتقادات و عبادات تک محدود رکھتے ہیں۔ باقی قوانین خواہ وہ جمہوریت کے ہوں' ملوکیت کے ہوں' ڈکٹیٹر

---

❷ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس سورۃ الفرقان' طٰ' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 2005۔

شپ کے ہوں، وہ تو انسانوں ہی کے ہونگے۔عزیزانِ من! ایک انسان ہو یا انسانوں کا ایک گروہ ہو، وہ الہ الارض تو نہیں رہتا۔قرآن نے اٰلھۃً کہا کہ تم ارض میں ایک الہ نہیں مانتے؟ بہت سے الہ مانتے ہو، تمہارے بہت سے الہ ہیں: معیشت کا الہ الگ، سیاست کا الگ، معاشرت کا الگ، تمدن کا الگ۔ یہ بہت الہ ہیں جنہیں تم مانتے ہو۔ **اَمِ اتَّخَذُوۡۤا اٰلِهَةً مِّنَ الۡاَرۡضِ هُمۡ يُنۡشِرُوۡنَ** (21:21) انہوں نے اپنی ارضی زندگی کے اندر ایسے ایسے الہ تراش رکھے ہیں جن کے متعلق انہیں یہ یقین ہے کہ ان کے سہارے زندگی آگے چلتی ہے، انہی کے مطابق اس زندگی کو پھیلنا اور آگے بڑھنا ہے۔زندگی کی ہر ضرورت کے لیے یہ الہ ضروری ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ **لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا** (21:22)۔اگر کائنات میں خدا کے علاوہ اور الہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھو کہ کہا کہ تم صرف الہ السماء ماننے والوں سے پوچھو کہ اگر وہاں ایک خدا کے قوانین نہ چلیں، مختلف خداؤں کے قوانین چلیں، تو اس خارجی کائنات کا کیا حشر ہوگا۔تم خود بتاؤ کہ اگر یہ آپس میں ہی ٹکرا ٹکرا کر یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور پھر ذرا اسی کے اندر ارض کی انسانی زندگی کو بھی شامل کرلو، پھر مختلف الہ تجویز کرلو، تو پھر دیکھو کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ کہا کہ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **لَفَسَدَتَا** (21:22) یہ آپس میں ٹکرا کے مر جائیں گے۔عزیزانِ من! اس فساد کا یہ محسوس منظر تو آج کی دنیا میں ہمارے سامنے آیا ہے جب ساری دنیا سمٹ کے ایک گھرانہ سا بن گئی ہے، کرہ ارض کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، ارض تو اتنا سا سمٹ کے رہ گیا ہے۔آج دیکھیے، ہر سو فساد رونما ہے۔دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے، عزیزانِ من! جہاں اس وقت اصلاح ہو، کوئی خطہ، کوئی ٹکڑا، اتنا سا نہیں جہاں فساد نہ رونما ہو گیا ہو۔یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ اس کا کہ ہم نے ارض میں اٰلھۃً تجویز کر رکھے ہیں، ماننے والوں نے تو اسے الہ السماء ہی رکھا ہے، مگر ہم نے بہت سے بڑے بڑے الہ بنا لیے، مثلاً معیشت کا الہ الگ، سیاست کا الگ، تمدن کا الگ، معاشرت کا الگ، کہا کہ یہ اس قسم کی ثنویت کا نتیجہ ہے۔پھر اُس آیت پر آ جاتا ہوں جس پہ ہم نے شاید دو تین درس صرف کیے تھے۔یہ وہی سورۃ النحل کی 53-16:51 ہے۔اس میں کہا تھا کہ **وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ** (16:51) الہ کا فیصلہ، الہ کا فرمان یہ ہے کہ یاد رکھو! دو خدا نہ بنا لینا۔ہم نے قرآن سے پوچھا نہیں کہ یہ جو دو خدا کہہ رہا ہے اس نے خود بتایا ہے کہ وہ دو کونسے خدا ہیں۔اس سے پوچھتے تو اس نے تو بار بار یہ کہا ہے کہ **هُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰـهٌ وَّفِى الۡاَرۡضِ اِلٰـهٌ** (43:84) سماء میں بھی وہی الہ ہے، ارض میں بھی وہی الہ ہے، ساری کائنات کی زمام اقتدار اُس کے ہاتھ میں ہے۔اگر تم نے سماء کا اور الہ بنا لیا اور ارض کا اور بنا لیا، تو یہی تو ہے جسے **اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ** (16:51) کہا یعنی دو خدا اسی لیے کہا کہ **اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ** (16:51) اِس حقیقت کا پورا پورا یقین رکھو کہ خارجی کائنات ہو یا انسانوں کی دنیا، سب میں اقتدار و اختیار صرف ایک خدا کا ہے۔کسی اور کا نہیں۔سوا اُسی کے قوانین کا اتباع کرو، ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب سے ڈرو۔پھر زور دے کر کہا کہ تمہیں احتیاط برتنی ہے۔اگر خطرات سے احتیاط چاہتے ہو، حفاظت کی ضمانت چاہتے ہو تو پھر صرف اس ایک خدا کے قانون کی

خلاف ورزی سے ڈرو۔ دو خدا ماننے والو! سماء اور ارض کے الٰہ کو الگ کرنے والو! یاد رکھو کہ وَلَـهٗ مَـا فِـى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (16:52) سماوات بھی اس کے حیطۂ اقتدار میں ہے اور ارض بھی اس کے حیطۂ اقتدار کے اندر ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (16:52) یہ ہے اصلی سچا دین۔ تمہیں اسی کی اطاعت لازم ہے۔ دین واصب یہ ہے کہ سماء میں بھی وہی الٰہ ہو تمہاری ارضی زندگی کے اندر بھی وہی الٰہ ہو اور یہ ہے دین واصب۔ پھر پوچھا کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (16:52)۔ ایسے واضح حقائق کے بعد بھی تم خدا کے علاوہ اور وں کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو گے؟ تو کیا تم خود ہی کچھ بناتے ہو اور خود ہی ان سے ڈرتے رہتے ہو' کانپتے رہتے ہو؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے' تو جاؤ مرو بزدلو! اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے سامنے!

الٰہ الارض کے ماننے کا مقصد اور اطاعت خدا کا مفہوم

عزیزانِ من! اب آگے سنیئے قرآن میں الٰہ الارض ماننے کے کیا معنی ہوئے۔ کہا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وَمَا بِـكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَـمِنَ اللّٰهِ (16:53)۔ (خارجی کائنات میں) تمہارے لیے جس قدر زندگی کی سہولتیں موجود ہیں اور کسب وہنر کی جس قدر صلاحیتیں تمہیں نصیب ہیں' یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں – نہ بنیادی طور پر یہ تمہاری پیدا کردہ ہیں' نہ ہی تم انہیں کہیں سے خرید سکتے ہو۔ اس لیے اس بات پہ ایمان کہ جو کچھ مجھے یہاں حاصل ہوتا ہے' میرا نہیں ہے' بلکہ یہ سب خدا کا ہے۔ یہ ہے ''اسے الٰہ الارض ماننا۔'' اس نے قرآن میں خدا کا ماننے والا ہونے کے باوجود یہ بات کیوں کہی کہ وہ خدا کا ماننے والا نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے کہا یہ تھا کہ ''جو کچھ مجھے ملتا ہے' یہ سارا میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔'' کہا کہ یہ اپنے آپ کو الٰہ بنا لینے والی بات ہے۔ یہ سب اس کا دیا ہوا ہے۔ اُس نے کہا کہ نہیں میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے' اس نے اپنے آپ کو الٰہ کہا۔ جب اس سے کہا کہ میری جو بھی صلاحیتیں ہیں' اور یہ جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے' جو کچھ اس ارض کے' اس کائنات کے اندر سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے' یہ تو سارے کا سارا اس کا دیا ہوا ہے تمہارا تو کچھ بھی نہیں' صرف محنت ہے جو تم کرتے ہو۔ تو اگلی بات یہ ہے کہ پھر اس کے دیئے ہوئے کو اس کے قوانین کے تابع استعمال کرو۔ یہ ہے اطاعتِ خدا۔ کہا کہ پھر اس کے بعد کفر کیا ہے؟ جواب دیا کہ لِيَكْـفُرُوْا بِمَا اٰتَيْنٰـهُمْ (16:55)۔ ''جو کچھ حاصل ہے' اسے کہنا کہ یہ میرا حاصل کردہ ہے''۔ یہ ہے کفر کیونکہ یہ بِـمَـا اٰتَيْـنٰـهُمْ (16:55) ہے یعنی ہم نے دیا ہوا ہے۔ اسے تسلیم کرنا' یہ ہے ایمان۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! یہ ہماری ہنرمندی یا فلاں کا دیا ہوا ہے تو کہا کہ یہ خدا سے کفر ہے۔ آؤ! کوئی میرے سمیت ہے مائی کا لال جو سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہے کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں' یعنی I believe in God عزیزانِ من! کسی جمگھٹے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے والا کوئی ایک بھی اٹھ کھڑا ہوا تو اس کائنات کے اندر' اس زمین کے اندر' پوچھو نہیں کیا کچھ کر کے دکھا دے گا۔ کہا کہ لَوْ كَـانَ فِيْهِـمَـآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰـهُ لَـفَسَـدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ (21:22)۔ اگر کائنات میں خدا کے علاوہ اور الٰہ بھی ہوں یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا

کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے' تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔ لہٰذا وہ ذاتِ خداوندی' کائنات کے نظامِ ربوبیت کا مرکزی کنٹرول اپنے اور صرف اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہے۔

عزیزانِ من! سنیئے' قرآن کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ ذات اس سے بہت دور اور بہت الگ ہے جو تم کہتے ہو۔ وہ پوری کائنات کے کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھنے والا تمہاری کہی ہوئی باتوں سے بہت دُور اور بہت الگ ہے۔ کس چیز سے الگ ہے؟ اس چیز سے الگ ہے جو عَمَّا يَصِفُونَ (21:22)۔ تم انسانوں نے' اپنے ذہن میں اس کے متعلق قائم کر رکھے ہیں۔ جو خدا کا تصور تم لیے بیٹھے ہوئے وہ اس سے بہت دور ہے۔ یہ عَمَّا يَصِفُونَ (21:22) والی بات اس نے انکار کرنے والوں سے نہیں کہی۔ یہ بات مانو اقرار کرنے والے کہیں گے۔ جو خدا کو مانتا ہی نہیں کیا وہ اس کے متعلق کہے گا کہ یہ میرے ذہن میں خدا کا' کیسا تصور ہے؟ نہیں' یہ اس کی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو خدا کا اقرار کرنے والوں کی بات ہے جنہیں کیا گیا ہے کہ عَمَّا يَصِفُونَ (21:22)۔ خدا کی ذات ان تصورات سے بہت بلند ہے جو انسانوں نے اس کے متعلق اپنے ذہن میں قائم رکھے ہیں۔

اقتدارِ مطلق کی Definition (تعریف)

عزیزان من! قرآن تو مجھے اور آپ سے کہہ رہا ہے کہ تم خدا کا جو تصور لیکر اپنے آپ کو کہتے ہو کہ I believe in God' یعنی خدا کو ماننے والے بنتے ہو' تو سنو! خدا تمہارے ان تصورات سے بہت دُور ہے' بہت پاکیزہ ہے۔ کہا کہ تم تو الہ الارض اوروں کو مانتے ہو۔ سنو! تمہیں بتائیں خدا تعالیٰ کو اس ارض میں الہ ماننے اور باقیوں کو الہ ماننے کا کیا فرق ہے۔ آپ اس آیت کی طرف آیئے جو میں نے تین چار روز پیشتر ہی دہرائی تھی۔ Sovereignty (اقتدارِ مطلق) کی Definition (تعریف) کی ہے کہ جو Accountable (جواب دہ) ہے۔ یہ دنیا میں جتنے بھی اقتدار ہیں' گورنمنٹ کی کوئی فارم ❶ بھی ہو۔ عزیزانِ من! Sovereignty (اقتدارِ اعلیٰ) کہیں

---

❶ قدیم یونان میں ارسطو نے حکومت کو تین انواع میں تقسیم کیا تھا: (ا) شخص واحد کی حکومت (۲) چند افراد کی حکومت اور (۳) بہت سے افراد کی حکومت۔ میکیاوَلی (Machiavelli) نے ان تین انواع پر ایک اور نوع کا اضافہ کیا جسے وہ ''مرکب حکومت'' قرار دیتا ہے۔ جین بوڈن (Jean Bodin) اسلوبِ حکومت کی اس طرح تقسیم کرتا ہے: (ا) ملوکیت (Monorchy) جس کی تین قسمیں ہیں: (ا) استبداد (Despotic) جس میں رعایا کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔ (ب) تاج سے وفاداری (Royal Monorchy) جس میں بادشاہ قوانین وضوابط کی رو سے حکومت کرتا ہے اور (ج) قہرمانیت (Tyranny) جس میں حکومت بادشاہ کی مفاد پرستیوں اور کامرانیوں کے لیے ہوتی ہے۔ (۲) امراء کی حکومت (Aristocracy) اور (۳) جمہوریت (Democracy) عوام کی حکومت۔ ہمارے زمانے میں جمہوری اندازِ حکومت کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً (ا) وحدانی (Unitary) جس میں تمام مملکت ایک ہی وحدت تصور ہوتی ہے اور (ب) وفاقی (Federal) جس میں مملکت کی مختلف وحدتیں (Units) اپنے اپنے ہاں صاحب مختار ہوتی ہیں لیکن سب کا مرکز ایک ہوتا ہے اور اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) مرکز ہی کو حاصل ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک اسلوب حکومت یا تو پارلیمانی (Parliamentarian) ہوگا یا غیر پارلیمانی۔ پارلیمانی اندازِ حکومت میں [باقی اگلے صفحے پر]

نہ کہیں انسانوں پہ ہی رکھتے ہیں' اقتدارِ مطلق ایک فرد کو حاصل ہو تو ملوکیت کا دور ہوگا' وہ ڈکٹیٹر ہوگا۔ اور وہ طرزِ حکومت' جسے دنیا میں نعمت کبریٰ بتا دیا گیا ہے' جمہوریت ہے۔ یوں سمجھو کہ ایک فرعون ہے تو وہ اب تک قابلِ ملامت ہے' لعنت ہے۔ اگر 100 میں سے 51 فرعون اکٹھے ہو گئے تو کہا کہ یہ بہترین نظامِ حکومت ہے۔ ارے تف لعنت! قرآن نے دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ لمبی چوڑی بات نہ سمجھو' اتنی ہی سمجھ لو کہ کسی ایک آقا کی نوکری کرنے والا ایک شخص ہے' اور ایک دوسرا شخص ہے جو گھر بار کے دس بندوں کی نوکری کرتا ہے۔ پچھوای ناں دواں نوکراں کولوں۔ کی حال ہونداا وہدا جہڑا دس بندیاں دی نوکری کرداوا؟ آ 51 دی نوکری کرن والیاں دا آ حال ہونداای۔ ❶ (21:23) میں کہا تھا کہ دوالہ مان لو تو لَفَسَدَتَا (21:23) ہو جائے یعنی کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے۔ یہاں کہا کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (23:71) اگر تم لوگوں کے خیالات کا اتباع شروع کر دو' یہاں اهوآء هــم آیا ہے۔ یہ جمع کا صیغہ ہے۔ اس میں وہ ڈکٹیٹر ایک نہیں رہا۔ یہاں ضمیر ھم آ گئی۔ اب اس آیت کا مطلب و مفہوم یہ ہوا کہ اگر ان کا اتباع کرنا شروع کر دو تو پھر بھی فساد ہی فساد ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ ایک ڈکٹیٹر ہے یا ایک سے زیادہ ہیں' نتیجہ ہمیشہ فساد ہی ہوگا' اور یہ فساد اُس صورت میں مٹے گا جب الہ الارض اور الــه السـمـاء ایک ہو۔ اس الہ کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (21:23) عزیزانِ من! یہ محض چار لفظ ہیں جن میں کہا ہے کہ ''پھر اُس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اُسی سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے اس سلسلۂ کائنات کو ایسا کیوں بنایا ہے اور اسی کے لیے اسی قسم کے قوانین کیوں نافذ کیے ہیں۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کے لیے ہے ❷ اس کے برعکس اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے لیے جداگانہ نظام کیوں وضع کر رکھا ہے۔'' پوچھے جانے سے مطلب یہ ہے کہ کوئی اور نظامِ زندگی کارگہ کائنات کے کلی پروگرام میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ نہ کسی کو اس کا حق اور اختیار دیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! میں نے اس دن ایک

[گزشتہ سے پیوستہ]

ہیئت اجزائیہ (Executive) لیجسلیچر کے سامنے جوابدہ (Accountable) ہوتی ہے۔ اور لیجسلیچر کی صوابدید کے مطابق قائم یا برطرف کر دی جا سکتی ہے۔ لیکن غیر پارلیمانی انداز میں ہیئت اجزائیہ' لیجسلیچر کے ماتحت نہیں ہوتی بلکہ ایک مدت معینہ کے لیے (جس کا تعین دستورِ مملکت کی رو سے ہوتا ہے) قائم رہتی ہے۔ انہی میں سے ایک انداز صدارتی حکومت (Presidential Form of Government) کا ہے جس میں ایک مدتِ معینہ کے لیے صدر حکومت کو تمام اختیارات تفویض کر دیتا ہے اور لیجسلیچر کا اس پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا۔

عصر حاضر میں جمہوری اندازِ حکومت کے برعکس آمرانہ حکومتیں بھی قائم ہونے لگی ہیں۔ اٹلی' جرمن اور سابقہ روس کے ڈکٹیٹر اسی اسلوبِ حکومت کے نمائندے تھے۔ جن مملکتوں میں زندگی کے ہر شعبے پر مملکت کا اقتدار ہوتا ہے' انہیں مملکت کلی (Totalitarian State) کہا جاتا ہے۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ 1955' ص ص 173-174)

❶ ان دونوں نوکروں سے پوچھو کہ اُس دس بندوں کی نوکری کرنے والے کا کیا حال ہوتا ہے۔ بس یہی 51 کی نوکری کرنے والے کا ہوتا ہے۔

❷ Sovereignty is "The Power to do all things without accountablility". (Man and the State)

پورا درس اس نکتے پر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ Definition (تعریف) الٰہ ماننے کی ہے کہ جو اس کے قوانین ہیں' ان کے متعلق تو یہ پوچھا نہیں جاسکتا کہ تو نے یہ کیسے بنائے اور کیسے نافذ کر رہے ہو۔ اس لیے کہ Sovereignty belongs to Him ❶ انسانوں نے اقتدارِ مطلق کہیں تو لے جانا ہے۔ کوئی بھی Form of Government (حکومت کی شکل) ہو گی' جسے آپ فائنل اقتدارِ مطلق کہتے ہیں' وہ کہیں رکھنا پڑے گا کہ جس سے آگے کوئی اس کے فیصلے کی اپیل نہ ہو' جو کسی اور کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ یہ ہے اصل مسئلہ۔ لہٰذا یہاں یہ صورت ہے۔ اور ملوکیت اس لیے مطعون ہے کہ وہاں وہ ایک شخص کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور اسی طرح جمہوریت میں اگر 51 کسی اور کے سامنے جوابدہ نہ ہوں تو صورتِ حال بدتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ الٰہ کے معنی اس ذات کے ہیں کہ جو کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہو۔ اور وہ صرف خدا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہو یا یہ ساری بھیڑیں 50% نہیں بلکہ یہ 100% بھی کیوں نہ ہوں تو قرآن کہتا ہے هُمْ يُسْـــــئَـــــلُـــــوْنَ (21:23) ان سے تو پوچھا جائے گا' وہ تو جوابدہ ہوں گے۔ تو جس سے پوچھا جائے اس سے یہ کیا ہے۔ لہٰذا وہ تو Sovereign (کلی اختیارات کا مالک) نہیں ہوسکتا۔ اب کہا کہ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً (21:24)۔ اس کے سوا انہوں نے اربابِ اختیار تجویز کر رکھے ہیں۔ اب یہ عقیدے کی بات نہیں رہی' عزیزانِ من! کیا بات ہے! کہا کہ قُلْ هَـاتُـوْا بُـرْهَـانَكُمْ (21:24)۔ ان سے کہو کہ تم اپنے اس مسلک کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو۔ پہلے دَور کے' آپ کے ہاں الوہیت کے' جتنے بھی نظام تھے ان کو تو چھوڑ دیجیے۔ اب الوہیت کے' معنی ہوئے: کس کے قانون کے تابع زندگی بسر کرنی ہے' کس کا فیصلہ آخری فیصلہ ماننا ہے؟ یہ معنی ہوئے الٰہ ماننے کے اور یہ ہوا خدا کا ماننا۔ اس دَور میں تو خیر کچھ دلیل والی بات ہی نہیں تھی' ملوکیت میں خیر نہیں ہوسکتی۔ اس دَور میں تو یہ ممکن ہے۔ میری کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' میں پورا ایک باب سیاست پر ہے۔ اس پورے بابِ سیاست میں جو جمہوریت کا باب ہے' اسے دیکھیے کہ یہ سب جمہوریت پسند' جمہوریت کے ماتحت زندگی بسر کرنے والے' اس وقت اس کو فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا ذریعہ قرار دینے والے' آج جمہوریت کے ہاتھوں کتنا چیخ رہے ہیں۔ یہ اس وقت لَفَسَدَتَا (21:22) ہے' فساد ہی فساد ہے۔ قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ کہا۔ آج ساری یورپ اور امریکہ وغیرہ کی سلطنتیں' جہاں جمہوریت اتنی Polished (صیقل) ہے' باقی ممالک تو ان کے اتباع میں ان کی پیروی کر رہے ہیں' ان کے مقلد ہیں' ان سے پوچھیے کہ ان کے ہاں جمہوریت لـفـسـدتــا ہے۔ فساد ہی فساد ہے' ناہمواریوں کی موجب ہے۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ هَـاتُـوْا بُـرْهَانَكُمْ (21:24) تم اپنے مسلک کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو' آج تو ان کے ہاں کی دلیل اس کے خلاف جا رہی ہے۔ کہا کہ یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں اُسے بگوشِ ہوش سنو۔ تمہارا سارا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کو شرف کیسے ہو' احترامِ آدمی کیسے ہو' تو سنو ''یہی تو مقصودِ دین ہے''۔

---

❶ اقتدارِ اعلیٰ اُسی کو حاصل ہے۔

اصل تہذیب تو انسانیت کا احترام ہے

عزیزانِ من! مقصود دین انسانیت کا احترام ہے۔انسان کی تگ وتاز کا مقصود بھی یہی ہونا چاہیے۔ایک انسان کا احترام بحیثیت انسان ہو۔اسے شرفِ انسانیت کہا ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ احترامِ انسانیت کیا ہے؟ جن طریقوں سے بھی تم نے مختلف الہٰ تجویز کیے ہیں' ان میں سے کسی ایک کو بھی الہٰ مان لیجیے یا ایک سے زیادہ کو مان لیجیے۔اب اگر ان الہٰ کے قوانین کے تابع انسان زندگی بسر کرے گا تو وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جائے گا۔اپنے جیسے ایک انسان کے بنائے ہوئے حکم کے تابع آپ اپنا سر جھکا رہے ہیں تو آپ کا شرف اس کے مقابلے میں کہاں رہا' جب کہ خدا کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق آپ کو برابر کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟ آپ کا برابر کا احترام ہے لہٰذا کہا کہ میں تمہیں یہ طریق بتا رہا ہوں کہ دین کا اصول یہ ہے کہ محکومیت خدا کے سوا کسی اور کی نہیں اختیار کی جا سکتی۔اس باب میں دین کا فیصلہ یہ ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3:79)۔کسی انسان کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین وحکومت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔اس کے برعکس اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ **وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ** (3:79)' آؤ تم اور ہم سب مل کے اللہ والے بن جائیں۔کہا: جی اللہ والے؟ کیا بات ہوئی؟ ایہہ تے سارے اللہ والے بنے پھردے نے [1] '' کہا کہ **بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ** (3:78) اس کتاب کے ذریعے جو خدا نے اتاری ہے اور جس کی تعلیم وتدریس تم کرتے ہو اور جس پر غور وتدبر سے' اس کے مغز تک پہنچتے ہو' اُس سے اللہ والے بن جائیں۔

کتاب اللہ کے مطابق حکومت نہ کرنا کفر ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ایمان اور کفر کے درمیان خطِ امتیاز یہ ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44)۔یاد رکھو! جو شخص اس کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا' جسے خدا نے نازل کیا ہے تو وہ کافر ہے خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا مدعی بھی کیوں نہ ہو۔کافر اور مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے۔عزیزانِ من! Believers in God ہوں یا Non - Believers in God اصل یہ ہے کہ جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ہیں' فیصلے نہیں کرتے' وہ کافر ہوتے ہیں۔جو Believers in God ہیں وہ الہٰ السماء اور الہٰ الارض دونوں کو مانیں۔الہٰ الارض میں خدا ماننے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے لیے سجدہ کر لیا جائے' صرف نماز پڑھ لی جائے اور اِس طرح اس کی اطاعت کی جائے۔یہ بات بھی اس نے Abstract (مجرد' بلا وجود) نہیں رکھی' مبہم نہیں رکھی کہ خدا کی اطاعت کیسے ہو۔ہر شخص کہے گا کہ میں خدا کی اطاعت کر رہا ہوں تینوں کی

---

[1] یہ تو سب اللہ والے بنے پھر رہے ہیں پھر یہ اللہ والے کیسے؟

پتا❶۔ کہا کہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ (5:44) یہ دیکھا جائے کہ اس نے جو قرآن نازل کیا ہے' اسکے مطابق اپنے معاملات کے فیصلے کرتے ہو یا نہیں۔ یہ ہے ایمان باللہ۔ عزیزانِ من! اُسے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میں خدا میں Believe (ایمان) کرتا ہوں۔ کہا کہ یہ چیز ہے جو میں کہے جا رہا ہوں کہ کیوں ایک خدا کی اطاعت کرو کسی اور کی اطاعت نہ کرو۔ اس کے لیے کہا کہ ھٰذَا ذِکۡرُ مَنۡ مَّعِیَ وَ ذِکۡرُ مَنۡ قَبۡلِیۡ (21:24)۔ اسی میں شرفِ انسانیت کا راز پوشیدہ ہے۔ پہلے انسانوں کو بھی یہی کہا گیا تھا کہ شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ طریقہ ہے۔ مجھ سے بھی یہی کہا گیا ہے کہ جو میرے ساتھ ہوگا اس سے بھی یہی کہا جائے گا۔ بَلۡ اَکۡثَرُھُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡحَقَّ فَھُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ (21:24)۔ بات ساری یہ ہے کہ صرف یہ الحق ہے اس کے سوا ہر بات باطل ہے۔ اسے وہ علم کی بنا پر' برہان کی بنا پر' تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو کسی اور چیز سے فریب دے لیتے ہیں اور اس حق سے اعراض برتتے ہیں' گریز کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! میں اسے دہرا دوں کہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اس مسلک پر' جسے میں پیش کرتا ہوں' میری جماعت کے لوگ میرے ساتھ ہیں اور اس مسلک پر وہ لوگ تھے جو مجھ سے پہلے (انبیاء اور اُن کے ساتھی) گزر چکے ہیں۔ یہ ان کے لیے بھی باعث شرف و عزت ہے جس طرح اُن کے لیے تھا۔ اصل یہ ہے کہ مخالفین حقیقت سے واقف نہیں اور یونہی (جذبات کی رو میں بہہ کر یا اندھی تقلید کی رو سے) اس مسلک حق و صداقت سے اعراض برتتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ الانبیاء کی آیت 24 تک ہم آج آ گئے۔ 25 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ تجھے کیا معلوم!

چوتھا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 25 تا 33)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا
اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ
يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى وَهُمۡ
مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ ؕ
كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا
فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ
رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِهِمۡ ۖ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ
سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۖۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ
وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۳۳﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1976 کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 25 سے ہو رہا ہے: (21:25)۔ سابقہ درس 18 جولائی کو ہوا تھا اور میں نے آپ سے چند ہفتوں کی رخصت مانگی تھی۔ اعلان کے مطابق پندرہ اگست کو درس ہونا چاہیے تھا لیکن بعض ایسے ناگزیر واقعات پیش آجاتے ہیں جن کی وجہ سے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ 15 اگست کے درس کے لیے میں حاضر نہ ہو سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہی نہیں، صدمہ بھی ہے۔ آپ احباب زحمت اٹھا کر تشریف لائے اور مایوس لوٹے۔ میں اِس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن حالات میرے بس میں نہیں تھے۔

توحید کا نقطۂ ماسکہ

آغازِ درس کا بنیادی نقطہ توحید ہے۔ اس کائنات میں اختیار و اقتدار صرف ایک ذات 'الٰہ واحد' کا ہے، جسے خدا تعالیٰ بھی کہتے ہیں

اور یہ کوئی بات نہیں، جسے پہلی دفعہ اسی رسول سے کہا گیا ہو۔ جب سے سلسلہ رشد و ہدایت شروع ہوا ہے یہ بنیادی نقطہ ہر رسول کی تعلیم کا نقطہ آغاز تھا۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ (21:25) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس کی طرف یہ وحی نہ کی گئی ہو کہ کائنات میں اختیار و اقتدار صرف خدا کا ہے، کسی اور کا نہیں۔ سو تم قوانینِ خداوندی کی ہی محکومی اور اطاعت اختیار کرو۔ اس طرح سمجھا دیا کہ ہم نے ہر ایک کی طرف یہی وحی کی تھی کہ ہمارے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! اب یہ چیز آپ کے سامنے آ چکی ہے، اور برسوں سے آ رہی ہے کہ الٰہ صاحبِ اقتدار کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ جب اقتدار ہمارا ہے تو اطاعت بھی ہمارے ہی قوانین کی ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ اقتدار تو تم ہمارا مانو اور اطاعت تم انسانوں کی کرو۔ اس لیے اس کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ جسے آپ الٰہ مانتے ہیں، محکومیت اور اطاعت اسی کی اختیار کی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو آپ اسے الٰہ مانتے ہی نہیں ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے کے بعد پھر ساری دنیا کی اطاعتیں کرتے پھرنا، کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ کہا کہ **فاعبدون** سو تم قوانین خداوندی کی ہی محکومی اور اطاعت اختیار کرو۔ یہ اس کا منطقی نتیجہ اور فطری تقاضا ہے۔ اب وہ جو اُس دَور کے توہم پرستیوں کی رو سے، مختلف قوتوں کو، مختلف شخصیات کو، الٰہ بنا رکھا تھا، اب ان کی تجدید ہو رہی ہے۔ ان کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ و وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَہٗ (21:26) یہ خدا کی اولاد کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں حالانکہ وہ اس سے بہت دُور ہے۔ یہاں سُبۡحٰنَہٗ [1] کہا گیا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اپنی اولاد بنا رکھی ہے۔ اس کی تردید کے لیے قرآن نے سُبۡحٰنَہٗ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ **سبحنہ** کیا بات ہے! آگے جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں: بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ ○ لَا یَسۡبِقُوۡنَہٗ بِالۡقَوۡلِ وَہُمۡ بِاَمۡرِہٖ یَعۡمَلُوۡنَ (21:26:27) بلکہ جنہیں یہ خدائی اولاد سمجھتے ہیں وہ تو ہمارے بڑے مکرم، معزز اطاعت گزار بندے ہیں۔ ان کی اطاعت کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی بات میں خدا سے سبقت نہیں کرتے۔ بس وہیں تک رہتے ہیں جہاں تک فرمانِ خداوندی ہوتا ہے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کے کرنے کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ تو اس سے یہ نظر آیا کہ یہاں جو یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے ہماری اولاد بنا رکھی ہے تو عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ خدا کی اولاد ہے بلکہ اس زمانے میں دنیا کی قریب ترین سب توہم پرست اور اصنام پرست اقوام کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور اس اعتبار سے ان کی پرستش ہوتی تھی تو یہاں یہ ولد کا لفظ انہی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آگے تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ جنہیں خدا کی اولاد کہتے ہیں، وہ تو ہمارے عبد ہیں، برگزیدہ بندے ہیں، واجب التکریم عبد ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **لَا**

---

[1] امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں کہا ہے کہ سَبۡحٌ اصل میں ''پانی یا ہوا میں تیزی سے گزرنا'' ہے۔ عربی کے مشہور لغت ''تاج العروس'' میں لکھا ہے کہ سبحان من کذا تعجب کے موقعہ پر بولتے ہیں۔ دُوری کے اعتبار سبحان اللہ عما یصفون (37:159) کے معنی ہیں: خدا ان تمام غلط تصورات سے دُور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں (نیز اس لفظ کے باقی معنوں کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم 1960ء ص ص۔ 837-834)

یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ (21:27) وہ تو ہماری کسی بات میں کبھی سبقت ہی نہیں کرتے' کبھی ہماری بات سے آگے بڑھتے ہی نہیں۔ جہاں تک فرمانِ خداوندی کا تعلق ہے تو وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ (21:27) جو ان کو کہا جاتا ہے' وہ اس کے امر کے مطابق کام کرتے ہیں' یعنی وہی کچھ کرتے ہیں جس کے کرنے کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کی وضاحت

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ عالمِ امر خدا کا وہ امر ہے جو عالمِ خلق سے پہلے آتا ہے' جہاں خدا کے ارادے اس کا قانونِ مشیت بنتے ہیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ وہ کیا ہے۔ یہ جتنی قوتیں ہیں' انہیں آپ فطرت کی قوتیں کہہ لیجئے' یا وہ ملائکہ ہیں جو کام کرتے ہیں یعنی خدائی پروگرام کی تکمیل' خدا کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔ ان تمام کا تعلق عالمِ امر سے ہے' عالمِ خلق سے نہیں ہے۔ لہٰذا اس قسم کی مخلوق' جسے آپ Physical Bodies (طبعی اجسام) کہتے ہیں' کے بارے میں طبعی قسم کی شخصیتوں کا تصور رکھنا غلط ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ان کا تعلق عالمِ امر سے ہے۔ عالمِ امر کی کوئی بھی شے ہمارے عالمِ خلق کی شے نہیں ہوسکتی۔ بہر حال یہ چیزیں بہت دفعہ آچکی ہیں۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہمارے امر کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ظاہرداری سے کچھ اور کرتے ہوں اور دل میں کچھ اور خیالات رکھتے ہوں۔ خدا ان کے احوال وکوائف سے واقف ہے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ (21:28) ان کے ماضی سے بھی اور مستقبل سے بھی۔ [1] ہم ان کے احوال وکوائف سے واقف ہیں' ہم ان کے مضمرات سے اچھی طرح واقف ہیں' اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔ یہ سب ہمارے علم میں ہے اور یہ بھی کہ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ (21:28) ان کی تائید ونصرت کسی کے ساتھ نہیں ہوتی سوائے اس کے جو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو۔ وہ خود قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے ڈرتے ہیں۔

مختلف عقائد کا مختصر سا ذکر

عزیزانِ من! یہاں ''شفاعت'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے متعلق دو تین درسوں میں بڑی تفصیل سے میں نے عرض کیا تھا کہ شفاعت کا مفہوم سفارش کا نہیں ہے جو ہمارے ہاں عام طور پہ رائج ہے۔ اس کا معنی ہوتا ہے ''کسی کے ساتھ کھڑے ہوکے' اس کے حق میں گواہی دینا۔'' یہ بات رفاقت اور تائید ونصرت کے معنی میں آتی ہے۔ یہاں (21:28) میں کہا گیا ہے کہ انہیں تم اسی لیے دیوی دیوتا بنا رہے ہو' ان کی پرستش و پوجا کرتے ہو کہ وہ تمہاری مدد کریں گے لیکن یاد رکھو' وہ تو تائید ونصرت اس کی بہم پہنچاتے ہیں جو ہمارے قوانین سے ہم آہنگ

---

[1] جسے ہم حال (Present) کہتے ہیں' وہ درحقیقت ماضی (Past) کا مستقبل (Future) ہے اور مستقبل (Future) کا ماضی (Past) ہے۔

ہوتا ہے۔ میں اس کی زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ یہ چیزیں بھی کئی دفعہ آ چکی ہیں۔ یہ "رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ" میں جو رضا کا لفظ ہے یہ قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی کا نام ہے۔ یہاں کہا ہے کہ جو خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے' اسے ان کی تائید ونصرت حاصل ہو جاتی ہے اور جنہیں تم کہتے ہو کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں' خدا کی اولاد ہیں' اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان جیسے معبود اس کے اقتدار میں شریک ہیں' ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ وہ خدا کے قوانین کی معصیت سے خود خائف رہتے ہیں۔ وہ کس طرح سے معبود ہو سکتے ہیں' کیا ان میں اتنی قوت ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے الٰہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ **وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰـهٌ مِّـنْ دُوْنِهٖ** (21:29) اگر بفرضِ محال' ان میں سے کوئی یہ بات کہے کہ خدا کے علاوہ' میں الٰہ ہوں' معبود ہوں' صاحبِ اقتدار ہوں' خود کوئی اختیار رکھتا ہوں' مجھے بھی خدائی اختیارات حاصل ہیں' تو **فَـذٰلِكَ نَـجْزِيْهِ جَهَنَّمَ** (21:29) اس کی پاداش میں اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ یہ بات سمجھانے کی ہے۔ اگر اولاد کی اس قسم کی کوئی بات ہے' تو اپنی اولاد کو تو کوئی اٹھا کے تندور میں نہیں پھینک دیتا۔ لہٰذا اولاد والی بات غلط ہے۔ کہا کہ بفرضِ محال اگر وہ بھی ہمارے قانون کی معصیت کریں تو ان کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو ہر معصیت کوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ **كَـذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ** (21:29) اسی طرح ہم دوسرے سرکش لوگوں کو سزا دیا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس مقام پہ آ گئے جو ان کا مقام نہیں ہے۔ ظلم کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ ان کا مقام تو "عباد مکرمون" کہا ہے اور اگر اس کو چھوڑ کے وہ خود الٰہ بن رہے ہیں تو پھر یہ ظلم ہے اور ظلم کا نتیجہ جہنم کی تباہی ہے۔ اس لیے ان کا بھی یہی نتیجہ ہوگا۔ تو ہم پرستیوں کے ان عقائد کی اس طرح تردید کرنے کے بعد انہیں بھی وہ خاص رعایت نہیں دی جائے گی۔

قرآنی تعلیم کا ایک نہایت اہم پہلو اور مختلف ادوار میں کائناتی تصورات

عزیزانِ من! اب ہم قرآنِ کریم کے اس مقام پہ آ گئے ہیں جس کے متعلق آج میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں بات چھڑ جائے گی تو بڑی ہی اہم' بڑی ہی بنیادی اور بڑی ہی لمبی بات ہوگی۔ میں اسے نا تمام نہیں چھوڑنا چاہتا کیوں کہ پھر اس کی تکمیل یوں نہیں ہو سکے گی کہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے اگرچہ جو ہمارے ہاں کا عام متعینہ وقت ہے اس سے زائد کچھ وقت ہو جائے تو مجھے معاف رکھیے گا۔ آپ اس کے لیے کچھ بھی کہہ دیجیے' میں اس کا کفارہ ادا کر رہا ہوں:

بھاگے تھے ہم بہت' سو اسی کی ہے یہ سزا
ہو کر اسیر' دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

تو یہ جو اس نکتے کی وضاحت کے لیے کچھ زائد وقت لے لوں گا اس کے لیے آپ سے معذرت کر رہا ہوں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں جو بھاگا تھا تو مجھے پاؤں دابنے پڑ جائیں گے۔ عزیزانِ من! بات بڑی اہم آ رہی ہے اور میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ایک تو یہ چیز ہے کہ اس

کے جو ریفرنسز (حوالہ جات) ہیں ابھی سے کاغذ پنسل لے لیجیے اور انہیں نوٹ کرتے چلے جایئے گا۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے کہ پھر یہ باتیں سامنے آئیں یا نہ آئیں۔ قرآنِ کریم کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس ذات کی طرف سے ہے جس کے سامنے غیب اور شہادت یکساں ہیں' جس کے لیے (مستقبل) Future' (حال) Present' (ماضی) Past کی کوئی Distinction (امتیاز) نہیں' کوئی حد نہیں ہے۔ ماضی حال اور مستقبل اس کے سامنے ہے۔ یہ اس ذات کی طرف سے قرآن ہے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے اور بعض مقامات آجاتے ہیں کہ جہاں اس دعویٰ کا ایک ٹھوس طبعی ثبوت ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یہ وہی مقام آگیا ہے۔

عزیزانِ من! چھٹی صدی عیسوی کی طرف چلے آیئے۔ عرب کا خطہ تو ایسا تھا جس میں عام علم بھی نہیں تھا۔ وہاں مکہ جیسے کیپٹل سٹی' مرکزی شہر' کے اندر سترہ آدمی تھے جو نوشت وخواند سے واقف تھے یعنی صرف ابتدائی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ وہی ہے جسے آج کی اصطلاح میں آپ Literacy (خواندگی) کہتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہونا تو ایک طرف رہا' وہ صرف لکھ پڑھ سکتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اس وقت کا مکہ صرف دارالسلطنت یا کیپٹل سٹی یا محض ایک دارالخلافہ ہی نہیں تھا۔ یہ اس زمانے کا بڑا ہی مرکزی شہر تھا۔ اس میں کیفیت یہ تھی کہ سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جن خطوں کو ہم کہتے ہیں کہ وہ بہت ایڈوانس (ترقی یافتہ) تھے انہیں تو چھوڑ دیجیے۔ اس کائناتِ ارض وسما اور اجرامِ فلکی کے متعلق ان کے ہاں کے جو بھی عقائد تھے' ذرا انہیں سامنے لایئے۔ یہ عقائد علم کی دنیا میں بڑے مقبول تھے۔ بطلیموسی نظام کی رو سے مانا یہ جاتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تو پوچھیے ہی نہیں۔ ان کے ہاں زمین کا یہ تصور تو کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ گول ہے' گھومتی ہے' حرکت کرتی ہے اور یہ بھی کہ یہ جو اوپر چاند' سورج' ستارے ہیں' ان کا بھی کوئی تعلق یا کوئی رشتہ ہے یا یہ بھی کہ یہ اسی طرح سے کرے ہیں۔ زمین کے متعلق تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک تھال کی طرح چپٹی ہے۔ تیرا پتا نہ پائیں تو لاچار کیا کریں۔ پس ان کے ہاں یہ تصور تھا کہ نیچے پانی ہے' پانی میں ایک مچھلی ہے' مچھلی کے اوپر ایک بیل یا گائے ہے' گائے کے سینگوں کے اوپر یہ دھرتی ماتا ہے۔ وہ دھرتی کو ایک سینگ کے اوپر ایک وقت میں رکھتی ہے کہ دونوں سینگ تھک جائیں گے۔ جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو پھر وہ سینگ بدلتی ہے۔ جب دوسرے سینگ پہ لاتی ہے تو اس سے زلزلہ آتا ہے۔ یہ ویدوں کی تعلیم تھی۔ یہ دراصل گاؤں کے بوجھ بجھکڑ تھے۔ یہ ان کے افسانے نہیں تھے بلکہ وہ انہیں الہامی کتابیں مانتے تھے' چاند سورج ستارے سارے دیوتا تھے یعنی یہ ان کے ہاں کا سوریہ یا دیوتا' چندر دیوتا تھے جب چاند گرہن لگتا تھا تو آپ کو معلوم ہے وہ کیا کہتے تھے؟ یہ جو ہمارے ہاں کا سوریہ دیوتا ہے' اس نے کسی سے قرض اٹھا رکھا تھا' وہ وقت پہ دے نہیں سکا۔ اب قرض خواہ آ گئے ہیں۔ انہوں نے گلے میں پٹا ڈالا ہوا ہے اور اب اس کا منہ سیاہ ہو گیا ہے۔ تو حسب معمول پنڈت اور برہمن کہتے تھے کہ جلدی جلدی پیسے لاؤ' زیور لاؤ تا کہ ہم وہ قرضہ ادا کریں اور کسی طرح سے دیوتا صاحب کا چھٹکارا ہو جائے۔ اس طرح وہ سارا کچھ سمیٹ کے گھر لے

جاتے تھے۔ اتنے میں چاند گرہن تو ختم ہو ہی جاتا تھا' دیوتا اٹھ جاتے تھے۔ یہ چیزیں افسانے نہیں تھے' ان کی الہامی کتابوں کے اندر یہ چیزیں موجود تھیں۔ میں اس پس منظر کو اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ چھٹی صدی عیسوی میں دیکھیے کہ اجرام فلکی' زمین' فلکیات کے متعلق ان کی مبینہ آسمانی کتابوں میں کیا چیز تھی۔ عیسائیت کا تو عقیدہ یہ تھا کہ جس کرے پہ یا جس جگہ حضرت عیسیٰؑ یا خدا کا بیٹا آیا ہے اسے کائنات کا مرکز ہونا چاہیے۔ یہ چھٹی صدی عیسوی میں ہم آ گئے۔ اب آگے بڑھیے۔ ۱۷ویں صدی عیسوی میں آ جائیے۔

سترہویں صدی عیسوی میں پہلی دفعہ گیلی لیو[1] (Galileo:1564-1642) نے یہ بات کہی کہ نہیں' زمین متحرک ہے۔ عزیزانِ من! یہ صرف دو تین سو سال[2] پہلے کی بات ہے۔ اس کے خلاف فتویٰ لگا اور اسے پھانسی[3] چڑھانے لگ گئے۔

کہتے تھے کہ پیسا (Pisa) کے ٹاور پہ کھڑا کر کے اِسے نیچے پھینک دیا جائے گا۔ یہ لوگ بھی خوب تھے۔ جب آخری وقت میں پادری Confession (اعترافِ گناہ) لینے کے لیے وہاں گیا تو اس نے یہ کہا کہ گیلی لیو (Galileo)! یہ بات ہی کونسی ہے' کہہ دو کہ یہ زمین ساکن ہے۔ کیا بات ہے! گیلی لیو نے کہا کہ میں کیسے کہہ دوں جب کہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ متحرک[4] ہے۔ یہ صرف زمین کے متعلق متحرک کہنے پر پھانسی لٹکانے کی بات تھی اور ابھی دو تین سو سال بھی نہیں ہوئے جب یہ مانا گیا کہ زمین متحرک بھی ہے اور گول بھی۔ گیلی لیو (Galileo 1564-1642)' کاپرنیکو (Nicolaus Copernicus 1473-1543) کیپلر[5] (Kepler 1571-1630) اس دور کے لوگ ہیں۔ اس دور میں یورپ اتنا ایڈوانس (ترقی یافتہ) نہیں ہوا تھا جتنا آج ان علوم سائنسز میں ایڈوانس

---

1. اطالوی ماہرِ فلکیات اور حساب دان تھا۔ جس نے 1609ء میں اپنی دُور بین بنائی اور زمین کو متحرک دیکھا۔
2. یاد رہے یہ بات 1976ء میں کہی گئی ہے۔
3. Galileo's belief that Copernicus was right to claim that the Sun was the Centre of our Universe led to his persecution by the Inquisition in 1633. (Readers Digest, 1990, P.625)
4. گلیلیو کے اصل الفاظ یہ تھے:

   He recanted but is said to have muttered under his breath "But it (the Earth) does move" (Reader`s Digest Dictionary, 1990. P.625
5. Kepler, Johannes (1571-1630) is a German astronomer and is the founder of modern astronomy. His three Lants, based on the observations made by his teacher Tycho Brahe (1546-1601) made sense of the theory that the planets revolve around the Sun. (Reader's Digest, 1990, P. 843)

ہوگیا ہے۔اب تو وہ خود چاند اور مریخ پر پہنچ رہا ہے۔اس یورپ میں دو تین سو سال پہلے یہ بات نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ جب یہ کہا کہ زمین متحرک ہے تو انہوں نے ان کے خلاف فتویٰ دے دیا' کہ انہیں پھانسی دیدو' جس کا تذکرہ میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔عزیزانِ من! اب پھر چھٹی صدی عیسوی میں عرب میں چلے جایئے' مکے میں جا پہنچے' جہاں سترہ نوشت وخواند تھے اور وہاں ایک شخص ﷺ ہے جو ابھی ان سترہ میں بھی نہیں آتا۔نبوت کے بعد کی اور چیز تھی' حضور ﷺ نے یہ علم حاصل کر لیا تھا۔قرآن کہتا ہے کہ اس سے پہلے تو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔پس منظر آپ کے سامنے آ گیا ہے۔اور آگے بڑھ جایئے۔آج سے تقریباً دو تین سو سال پہلے تو گیلی لیو' اور کاپرنیکس تھے' جنہوں نے صرف یہ ابتداء کی تھی۔آج بات کہاں تک جا پہنچی ہے' اسے دیکھنے کے لیے آج میرے سامنے 19 جولائی 1976 کے پاکستان ٹائم کی ایک اور کٹنگ (تراشہ) ہے یعنی اسے ابھی ایک مہینہ ہوا ہے۔یہ جسے آپ اجرامِ فلکی کہتے ہیں' Astronomy (علم فلکیات) کہتے ہیں۔اس میں رشیا (روس) بہت آگے ہے' اگرچہ امریکہ بھی اس کے بعد اسی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا لیکن تاحال روس کا نام علم فلکیات کی دنیا میں سب سے آگے ہے۔(روس) رشیا کے Scientists (سائنسدان) محققین' چاند کی مٹی کا کچھ تھوڑا سا حصہ نیچے لائے ہیں۔اب اس پہ تحقیق ہو رہی ہے۔اسی کی رو سے یہ جو باقی مرکری' مریخ' اور دوسرے Planets (سیارے) ہیں' ان کے متعلق بھی وہاں تحقیق جاری ہے۔یہ کٹنگ (تراشہ) پاکستان ٹائمز میں ہے' انگریزی میں ہے' میں اسے پہلے انگریزی ہی میں پڑھ کے سناتا ہوں۔جب میں آگے پہنچوں گا تو بات سمجھ میں آئے گی کہ قرآن اس سلسلہ میں کیا کہہ گیا ہے۔

عزیزانِ من! رپورٹ یہ ہے کہ

"All the planets of the solid system emerged out of a proto-planetry cloud several thousands million years ago."

یاد رہے کہ ''یہ Latest (جدید ترین) تحقیق ہے جو روس کے سائنسدانوں کی ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔یہ تحقیق ہماری نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ''اجرامِ فلکی کا یہ سارا سلسلۂ کائنات ابتداً ایک ہیولا (ہیولیٰ۔Nebula) تھا اور Gases (گیسوں) کی شکل میں تھا۔'' پہلی چیز تو یہ ہے۔اس کے بعد اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

" This is the conclusion Soviet Scientists come after they compared the chemical composition of substances on the planets: Earth, Moon, Mars and Mercury, " said a Russian paper

''روس سے شائع ہونے والے ایک بیان میں یہ کہا ہے کہ ''یہ زمین' عطارد' چاند اور مریخ کی ہئیت ترکیبی (Composition) کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ سائنسدان اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ یہ تمام کے تمام پہلے ایک ہیولا تھے اور وہ ہیولا ٹھوس سخت مادے کا نہیں تھا' گیسز کا

تھا۔'' عزیزانِ من! gases , cloud کے یہ الفاظ ذہن میں رکھتے جایئے جن میں کہا گیا ہے کہ پہلے یہ سب ایک تھے اور شکل گیسز کی تھی۔ آگے کہا کہ

According to the USSR press statement, "the samples of the lunar rock brought to earth by Soviet astronomurs are composed of the same substances, which are found on the earth, they do not go in different proportions."

''یہ چاند سے جو مٹی لے کر آئے' اس کا تجزیہ کیا تو دیکھا کہ یہاں زمین کی مٹی کے جو اجزاء ہیں یہ وہاں بھی وہی پائے جا رہے ہیں۔ اور اسی نسبت میں ہیں۔'' عزیزانِ من! یہ شاعری نہیں تھی جب اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ ''لہو خورشید کا ٹپکے' اگر ذرے کا دل چیریں۔'' روس کے وہ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ ہیولائے کائنات شروع سے ایک ہی ہیں۔ غور کیا آپ نے! آگے اس رپورٹ میں یہ لکھا ہے کہ

Scientists believe that the moon and the earth on similar crust had similar crust several thousands million years ago .

''کروڑوں عربوں سال پہلے کی بات ہے کہ چاند اور زمین کا مرکب (Compound) کم از کم جن چیزوں سے یہ آج بنا ہوا ملا ہے' وہ اس وقت بھی وہی تھیں' وہ ایک ہی تھیں' وہ الگ الگ (Different) نہیں تھیں۔'' اس کے بعد یہ کہا ہے کہ

The differences are developed later on and are explained by the loss of many volatile elements due to the absence of the atmosphere on the moon.

''چونکہ چاند کے اوپر یہ فضائی تہہ نہیں ہے جسے ہم فضا Atmosphere کہتے ہیں: یہ تبدیلیاں اس سے پیدا ہوئیں۔'' آگے چل کر یہ بات سامنے آئے گی کہ قرآن اس کے متعلق کیا کہہ رہا ہے۔'' جسے Atmosphere (فضا) کہتے ہیں چونکہ چاند پہ یہ نہیں ہے' زمین پہ ہے' اس Atmosphere (فضا) کے نہ ہونے کی وجہ سے وہاں جو تبدیلیاں آئی ہیں' ان کی وجہ سے زمین اور چاند کے اوپر کے حصوں میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ اس کی وجہ وہاں Atmosphere (فضا) کا نہ ہونا ہے۔'' اس کے بعد لکھا ہے کہ

The surface of the Mercury not protected by the atmosphere is believed to have much in common with that of the moon.

''عطارد کے اوپر بھی یہ Atmosphere (فضا) نہیں ہے اس لیے چاند اور عطارد کی جو سطح اور ان کے جو اجزاء ہیں' وہ کم و بیش ایک جیسے ہیں۔ اس Atmospher (فضا) زمین کے مختلف ہو گئے۔'' پھر لکھا ہے کہ

The planet Mars has a rarefied atmosphere within a lot of carbonic acid gas and probably little water.

''اس کے مقابلے میں سیارہ مریخ پر ذرا سا 'لطیف سا Atmosphere (فضا) ہے اس لیے وہ اور زمین کے اجزاء کم و بیش ملتے جلتے نظر آتے ہیں اور اندازہ یہ ہے کہ شاید وہاں پانی ہے۔'' اس کے بعد لکھا ہے کہ

This also had an effect on the surface rock.

''اس کی وجہ سے اس کی سطح پر۔ کچھ تھوڑی سی تبدیلی آئی ہوئی ہے۔''

On the whole the planet looks very much like the Earth, the Moon, and the Mercury

بہ ہئیت مجموعی وہ بھی ان کرّوں یعنی زمین' چاند اور عطارد ہی جیسا نظر آتا ہے اور حقیقت میں یہ شروع میں ایک ہی تھے۔ یہ جو مریخ ہے' جہاں یہ اب جارہے ہیں' ❶ اس کے متعلق یہاں کہا جارہا ہے کہ وہ اور زمین کم و بیش ایک ہی جیسے ہیں۔ اتنا سمجھ لیجیے کہ وہ' ان کے آج کے Measurement یعنی پیمانے کی رو سے' زمین سے 215,000,000 میل دُور ہے۔ ان کے اس راکٹ کو وہاں تک پہنچنے کے لیے گیارہ مہینے لگ گئے تھے۔ یہ راکٹ جو ہزاروں ❷ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اڑ رہا تھا اور وہاں کے متعلق جاننے کے لیے یہ سائنسدان اب تو وہاں کی مٹی بھی لے آئے ہیں اور اس کا تجزیہ بھی ہوگیا ہے۔ یہ ہے زمین سمیت اجرامِ فلکی کے متعلق آج کی ہمارے ہاں کی latest scientific report (تازہ ترین سائنسی رپورٹ)

آج کی سائنسی رپورٹ اور 14 سو سال پہلے قرآن حکیم کا پیغام

عزیزانِ من! اس تحقیقاتی رپورٹ میں پہلی چیز یہ کہی گئی ہے کہ سائنسی تحقیقات نے ہمیں اس نتیجہ پہ پہنچایا ہے کہ یہ تمام اجرامِ فلکی نہ صرف یہ کہ موٹے موٹے چاند سورج تارے ہیں بلکہ یہ بھی جنہیں آپ ستارے کہہ رہے ہیں عام اجرامِ فلکی کرّے ہیں اور کہکشاں میں تو یہ کئی (Millions) ملین ❸ کی تعداد میں ہیں۔ تحقیقات نے یہ بات بتائی ہے کہ اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے یہ الگ الگ نہیں ہیں بلکہ شروع میں تو یہ ایک ہی ہیولا (Nebulae) تھا۔ اس وقت یہ Cloud (دخان) کی شکل میں گیس (Gases) کی حالت میں تھا۔

---

❶ یاد رہے کہ یہ 1976 کی اگست 22 کی بات ہے۔

❷ یاد رہے روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور راکٹ کو زمینی فضا سے نکلنے کے لیے 26,000 ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار حاصل کر کے نکلنا ہوتا ہے اس لیے اس رفتار کو Escape Velocity (نکلنے کی رفتار) کہتے ہیں۔

❸ ۱۰ لاکھ کا ایک ملین (Million) ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی سورۃ حٰمٓ السجدہ کی گیارہویں آیت دیکھیے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (41:11)۔ خدا نے اپنی توجہ دیگر اجرامِ فلکی کی طرف منعطف کی۔ اس وقت وہ بالکل دھوئیں' گیس (Nabulae) کی شکل میں تھے۔ عزیزانِ من! اسے یوں کہیے کہ پھر خدا نے اپنا کنٹرول خارجی کائنات کے اوپر رکھا اور یہ سارے دخان تھے۔ اللہ اکبر! چھٹی صدی عیسوی میں عرب کی سرزمین میں ایک امی' ایک ان پڑھ ❶ یہ کہہ رہا ہے کہ تخلیق کے بعد اس نے اپنا کنٹرول ان کے اوپر رکھا اور یہ سارے فضائی کرے جنہیں تم فضائی کائنات کہہ رہے ہو' جسے قرآن سماء کہہ کے پکارتا ہے' یہ سب و ھی دخان تھے' Clouds تھے۔ یعنی دخان کی شکل کا ایک ہیولا تھا۔ کہیے عزیزانِ من! ساری دنیا کے اہلِ مذاہب سے کہ ان کے پاس جو بھی کتابیں موجود ہیں اِن فضائی کروں کے متعلق' وہ کہیں سے' یہ ایک فقرہ بتا دیں۔ آپ کے ہاں دو ہزار سال پہلے کے جو Scientists (سائنسدان) ہیں' یونان کے خطہ سے لے کر یورپ تک آ جائیے' ساری دنیا کے Scientists (سائنسدان) سے کہیے کہ دو سو سال پہلے کوئی یہ بات کہہ دے' جو چودہ سو سال پہلے کی اس کتاب' قرآن کریم' میں موجود ہے جس میں یہ کہا ہے کہ وَهِيَ دُخَانٌ (41:11) یہ دھواں سا ہی تو تھا۔ کیا حسین انداز ہے! فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (41:11) سو ہم نے انہیں اور زمین کو کہا کہ تم ہمارے قوانین کے تابع چلو......طوعاً یا کرہاً......بطیّبِ خاطر یا مجبوری سے۔ یعنی اس خارجی کائنات میں اجرامِ فلکی اور کرہ ارض سے کہا کہ آؤ کچھ اور بتائے جائیں۔ کیا انداز ہے! طَوْعًا اَوْ كَرْهًا (41:11) ہمارے قانون کے تابع آؤ: طوعاً آؤ یا کرہاً آؤ۔ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (41:11) انہوں نے کہا کہ کرھًا کیوں آئیں ہمارا تو سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ ہم بطیبِ خاطر آتے ہیں اور اطاعت گزار بن کر آتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ سب گیسز کا ایک ہیولا تھا' دخان تھا۔ یہ بات ذہن میں آ گئی' ہیولا تھا' پھر کیا ہوا؟ یہی ہے وہ مقام جس پہ اس درس کی آیت (21:30) پہ پہنچ گئے ہیں۔ یہ سورۃ الانبیا کی آیت 30 ہے۔ جو اس آج کے درس میں ہمارے زیرِ نظر ہے۔ بعض لوگ بر بنائے جہالت' مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ لیتے ہیں حالانکہ سلسلہ کائنات' تمام کا تمام خدا کا پیدا کردہ ہے اور اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس وقت تو انہیں کائنات میں مختلف مظاہر' الگ الگ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (21:30)۔ انہوں نے' جو ان صداقتوں کا انکار کرتے ہیں' غور نہیں کیا۔ عزیزانِ من! یہ بات تو میں بعد میں کہوں گا کہ یہاں کفر اور ایمان کا یہ امتیاز کہاں آ رہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو کفر کرنے والے ہیں' انہوں نے کبھی اس چیز پہ غور ہی نہیں کیا۔

---

❶ آپ نبی اکرمؐ نبوت سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ آپؐ کو اس اعتبار سے امی کہا جاتا ہے۔ لیکن نبوت کے بعد آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اس کے لیے قرآن کریم کا حوالہ ہے: 29:28۔ احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی (دمشقی) نے اپنی معروف تصنیف لطائف اللغۃ میں لکھا ہے کہ الامی کے بنیادی معنی ہیں: ایسا شخص جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو (جیسا ماں نے جنا تھا ویسا ہی رہے۔ اسے مادر زاد بھی کہتے ہیں) اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص ص۔ 262-261۔

مظاہر فطرت پہ غور وفکر نہ کرنا کفر ہے

عزیزانِ من! گیلی لیو (Galileo: 1564-1642) نے اپنی پہلی دوربین سے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ زمین ساکن نہیں ہے۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ متحرک ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا (21:30) کیا یہ انکار کرنے والے اس چیز کو دیکھ نہیں رہے؟ اگلی بات کل کرونگا کہ ان مظاہر فطرت کو ان آنکھوں سے دیکھنا اور ان پر غور وفکر نہ کرنا کفر ہے۔ یہ بات دوسری ہے۔ یہاں اس آیت میں کہا کہ کیا ان کو یہ نظر نہیں آتا؟ کیا انہوں نے دیکھا نہیں ہے؟ کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا؟ اب یہاں سوال یہ ہے کہ انہوں نے کس بات پہ غور نہیں کیا؟ کہا اس بات پہ کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30) یہ سارے اجرامِ فلکی ابتدائی دور میں ایک ہی ہیولائے کائنات تھے' یہ سب ایک تھا اور اس کے بعد چھینٹے اڑے اور یہ الگ الگ ہو گئے۔ یہاں رتقًا [1] پھر فتق آیا ہے۔ آج کے Scientists (سائنسدانوں) نے اتنی تحقیقات کے بعد بتایا ہے کہ شروع میں یہ سارا سلسلہ ایک دخان تھا' ایک ہیولا تھا اور پھر اس میں جیسے چھینٹے اڑتے ہیں سارے کرے الگ الگ ہو گئے۔ [2] دوسری جگہ اسی کو ایک اور انداز میں سمجھایا ہے کہ یہ سارا کچھ پہلے ہیولا تھا۔ اس میں وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (79:30) اپنی (زمین) کو الگ کر کے یوں دور پھینکا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے بدو پہلے مخاطب ہیں۔ میں نے کہا کہ کہیں سترھویں صدی عیسوی میں گیلی لیو (Galileo: 1564-1642) نے یہ کہہ دیا کہ یہ زمین متحرک ہے تو مذہب کے مبلغین انہیں پھانسی دیدیتے' وہ بیچارہ بچ گیا۔ اُسے سزائے موت دے رہے ہیں۔ کس بات پر؟ کہ یہ کہتا ہے کہ یہ زمین متحرک ہے۔ یہ سترھویں صدی عیسوی میں یورپ کی علمی حالت ہے۔ وہ گیلی لیو جیسا Scientist (سائنسدان) ہے۔ نیوٹن (1642-1727) کیپلر (1571-1630) وغیرہ یعنی یہ وہاں کے Scientists سائنسدان بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ اگر گیلی لیو کہتا ہے کہ زمین متحرک ہے تو کہا کہ اسے پھانسی دیدو۔ یہاں چھٹی صدی عیسوی میں قرآن کے اوّلیں مخاطب عرب کے بدو ہیں۔ انہیں بات یہ سمجھانی تھی کہ یہ تمام کرے کس طرح سے الگ ہوئے۔ لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بات کس طرح ذہن میں آ سکتی تھی۔

---

[1] تاج العروس میں ہے کہ رَتْقٌ کے معنی ملا دینا ہیں اور اِرْتَتَقَ الشَّيْئُ کے معنی چیز مل گئی اور جڑ گئی' اس میں کہیں شگاف نہ رہا۔ پطرس بستانی نے اپنی تصنیف ''محیط المحیط'' اور امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں ان معانی کی تصدیق کی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اَلْفَتْقُ کے معنی دیئے ہیں ''دو ملی ہوئی چیزوں کو الگ کر دینا۔'' اسی لیے اس آیت (21:30) میں ارض وسماء کے متعلق آیا ہے کہ پہلے یہ تمام کائنات ایک ہی ہیولیٰ تھی' بعد میں اس سے مختلف کُرے پیدا ہو گئے۔ یہ اعلان چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کسی انسان کے ذہن میں اس کا تصور تک نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرامِ فلکی شروع میں ایک ہی ہیولیٰ تھے اور بعد میں الگ ہوئے۔ آج سائنس کی تحقیق نے اس اعلان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

[2] مثلاً کرہ ارض اس اوّلین ہیولیٰ سے یوں الگ ہوا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے (79:30)۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیاں

عزیزانِ من! یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ الفاظ ہی ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس سے چھٹی صدی عیسوی کا بدو بھی وہی مفہوم سمجھتا ہے جو 17 ویں صدی کا اور بیسویں صدی عیسوی کا روس کا Scientist (سائنسدان) سمجھتا ہے اور انہی الفاظ میں سمجھتا ہے۔ یہ الفاظِ قرآنی کا اعجاز ہے اور سمجھانے کا انداز ہے۔ اگلے دن میرے ایک دوست سے بہت بحث ہو رہی تھی کہ جی! قرآنِ کریم نے یوں صاف صاف کیوں نہ بتا دیا۔ عزیزانِ من! آپ کے جو بچے پانچویں چھٹی جماعت میں آ گئے ہیں' وہ آ کے روز پوچھتے ہیں کہ اللہ میاں کیا ہے؟ آسمان کیا ہے؟ تو کیا آپ ان بچوں کو آئن سٹائن (Einstein, Albert:1879-1955) کی Theory (نظریہ) سمجھایا کرتے ہیں؟

آپ تو انہیں ان کی عقل' فکر اور سمجھ کے معیار کے مطابق کچھ سمجھاتے ہیں۔ اس طرح سے اور کتنی دشواری تمہیں پیش آتی ہے لیکن سمجھاتے تو ایسے ہی ہو۔ انہیں سمجھانے کے لیے سائنس کی منتہٰی یا فلسفہ کی منتہٰی کی زبان تو استعمال نہیں کرتے' یوں سائنس کی زبان یا فلسفہ کی اصطلاحات میں تو نہیں سمجھاتے۔ اس طرح' اس زبان میں تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا۔ وہ دوست کہنے لگے کہ ٹھیک ہے' اسی طرح عام انداز میں ہی سمجھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ فرق یہ ہے کہ آج جن الفاظ میں تم ان بچوں کو سمجھاتے ہو' جب وہی بچے ایم اے میں پہنچیں گے تو پھر یہ الفاظ انہیں طفلانہ نظر آئیں گے اور یہاں عزیزانِ من! اعجاز یہ ہے کہ وہی الفاظ ان بچوں کے سامنے آئے ہیں تو انہوں نے بھی سمجھا۔ آج نیوٹن (Newton) کے سامنے وہی الفاظ آ رہے ہیں تو وہ سجدہ کرتا ہے۔ سر جیمز جینس جو ہمارے دَور کا سب سے بڑا علم الافلاک کا ماہر ہے' اس کی مشہور کتاب ہے: The Mysterious Universe۔ اس سے ایک دفعہ یہ سوال کیا گیا تھا کہ تم خدا کے متعلق کیا جانتے ہو؟ اس نے کہا تھا کہ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے لیکن یہ جو فلکیات کا علم ہے' یہ Mathematics (علم ہندسہ) پہ مبنی ہوتا ہے۔ اس میں Calculation کرتے ہیں۔ میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ ''اس'' سے بڑا Mathematician (حسابدان' علم ہندسہ دان) کوئی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہاں سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم نے لفظ **دحٰھا** استعمال کیا ہے۔ یہ گوپیا[1] چلاتے ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گوپیے میں سے جو پتھر نکلتا ہے وہ شوں کر کے جاتا ہے۔ اسے **دحٰی**[2] کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں

---

[1] گوپیا یا گوپن یا گوپھن یا فلاخن: رسی کا بنا ہوا آلہ جس میں پتھر یا مٹی کی گولی رکھ کر چلاتے ہیں۔

[2] ابن مکرم' جنہیں ابن منظور بھی کہا جاتا ہے' نے اپنی مشہور تالیف ''لسان العرب'' میں لکھا ہے کہ ھُوَ یَدْحُو بِالْحَجَرِ۔ ''اس نے پتھر پھینکا'' اور ''تاج العروس'' کے مؤلف محبّ الدین' ابن الفیض السید محمد مرتضٰی الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی (وفات 1205ھ مطابق 1791) نے ''تاج العروس'' میں یہ لفظ اس معنی میں لکھا ہے: یَدْحُو الْحَجَرَ بِیَدِہٖ اور لکھا ہے کہ یَدْحُوْ دَحْوًا کے معنی ہیں: گھوڑا اپنے سم سے زمین پر لگا تار مٹی اڑاتا ہوا دوڑا۔ دَحَا الْمَطَرُ الْحَصَا کے معنی ہیں: بارش نے کنکریوں کو بہا دیا۔ اس سے ''تاج العروس کے مطابق' دحی کے معنی ''پھیلانا' بچھا دینا' وسیع کر دینا'' ہیں۔ اب (79:30) کو یوں سمجھیے کہ ارض (زمین) کو اس ہیولیٰ سے یوں الگ کیا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے یا جیسے بارش کنکریوں کو بہا کر لے جاتی ہے یا جیسے گھوڑا گرد و غبار اڑاتا چلا جاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو **دحٰھا** سے تعبیر کیا ہے۔

ہے کہ **وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا** (79:30) اس نے اس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دُور پھینک دیا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ [1] عزیزانِ من! اس دخان کے ہیولے سے تمہارا یہ کرّہ ارض یوں کٹ کے، شوں کر کے، الگ ہوا جیسے گوپیے سے پتھر نکلتا ہے۔ چوتھی جماعت کے بچے کو سمجھایا جا رہا ہے۔ اگلی بات تو آگے چل کے ہی کہوں گا۔ آیت تو اگلی ہے جس میں کہا ہے کہ **اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَ مَرۡعٰهَا** (79:31) اس کے بعد اس میں سے پانی کشید کر کے سمندروں کو الگ کیا اور خشکی کے قطعات کو الگ۔ پھر ان قطعات میں نباتات کی نمود آئی۔ جیسی تھی یوں الگ ہوگئی۔ کیا ایسی رہنی چاہیے تھی؟ کہا کہ نہیں۔ اس کے بعد اس میں پانی بھی تھا، خشکی بھی تھی۔ ہم نے ایسا کیا کہ پانی کو الگ کر دیا اور خشکی کے قطعے کو الگ کر کے رکھ دیا۔ یہ **و مرعٰها** ہے اور وہاں یہ تمہاری کھیتی باڑی ہو رہی ہے۔ لیکن بات وہاں تک آئی تھی۔ گوپیے سے، یہ سارے سماوات کے کُرّے نکلے تھے۔ نکلنے کے بعد پھر ہوا کیا؟ کہا کہ **کل فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ** (21:33) اور ہر کرہ گوپیے سے نکل کر اپنے اپنے مدار کے اندر تیرنے لگ گیا۔ اللہ اکبر! یعنی معلق ہونا تو ابھی ان لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ معلق ہونے کے لیے وہ تو اِن لوگوں کے مطابق کسی ''چیز'' کو'' گائے کے سینگ کے اوپر'' رکھنا پڑتا ہے، اس کے بغیر تصور ہی نہیں تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ آپ قرآن کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کرے وہاں سے نکلے اور پھر لفظ آیا ہے: **یَسۡبَحُوۡن** ۔ اس لفظ کے معنی ''بڑی تیزی سے گردش کرنا'' ہے۔ جیسا میں نے کہا ہے۔ یہ لفظ ''س ب ح'' سے ہے۔ اس کے معنی ہیں:'' اس قسم کی تیراکی جو پورے ہاتھ مار کے تیرتے ہیں۔'' اس عمل کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ اس قسم کی کوئی ٹیکنیک ہے جس میں پورے ہاتھ مار کے تیرنا ہوتا ہے۔ یہ اس کا معنی ہوتا ہے۔ اس کے معانی انتہائی طور پر سرگرمِ عمل رہنا بھی ہیں، یعنی پوری پوری قوت کے ساتھ تیرنا۔ یہاں یہ لفظ ان کروں کے متعلق آیا ہے کہ ''وہ اپنے اپنے فلک یا مدار کے اندر پوری قوت کے ساتھ تیر رہے ہیں۔'' عزیزانِ من! یہ چھٹی صدی عیسوی میں کہا گیا ہے کہ یہ دخان تھا، سارا ہیولا تھا۔ اس کے چھینٹے اڑے، یہ الگ الگ ہوئے جیسے گوپیے میں سے پتھر نکلتا ہے۔ تمہاری زمین یوں الگ ہوئی اور ان میں سے ہر ایک جو چھینٹا اڑا ہے، وہ کُرّے ہیں۔ یہ کونسے چھینٹے تھے؟ کہا کہ یہ **والشمس والقمر** شمس وقمر تھے۔ وہی شمس وقمر جنہیں یہ دیوتا بنا رہے ہو، جنہیں آج تک چندا ماموں ہی کہہ کے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔ چاند شاعروں کی تشبیہ کے کام آتا تھا جیسے ''مہ جبیں'' مہ لقا۔ یہ جو ''مہ جبیں'' کے چہرے پر سے اب پردہ اٹھا ہے تو ''ڈر دے مارے شاعراں دیاں چیخاں نکل ڈیاں ہویاں'' [2] نے کہ یا میرے اللہ! یہ ہے چہرہ! عزیزانِ من! ہر حسین کا نقاب اٹھے تو وہ وہی نظر آتا ہے جو وہ اصل ہوتا ہے، جی!

---

[1] آیت (2:29) میں ثُمَّ ترتیب کے لیے نہیں ہے۔ عصر حاضر کا علمی انکشاف یہ ہے کہ اولین ہیولیٰ (Nebula) کی تیز گردش سے جو چھینٹے اڑے وہ ان کُرّوں کی شکل میں گردش کر رہے ہیں۔ اس سے قرآنی مثال کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اس ہیولیٰ سے کرہِ ارض یوں اڑ کر الگ ہوا جس طرح تیزی سے گھومنے والے گوپیے سے نکل کر پتھر دُور چلا جاتا اور گھومتا رہتا ہے۔

[2] ڈرے سہمے شاعروں کی چیخیں نکل گئی ہیں۔

آج کی ہمارے ہاں کی یہ صورت ہے اور وہ شاعر وہاں یہ کہہ رہا ہے: مہ جبیں، مہ لقا۔

شمس وقمر کا وجود میں آ کر اپنے اپنے مدار میں سرگرمِ عمل ہونا

عزیزانِ من! یہاں کل دو مثالیں دیں جو نمایاں طور پہ تمہیں نظر آتی ہیں۔ کہا کہ **وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ** (21:33) سورج اور چاند' ان میں سے ہر ایک کرہ اپنے اپنے مدار میں تیزی سے تیر رہا ہے۔ اس کا ایک ریفرنس یہ ہے۔ اسی کا ایک دوسرا ریفرنس ہے: **كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ** (40:36)۔ یہ تمام عظیم الجثہ کُرّے' اپنی اپنی جگہ ساکت نہیں کھڑے بلکہ پیہم اور مسلسل حرکت کر رہے ہیں لیکن ان کی یہ حرکت اس طرح حساب اور قاعدے کے مطابق ہوتی ہے کہ (36:40) کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ سورج اپنی رفتار کو تیز کر کے چاند کو جا پکڑے یا کبھی ایسا ہو کہ جس نقطہ سے رات کا اختتام اور دن کا آغاز ہونا تھا' رات وہاں سے آگے بڑھ جائے۔ یعنی کسی مقام پر سورج اپنے معینہ وقت کے بعد طلوع ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ ان میں سے ہر کرہ اپنے اپنے دائرے میں' اپنی اپنی رفتار سے' ٹھیک اپنے اپنے راستے پر' بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! دونوں جگہ یہی الفاظ آئے ہیں: **كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ** چھینٹے اڑے اور یہ الشمس و القمر بنے' اور اپنے اپنے مدار میں ہر ایک تیزی سے تیرنے لگا۔ الفاظ کا انتخاب دیکھیے۔ وجد آ جاتا ہے۔ معلق شے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ تیر رہے ہیں یقیناً وجد آفریں ہے۔

چلیے صاحب! یہ تو ہو گیا کہ یہ کُرّے یعنی اجرامِ فلکی کیسے الگ ہوئے۔ اس کے بعد اب زندگی کی نمود ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ زندگی کی نمود کیسے ہوئی؟

زندگی کی نمود کا دارومدار پانی پر ہے

عزیزانِ من! اس وقت [1] دنیا کی آنکھیں مریخ سے آنے والی مٹی پر لگ رہی ہیں۔ یہ آنکھیں کس لیے اس مٹی پہ لگ رہی ہیں؟ کہتے ہیں کہ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس میں رطوبت ہے۔ Moisture (نمی) ہے۔ پانی کی نمی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمہیں پتہ لگ جائے کہ نمی ہے تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ اگر اس میں پانی کی نمی ہے تو زندگی کا امکان ہے۔ یہ ہے ہمارے ہاں سائنس کا آخری انکشاف۔ یعنی اگر کہیں پانی ہے تو زندگی ہے یا الفاظ دیگر پانی سے ہی زندگی کی نمود ہے۔ یہ نہیں ہے تو زندگی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیت ہے کہ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** (21:30) اور ہم نے پانی سے زندگی کی نمود کی' اس کرہ ارض پر ہی نہیں' ہر شے میں زندگی کی نمود پانی سے ہوئی۔ دیکھیے قرآن کا انداز! یہی چیز (24:45) میں بھی کہی ہے اور دونوں میں ذرا فرق ملاحظہ فرمائیے گا۔ یہاں کہا ہے کہ

---

[1] یہ بات 1976ء میں کہی گئی ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30) ہر شے میں زندگی، جسے بھی آپ زندہ کہیں گے، پانی سے ہے، ہر شے میں زندگی کی نمود پانی سے ہے اور وہاں کہا ہے کہ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (24:45) اور اللہ نے اپنے قانون کے مطابق، ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ عزیزانِ من! دآبہ متنفس کو، سانس لینے والی چیز کو، کہتے ہیں۔ یہاں اس نے خود اس کی تشریح کر دی کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِیْ عَلٰٓی اَرْبَعٍ (24:45) پھر ان میں وہ بھی ہیں، جو پیٹ کے بل رینگتے ہیں، بعض دو پاؤں پر چلنے والے ہیں، بعض چار پاؤں پر۔ اس طرح ان دو پاؤں پہ چلنے والوں، چار پہ رینگنے والوں کو دآبہ کہا جاتا ہے، انہی کو متنفس کہا جاتا ہے۔ اب ذرا قرآن کی یہ بات سوچیے۔ دآبہ کے متعلق یہ کہا ہے۔ زندگی کی نمود تو ہمارے سامنے وہی ہوتی ہے جہاں سانس لینے والی کوئی چیز ہو، خواہ وہ ہو جسے آپ اوّلیں جرثومہ کہتے ہیں اس میں تو وہ سب ہی آ جائیں گے۔ یعنی اوّلین جرثومہ سے لے کر انسان تک دآبہ کے اندر آ جائیں گے۔ زندگی کی نمود اسی پانی سے ہوئی ہے۔

زندگی صرف سانس لینے والوں تک ہی محدود نہیں

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30) ہم نے پانی سے زندگی کی نمود کی۔ تو گویا جنہیں ہم سانس لینے والے سمجھتے ہیں تو کیا زندگی انہی تک محدود ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں، دآبہ کے علاوہ اور چیزیں بھی ہیں جن میں زندگی تو ہے مگر وہ سانس نہیں لیتیں۔ اب ساری نباتات کے متعلق تحقیق ہو گئی ہے کہ ہر وہ چیز جو بڑھتی ہے وہ زندگی Develope کرتی ہے وہ زندہ ہوتی ہے۔ قرآن نے یہاں تو کل شیٔ کہا ہے اور وہاں کل دَآبَّةٍ (24:45) کہا ہے۔ شیٔ میں دآبہ آ جائیں گے مگر دآبہ میں ہر شے نہیں آئے گی۔ جسے آپ ہر شے کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندہ ہے تو اس میں زندگی کی نمود پانی سے ہوئی ہے۔ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ انتہائی کوشش ہو رہی ہے کہ مریخ سے جو Dust (مٹی) ملی ہے، اس میں یہ معلوم ہو جائے کہ آیا اس میں Moisture (نمی) ہے اور اس طرح وہ اس چیز کی دلیل یا شہادت بن جائے گی کہ وہاں دآبہ کی شکل میں زندگی ہے، نباتات کی شکل کی زندگی نہیں بلکہ وہ یہ تحقیق کر رہے ہیں کہ اس مٹی کے اندر اگر Moisture (نمی) ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم Life Cell (جرثومہ حیات) دیکھیں گے، خواہ وہ اس وقت ہمیں زندہ ملیں یا وہ اس وقت مردہ ملیں۔ اس کے معنی ہونگے کہ Life (زندگی) دآبہ کی شکل میں ان کروں کے اندر موجود تھی یا موجود ہے۔ عزیزانِ من! اس زندگی کا امکان ہے۔ وہ بھی اس نتیجے پہ پہنچے ہیں اور یہ تحقیق ہے جو اس وقت مریخ کی مٹی پر ہو رہی ہے اور اب وہ مریخ سے بھی آگے جا رہے ہیں۔ اب ان کی پرواز زہرہ کیطرف بھی تو ہو رہی ہے، یا شاید مشتری کی طرف پہلے جائیں گے۔ یعنی پیش نظر مقصد یہ ہے کہ آیا وہاں Moisture (نمی) ہے تا کہ یہ دیکھا جائے کہ وہاں زندگی دآبہ کی شکل میں ہے اور قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (42:29) زمین اور اجرام فلکی خدا کی نشانیوں میں سے ہیں، یعنی خدا کی نشانیوں میں سے

یہ بھی ایک بات ہے۔ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ آیات کے کیا معنی ہیں۔ اس نے یہ سارا سلسلہ ارض وسما پیدا کیا' سنیے عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (42:29) نیز وہ ذی حیات (چلنے پھرنے والی آبادیاں) جو اس نے ان میں (زمین اور آسمانی کرّوں میں) پھیلا رکھی ہیں' یعنی اس ارض وسما کے کرّوں میں پھر اس نے دآبہ پیدا کردیئے' سماء کے کروں میں بھی مگر ہر کُرّے میں نہیں۔ لیکن یہ بات کہ ان کرّوں کے اندر بھی دآبہ کا امکان ہے' آج سے چودہ سو سال پہلے کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ آیاتِ خداوندی ہیں اور ہمیں آیاتِ خداوندی پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا ہے۔ آج ان پر غور وفکر کی اشد ضرورت ہے۔

آیاتِ خداوندی کی اہمیت کے پیش نظر اُن پر غور وفکر کی ضرورت

عزیزانِ من! یہاں بات یوں چلی آرہی تھی کہ بعض لوگ جہالت کی بنا پر مظاہر فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ لیتے ہیں حالانکہ سلسلۂ کائنات' تمام کا تمام' خدا کا پیدا کردہ ہے اور اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس وقت تو انہیں مظاہرِ فطرت الگ الگ دکھائی دیتے ہیں لیکن قرآن کریم نے کہا ہے کہ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (21:30) جو لوگ آیاتِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں اور یہ کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ (42:29) اور آیاتِ خداوندی میں تخلیق ارض وسماء اور ان میں دآبہ ہیں۔ جو ان کا انکار کرتے ہیں' قرآن انہیں "کفروا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ آپ یہ آیاتِ خداوندی دیکھتے چلے جایئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں پہنچ رہی ہے اور مومن کسے کہتے ہیں۔

قرآن نے کہا ہے کہ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا (42:29) زمین اور اجرامِ فلکی کی پیدائش' خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔ نیز وہ ذی حیات (چلنے پھرنے والی آبادیاں) بھی جو اس نے (زمین اور آسمان کرّوں میں) پھیلا رکھی ہیں۔ یہ آبادیاں اس وقت تو الگ الگ ہیں۔ صرف ارض میں ہی نہیں ہے بلکہ سمٰوٰت میں بھی ہیں۔ دونوں میں ہیں۔ یعنی اجرامِ فلکی جو سماوات کے اندر ہیں' بلندیوں میں ہیں' اور یہ جو ارض ہے اس کے اندر بھی ہیں۔ ان تمام میں دآبہ ہیں اور قرآنِ کریم کے اگلے الفاظ پہ' عزیزانِ من! وجد میں آجایئے کہا کہ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (42:29) اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا وقت آسکتا ہے کہ ان میں باہمی رابطہ پیدا ہوجائے اور یہ اکٹھے ہوجائیں۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ [1] عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے' چھٹی صدی عیسوی میں' عرب کی سرزمین میں' ایک امی [2] کھڑا ہو کر کہہ رہا ہے کہ ان میں

---

[1] اس آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض آسمانی کرّوں میں زندگی موجود ہے۔ اب انسان نے جس انداز میں اجرام فلکی سے سلسلۂ مواصلات شروع کیا ہے اس سے اس کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ کسی کُرّے (Sphere) کی آبادی اور ہم میں ربط پیدا ہوجائے اور یوں یہ آبادیاں اکٹھی ہوجائیں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1134 فٹ نوٹ)

[2] اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔

دآ بہ (ذی حیات: چلنے پھرنے والی آبادیوں) کا امکان ہے اور خدا اس پر قادر ہے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایک وقت آئے کہ ان کے اندر باہمی رابطہ پیدا ہو جائے اور یہ اکٹھے ہو جائیں۔ اف! زندگی کی نمود پانی سے ہے' Moisture (نمی) ہے' وہ پانی جو الماء ہے۔ یہ ہے سرچشمہ حیات! قرآنِ کریم تو صرف سائنس کے اصول بیان کر رہا تھا۔ نیوٹن (Newton:1642:1724) کے انداز میں یہ باتیں تھیں' اب باتیں تو ساری آپ کے سامنے آ گئی ہیں۔ یہ گیلی لیو (Galileo:1564-1642) وہ' کیپلر (Kepler, Johannes:1571-1630) اور یہ کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus 1473-1543) کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن قرآن یہ باتیں تو کسی اور مقصد کے لیے کہہ رہا ہے۔ اس نے ہمیں مآء (پانی) تک پہنچا دیا۔ زندگی کا سرچشمہ مآءٌ (پانی) ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ **وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ** (11:7) اور اس سرچشمہ حیات پر مرکزی کنٹرول خدا کا ہے۔ یہاں قرآن نے اس مقصد تک پہنچانا تھا کہ اس کا مرکزی کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔

ہماری کم مائیگی کی اصل وجہ کی ایک مثال

عزیزانِ من! آج مجھے معاف رکھیے گا میں یوں نہیں کروں گا کہ ان کی تفسیریں آپ کو بیان کروں تو آپ ہنس اٹھیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہوا ہے' یہ بات ایسی نہیں ہے کہ ہم انہیں صرف Concede (تسلیم) ہی کریں۔ اُس دَور کا علم انسانی ان بلند و بالا تصورات تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ میں جس چیز کو Concede (تسلیم) کیا کرتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اگر وہ مفسرین یہ کہتے کہ ہم نے ایسا سمجھا ہے تو ٹھیک تھی یہ ان کے دَور کی سمجھ تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے وہ تمام کچھ رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیا کہ انہوں نے یہ کہا تھا۔ آج ہم پاٹے خاں [1] اس لیے ہیں کہ ہمارے دَور میں علم انسانی یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ یہاں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ ان مفسرین میں سے قریباً ہر شخص نے یہ بات کہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا ہے۔ بس یہ ہے وہ چیز جو برداشت نہیں ہو سکتی۔ وہ رسول جس کے سامنے یہ قرآن تھا' وہ یہ باتیں نہیں کہہ سکتا تھا۔ ذہنِ انسانی ہی ایسی باتیں کہہ سکتا ہے۔ **كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَآءِ** (11:7) کے معنی تو میں دو لفظوں میں کہہ دوں کہ سرچشمہ حیات (پانی) پر مرکزی کنٹرول خدا کا ہے۔ مگر یہاں ترمذی کی وہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ آسمان شیشے کے ڈلے ہیں۔ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سات سو برس کا فاصلہ ہے۔ اس طرح کے سات آسمان ہیں اور اس طرح سے یہ سات شیشے کے ڈلے ہیں۔ اب ساتواں آسمان سب سے اوپر چلا گیا۔ اس کے اوپر پانی ہے۔ اس پانی کی گہرائی بھی پانچ سات سو میل کی مسافت کی ہے۔ اس پانی کے اندر سات پہاڑی بکرے کھڑے ہیں اور وہ پانی صرف ان کے گھٹنوں تک آیا ہے اور ان سات پہاڑی بکروں کے سر کے اوپر خدا کا عرش ہے۔ اس عرش کے اوپر خدا بیٹھا ہے۔ یہ روایت نبی اکرم ﷺ کی طرف (معاذ اللہ)

---

[1] معتبر، بارعب

منسوب کی جاتی ہے۔ میں اس روایت کے نفسِ مضمون کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اُس دَور کے اندر ایک ذہنِ انسانی نے ایسی بات کہی۔ لیکن جب آپ یہ کہیں گے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے تو یہاں میں پھسل جاؤں گا۔ اس معاملے میں ہزار علماء ومفسرین غلطیاں کھا سکتے ہیں۔ وہ رسول ﷺ جس کا سینہ اس وحی خداوندی کا مہبط ہے اور جسے علمِ خداوندی حاصل تھا، وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ یہ تمہاری ایک الگ بات ہے کہ کسی انسان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اور وہ تم سے اس طرح کہے لیکن اگر رسول ﷺ کچھ کہے گا تو وہ ایسی بات کبھی نہیں کہے گا۔ ایسی باتوں کی ان ﷺ سے نسبت ہی غلط ہے۔ یہ ہماری کم مائیگی کی اصلی وجہ کی صرف ایک مثال ہے۔ یہ روایات کی تعدیل وجرح کی ایک دوسری بات آئی۔

زمین کے متعلق ارشادِ خداوندی

عزیزانِ من! قرآن کریم نے سرچشمہ حیات کے متعلق کہا ہے کہ **كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ** (11:7) زندگی کے سرچشمہ پر مرکزی کنٹرول خدا کا ہے۔ بہرحال بات یہ چلی آ رہی تھی کہ ابتدائی دَور میں یہ سب ایک ہی ہیولا (Nebulae) تھے۔ کُرۂ ارض اس اولین ہیولیٰ سے یوں الگ ہوا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ تو اس طرح زمین الگ ہوگئی ہے۔ اب سوال تو اُس سب سے بڑی اور اگلی بات کا ہے، جو گیلی لیو (Galileo:1564-1642) نے کہی کہ زمین گھوم رہی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ** (21:31) اور ہم نے زمین کو ایسا بنا دیا کہ وہ گھومتی بھی رہے اور انسان اس پر اطمینان سے سکونت پذیر بھی رہے (16:15)۔ نیز اس میں بڑے بڑے پہاڑ بھی بنا دیئے (جو واٹر ورکس کا کام بھی دیتے ہیں اور دیگر سامانِ زیست کے ذخائر کا بھی)۔ دوسری جگہ ہے کہ **وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ** (16:15) اور اس نے زمین کو ایسا بنا دیا کہ تم اس پر آرام سکون سے بیٹھے رہو اور وہ تمہیں لے کر گھومتی رہے اور اس میں پہاڑ پیدا کر دیئے (جو تمہارے واٹر ورکس کا بھی کام دیتے ہیں اور طرح طرح کے دیگر فوائد اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں: **تَمِيْدَ بِهِمْ** (21:31)۔ اور وہاں **تَمِيْدَ بِكُمْ** (16:15) ہے۔ یہ ''تمید'' بڑی معنی خیز چیز ہے۔ اس کا مادہ تو ''م ی د'' ہی ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی چیز کا بڑی تیزی سے متحرک[1] ہونا اور ''بکم'' کے معنی ہیں: تمہیں ساتھ لیے ہوئے۔ اس تیزی سے یہ زمین متحرک ہے، تمہیں اس سے سامانِ رزق بھی مل رہا ہے، تم نہایت اطمینان وسکون سے اس پر بیٹھے ہوئے بھی ہو اور یہ اس طرح سے تمہیں ساتھ لیے ہوئے گردش میں چلی جا رہی

---

[1] عربی کے مشہور لغت ''تاج العروس اور محیط المحیط'' میں ہے کہ ''ماد'' کے معنی ''شدت سے ہلنا اور حرکت کرنا بھی ہیں۔'' نیز جھکنا۔ مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں: زمین اسے لے کر گھومی۔ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے ''مقاییس اللغۃ'' میں اس مادہ کے بنیادی معنی (1) حرکت اور (2) نفع پہنچانا لکھے ہیں۔ ''تاج العروس اور محیط المحیط'' میں ان تمید بکم (16:15) کے معنی یہ لکھے ہیں کہ ''تم اس پر اطمینان سے سکونت پذیر رہو اور یہ تمہیں لے کر گھومتی رہے۔''

ہے۔ دونوں ہی چیزیں ایک ہی لفظ ''تمید'' میں اور ''بھم'' یا ''بکم'' میں آ گئی ہیں' یہ اس قدر تیزی سے متحرک ہے۔ وہاں (21:33) میں تو یہ تھا کہ یہ فضا کی پہنائیوں کے اندر تیر رہی ہے۔ پھر دوسری چیز یہ ہے کہ یہ اس تیزی سے متحرک ہے۔ جو شے اتنی تیزی سے متحرک ہو اس پہ تو کوئی ٹک نہیں سکتا' ٹھہر نہیں سکتا۔ ذرا کسی رسی کو گھما کے اس پر ذرا سا تنکا ہی رکھیے تو وہ اڑ کر دُور چلا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ کس تیزی سے یہ متحرک ہے اور پھر تم کس اطمینان سے اس پر بیٹھے ہوئے ہو۔ وہ جو میں نے اسی درس کے دوران رشیا (روس) کے Scientists (سائنسدانوں) کی رپورٹ پڑھی تھی' اس میں یہ تھا کہ یہ جو ہمارے اوپر کُرّہ فضائی' Atmosphere ہے' ہم اسے فضا ہی صرف کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ زمین کے مدار (Orbit) سے راکٹ نکل کر آگے گیا تھا۔ وہ قریباً بارہ میل کا فاصلہ تھا۔ اس طرح سے اس فضا کی چوڑائی یہ 12 میل ہے' اور یہ بڑی اہم چیز ہے' جو انہوں نے اس علم کے ذریعے کہا۔ اس میں فرق یہ نظر آیا کہ وہاں اس فاصلے کے اوپر یہ فضا نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کروں کے ہاں کی جو Surface (سطح) ہے وہ اتنی کچھ پتھریلی سی ہوگئی ہے' جو اس سے بڑی مختلف نظر آتی ہے۔ زمین کے اوپر یہ ایک ایسی فضا ہے جس کی وجہ سے اس کی Surface (سطح) محفوظ رہی ہے۔ اس کے اوپر ان چیزوں کی' وہ یورش نہیں ہوئی۔ یہ جو اس کے اوپر کی خصوصیت سے ایک چیز ہے' قرآن اسے ''سقف'' کہتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا** (21:32) اور تمہارے اوپر یہ جو پہلی بلندی ہے' یہ ہم نے تمہارے لیے چھت بنائی ہے' خود بھی محفوظ ہے اور تمہیں بھی اوپر سے گرنے والے شہابِ ثاقب [1] کی تباہی سے حفاظت میں رکھتی ہے۔ سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ کروڑہا سال سے یہ کُرّے اتنی تیزی سے گردش کر رہے ہیں اور ان میں سے' اب بھی اس رپورٹ کے مطابق' جو Elements (عناصر) ہیں' وہ وہاں سے نکل کر دُور دُور چلے جاتے ہیں۔ اُن میں سے وہ جو قدرے ذرا سے کمزور واقع ہوئے ہیں' وہ دوسروں سے پھٹ کر الگ ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہاں تخلیق ارض و سمٰوٰت کے وقت یہ ہوا ہے۔ چونکہ وہاں آج Atmosphere نہیں ہے۔ اس لیے اس قسم کے Elements (عناصر) ان میں سے نکلتے بھی ہیں اور ان کے اوپر آ کے گرتے بھی ہیں۔ یہ جو آپ کے شہابِ ثاقب ہیں یا یہ جو دم دار تارہ ہم کبھی کبھی دیکھتے ہیں' یہ کیا ہے؟ یہ جو اوپر اجرامِ فلکی ہیں'

---

[1] جنہیں ہم ''ٹوٹنے والے تارے'' (Meteors) کہتے ہیں وہ درحقیقت نظامِ شمسی (Solar System) کے چھوٹے چھوٹے اجرام ہوتے ہیں' جو کششِ ثقل (Gravitational Force of Attraction) کی قوت سے ٹوٹ کر نیچے گرتے ہیں اور ان کے پتھریلے ٹکڑے بارش کی طرح برستے ہیں۔ بعض اوقات کرہ ارض اس ''بارش'' کے راستے میں آ جاتا ہے لیکن اس کے اوپر کی فضا ان پتھروں کو پیس کر رکھ دیتی ہے۔ جسے ہم ''ٹوٹا ہوا تارہ'' کہتے ہیں۔ وہ ان کی چمکنے والی راکھ (Ashes) ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ پتھر اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ فضا سے پس کر راکھ نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کے بعض ٹکڑے زمین پر گرتے ہیں لیکن یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ فضا میں پس جاتے ہیں۔ اگر فضا ان ''پتھروں کی بارش'' کو پیس کر راکھ نہ بنا دے تو زمین پر زندگی محال ہوئے۔ یوں یہ فضا ''ہمارے لیے'' ''محفوظ چھت'' کا کام دیتی ہے۔

یہ جو بڑے بڑے کُرّے ہیں، ان میں سے کبھی کبھی کوئی ٹکڑا چھوٹ کے اِدھر نکل آتا ہے، تو وہ یہ شہاب ثاقب ہیں۔ یعنی یہ سورج زمین سے 13 لاکھ گنا بڑا ہے۔ ان کروں میں سے کچھ نکلے گا تو وہ تو پتہ نہیں ہمالیہ پہاڑ جتنا ہوگا یعنی وہ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ وہ وہاں ان اجرامِ فلکی سے نکلتے ہیں تو آپ سوچیے کہ اگر وہاں وہ ایک اتنا بڑا ٹکڑا نکلے اور آ کے سیدھا زمین پہ گرے تو یہاں حشر کیا ہو۔ کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ سنیے Scientist (سائنسدان) کیا کہتا ہے؟ کہ یہ جو زمین کا Atmosphere (فضا) ہے، یہ ایسی محفوظ چھت ہے جس کی وجہ سے ہم بچے ہوئے ہیں۔ جب ٹکڑے اس فضا کے اندر آتے ہیں تو اس کی رگڑ (Friction) سے وہ پس جاتے ہیں، راکھ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ذرا سخت جان سا تھوڑا سا ٹکڑا بچ جائے تو وہ جو کبھی کہتے ہیں کہ وہ اوپر سے گرا ہے اور فلاں جگہ اتنا بڑا ٹکڑا ہے، وہ یہی ہوتا ہے۔ کبھی ہی ایسا ہوتا ہے کہ یہ کچھ ہو جائے ورنہ ان کی صورت یہی ہوتی ہے کہ وہ اس میں آتے ہیں تو اس کی گردش میں پس کر راکھ ہو جاتے ہیں اور یہ جو آپ کو اس راکھ کے اوپر روشنی نظر آتی ہے وہ اس لیے ہے کہ اگر کسی کُرّے کی شعاع اس وقت پڑ رہی ہو تو وہ تمہیں اتنے وقت کے لیے روشن نظر آتا ہے اور یہ جو پس کے اس کے اندر ان کی Dust (گرد) جمع ہوتی ہے، یہی نہیں ہے کہ ہم اس ٹکڑے کی تباہی سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ یہ جو ہمارے ہاں روشنی آتی ہے، ان ذروں کے صدقے میں ہے کہ یہ چمکتے ہیں، تو زمین چمکتی ہے یااللہ! سچ کہا تھا قرآن کریم نے کہ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (21:32) اس کرہِ ارض کے اوپر ایسی فضا (Atmosphere) پیدا کر دی جو خود بھی محفوظ ہے اور زمین کے اوپر رہنے والوں کو اوپر سے گرنے والے شہابِ ثاقب کی تباہی سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اسی طرح یہ جو تمہارے اوپر Atmosphere (فضا) بنایا ہے، یہ سقفِ محفوظ ہے جس سے تم بچے ہوئے ہو۔

خداوند تعالیٰ کی بے پناہ نوازشات کا ذکر خیر

عزیزانِ من! کُرّہ زمین کے اس سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے کہ ''ہم نے زمین کو ایسا بنا دیا کہ وہ گھومتی بھی رہے اور انسان اس پر اطمینان سے سکونت پذیر بھی رہیں (16:15)۔ نیز اس میں بڑے بڑے پہاڑ بنا دیئے (جو واٹر ورکس کا کام بھی دیتے ہیں اور دیگر سامانِ زیست کے ذخائر کا بھی)۔ اور وانھر وسبلا (16:15) اور دریا اور خشکی کے راستے، اور ان میں درّے رکھ دیئے تا کہ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا (21:31) ان سے راستوں کا کام لیا جا سکے۔ اور کُرّہِ ارض کے اوپر ایسی فضا (Atmosphere) پیدا کر دی جو خود بھی محفوظ ہے اور زمین کے رہنے والوں کو اوپر سے گرنے والے شہابِ ثاقب کی تباہی سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (21:31) تا کہ تمہیں راہنمائی مل سکے۔ زمین ہی متحرک نہیں ہے بلکہ یہ باقی کُرّے بھی متحرک ہیں۔ ان کے اس تحرک سے جو فضا یا جو دیگر نتائج مرتب ہونگے تو وہ الگ رہے، قرآن نے کہا ہے کہ تم نے دیکھا ہے کہ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (10:67) رات آ جاتی ہے جس سے تم آرام کرتے ہو۔ یہ رات تمہارے لیے کس قدر سکون افزا تھی۔ پھر دن آ جاتا ہے جس کی روشنی میں تم اپنا کاروبار

کرتے ہو۔ اس طرح قرآن نے واضح کیا ہے کہ رات سکون کے لیے ہے' یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ عزیزانِ من! جن کے لیے رات رات نہیں ہوتی' یعنی جنہیں نیند نہیں آتی' ان سے پوچھیے کہ رات کتنی نعمت ہے۔ سارے دن کی کوششوں کے تھکے ماندے اعصاب اس قدر سکون پا لیتے ہیں کہ دوسرے دن آپ تر و تازہ پھر اٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے یہ کیسے پیدا ہوا؟ عزیزانِ من! ذرا اس پہ غور و خوض تو کرو۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (21:33)۔ خدا وہ ہے جس نے (زمین کی گردش سے) رات اور دن' یکے بعد دیگرے' آنے کا سلسلہ قائم کیا اور سورج چاند بنائے۔ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (21:33) ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ اسی طرح چاند اور سورج اور زمین کی گردش باہم سے ایک بات تو تمہارے لیے بھی یہ ہوئی کہ دن اور رات تمہارے لیے الگ الگ ہو گئے اور رات میں تم آرام پاؤ اور دن میں کام کرو۔ آپ نے غور فرمایا: عزیزانِ من! یہ چند سورۃ الانبیاء کی آیتیں اور اس کے ساتھ جو میں نے دیگر مقامات کی یہ آیات ملائی ہیں تو کیا حقیقت نکھر کر سامنے آئی۔ آج کے جو Scientists (سائنسدان) ہیں اگر یہ آیات ان کے سامنے اس انداز سے رکھ دی جائیں تو وہ کس طرح وجد میں آ جائیں۔ یہ چودہ سو سال پہلے کی چیز ہے۔

کاش! ہم نے قرآنِ حکیم کی اس تعلیم پر غور کیا ہوتا

عزیزانِ من! اگر ہمارے سامنے' اس انداز میں' ہزار برس پیشتر یہ معنی آ گئے ہوتے تو آج سائنس کی دنیا میں امامتِ کبریٰ اسی قوم کے ہاتھ میں ہوتی جسے قرآن نے کہا تھا کہ تم ملتِ ابراہیمیؑ کے پیرو ہو اور ابراہیمؑ کو ہم نے **انی جاعلک للناس اماما** (21:24) بنا دیا یعنی دنیا کی لیڈر شپ اس قوم کے ہاتھ میں ہوتی۔ قرآن نے اسی لیے اس قسم کی تمام آیات بیان کرنے کے بعد' یہ جتنے بھی ارضی اور سماوی نظام کا جو سلسلہ ہے وہ بیان کرنے کے بعد' کہا ہے کہ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (15:77) یہ مومنین کے لیے حقیقت شناسی کی نشانیاں ہیں۔ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (16:67) یہ ان لوگوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (16:11) یقیناً اس تمام سلسلۂ تخلیق میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے خدا کے نظامِ ربوبیت اور کائنات کے بالحق پیدا کیے جانے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اندازہ لگائیے' یہ جو چیز ہے کہ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُو الْاَلْبَابِ (13:19) انہی لوگوں کے سامنے حقیقت آ سکتی ہے جو عقل و دانش سے کام لیں۔ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (3:191) ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لیے جو زندگی کے ہر گوشہ میں کھڑے بیٹھے لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور تحقیقات کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (13:191) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ اب یہاں مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اٹھتے

بیٹھتے لیٹتے ان آیاتِ خداوندی کے اوپر غوروخوض کرتے ہیں کیونکہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ (3:190) کائنات کی پیدائش اور رات دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ لیکن یہ بات غور وفکر سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

مومن اور کافر میں فرق

عزیزانِ من! مومن کی یہ صفت تھی کہ وہ زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے' بیٹھے' لیٹے' قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غوروفکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد' علیٰ وجہ البصیرت' پکار اٹھتے ہیں کہ اے بارِ الٰہی! تو نے اس کارگہہِ ہستی کو نہ عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔اسی لیے عزیزانِ من! بات شروع ہوئی ہے کہ اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا (21:30) کیا وہ لوگ جو کفر اختیار کرتے ہیں' کبھی انہوں نے ان چیزوں پہ غور کیا ہے کہ یہ سلسلہ ارض وسما کیسے تخلیق میں آیا' کس طرح سے چل رہا ہے' اس کی کیا ابتداء تھی' کیسے یہ ابتدا میں ایک ہی ہیولیٰ تھا پھر کیسے الگ الگ ہو گئے؟ آج کیا ہو رہا ہے؟ کفر یہ ہے کہ ان پر غور وفکر نہ کیا جائے۔ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر غور وفکر کیا جائے اور یہ سارا کچھ ان آیات میں دینے کے بعد خدا نے کہا کہ وَهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ (21:33) لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان حقائق سے منہ پھیرے رہتے ہیں' کائنات میں جو خدا کی بکھری ہوئی جو نشانیاں ہیں' یہ ان سے اعراض برتتے ہیں' پہلو تہی کر کے ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ان آیاتِ خداوندی سے اعراض برتنا' پہلو تہی کرنا' ایک طرف ہو کے نکل جانا' غور وفکر نہ کرنا' قرآنِ کریم نے کفر بتایا ہے۔مومن کا تو فریضہ یہ بتایا تھا کہ وہ ان چیزوں پر غور وفکر کرتے ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام میں جو اتنا یقینِ محکم پیدا ہوا تو کس چیز پہ ہوا؟ اس پہ کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سماوات والارض دکھا دے کہ اس میں کائنات کی قوتیں ہمارے جلال وکبریائی سے اس طرح کارفرما ہیں۔یہ اتنا بڑا عظیم الشان نبی ہے۔یہ انبیاء کرام علیہم السلام صرف آپ کو وعظ ونصیحت کرنے کے لیے نہیں آتے تھے' وہ یہ بھی بتانے کے لیے آیا کرتے تھے کہ تخلیق ارض وسمٰوٰت پہ غور کرو۔یہ ہے خدا کی اطاعت جو نبی اکرم نے اس کتاب کے ذریعے سے ہمیں بتائی۔میں نے آپ کو آیات کے حوالے دیدیئے ہیں' انہیں دیکھ لیجیے گا' خود دیکھ لیجیے گا۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھا جائے نہ کہ تراجم سے

عزیزانِ من! میں پھر بار بار کہا کرتا ہوں کہ اللہ کرے کہ آپ اتنی عربی پڑھ لیجیے گا۔قرآن کریم کو ترجمے سے نہ دیکھیے گا۔اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔قرآن کی آیات کو لیجیے گا اور یہ جو چیز میں نے آج کے درس میں بیان کی ہے' یہ بھی اپنی طرف سے نہیں ہے' قرآن نے قرآن کے سمجھنے اور قرآن کو حق ثابت کرنے یا اس کے حق ثابت ہونے کے لیے یہ طریق بتایا تھا اور وہ یہ طریق ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) ہم عالم آفاق میں اس خارجی کائنات میں، عالمِ انفس میں، انسان کے اپنے نفس کی دنیا میں، اپنی آیات کو بے نقاب کرتے چلے جائیں گے یہ انگریزی میں Discover ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں لفظ ہی، یہ استعمال کیا ہوا ہے کہ جو پردہ پڑا ہوا ہے، اس کو اٹھا دیا جائے، یہ Discovery ہے۔ ہاں تو جب وہ پردہ اٹھے گا، تو کیا نظر آئے گا؟ کہ **اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) قرآن نے واقعی سچی بات کہی تھی۔ کائنات پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں، ان میں سے ہر پردہ اٹھنے کے بعد اندر سے یہ حقیقت نظر آئے گی کہ **اَنَّهُ الْحَقُّ** (41:53) یہ واقعی الحق ہے۔ The Truth ہے۔ یہ قرآن کریم کو سمجھنے کا ایک طریق ہے۔

کعبہ کو پاسباں مل گئے صنم خانے سے

عزیزانِ من! آفاق کی دنیا میں ان Scientists (سائنسدان) نے قریباً دو تین سو سال سے اس پر پڑے ہوئے پردوں کی نقاب کشائی شروع کر رکھی تھی۔ یہ کچھ ماہرین علوم طبیعات یا مختلف علومِ سائنس کے ماہرین کر رہے ہیں اور جب ہر پردہ اٹھتا ہے تو اس کے نیچے سے ان کے ہاتھوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ قرآن کی صداقت کی دلیل بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ تو یوں ہوا گویا کہ پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔ اور اُدھر ہم ہیں کہ انہیں جھٹلاتے چلے جاتے ہیں۔ جب یہ پہلی دفعہ واقعہ ہوا کہ چاند پہ پہنچ گئے تو آپ کے ہاں کے محراب و مسجد کے اندر ان کے متعلق پھبتیاں اڑائی جاتی تھیں، طنز کیے جاتے تھے۔ اتفاق سے جب یہ شروع میں گئے تو وہ چاند کی چودھویں تاریخ تھی، بہت زور کا وعظ ہوا تھا۔ میرے پاس یہ بیچارے طالب علم بھاگے ہوئے آئے۔ کہنے لگے جی! مولوی صاحب نے فرمایا ہے: کہ یہ ہم کو فریب دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چاند پہ گئے ہیں۔ آج تو یہ چاند اتنا بڑا ہے تو چلے گئے، اب جو چودھویں کے بعد آہستہ آہستہ یہ سمٹنا شروع ہوگا تو پھر تم انہیں دیکھو کہ یہ سمٹتے ہوئے ادھر آتے جائیں گے، ادھر آتے جائیں گے'' تے جدوں 29 ہوئی تے فیر کتھے جاؤ گے۔ او منڈیاں نے مینوں آن کے ایویں ای دسیا کہ پوچھو ایناں نوں کہ جدوں 29 ہوئی، تے فیر کتھے جاؤ گے۔''[1] بچو! ہمارے ہاں مومن کا شعار تھا کہ وہ ان پڑے ہوئے پردوں کو اٹھائے اور دنیا کو بتائے کہ ہر سامنے آنے والی حقیقت قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی دلیل بنتی ہے۔ مگر حیف! کہ ہماری آج بھی یہ صورت ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں، یہ سارا ہی جھوٹ ہے جو یہ کہہ دیتے ہیں۔ وہ اب بھی نہیں مان رہے لیکن قرآنِ کریم نے خود کہا ہے کہ اس کے الحق ہونے کی شہادات یہ نفس اور آفاق پہ پڑے ہوئے پردے ہیں۔ جب یہ اٹھتے چلے جائیں گے تو اس کے ہر دعوے کی صداقت کی دلیل بنتے چلے جائیں گے۔

---

[1] جب 29 ویں تاریخ ہوگئی تو پھر کہاں جاؤ گے۔ ان لڑکوں نے آکر مجھے یہی بتایا کہ جب چاند کی 29 تاریخ ہوگی تو پھر اے احمقو! کہاں جاؤ گے؟ (چاند تو ختم ہوگیا ہوگا)

قرآنِ حکیم کے حقائق پر کسی کی اجارہ داری نہیں

عزیزانِ من! انفس و آفاق پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانا ہمارا کام تھا' کسی اور کا نہیں تھا لیکن قرآن کوئی ہماری Monopoly (اجارہ داری) نہیں ہے۔ یہ نوعِ انسان کا قرآن ہے۔ جو بھی اس پر غور کرے گا' اس کے سامنے یہ حقیقتیں ابھر اور نکھر کر آتی چلی جائیں گی اور دیکھو کہ عالمِ آفاق پر تو یہ بات شروع ہو گئی تھی' عالم انفس پر ابھی شروع ہوئی ہے۔ یہ جسے آپ سائیکالوجی (علم نفسیات) کہتے ہیں' اس میں بھی آہستہ آہستہ بڑے عجیب انکشافات ہو رہے ہیں' اگرچہ یہ ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہے اور ابھی سائنس نہیں بنی لیکن عزیزانِ من! معلوم نہیں آگے چل کر یہ کتنے بڑے انکشافات کرے اور جو کچھ قرآن کے اندر نفس کے متعلق آیا ہے' اس پہ بھی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ علم ان پردوں کو اٹھا دے اور حقائق ابھر کر سامنے آ جائیں۔ ہمارے ہاں تو مذہب کی دنیا میں تزکیۂ نفس سے مراد نفس کشی بمعنی نفس کو مارنا ہی ہے اور یہی ہمارے ہاں کی معراج ہے۔

ہمارے ہاں تزکیۂ نفس کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ** (13:11) کسی قوم کی خارجی زندگی میں کوئی تغیر نہیں آ سکتا **حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ** (13:11) تاوقتیکہ ان کے نفس کی دنیا کے اندر تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ اس طرح خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ اس Psyche (نفس) کی دنیا کو وہ اتنی اہمیت دیتا ہے۔ منتہیٰ یہ ہے کہ ہمارے ہاں شروع سے اس کے پیچھے لٹھ لے کے پڑے ہیں' کیا کہا جائے' عزیزانِ من! قرآن کی حامل قوم کی یہ کیفیت ہے؟ اور پھر یہ دیکھنے کے لیے ہم کمیشن بٹھاتے ہیں کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ عزیزانِ من! میں نے آپ کا وقت تو زیادہ لیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ متفق ہوں گے کہ ہمارا یہ وقت ضائع نہیں گیا اور یہ بات یوں تکمیل تک پہنچنی چاہیے تھی۔ ابھی میں نے اجرامِ فلکی کا اتنا سا گوشہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ فلکیات سے متعلق اجرامِ فلکی کا جو علم ہے یہ اس کا تھوڑا سا گوشہ ہے۔ قرآن کے اندر اس قسم کی بہت سی اور آیات ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ریسرچ اسکالر اپنے اپنے شعبے کے اندر بیٹھتے اور اس شعبے سے متعلق قرآنِ کریم کی آیات لیتے اور پھر یہ تحقیق کرتے لیکن بہرحال جو بھی اس پر تحقیق کرے گا انفس و آفاق پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے چلے جائیں گے اور حقائق سامنے آتے چلے جائیں گے۔ قرآن تو نوعِ انسان کے لیے ہے۔ اس اعتبار سے اگر آج کے درس میں ہم دیکھیں ہم کہاں تک پہنچے ہیں تو بات یوں کہہ لیجیے کہ ہم آیت 33 تک پہنچ گئے ہیں۔ جس میں کہا تھا کہ **وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ** (21:33) خدا وہ ہے جس نے (زمین کی گردش سے) رات دن یکے بعد دیگرے' آنے کا سلسلہ قائم کیا اور سورج اور چاند بنائے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار (Orbit) میں تیزی سے تیر رہا ہے۔

عزیزانِ من! ہم آئندہ ہم آیت 34 لیں گے لیکن اگلے درس میں ایک دفعہ پھر ان آیات کو پڑھ کر ان کا رواں سا مفہوم بھی پیش کروں گا تاکہ درس کا تسلسل اسی طرح سے قائم رہے۔ آگے بات کچھ اور شروع ہے۔ یہ سارا کچھ لانے کے بعد میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ ایف ایس سی کے اسٹوڈنٹ (طالب علم) کو یہ کچھ پڑھا رہا ہے کہ جاؤ امتحان پاس کرو اگر پاس نہ ہو تو پرچے نقل کر لیا کرو۔ وہ تو ان علوم کی ایک ایک چیز ہے جو قرآنِ کریم دیتا ہے۔ اس کے سامنے تو انسان کی منزل کا ایک نصب العین ہے۔ وہ اس نصب العین کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے یہ دلائل و شواہد دیتا ہے لہٰذا وہ بات کو وہاں پہنچاتا ہے۔ آیات اور ان کے یہ حقائق مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہ تو کسی مقصد کی طرف لے جانے کے ذرائع ہیں۔ آگے بات ہوئی ہے کہ ہمارے قوانین کی صداقتیں ان آفاقی نشانیوں سے سمجھ میں آ سکتی ہیں لیکن ان لوگوں کا اصرار ہے کہ رسول کو ایسی نشانیاں پیش کرنی چاہئیں جو ان قوانین فطرت (Laws of Nature) کے خلاف ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کوئی مافوق البشر ہستی ہے۔ ان سے کہو کہ رسول عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں اور اپنے وقت پر وفات پا جاتے ہیں۔ اس لیے ان سے کہو کہ **وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَائِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ o كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَ نَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَ الۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَ اِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ o** (21:34-35) تجھ سے پہلے بھی ہم نے کوئی انسان ایسا نہیں بنایا جو ہمیشہ کے لیے زندہ رہا ہو۔ نہ ہی تیرے لیے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ پھر اگر تیرے لیے ایک دن مرنا ہے تو یہ کون سے ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں؟ دنیا میں ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ (باقی رہی یہاں کی زندگی اور اس کے حوادث (Events) سو ان میں تم سب اچھی بری حالتوں کی کٹھالیوں سے گزرتے ہو تاکہ تمہاری مضمر صلاحیتوں (Latent Faculties) کی نمود (Development) ہو جائے۔ تمہاری ہر نقل و حرکت کا رخ ہمارے قانونِ مکافات (Law of Requital) کی طرف ہے۔ تم اس سے الگ ہٹ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ تو یہ ہے وہ نصب العین جہاں قرآن پہنچانا چاہتا ہے لیکن یہ بات کا دوسرا موضوع آ جاتا ہے جہاں اس نے پہنچانا ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔

آج ہم اس سورۃ کی آیت نمبر 33 تک آ گئے ہیں، 34 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

❀......❀......❀

پانچواں باب: سورۃ الانبیاء (حقائقِ کائنات)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۳۳

عزیزانِ من! آج اگست 1976ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کے متعلق یوں کہیے کہ سابقہ درس میں متفرق طور پر سورۃ الانبیا کی آیت 33 تک ہم پہنچ گئے تھے:(21:33)۔ وہ درس کچھ Academic Nature کا سا' عارضی کائنات کے حقائق پر مشتمل تھا' لیکن میں نے یہ دیکھا کہ احباب نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور ہفتہ بھر سے کچھ استفسارات بھی ہوتے رہے' کچھ مزید وضاحتیں بھی طلب کی جاتی رہیں۔ تو پھر اس سے مجھے خیال گزرا کہ واقعی اس کے ضمیمہ کے طور پر ایک درس یا درس کا کچھ مزید حصہ مجھے صرف اسی نکتے پر مختص کرنا چاہیے تو آج کا درس بھی میں سمجھتا ہوں کہ انہی حقائق کی مزید توضیح لیے ہوئے ہوگا۔

خارجی کائنات کی ساخت کی حقیقت اور اس کے کنٹرول کا مقصد

عزیزانِ من! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس درس میں جو کچھ میں نے کہا تھا اس کا تعلق تو خارجی کائنات کی Scientific (سائنسی) دنیا سے تھا کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟ اس کا ابتدائی ہیولا کیا تھا؟ کس طرح کے چھینٹے اڑے' الگ الگ کرے بنے' اور پھر کس طرح سے کُرّے اپنے اپنے فلک میں' اپنے اپنے مدار میں' مصروفِ گردش ہیں؟ پھر اس میں زندگی کی نمود کیسے ہوئی؟ یہ چیز حقیقت پر مبنی ہے کہ جہاں کہیں بھی رطوبت ہوگی' Moisture (نمی) ہوگی' وہاں زندگی کا امکان ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دوسرے کرّوں میں بھی زندگی کا امکان ہے اور قرآن کی رو سے یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کرّوں میں اور زمین میں کسی دن باہمی ربط بھی پیدا ہوجائے گا۔ یہ تمام حقائق میں نے قرآنی آیات کی رو سے پچھلے درس میں پیش کیے تھے۔ لیکن قرآن کریم' جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا' کوئی سائنس کی نصابی کتاب نہیں ہے۔ اس کتاب کے سامنے تو ایک متعین نصب العین ہے۔ اس کی تعلیم کا ایک نقطہ ماسکہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ ہے اور وہ قانون ایک ہی صاحبِ اقتدار کا دیا ہوا ہے' ان اشیاء میں سے کسی شے کا خود وضع کردہ نہیں ہے۔ یہ کائنات اس قدر عظیم القدر اور محیر العقول ہے کہ اِس کی وسعت کا تصور بھی ذہنِ انسانی میں نہیں آسکتا۔ اس میں تمام جگہ Uniformity of Law ہے یعنی قانون کی وحدت کارفرما ہے' اور یہی عمل ہمیں توحید کی طرف لے جاتا ہے کہ اختیارِ قانون کا

سرچشمہ ایک ہے۔ اوراس حقیقت سے تو آپ آگاہ ہیں کہ قانون میں وحدت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب قانون دینے والا' اور بنانے والا ایک ہی ہو۔ اگر کائنات میں مختلف الٰہ ہوں تو قوانین میں اختلاف پیدا ہوگا۔ الٰہ کے معنی ہی صاحبِ اقتدار اور قانون دینے والے کے ہیں۔ تو قوانین میں اختلاف پیدا ہوگا تو وہ یہاں تک بات لاتا ہے اوراس کی تائید میں شواہد پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان پہ غور کر کے دیکھو کہ کیا انسان اسی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتا کہ یہاں اس ساری کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے اور یہ کہ قرآن یہ تمام چیزیں اپنے اس نصب العین کی تائید وضاحت کے لیے بطورِ شہادات پیش کرتا ہے۔

ان کائناتی کلیات کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ کیا قرآنِ کریم یہ چیزیں صرف Scientific (سائنسی) اصولوں یا سائنسی کلیات کے طریقے پہ پیش کر کے آگے بڑھ جاتا ہے یا ان میں ہمارے لیے کوئی تعلیم' کوئی پیغام' کوئی تلقین' کوئی تاکید بھی پوشیدہ ہے؟ دراصل وہ تو ہمارے ہی لیے کچھ ہونا چاہیے۔ اگر سائنس کے کلیے کو بیان کر کے وہ یونہی آگے بڑھ جائے تو ہمیں اس سے کیا فائدہ ہے کہ ہماری بلا سے یہ ساری کائنات پہلے ایک دخان تھی' پھر رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30)۔ شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولیٰ (Nebula) ملا جلا تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کُرّے الگ الگ ہوگئے۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا (79:30) اور پھر اُس نے اِس ہیولیٰ سے ارض (زمین) کو الگ کر کے یوں دور پھینک دیا جس طرح گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کا علمی انکشاف بھی یہ ہے کہ اولین ہیولیٰ (Nebula) کی تیز گردش سے جو چھینٹے اڑے' وہ اِن کروں کی شکل میں گردش کر رہے ہیں۔ اس سے قرآنی مثال کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی اس ہیولیٰ سے کرۂ ارض یوں اڑ کر الگ ہوا جس طرح تیزی سے گھومنے والے گوپیے سے نکل کر پتھر دُور چلا جاتا اور گھومتا رہتا ہے کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ٹھیک ہے ہوا کرے' ہمیں کیا؟ دراصل بات یہاں سے آگے چلتی ہے کہ ہمارا اس کائنات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں Objectively' خارج میں کھڑے ہوئے' ایک تماشائی کی طرح ان چیزوں کو دیکھتے رہیں اور یہ کہیں کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے: ایک ہی قانون ہے جس کی یہاں کارفرمائی ہو رہی ہے' اس سے زیادہ یہ ہمارے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ یہ کلامِ الٰہی ہمارے ہی لیے ہے۔ یہ کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس طرح سے یہ سائنس کے کلیے اور اصول بیان کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ تو ہمارے ہی لیے ہے اوراس کائنات کے ساتھ ہمارا گہرا تعلق بتاتا ہے۔

وارثِ کتاب امت کے خلاف ایک گہری سازش کا ذکر

عزیزانِ من! اس کائنات کے ساتھ ہمارے گہرے تعلق کی حقیقت کے نظروں سے اوجھل ہو جانے' یا اوجھل کرا دینے کی وجہ سے' میں اس پہ زور دیتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جو ہمارے یعنی اس کتاب کی وارث امت کے خلاف ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ

اس کتاب کو سینے سے تو لگائے لگائے پھرتی رہے لیکن اسے یہ معلوم ہی نہ ہونے پائے کہ اس کا ہمارے ساتھ بھی کچھ تعلق ہے۔ اگر یہ کتاب سائنس کے کلیے بیان کرے تو وہ کہے کہ جی ہاں' سبحان اللہ' کیا بات ہے! جناب' شمس و قمر کے متعلق بھی بات کہہ دی ہے۔ اور پھر اس بات کو یہ سمجھا جائے کہ یہ ہمارے متعلق نہیں کی ہے۔ اس موجودہ سازش کے تحت تو اس قرآن میں ہمارے متعلق کچھ ہے ہی نہیں' سوائے اس کے کہ اس کی آیات کی تلاوت سے ثواب ہوتا ہے اور ثواب وہ Term (اصطلاح) ہے کہ جس کا کوئی متعین مفہوم سامنے لایا ہی نہیں جاتا کہ وہ ہوتا کیا ہے؟ ''ہوتا کیا ہے'' اگر کسی مولوی صاحب سے پوچھو تو وہ کہتا ہے کہ ثواب ہوتا ہے۔ صاحب! سمجھا دیجیے کہ یہ کیا ہوتا ہے' میں جاہل سا آدمی ہوں اور یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ تسیں پنجابی اچ دس دیو۔ پنجابی اچ ثواب نہیں ہوندا۔ لے' ثواب ہوندا ای پنجابی اچ ہے۔ [1] اجی' کچھ تو بتائیے کہ یہ کیا ہوتا ہے؟ لو جی' یہ کہتا ہے ثواب بتائیے کیا ہوتا ہے؟ یعنی بات ساری یہ ہے۔ یہ سازش ہے کہ اسے اتنا مبہم رکھا گیا کہ آپ الفاظ کو' اس کی اصطلاحات کو دہراتے رہیں' اس کا متعین مفہوم آپ کے سامنے کبھی نہ آنے پائے اور جہاں یہ حقائق آتے جائیں وہاں تو ان سے پوچھیے نہیں۔ یہ پوچھنا تو ان کے نزدیک ایک مذموم سی بات ہے کہ ثواب ہوتا کیا ہے؟ اس لیے کہ وہ مردوں کو بخشوانے کے لیے جو آیتیں یا سورتیں پڑھتے ہیں' ان میں کبھی ان آیات کو نہیں لاتے جن کا تعلق حقائق کائنات سے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کچھ ایسا ثواب بھی نہیں ہوتا کہ مردے کو پہنچایا جائے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ بات غلط ہے۔ یہ کتابِ عظیم ہمارے لیے ہے' انسان کے لیے ہے' انسان کی راہنمائی کے لیے ہے۔ اس میں جو کچھ براہِ راست راہنمائی کے متعلق کہا گیا ہے یا بالواسطہ بطور تائیدات و شہادات بیان کیا گیا ہے' اس کا مقصود' اس کا نقطہ ماسکہ' انسان ہی کی راہنمائی ہے اور انسانوں میں وہ لوگ' جو اس کتاب پر ایمان لائیں' اس کی صداقت پر ایمان لائیں' ان کے لیے تو وہ سب سے پہلے ان حقائق کائنات کو پیش کرتا ہے اور یہی وہ وضاحتیں تھیں جو میں نے ضروری سمجھا کہ آج کے درس میں آپ کے سامنے پیش کروں۔

آیات کے آخر میں صفاتِ خداوندی کے بیان کرنے کی اس کی حکمت

عزیزانِ من! سورۃ الجاثیہ لیجیے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ یہ حوالے ضرور نقل کرتے چلے جائیے اور کچھ نہیں تو اس درس کے ہی کرتے چلے جائیے' یہ آپ کے کام آئیں گے۔ قرآن کا انداز دیکھیے' بات شروع کرتا ہے **تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ** (45:2)۔ یہ ضابطۂ ہدایت' اس خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے جو بڑے ہی غلبہ و اقتدار کا مالک' اور اس کے ساتھ بڑا ہی صاحب حکمت و تدابیر ہے۔ اللہ اکبر! میں نے کہا تھا کہ آیتوں کے آخر میں جو خدا کی صفات آتی ہیں' ان پہ بہت گہرائی میں اتر کے غور کرنا چاہیے' یہ ضابطہ قوانین بتدریج اتارا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے کون نازل کرنے والا ہے؟ کہا کہ خدا نازل کرنے والا ہے۔

---

[1] آپ پنجابی زبان میں بتا دیں۔ (کہنے لگا) پنجابی زبان میں (اس کا) ثواب نہیں ہوتا۔ دیکھو جی' ثواب ہوتا ہی پنجابی میں ہے۔

دیکھیے اس کی کیا ہی دو صفات العزیز الحکیم آئی ہیں! عزیز کہتے ہیں: انتہائی غلبے کا مالک۔ غلبے کا تو آپ اندازہ لگا لیجیے کہ یہ اتنی بڑی کائنات ہے اور اس پر ایسا کنٹرول ہے کہ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصہ میں بھی کسی طرح سے کم و بیش کر دے تو یہ کُرّے ٹکرا کے فنا یعنی پاش پاش ہو جائیں۔ کنٹرول کی یہ کیفیت ہے اسی لیے وہ عزیز ہے‘ لیکن یہ غلبہ و کنٹرول کسی مستبد حاکم کا نہیں ہے کہ یونہی وہ پکڑ لے۔ اس کی دوسری صفت حکیم ہے یعنی اس کا غلبہ پورے قانون کے مطابق ہے۔ حکمت کے مطابق ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ دو صفتیں کیسی آئیں: غلبہ اور حکمت۔ آپ دونوں چیزیں دیکھیے‘ یہ اس سورۃ الجاثیہ کی پہلی ہی آیت ہے جس میں تنزیل الکتٰب کا ذکر آ رہا ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ عزیز اور حکیم نے نازل کی ہے اور اگلی ہی آیت ہے۔ کہا کہ **اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ** (45:3)۔ اس کے (غلبہ و حکمت کی) نشانیاں‘ صحنِ کائنات (ارض و سما) میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ اس صحنِ کائنات میں خارجی کائنات جو ہمارے اوپر ہے وہ اسے سماوات کہہ کے پکارتا ہے اور اس کے ساتھ جو ہمارا کرّہ ہے‘ وہ اسے ارض کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اس کو کہتا ہے کہ یقین جانیے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ بھی ہے‘ اس میں آیات ہیں۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن ہر جگہ یہ لفظ آیت استعمال کرتا ہے۔ خود اس لفظ کے اندر بڑی معنوی گہرائی ہے۔ آیت ہوتی ہے ''وہ جو خود مقصودِ بالذات نہ ہو بلکہ وہ کسی بڑی چیز کی طرف اشارہ کرنے کی علامت ہو۔ میں نے کہا تھا کہ اگر کہیں کسی صحرا کے اندر کوئی پرندہ اڑتا ہوا دکھائی دے تو وہ اس حقیقت کی علامت ہوتا ہے کہ یہاں کہیں پانی ضرور ہوگا کیونکہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر کہیں دُور سے دھواں دکھائی دے تو وہ بھی اس حقیقت کی علامت ہوتا ہے کہ اس کے نیچے کہیں آگ ہے۔ اس طرح یہ دھواں اور وہ پرندہ اس چیز کی آیات بنتی ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی کتنی بڑی چیز ہے۔ تو گویا یہ جتنے بھی حقائق بیان ہو رہے ہیں‘ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ کسی بڑے مقصد کی طرف راہنمائی کی علامت بن رہے ہیں‘ آپ پہلے تو یہ لفظ آیت ہی دیکھ لیجیے کہ کتنی عظیم چیز ہے اور ہر جگہ اس نے ان چیزوں کو آیت کہا ہے‘ جہاں انسانی زندگی کا یہ مقصود ہو کہ وہ چیز کسی بڑے مقصد کی علامت ہے‘ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے وہاں یہ تمام چیزیں بجائے خویش مقصود بالذات بن جاتی ہیں جیسے آج یورپ کے Scientists (سائنسدان) یہ معلوم کر کے کہ صاحب! پہلے یہ Vapor یعنی دخان تھا‘ **رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا** (21:30)۔ یہ ہیولٰی (Nebula) ملا جلا تھا۔ پھر اس میں مختلف کُرّے الگ الگ ہو گئے اور یہ ہیولٰی کروں کی صورت میں گھومنے لگ گیا اور اس طرح یہ صحنِ کائناتِ وجود میں آیا۔ یورپ کے وہ سائنسدان اس بات کو وہاں ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کائنات آیت نہیں بنتی یہ صرف علم مقصود بالذات بن گیا ہے‘ مگر قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر تمہیں یہ معلوم بھی ہو جائے کہ پہلے یہ دخان تھا‘ پھر اس طرح سے یہ کُرّے بنے تو کیا تمہاری زندگی میں اِس سے کچھ فرق پڑا؟ کیا اسے لیبارٹری یا کلینک میں لے جانے سے تمہاری اپنی زندگی میں کچھ فرق پڑا؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ سوائے اس کے کہ بہت بڑے Scientists کہلا دیئے اسے مقصود بالذات (End in itself) سمجھ لیتے ہیں۔

خارجی کائنات کے سلسلہ میں جماعت مومنین کا فریضہ

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ سماء کا یعنی خارجی کائنات کا تمہاری زندگی پہ کیا فرق پڑا؟ وہ کہتا ہے خارجی کائنات کا یہ علم اور یہ تمام چیزیں، مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہ کسی بلند حقیقت کی طرف پہنچنے کیلئے علامات ہیں۔ اسی لیے یہاں یہ کہا کہ یہ سماوات اورارض میں لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ہیں۔ لیجیے صاحب! یہ تو مومن ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ سماوات اورارض کے اندر پھیلی ہوئی ان اتنی آیات پہ ریسرچ Research (تحقیق) کرتا۔ یہ جماعتِ مومنین کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ یہ ان کے لیے آیات (نشانیاں) ہیں۔ جو ان آیات پر غور وفکر نہیں کرتے، ان کی ریسرچ نہیں کرتے، تحقیق وتدقیق نہیں کرتے تو مومنین کے زمرے میں ہی نہیں آسکتے۔ جن کے لیے یہ چیزیں آیات نہیں بنتیں، وہ مومن ہی نہیں بن سکتے۔

مغرب کے سائنسدانوں اور قرآنی سائنسدانوں میں ایک بنیادی فرق

عزیزانِ من! اسے بارِ دگر ذہن میں رکھیے کہ مغربی اور قرآنی سائنسدانوں میں فرق ہے۔ مومنین قرآن کے سائنسدان ہیں۔ قرآن تو ان دونوں کا فرق ایک لفظِ ''آیت'' میں دے جاتا ہے۔ یورپ کے سائنسدانوں کے ہاتھوں یہ ساری ریسرچ (تحقیق) ہوئی اور ریسرچ ہونے کے بعد ان کی اپنی پرائیویٹ زندگی کو دیکھیے۔ ان کی اپنی زندگی میں قطعاً ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ وہاں کے بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) ہیں، بڑے بڑے محقق ہیں، بڑے بڑے مؤرخ ہیں۔ علمی دنیا کے اندر تو واقعی وہ بلندیوں پہ پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی پرائیویٹ لائف کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ان چیزوں کو خارجی طور پہ، محض علمی تحقیق کی رو سے، دیکھتے ہیں، مگر یہاں یہ آیات ہیں اور وہ بھی صرف لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ہیں یہ (غلبہ وحکمت کی) نشانیاں (صحنِ کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ لیکن یہ انہی کو نظر آسکتی ہیں جو) اس (خدا) کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھیں۔ دیکھیے کہ یہ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ، یہ ضابطۂ حیات (خدا کی طرف سے) نازل ہو رہا ہے۔ اس میں سماوات اورارض کی کیا چیزیں آیات للمؤمنین ہیں؟ اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَفِیۡ خَلۡقِکُمۡ (45:4) پہلی چیز تو خود تمہاری تخلیق کے اندر، یعنی انسانی تخلیق، ہی میں ہے اور پھر کہا کہ وَ مَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ (45:4)۔ اور دیگر ذی حیات میں جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ جتنے بھی متنفس ہیں، جو مخلوق سانس لینے والی ہے، وہ ساری دآبۃ کے اندر آجاتی ہے۔ کہا کہ ان کے اندر اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ (45:4)۔ یہ اس کی نشانیاں ہیں لیکن صرف اسی قوم کے لیے ہیں جو اس کے قوانین پر یقین رکھتے ہیں۔ پہلے مؤمنین کہا ہے کہ ایمان والے ہیں، اب یہاں کہا کہ یہ یقین کے ساتھ ماننے والی قوم ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان میں یقین کیسے پیدا ہوگا؟ لہٰذا اس کے لیے انسانی تخلیق اور یہ جتنے متنفس یا نفوس کہلا سکتے ہیں، ان کی تخلیق میں جو قوانین کارفرما ہیں، ان پہ غور وخوض، تحقیق، قدم قدم پر جستجو کرنا، ایمان اور یقین کی طرف لے جانے کی

علامت بنے گا۔آپ نے دیکھا کہ یہاں قرآن مومن اور جسے مومنین کہتے ہیں یعنی یقین لانے والے' کا طریق کیا بتاتا ہے۔یہ امنت باللہ والی بات نہیں ہے کہ آپ نے یہ الفاظ دہرائے یا کسی غیر مسلم کو مسجد میں بلایا' اسے چار کلمے پڑھائے اور کہہ دیا کہ صاحب! بس ٹھیک ہے جی! الحمدللہ' وہ مومن ہوگیا۔وہ ٹھیک ہے کہ جیسے ہم تھے ویسے وہ ایک اور ہم میں شامل ہوگیا مگر قرآن کہتا ہے کہ اس کا طریق یہ ہے۔ یہ آیات ان کے لیے باعث ایمان وایقان ہیں۔اسی لیے ان کو آیات کہا ہے۔یہاں ان نشانیوں میں پہلی چیز **فی خلقکم** ہے یعنی خود تخلیق انسانیت' ہر متنفس کی تخلیق' زندگی کے اولیں جرثوموں سے لے کر بڑے بڑے ثقیل الجثہ تک شامل ہیں اور یہ جو آپ کو بڑے بڑے ثقیل الجثہ ڈھانچے **وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ** (45:4) نظر آتے ہیں' جواب برفوں میں دبے ہوئے ہیں' اور دس دس کروڑ سال اور لاکھوں سال پہلے کے تھے' ان سے لے کر یعنی زندگی کے اولیں جرثومے تک' ان سب کے اندر صاحبِ ایمان وایقان قوم کے لیے شہادات ہیں' آیات ہیں' علامات ہیں۔چلیے یہ آپ بائیالوجی (Biology) کی دنیا میں آگئے۔**وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ** (45:5)۔اور دن رات کی گردش میں نشانیاں۔چلیے بائیالوجی کی دنیا سے' اب آپ اس دنیا کی طرف چلے آیئے۔کہا کہ یہ اختلاف لیل ونہار' یہ دن اور رات کی گردشِ دولابی' ذرا دیکھو تو' کہ کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اب کہا کہ **وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** (45:5)۔اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور زمین مردہ کو از سرِ نو زندگی عطا کردیتی ہے۔آیئے صاحب! بارشوں کی طرف آجایئے' نباتات کی طرف اب آگئے صاحب! دیکھ رہے ہیں کہ سائنس کا کوئی شعبہ بھی ہے جو اس سے خارج ہوجاتا ہے۔پھر کہا کہ **وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ** (45:5)۔اور ہوائیں جو مقررہ اوقات پر اپنی سمت بدلتی رہتی ہیں۔اس طرح یہ ہواؤں کا چلنا' ان کے رخ کا بدلنا' ان تمام کے اندر **اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ** (45:5) خدا کے قوانین کی صداقت کی نشانیاں ہیں لیکن صرف انہی کے لیے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیں یعنی یہ ایمان اور ایقان کے ساتھ عقل وخرد بھی لایا ہے۔انگریزی لینگویج (زبان) میں عیسائیوں نے ایمان کا ترجمہ Faith کیا۔ایمان کے اس ترجمہ Faith کے معنی میں عقل وفکر کو دخل نہیں ہے۔یہ تو بس Just to believe in it ہے جب کہ قرآن اس کا یہ ترجمہ نہیں دیتا۔ایمان وایقان کے بعد تیسری شرط میں وہ انہی کو **یعقلون** (45:5)۔کہتا ہے یعنی صاحبانِ عقل وخرد۔اور آگے' عزیزانِ من! اس آیت پہ غور کیجیے کہا کہ **تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ** (45:6)۔جس خدا کے قوانین' خارجی کائنات میں اس حسن وخوبی سے کارفرما ہیں' اسی نے انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لیے' اس کتاب میں قوانین دیئے ہیں' جو تم پر بالحق نازل کیے جاتے ہیں۔اس طرح کہا کہ یہ حقائق کائنات ہیں اے رسول! یہ خدا کی آیات ہیں جو تیرے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔یہ حقیقت پر مبنی ہیں۔اور آگے ہے کہ **فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ** (45:6)۔اگر کوئی ان کے بعد بھی ایمان نہیں لاتا تو پھر وہ کسی بات پہ ایمان لا ہی نہیں سکتا' ایمان لانے کا کوئی اور ذریعہ ہے ہی نہیں۔

خارجی کائنات کے برحق ہونے پر ایمان ہی خدا پر ایمان ہے

عزیزانِ من! اگر وہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے قوانین اور اس کی نشانیوں پر جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں، غور و فکر کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے، تو پھر وہ کونسی ایسی بات ہوگی جس پر یہ ایمان لائیں گے؟ یہ آخری چیز ہوگئی کہ اگر ان پر جس طرح قرآن کہتا ہے غور وخوض اور تحقیق کر لی جائے تو انسان یقیناً اس حقیقت پر ایمان لے آئے گا اور وہ کہتا ہے کہ اگر اس کے بعد بھی نہیں تو پھر جہنم میں جاؤ، کوئی دوسرا طریقہ اور ذریعہ نہیں جس کی بنا پر ایمان لاسکو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایمان لانے کا کیا طریقہ اور ذریعہ ہے اور یہ بھی کہ قرآن کی رو سے مومن کسے کہتے ہیں، قرآن کی رو سے یقین کرنے والا کسے کہتے ہیں؟ آپ نے دیکھا کہ یہ حقائق جو بیان ہوئے ہیں جنہیں آپ Scientific Truth کہہ لیجئے، پر تو ہمارے ایمان کی بنیاد ہے اور یہ ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ کوئی Objective (خارجی) حقیقت نہیں ہے اور یہ بھی کہ جو خارجی حقیقت ہے اس کا ہمارے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ایمان اور ایقان کے لیے ان دو چیزوں، دو باتوں کا ذکر آیا۔ ہمارے ہاں تو ایمان سے بھی زیادہ، مومن سے بھی زیادہ، ایک اور درجہ آتا ہے جسے متقی کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں متقی اور پرہیزگار کی تعریف

آپ کے ذہن میں متقی کا ایک تصور ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بڑا متقی ہے یعنی یہ کہ یہ بہت ہی پرہیزگار ہے، تشریح میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ گوشے میں بیٹھا ہوا ہے، تسبیح پھیر رہا ہے، نفل پڑھ رہا ہے، نمازیں پڑھ رہا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے آپ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب نے چالیس سال عبادت میں گزار دیئے۔ کبھی کسی سے پوچھو کہ صاحب! یہ کیا چیز تھی کہ جس میں یہ چالیس سال گزار دیئے؟ کہا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بڑی عبادت کی اور بڑا مرتبہ پایا۔ اور اگر آپ ان سے اس عبادت کی تفصیل پوچھیے تو سوائے اس کے کہ روزہ رکھتے تھے، نفل پڑھتے رہتے تھے، تہجد گزارتے تھے، تسبیح پھیرتے رہتے تھے، وظیفہ کرتے رہتے تھے، اس سے زیادہ تو عبادت کی کوئی اور شکل ہی نہیں ہے، یعنی چالیس سال تک وہ یہ کرتے رہے۔ کیا خوب!

زاہد نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

بیٹھے ہوئے یہ کچھ کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو خود بھی بیٹھا اللہ واسطے کی روٹیاں کھاتا ہے تو اس نے نوعِ انسان کے فائدے کے لیے کیا کرنا ہے۔ قرآن یہاں وہ معیار بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ یاد رکھیے کہ ایک ہی عمل ہے جسے بقا حاصل ہے اور وہ ہے **مَا يَنْفَعُ النَّاسَ** (13:17) یعنی جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے اسے بقا ہے، جس میں نوعِ انسان کے لیے کچھ فائدہ ہوا اُسے بقا حاصل ہے لہٰذا یہی وہ عمل ہے جسے نیک عمل کہا جاسکتا ہے۔ **فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ** (13:17) وہی باقی رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ یاد رکھیے،

بقا اسی کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کو کسی طریق سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ دراصل یہ ہوگی وہ عبادت جو مطلوب و مقصود ہے۔ مگر ہمارے ہاں متقی اور پرہیز گار کی یہ عبادت ہے کہ وہ چالیس سال تک بیٹھے رہے، جنگل میں ایک ٹانگ پہ اس طرح کھڑے رہے کہ ان کے بال بڑھ کر پاؤں تک آ گئے تھے، روتے روتے ان کے رخسار پر گوشت گل سڑ گیا تھا' ''چڑیوں نے آلنے بنا لیے سن۔''❶ وہ آپ کو بڑے بڑے بزرگوں کے یہ معرکے بتائیں گے۔ میں کسی اور نقطہ نگاہ سے تنقید نہیں کرتا۔ میں وہی کہتا ہوں جو قرآن کہتا ہے۔ یہاں قرآن کہتا ہے کہ **مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ** (13:17) جو کچھ نوعِ انسان کے لیے نفع بخش ہوتا ہے، وہ باقی رہ جاتا ہے۔ انسانیت کو جس چیز سے فائدہ پہنچتا ہے، یہ وہ عمل ہے جسے بقا حاصل ہے۔ اس طرح وہ یہی چیز ہے کہ آپ جس قدر بھی یہ آیات اللہ جسے قرآن نے کہا ہے کہ کائنات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں کی تحقیق و تدقیق کرتے ہوئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کریں اور پھر ان کو نوعِ انسان کے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ ایسا کرنے والے ہی مومن ہیں۔ اب یہاں مومن اور غیر مومن میں فرق ہوا۔ غیر مومن ہونے کی صورت میں انہیں انسانیت کی Destruction کے لیے، تباہی کے لیے، استعمال کیا جاتا ہے، نوعِ انسانی کو زندگی بخشنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ لیکن مومن ہونے کی صورت میں انہیں نوعِ انسانی کو زندگی بخشنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والے ہی متقی ہیں۔ تو میں نے کہا کہ متقی کا ایک لفظ تھا جس کے معانی و مطالب کچھ سے کچھ بنا دیئے۔

قرآنِ حکیم کا اعجاز شمس کے لیے ضیا اور قمر کے لیے نور کے لفظ کا استعمال

عزیزانِ من! قوانین خداوندی اور ان کی صداقت کی نشانیاں کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ سورۃ یونس دیکھیے کہا کہ **هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ** (10:5) خدا وہ ہے کہ جس نے شمس کو ضیا اور قمر کو نور بنایا اور چاند کی منازل متعین کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ (اسی طرح سورج کی رو سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے: (6:97 اور 17:12) صاحب! میں کہتا ہوں کہ اگر میں ایک ایک لفظ کی تفصیل و تشریح میں جاؤں تو وقت باقی نہیں رہے گا۔ میں کیا عرض کروں ہمارے ہاں تو عربی زبان کے الفاظ ضیا اور نور دونوں ہی کا ترجمہ روشنی ہوگا کیونکہ ہمارے ہاں تو ان کے لیے دوسرے لفظ ہی نہیں ہیں لیکن یہ تو عربی زبان ہے، اس میں تو مرادف ہوتے ہی نہیں ہیں۔ عربی زبان میں ضیا وہ ہوتی ہے جو خود اپنی ذات کے اندر روشنی ہو، جب کہ نور وہ ہوتی ہے جو دوسرے کی روشنی کے عکس سے پیدا ہو۔ اب شمس کو ضیا کہنا اور چاند کو نور کہنا کہ وہ دوسروں سے روشنی مستعار لیتا ہے، قرآن ہی چودہ سو سال پہلے کہہ سکتا تھا۔ قرآن تو ایک ایک لفظ میں ایک ایک Scientific (سائنسی) حقیقت بیان کر جاتا ہے۔ اب آگے کہا کہ **وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ** (10:5) پھر ہم نے چاند کی

---

❶ چڑیوں نے اس پر اپنے گھونسلے بنا لیے تھے۔

منازل مقرر کیں تا کہ تم اس سے اپنا حساب رکھ سکو۔ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو قوم لکھی پڑھی نہ بھی ہو' کسی علم سے ناواقف ہو' کیلنڈر نہ رکھنا جانتی ہو تو وہ چاند کے ان منازل سے اپنا حساب کتاب آسانی سے رکھ سکتی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پہ گاؤں میں جتنی زندگی تھی وہ اپنا حساب کتاب چاند کی ان مقررہ منازل سے کرتی تھی اور پھر عربوں کے ہاں تو وہ صحرا نشین تھے۔ ان کی زندگی صحراؤں میں بسر ہوتی تھی۔ اگر ان کے سامنے آسمان کے اوپر اس قسم کا چاند کی منازل کا کیلنڈر نہ ہوتا تو ان کو تو پتہ ہی نہ چلتا کہ رات کے کسی پہر کہاں جانا ہے' کہاں ہیں' کیا کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یاد رکھیے کہ قرآن نے صرف قمری یا چاند کے مہینوں کو ہی حساب کتاب کے لیے نہیں بتایا ہے' سورج کے متعلق بھی اس نے کہا ہے کہ سورج بھی کیلنڈر کا کام دے سکتا ہے' مگر جسے تم اپنے ہاں Convenient سمجھو تم اس کو رکھ لو۔ لیکن ہمارے ہاں تو قمری مہینہ چونکہ پیچھے سے چلا آ رہا ہے اور پھر ہر وہ چیز جو پرانی ہو جائے' وہ مذہبی اور مقدس ہو جاتی ہے اس لیے ہم قمری سال کو ہی اسلامی سال سمجھنے لگے ہیں۔

ہمارے ہاں پرانی شے مقصود و مطلوب تصور کی جاتی ہے

میرے استاد مولانا اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ حج کے بعد عجیب عجیب چیزیں بتایا کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے کہ میں نے مکہ میں دیکھا کہ ایک نان بائی آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں اور کل کی روٹی باسی ایک آنے میں بیچتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ صاحب! یہ تازہ روٹی دو پیسے میں اور کل کی باسی ایک آنے میں' کیوں؟ کہنے لگے کہ وہ صدرِ اوّلی سے ایک دن قریب تر ہے' اس واسطے مقدس ہو گئی۔ لو' عزیزانِ من! پھر تو پچھلے سال کی روٹی تو وہ دو آنے میں بیچتا ہوگا۔ ہماری یہ ذہنیت ہے' یاد رکھیے! ان چیزوں میں کوئی تقدس نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یہ پرانی ہو گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ شمس اور قمر دونوں کیلنڈر کا کام دے سکتے ہیں' یہ دونوں کے لیے کہا ہے' لیکن آج آپ کہیں یہ چیز کہہ دیجیے کہ ہاں صاحب! ہم شمسی کیلنڈر بھی استعمال کرتے ہیں تو اس سے خلافِ شریعت اور خلافِ دین طوفان مچ جائے گا۔ ہمارے ہاں تو قمری حساب کو ہی بس مذہب اسلام کہتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جنگ کے زمانے [1] میں ابھی ہم دلی میں تھے۔ پہلے پہل غالباً آدھا گھنٹا وقت کچھ پیچھے کر دیا تھا' ہر جگہ ہی ایسا ہوا ہوگا' تو دلی کی مسجدوں میں جتنے کلاک تھے' انہوں نے اس کو پیچھے نہیں کیا۔ بازار میں اگر کسی ایسے شخص سے جو ذرا مذہبی وضع قطع کا ہو' سے پوچھا جائے کہ صاحب! وقت کیا ہے' تو وہ کہا کرتا تھا کہ دینی وقت پوچھتے ہو؟ عزیزانِ من! ہنسنے کی بات نہیں۔ اس قوم کا سائنس کے متعلق یہ نظریہ پیدا ہو گیا تھا کہ ان کے نصاب میں تین ہی بڑ اعظم

---

[1] جنگ عظیم دوم (1939-1945ء) کی طرف اشارہ ہے جس میں برطانیہ' فرانس' سابقہ روس' امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مل کر جرمنی' اٹلی اور جاپان کو شکست دی۔

ہیں، باقی دو تو دریافت نہیں ہوئے تھے۔ [1] جب ان کا یہ جغرافیہ لکھا گیا تھا، تین ہی براعظم تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو کا اضافہ بدعت ہے۔

جی! مگر قرآن کہتا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (10:5)۔ یہ اُس خدا کا قانون ہے جس نے سورج کو ایسا درخشندہ اور چاند کو ایسا تابناک بنا دیا۔ اور چاند کی منازل متعین کر دیں تا کہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ (اسی طرح سورج کی رو سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے:6:97;12:12)۔ اللہ نے یہ سب کچھ، مبنی بر حقیقت اور تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لیے بنایا ہے۔ نہ کہ یہ محض دامِ حلقہ خیال ہے اور نہ ہی اس کا انجام تخریب ہے۔ ان چیزوں کی تخلیق یونہی کھیلتے ہوئے نہیں کر دی، یہ تو بہت بڑی بنیادی حقیقتیں لیے ہوئے ہے۔ اگر میں اس پہ بھی آ جاؤں کہ جو قرآن نے بالحق اور باطل تخلیق کہی ہے اس کے معنی کیا ہیں تو پوچھو نہیں کتنی بڑی علمی حقیقت آپ کے سامنے آ جائے لیکن میں اس سے آگے گزرتا ہوں کہ آج موضوعِ سخن کچھ اور ہے۔ آگے کہا کہ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (10:5) وہ اپنی آیات کو اس قوم کے لیے جو عقل و بصیرت سے کام لے، نکھیڑ [2] کر بیان کرتا ہے۔ ''تفصیل'' کے معنی ہوتا ہے: نکھار کر، ایک ایک چیز کو بیان کر کے رکھ دینا۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ بقول ان کے شریعت میں شرم تے عقل دا تے کم کوئی نہیں نا ہوندا، [3] مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ عقل والوں کے لیے ہے لہٰذا یہ ان ''حاملین شرعِ متین'' کے لیے تو ہے نہیں۔ یہ تو لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (30:28) عقل و خرد سے کام لینے والوں کے لیے ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جی! ہمارے لیے نہیں ہے، ٹھیک بات ہے جی! یہاں لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ میں علم ہے، اور آگے میں ابھی بتاؤں گا کہ علم کسے کہتے ہیں۔ اس آیت کے ساتھ ہے کہ اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (10:6)۔ اختلافِ لیل و نہار میں اور جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں پیدا کیا گیا ہے، اب اس کے اندر ساری کائنات آ گئی۔ اس کائنات میں لَاٰیٰتٍ (10:6) ہیں۔ ان کے اندر بھی آیات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ آیات کس کے لیے ہیں؟ کہا کہ یہ لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6) ہیں یعنی متقیوں کے لیے ہیں۔ ان میں مومنین آ گئے، موقنین آ گئے۔ یعنی یہ آیات ان کے لیے ہیں جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں۔

ذاتِ خداوندی کو دیکھنے کا طریق

عزیزانِ من! اس کے مقابلے میں اگلی آیت تو عجیب و غریب ہے۔ کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا

---

[1] یہ 1976ء کی بات ہے۔ آج سات براعظم دریافت ہو چکے ہیں: (۱)۔ ایشیا (۲)۔ یورپ (۳)۔ افریقہ (۴) جنوبی امریکہ (۵)۔ شمالی امریکہ (۶)۔ اوشینیا اور (۷) انٹارکٹیکا۔

[2] واضح تر انداز میں

[3] شریعت میں عقل کا تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔

بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (10:7) ان آیات یعنی حقائق سے وہی لوگ صحیح معنوں میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اس حقیقت پر یقین رکھیں کہ جس طرح خدا کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں' اسی طرح انسانی اعمال بھی اُسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ نیز وہ اس پر بھی یقین رکھیں کہ زندگی صرف اس دنیا کی طبعی زندگی نہیں' حیات کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس طرح فرمایا کہ جو ہمارے سامنے نہیں آنا چاہتے' ہمارا سامنا نہیں کرنا چاہتے' ہمیں بے نقاب دیکھنا نہیں چاہتے' وہ اگر ہمیں بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں تو جو خارجی کائنات کے حقائق پہ پڑے ہوئے پردے ہیں' یہ آیات اللہ ہیں' قرآن کہتا ہے کہ انہیں اٹھاؤ تو خدا سامنے آجائے گا' اللہ اکبر! یوں تو خدا کی وہ ذات ایسی نہیں ہے کہ یوں آنکھوں کے سامنے آئے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:104) اس نے کہا ہے' آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ان حقائق کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاؤ تو لقآءنا [1] یوں ہو جائے گا جیسے تم ہمارے سامنے کھڑے ہو۔ جو لوگ یہ نہیں کرتے ان کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ ان کو دیا گیا ہے' جو کچھ ان کے سامنے پڑا ہوا ہوتا ہے' وہ اس پہ راضی ہو جاتے ہیں' مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے ہیں کہ ٹھیک ہے جی! بس' اینا ای کافی ہے۔ [2]

سوچنے کی بجائے اپنے حال پر راضی ہو جانے اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ جانے والوں کی حالت

عزیزانِ من! ایسے لوگوں کو اس کائنات کی پیداوار میں نہ کوئی اضافے کا فکر ہوتا ہے' نہ یہ چیز ہے کہ یہ جو اس طرح تباہیاں آتی ہیں ان کو روکا کیسے جاتا ہے' نہ یہ کہ ان چیزوں سے فائدہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے' جس حال میں وہ پیدا ہوئے' جو کچھ ان کے سامنے تھا' پہلا لفظ ہے کہ وہ اس پہ راضی ہو کے بیٹھ گئے' پھر اگلی کیفیت یہ ہے کہ مطمئن ہو کے بیٹھ گئے' آگے ضرورت ہی نہ سمجھی اور کہا کہ جی! رازق تو وہ خدا ہے' وہ جتنا رزق کسی کو دینا چاہے صاحب! اس کے بعد ٹھیک ہے: بنجر زمین ہے بنجر ہی لے لو' بارانی ہے تو بارانی ہی لے لو۔ ٹھیک ہے' یعنی جو کچھ ہو رہا ہے اس پہ مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی یہ کیفیت ہے کہ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ (10:7)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری ان آیات سے جاہل اور بے خبر رہتے ہیں۔ سنیئے' ان لوگوں کے متعلق کیا کہا ہے؟ عزیزانِ من! مسلمان تو یہ کہلائیں گے۔ کہا کہ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (10:8)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے' ہم یہ جہنم اوپر سے وارد نہیں کرتے بلکہ یہ تو ان کا

---

1. امام راغب اصفہانی نے ''محیط المحیط'' میں لکھا ہے کہ لِقَاءٌ کسی بات کا حس اور بصر یا بصیرت سے ادراک (Perception) کر لینا یا کسی بات کو پا لینا ہے۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد چہارم ص۔ 1500 پر لکھا ہے کہ لِقَاءِ رَبٌّ کے معنی ہیں خدا کے نظامِ ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا یا قانونِ خداوندی کی رو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے قانونِ مکافات کے سامنے جواب دہ ہے۔ لِقَاءنا سے مراد ہے خدا کے قانون کو مشہود طور پر دیکھنا۔ اس لیے قرآن نے کہا ہے کہ نظامِ کائنات پر غور کرو' ریسرچ کرو' اس کے نظم و نسق کو سمجھو' اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائے گا۔ یہ ہے لِقَاءنا
2. یہی کافی ہے۔

اپنا ہی پیدا کیا ہوا جہنم ہے' اور یہ اس جہنم پر مطمئن ہیں۔ یہ ہے وہ جو قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ کون ہیں جو ان قوانینِ خداوندی پہ غور نہیں کرتے؟ یہ کچھ خارجی کائنات کی حقیقتوں کے اوپر غور وفکر نہ کرنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے' اور جو غور وفکر کرتے ہیں وہ متقی بھی ہیں' وہ مومن بھی ہیں۔ ان کے برعکس جو نہیں کرتے ہیں' وہ جو کچھ ان کے سامنے پیش پا افتادہ ہوتا ہے' اس پہ مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے ہیں' وہ جہنم کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں' عزیزانِ من! اِسے لقاء رب کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ چیز خدا کا آمنا سامنا کرنا کہلاتا ہے۔

یہی خدا کے سامنے جانا ہے

عزیزانِ من! یہ جو میں نے کہا ہے کہ ان حقائق سے خدا کا عزیز وحکیم ہونا سامنے آ جاتا ہے اور اس کی صفات نہایت واضح طور پہ سمجھ میں آ جاتی ہیں' یہی خدا کا سامنا ہے۔ جب انسانی اعمال کی جزا اور سزا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہوتی ہے تو اسے بھی خدا کے سامنے جانا کہتے ہیں لیکن آپ دیکھیے کہ اس کے لیے وہ کہتا کیا ہے؟ اس کے لیے سورۃ الرعد کی پہلی چار آیتیں دیکھیے۔ کہا کہ **الٓمّٓرٰ** قف **تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ** (13:1) خدائے علیم وحکیم ورحیم کا ارشاد ہے کہ یہ خدا کے ضابطہ قوانین (قرآن) کی آیات ہیں' **وَالَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ** (13:1)۔ یعنی اس ضابطہ خداوندی کے قوانین' جو تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے' تجھ پر بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے۔ یہ یکسر مبنی برحقیقت ہے جسے آپ انگریزی میں The truth کہہ سکتے ہیں (الحق)۔ جب ان لفظوں پہ ال داخل ہوتا ہے تو وہ بنتا ہے جسے آپ Definite کہتے ہیں' کہ یہی حقیقت ہے' یہی حق ہے' اور کوئی حقیقت اور حق نہیں ہے۔ **وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ** (13:1) لیکن اکثریت لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ان حقائق پر ایمان نہیں لاتے۔ اب نظر آ گیا کہ وہ تو حقائقِ کائنات پہ ایمان لانے کا نام ایمان قرار دے رہا ہے۔ یہ پہلی آیت ہے۔ اگلی آیت سن لیجیے: **اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا** (13:2)۔ یہ اُس خدا کی طرف سے ہے جس نے اتنے بڑے اجرامِ فلکی کو فضا کی بلندیوں میں معلق کر رکھا ہے اور جیسا کہ تم دیکھتے ہو' انہیں کوئی ستون تھامے ہوئے نہیں ہے۔ یہ اس قدر عظیم الجثہ کرے ہیں کہ یہ سورج ہی آپ کی زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے اور باقی کروں کا تو پوچھیے ہی نہیں۔ اس سماء میں یہ کُرّے تمہیں کھڑے نظر آتے ہیں' کوئی ستون بھی نظر آتا ہے جس کے اوپر یہ قائم ہیں۔ اب اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ بغیر ستونوں کے قائم ہے۔ کہا کہ یہ بھی ستونوں پہ قائم ہیں لیکن وہ ستون محسوس نہیں ہیں جو تم ان نظروں سے دیکھ لو۔ یہ غیر محسوس' غیر مرئی ستونوں پہ قائم ہیں۔ کششِ ثقل Gravitation کو ایسے ستون کہنا جو محسوس طور پر نظر نہ آ سکیں قرآن ہی کا اعجاز ہو سکتا ہے۔ کیا الفاظ ہیں! **بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا** (13:2)۔ تم دیکھتے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے۔ یہ صرف اس کا قانونِ کشش وجذب (Law of Gravitation) ہے جس کے سہارے یہ قائم ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی**

الْعَرْشِ (13:2)۔اس کے بعد پھر انکا مرکزی کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں آپ ترجمے دیکھیں گے وہ عجیب ہونگے کہ یہ کچھ کیا اور اس کے بعد پھر وہ اپنے عرش کے اوپر آرام سے بیٹھ گیا' وہ جو کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا تو کاہے کے لیے رکھا' وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ یہ تمام اجرامِ فلکی شمس وقمر جس کے اندر موجود ہیں تمام کو قانون کی زنجیروں کے اندر مسخر کر دیا کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (13:2) اپنی رفتار کے مطابق ان میں سے ہر ایک چلا جارہا ہے لیکن ان کے اندر ابدیت نہیں ہے' ایک متعین مدت ہے جس کے لیے یہ کارگہ کائنات اس حسن وخوبی سے چلا جارہا ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (13:2)۔ یہ ہے خدا جو کر رہا ہے۔ اس کے برعکس وہ جو بعض دہریئے Scientists سائنسدان ہیں' وہ کہتے ہیں کہ گھڑی کلاک کی طرح آئے' ایک دفعہ کائنات کے کلاک میں اس نے پھونک دے دی ہے' چابی دے دی ہے اور پھر اس کے بعد جیسے آٹھویں دن پھر ضرورت پڑتی ہے' پھر اس کے بعد وہ سو گیا ہے یا عرش پہ جا بیٹھا ہے اور یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ صورت نہیں ہے: یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (13:2) وہ تمام جتنے بھی الامر ہیں' معاملات ہیں' جو کچھ ہو رہا ہے وہ انہیں چلا رہا ہے۔ ''دَبَّرَ یُدَبِّرُ '' کے معنی ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے رہنا' یہاں کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے دیکھتا چلا آ رہا ہے۔ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ (13:2) وہ اپنی ان چیزوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ یہ کاہے کے لیے بیان کرتا ہے؟ کیا یہ کہ پڑھ کے مردوں کو بخشا کرو۔ کہا کہ نہیں' یہ صرف اس لیے ہے کہ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:2) تم اپنے خدا کو بے حجاب دیکھو اور تمہیں اس پہ یقین آ جائے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (3:190)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہہ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ اس لیے یوں بیان کرتے ہیں۔ وہی آیت کی بات ہے کہ یہ خود مقصود بالذات نہیں' مقصود یہ ہے کہ خدا کی کارفرمائی تمہارے سامنے بے نقاب ہو کے آ جائے۔ پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ رفعت سماوات' یہ اجرامِ فلکی وغیرہ دیکھیے یہ' ایسے ستونوں کے بغیر کھڑے ہیں جو تمہیں نظر آ سکیں: وَھُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْھَا رَوَاسِیَ وَ اَنْھٰرًا (13:3) زمین تو گول ہونے کے باوجود اس نے پھیلا دی ہے کہ آرام سے اس کے اوپر بس سکو اور اس میں پہاڑ بنا دیئے۔ اس کے اندر پانی کے دریا اور نہریں بہا دیں تا کہ ہر قسم کے ثمرات وکھیتیاں اُگ سکیں۔

کائنات کے اندر ہر شےء کا جوڑا پیدا کیا گیا

عزیزانِ من! اب ایک اور بڑی بات آ گئی۔ میں نے کہا ہے کہ سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس کا ذکر نہ آ گیا ہو۔ کہا کہ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْھَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ (13:3) اور اس میں ہر ایک پھل کے دو جوڑے' دو دو قسم کے' پیدا کر دیئے۔ ہر شے کے جوڑے کہے گئے ہیں۔ اس سے پہلے تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ سانوں تے دویں کھجوراں اکو جیاں نظر اوندیاں آ۔ دویں امب اکو جئے' امب ای اوناں نوں کیندے نیں' کسے نوں اسی کیندے ای نئیں ہیگے پئی اے امب جیہڑا ہیگا اے اے مردہے تے اے امب جیہڑا اے

عورت ہے۔ ❶ آج کسی بھی سائنسدان سے پوچھیے' وہ کہتا ہے کہ ہر شے کے جوڑے ہوتے ہیں اور اسی سے یہ سلسلہ آگے چلتا ہے۔

غور کرنے والے کے لیے گردشِ لیل ونہار میں بڑی نشانیاں ہیں

عزیزانِ من! آج سے چودہ سو سال پیشتر قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ **جَعَلَ فِيۡهَا زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ** (13:3) ہر شے کے جوڑے پیدا کردیئے اور پھر یہ کہ زمین کی گردش کا ایسا قاعدہ مقرر کردیا کہ اس سے **يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ** (13:3) رات کی تاریکی' دن کی روشنی کو ڈھانپ لیتی ہے گویا کہ یوں لگتا ہے کہ گردشِ لیل ونہار ہے کہ جیسے تاریکی کی ایک چادر ہے جو دن پہ لپٹی چلی جارہی ہے اور نور کی ایک چادر ہے جو اس کے بعد اس کی جگہ لیتی چلی جارہی ہے۔ تمہیں یوں نظر آتا ہے جب کہ بات یوں نہیں ہے۔ **اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ** (13:3)۔ ان تمام امور میں غور وفکر کرنے والی قوم کے لیے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ لمبی چوڑی بات نہیں' چھوٹی سی بات ہے کہ اس سمت ذرا غور کرلو کہ **وَفِى الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّنَخِيۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَيۡرُ صِنۡوَانٍ يُّسۡقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ** (13:4)۔ زمین کے مختلف قطعات' ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں (لیکن ان میں) کسی میں انگور کے باغ ہیں' کسی میں کھیتیاں۔ کہیں کھجور کے درخت ہیں۔ ان میں سے بعض ایک ہی جڑ سے پھوٹ کر الگ الگ ہوجاتے ہیں اور بعض الگ الگ جڑوں سے اگتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ کبھی غور کرو کہ یہ تغیرات کیسے پیدا ہوتے ہیں۔

ہر مختلف شکل کا پھل اپنے اندر مختلف ذائقہ لیے ہوتا ہے

عزیزانِ من! پھر سنو۔ تمہارے مختلف قسم کے باغات میں پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھلوں کا مختلف ذائقہ ہوتا ہے حتیٰ کہ اسی میں وہ چیزیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں جو بڑی کڑوی کسیلی ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے تم نے کبھی دیکھا بھی کہ تم ان کو ایک ہی قسم کا میٹھا پانی دیتے ہو' کوئی ترش ہے' کوئی میٹھا ہے' کوئی کڑوا ہے' کوئی پھیکا ہے اور کبھی غور کرو کہ یہ تغیرات کیسے رونما ہورہے ہیں۔ یہ بھی تمہارا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی قسم کی زمین ہے' یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ایک ہی قسم کا پانی دیتے ہو' پھر یہ بھی تمہارا مشاہدہ ہے کہ کوئی کڑوا ہے' کوئی کسیلا ہے' کوئی پھیکا ہے' کوئی میٹھا ہے' کوئی شیریں ہے۔ دیکھ رہے ہو نا کہ یہ کیا ہے۔ پھر کہا کہ **وَنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰى بَعۡضٍ فِى الۡاُكُلِ** (13:4) پھر وہ ثمرات بھی تو دیکھو کہ کیسے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے' غور کیجیے: پھر اگلی بات **اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ** (13:5) ان تمام امور میں اس قوم کے لیے جو عقل وفکر سے کام لیتی ہے ایمان وتقویٰ والی قوم ہے اسکے لیے ان چیزوں میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ سائنس کے ہی علوم کہلاتے ہیں اور میں پھر بار بار یہ کہونگا کہ کوئی شعبہ علم ایسا نہیں ہے جو اس دائرے سے باہر نکل گیا

---

❶ ہمیں تو دونوں کھجوریں ایک ہی جیسی لگتی ہیں۔ دونوں آم بھی ایک ہی جیسے۔ ان دونوں کو آم ہی کہتے ہیں کسی کو تو یہ کہتے ہی نہیں کہ یہ آم (کا پودا) مرد (نر) ہے اور یہ عورت (مادہ)۔

ہو اور یہ سارا کا ہے کے لیے ہے؟ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (13:1) تاکہ تمہیں خدا کے سامنے آنے کا یقین پیدا ہو جائے۔ یہ چیزیں آ گئیں: غور و فکر کرنے والے، متقی، مومن، پرہیزگاروں کے لیے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

اہل تصوف کی حالت

عزیزانِ من! ان سے بھی ایک قدم اور آگے ہمارے سامنے ایک اور قوم آتی ہے۔ یہ ایک گروہ ہے جسے صاحبِ ذکر کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ تو بزعم خویش ایمان و تقویٰ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ یہ بڑی ''بلندیوں'' پر ہوتے ہیں۔ ان اہل تصوف کو اربابِ طریقت کہا جاتا ہے۔ اب تک تو ایمان و تقویٰ کا ذکر ہے۔ اب اربابِ ذکر کا بھی گوشہ سامنے آتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جسے آپ ذکر کہتے ہیں یہ آج کل تو بڑے زوروں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ ذکر خفی سے ذکر جلی کی منزل میں آ گئے۔ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں چار چار لاؤڈ اسپیکر ہوتے ہیں۔ نہ آپ سوندے نیں ساری رات، نہ محلے نوں سون دیندے ہیگے۔ پوچھو پئی اوئے اے کی کردے او؟ جی خدا دی صفت ہیگی اے۔ [1] یہ اس خدا کی صفت ہے جسے لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (2:255) نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ اونہاں پوچھو کہ رات نوں تے تہاڈے صفت ہوندی اے، تے سارا دن کراڑے مارن ڈئے ہوندے او۔ ذکر ہو رہا ہے' [2] یہ کہتے ہوئے کہ قلب پہ ضربیں لگ رہی ہیں۔

ان ضربوں سے میری جسمانی صحت پر اثر

عزیزانِ من! اپنا وہ دَور یاد آ جاتا ہے۔ ان ضربوں نے آج تک قلب کا مریض بنایا ہوا ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے، مگر ذکر کی دل پر ضربیں مستقل علامات چھوڑ گئی ہیں۔ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی میں نے اپنی انتڑیاں پکڑی ہوئی ہیں، کبھی دل پکڑا ہوا ہے۔ یہ سارا اس ذکرِ خفی اور جلی کا ثمر ہے۔ پتہ نہیں آدمی کیسے بچ جاتا ہے۔

عقل کے بعد کی منزل الباب ہے

قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ (3:190) یقیناً تخلیق ارض و سما میں اور اختلافِ لیل و نہار میں صاحبانِ عقل و فکر کے لیے نشانیاں ہیں بلکہ یہاں الباب کہا ہے۔ یہ عقل کی بھی اگلی منزل ہے۔ ''لب لباب'' تو آپ جانتے ہیں: اے تت کڈیا ہویا جینوں پنجابی اچ کیندے نیں، یہ عقل کا تت کڈیا ہویا جتھے

-----

[1] تمام رات نہ خود سوتے ہیں، نہ ہی محلے میں کسی کو سونے دیتے ہیں۔ پوچھو کہ بھئی! یہ کیا کر رہے ہو؟ (کہتے ہیں کہ) جی! یہ خدا کی صفت ہو رہی ہے۔

[2] ان سے پوچھو کہ رات کو تو یہ تمہارے ہاں صفت خداوندی ہوتی ہے مگر دن کو تو تم نیند کے خراٹے لے رہے ہوتے ہو۔ یہ ذکر ہو رہا ہے!

ہووے ❶ عقل کا لب لباب ہے۔اندازہ لگایئے یہ عقل کتنی گہرائیوں کی ہے۔ یہ ہے جنہیں اولی الباب کہا گیا ہے یعنی صاحبانِ عقل وبصیرت اورار بابِ فکر ونظر۔ ان کے لیے تخلیق ارض وسما اور اختلاف لیل ونہار میں قوانین خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ اربابِ عقل وفکر وہ کون لوگ ہیں جو **اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ** (3:191) خدا کا ذکر کرتے ہیں' یعنی قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ وہ کیسے ذکر کرتے ہیں' کیا گوشے میں بیٹھے ہوئے؟ تسبیح کے اوپر؟ کہا کہ نہیں بلکہ **قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ** (3:191) کھڑے بیٹھے لیٹے ذکر کرتے ہیں۔ذکر کیا ہے؟ قرآن سے پوچھیے۔وہ کہتا ہے کہ **وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (3:191) وہ کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رو سے ذکر۔اس ذکر کے لیے ایک تو صاحبانِ عقل وبصیرت' اربابِ عقل وفکر یعنی اولی الباب ہونا ضروری ہے: عقل وفکر کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے' پھر ان کے سامنے یہ موضوع' یہ عنوان' یہ نصب العین' یہ مشن' یوں آنا چاہیے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے **خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** پر غور وفکر کرتے رہیں۔قرآنِ کریم نے اسے کہا ہے کہ یہ ہے ذکرِ خداوندی۔ ویسے ذکر کے معنی ہیں: کسی چیز کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا' ہر وقت اپنے سامنے رکھنا تا کہ **یتفکرون** اس پر غور وفکر کرتے رہیں۔

امام غزالی کی فکر کا ماحصل

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ذکر اور فکر دو الگ الگ اصطلاحیں ہوگئی ہیں' اور وہ مقامِ ذکر اور مقامِ فکر کے نام سے موسوم ہیں۔ وہ تو انہی **یتفکرون** والوں کو کہتا ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو **الذین یذکرون اللہ** قوانین خداوندی کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں ذکر اور فکر الگ الگ نہیں ہیں لیکن ہمارے ہاں تو پھر جناب فکر تو ہو گیا مفکر' فلاسفر اور ذکر کون ہو گیا؟ اس کا آپ امام غزالیؒ ❷ (1059-111) سے پوچھیے۔ آدھی عمر وہ فلسفہ پہ کتابیں لکھتے رہے' بڑے پائے کی کتابیں لکھیں' اور اس کے بعد پھر ان کی گاڑی نے کانٹا بدلا تو وہ خانقاہوں میں چلے گئے' صوفی بن گئے اور اس طرح باقی آدھی عمر جو کچھ پہلے لکھا تھا فکر کی رو سے اس کی تردید کرتے چلے گئے۔ تے ساری عمر ایہد ے اچ ای مکا دتی۔ ❸ آپ کو پتہ ہے کہ ان کا نام کتنا بلندی پہ لیا جاتا ہے۔امام غزالی رحمۃ اللہ تو آپ پوچھیے نہیں! وہ غزالیؒ کا پہلا دَور تھا' وہ فکر کا دور تھا۔ جب دوسرا دَور آیا تو اس میں اپنی پہلے دَور کی ہر عقل وفکر کی بات کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں' یعنی جو کچھ پہلے لکھا ہے' اس کی تردید کرتے جا رہے ہیں۔ اب عزیزانِ من! ہم پہ تو دونوں دَور گزرے تھے۔ میں نے ان حضرات سے پوچھا

---

❶ یہ وہ ہے جسے پنجابی میں ''اصل نچوڑ نکالا ہوا'' کہتے ہیں۔ جہاں پر عقل کا یہ ''نچوڑِ خالص'' نکالا ہوا ہو۔(وہاں تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔)

❷ آپ ایران کے ضلع طوس کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔(شبیر احمد: تعلیم کی کہانی' کفایت اکیڈمی' کراچی' 1974' ص۔211)

❸ تمام عمر اسی میں گنوا دی۔

کہ جب ان پر تنقید کا دوسرا دَور آیا تو امامِ غزالی اپنی پہلی فکری چیز کی تردید عقلی دلائل سے کرتے ہیں۔ میں نے کہا: جب عقل کے پیچھے لٹھ لے کے پھرتے ہو تو عقل کی رو سے تو بات ثابت کرتے ہو اس طرح وہ بات تو ثابت ہی نہیں ہو سکتی' کیونکہ عقل کے متعلق تو تم کہتے ہو کہ یہ قابلِ اعتماد نہیں اور اپنے ہی عقلی دلائل کی تردید کے لیے عقلی دلائل دیتے ہو تو یہ تو عقل کا عقل کے ساتھ مواخذہ ہوا' جب کہ عقل تو قابلِ اعتماد نہیں' اگر تمہاری پہلے دَور کی عقل قابلِ اعتماد نہیں تھی تو اس دوسرے دَور کی عقل کیسے قابلِ اعتماد ہو گئی؟

عقل کی نفی کے بعد وجدان کی منزل کا تصور

عزیزانِ من! یہاں پہنچنے کے بعد جب دلیل نہیں ملتی تو پھر وجدان آ جاتا ہے کہ جی! وہ بات سمجھائی نہیں جا سکتی۔ یہاں (3:190) میں ذکر اور فکر دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ آپ جب آگے چلیں گے تو نظر آئے گا کہ ذکر و فکر کا یہاں اکٹھے آنا بڑی اہم چیز ہے' یہ **یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (3:191) ہے یعنی جب وہ اربابِ عقل و فکر تخلیق ارض و سما پہ غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا** (3:191) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہاں بات لمبی چلی جاتی ہے۔ پلیٹو (Plato) کا نظریہ ہے کہ یہ کائنات Exist ہی نہیں کرتی' یہ تو وجود میں ہے ہی نہیں' یہ حقیقت میں صرف ہمارا تخیل ہی تخیل ہے' عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(غالب)

اِس مکتبِ فکر کے ماننے والے اسے باطل کہتے ہیں اور قرآنی اصطلاح میں باطل کہتے ہیں جو تخریبی نتائج پیدا کر رہا ہو۔ یہاں کہا ہے کہ اپنی تحقیقات کے بعد وہ اربابِ عقل و فکر علی وجہ البصیرت اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ **رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ** (3:191)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لیے۔ دیکھیے' تو اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی چیز باطل پیدا کرے' کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کرے (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیقات سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر' عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔) اور ان کے بعد اس کی دعا یہ ہے کہ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور علمی تجربے کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں یعنی جہنم یا نار یا تباہ کرنے والی جو زندگی ہے اس سے بچے رہیں۔ اس سے بچنے کا یہ طریقہ ہے کہ کائنات کے اوپر غور و فکر کرو' یہ صاحبانِ ذکر و فکر آ گئے صاحب! اب

اس سے آگے ایک بڑی اہم بات شروع ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں علمائے کرام کا نصابِ تعلیم اور فکری کاوش

ہمارے ہاں یہ ''علمائے کرام'' ہیں۔ انہوں نے یہ Term یعنی عالم کی اصطلاح اپنے لیے مختص کر لی ہے۔ مجھے یاد آ جاتا ہے کہ ایک دفعہ کسی صاحب نے کسی دوسرے شخص سے کہا کہ یہ درویش صاحب بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' آپ انہیں Scholar (اسکالر) تو کہہ سکتے ہیں' ''عالم'' نہیں کہہ سکتے۔ ٹھیک ہے' انہوں نے ساری عمر علامہ اقبالؒ کو ''عالم'' نہیں مانا۔ کہا کہ وہ فلاسفر تو ہو سکتا ہے اسکالر بھی ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ جی! ذرا آپ اسکالر کا ترجمہ کر دیجیے۔ ترجمہ تو ہو گا عالم۔ تو عالم تو یہ حضرات اپنے سوا کسی اور کو مانتے ہی نہیں۔ اپنے آپ کو عالم' علمائے کرام' کہتے ہیں۔ ان کے ہاں کے نصاب (Curriculum) کو آپ دیکھیے۔ اس میں پانچ پانچ چھ چھ سو سال پہلے کی فرسودہ کتابیں ہیں۔ ان میں کسی ایک شعبے کا تعلق انسانوں کی عملی زندگی سے نہیں' ان کے ہاں سارے علوم نظری ہیں' ان نظری علوم میں بھی یہ نہیں ہے کہ جو کوئی واقعات واقعی ہونے والے ہیں یا ہو چکے ہیں' یہ ان سے متعلق بات ہو۔ یہ لوگ ساری عمر بحث کرتے ہیں: **لو فرضنا** یعنی فرض کیجیے اور فرض وہ کیجیے کہ جو محال ہو۔ آپ کو پتہ ہے کہ ان کے ہاں جلدوں پہ جلدیں ان بحثوں پہ چل جاتی ہیں کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ وہ جو میں کہا کرتا ہوں: ویلی جٹی اون ویلے۔ [1] اونہاں دی روٹی دا فکر تے تہانوں ہوندا اے' [2] یہ آج بیٹھے ہیں' اتنے بڑے بڑے دلائل دونوں ہی لاتے ہیں کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے کہ نہیں بول سکتا۔ دونوں بیٹھے ہوئے ہیں' کتابوں سے کمرے بھر جاتے ہیں اور موضوعات یہ ہوتے ہیں' ان کے ہاں منطق ہے' بلاغت ہے' فصاحت ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ان کے نصاب میں کوئی ایک موضوع ایسا نہیں ہوتا کہ جس کا زندگی کے عملی مسائل سے کوئی تعلق ہو۔ ان کے ہاں دین کے متعلق نکاح اور طلاق کے مسائل ہیں ان کے ہاں کی فقہ کی 75% کتابیں' عزیزانِ من! جنسی مسائل پہ مشتمل ہیں' جو باقی رہ گئیں وہ وضو اور تیمّم کے متعلق ہیں۔ جو اس سے زیادہ بلند پایہ ہوتے ہیں ان کے ہاں وہ بحثیں ہیں کہ حضور ﷺ نور تھے یا بشر تھے' آجکل بھی [3] یہ بحث بڑے

---

[1] اب تو شاید ایسا نہ ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک دیہات میں ہر گھر میں چھوٹا سا بیلنا ہوتا تھا۔ گھر کی خواتین فرصت کے اوقات میں کپاس بیلا کرتی تھیں یعنی کپاس سے بنولے الگ کر کے روئی تیار کرتی تھیں۔ یہ تعمیری کام تھا۔ محاورہ میں کہا گیا ہے کہ اس بیکار عورت کو دیکھیے۔ وہ کپاس نہیں' اون بیل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں وقت بھی صرف ہو گا اور توانائی بھی لیکن نتیجہ کچھ نہیں برآمد ہو گا۔ ہماری قوم صدیوں سے اون بیل رہی ہے۔ یہ اس لیے کہ ملوکیت، ساری ''کپاس'' اپنی فیکٹریوں میں بھیج دیتی ہے۔ یہ بیچاری بیکار بیٹھی اون نہ بیلے تو کیا کرے؟ (حوالہ: لمعات۔ نظریہ ضرورت (در) طلوع اسلام' بابت فروری 1983ء' لاہور' ص۔ 2)

[2] ان کی معاش...... کھانے پینے...... کا فکر تو آپ کو ہوتا ہے' انہیں نہیں۔

[3] یہ 29 اگست 1976ء کی بات ہے۔

زوروں پہ چلی ہوئی ہے۔ یہ عالم بن گئے' جس میں محسوسات کو کوئی دخل نہیں یعنی یہ محسوس کائنات' محسوس دنیا' آنکھوں سے دیکھی جانے والی' کانوں سے سنی جانے والی' یہ Physical World' یہ کائنات' جس میں ہم بستے ہیں' اس کے متعلق ان کے ہاں کی کسی کتب میں کوئی ذکر نہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک حواسِ خمسہ کے تحت علم کی تعریف

عزیزانِ من! آؤ تو ذرا قرآن سے علم کی تعریف پوچھیں۔ علم کی ایک Definition (تعریف) قرآن بھی دیتا ہے کہ علم کہتے کسے ہیں؟ (17:36) میں دیکھیں۔ یہ سورۃ بنی اسرائیل کی 36ویں آیت ہے: **لا تقف ما لیس لک به علم** جس بات کا تمہیں علم نہ ہو' اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ بڑی ٹھیک بات ہے' تو علم کیا ہوگا؟ کہا: یاد رکھو: **ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولا** یہ جو تمہارے ہاں Physical Senses (طبعی حواس) ہیں' جنہیں تم حواسِ خمسہ کہتے ہو اس کے لیے قرآنِ کریم نے یہ ٹرم (اصطلاح) استعمال کی ہے۔ یاد رکھو! تمہارے دیکھنے کی قوت' تمہارے سننے کی قوت' تمہارے سمجھنے کی قوت' ان میں سے ہر ایک کے متعلق پوچھا جائے گا کہ جس بات کے متعلق تم نے کہا تھا ''ہمیں علم ہے'' ان چیزوں کی شہادت ہے تمہارے پاس۔ جس علم میں ان کی شہادت نہیں ہے قرآن اسے علم کی definition میں ہی نہیں لاتا' وہ علم ہی علمِ محسوس کو کہتا ہے اور زندگی کی اس سطح پر تو عزیزانِ من! ہمارا سارا کاروبار ہی ان محسوسات کے اوپر ہے' ہمارا یہ بدن' ہمارا یہ جسم' جسم کی یہ ساری زندگی' اس کا سارا تعلق' ان محسوسات کے اوپر ہے۔ ہمارا رہنا سہنا' یہ زمین' زمین کے یہ مسائل حتیٰ کہ خواہ آپ چاند اور مریخ تک بھی کیوں نہ اڑ جائیں' یہ سارے Physical World (طبعی دنیا) کے مسائل ہیں' چنانچہ آگے جا کے بات آئے گی کہ آپ ان مسائل کو ان اقدارِ خداوندی اور قوانین کی رو سے حل کرتے ہیں یا نہیں۔ یہاں تو مقامِ مومن آئے گا۔ اس کے نزدیک علم کی Definition (تعریف) یہی ہے۔ اس میں پہلے آپ ایک استثنیٰ کر لیجیے۔ وہ وحی ہے جس میں صاحبِ وحی کی اپنی فکر کا دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک ایسی چیز دیتا ہے لیکن دینے کے بعد وہ یہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے آپ اسی علم کے ذریعے سے پرکھیے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جن کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو وہ آنکھیں بند کر کے' بہرے ہو کر' اندھے ہو کر' گونگے ہو کر' ان کو Accept (قبول) نہیں کرتے۔ مومن وہ ہے جو عقل و فکر کی رو سے قرآن کی آیات کو Accept (قبول) کرتے ہیں۔ اس استثناء کو آپ چھوڑ دیجیے۔ یہ نبی کا Source of knowledge (سرچشمۂ عمل) ہے۔ اس کے جو بھی Contents (نفسِ مضمون) ہیں' وحی کا جو بھی متن اس نے لیا ہے' وہ اس کے متعلق کہتا ہے کہ **اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ** (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو عقل و فکر و بصیرت کی بنا

یہ دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرونگا اور میری سنت کا اتباع کرنے والے بھی ایسا کریں گے۔ وہ علم وخرد کی بناء پر دعوت پیش کرتا ہے۔ جو مانتے ہیں ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ کبھی بھی بہرے گونگے اندھے بن کر اسے نہیں مانتے' عقل وفکر کی رو سے مانتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ سب سے پہلی چیز تو علم کی یہ Definition (تعریف) ہے۔ یہ تو علم کی بات آئی۔ قرآن تو کوئی چیز چھوڑتا ہی نہیں ہے' ایسا پیچھا کرتا ہے کہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ سارے قرآن میں دو جگہ علماء کا لفظ آیا ہے۔ ایک تو علمائے بنی اسرائیل ہیں ان کو تو آپ چھوڑ دیجیے اور پھر جو باقی ''علمائے کرام'' ہیں' آپ انہیں لے لیجیے۔ میں ان کو انورٹڈ کاماز (Inverted Comas) میں لکھ رہا ہوں۔

کائنات کے ایک ایک ذرے پر غوروفکر کرنے کی تلقین

اب آیئے' دیکھیں کہ قرآن علماء کہتا کن کو ہے؟ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (35:27)۔ ذرا غور کرو کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے۔ عزیزانِ من! علومِ سائنس کے مختلف گوشوں کو سامنے رکھیے۔ پہلے بارش کے متعلق سارا علم سامنے لایئے کہ کیسے برستی ہے؟ کیسے بادل بنتے ہیں؟ کیسے ہوائیں ان بادلوں کو لیے لیے اڑتی ہیں؟ یہاں قرآن نے بات ہی الم تر سے شروع کی ہے' یہاں یہ بات یہ نہیں ہے کہ تم اپنے ہاں کے نظری بحث کے طور پہ کیا کرتے ہو۔ یہاں ''تر'' لفظ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں: دیکھنا' غوروفکر کرنا۔ یہاں لفظ ہی وہ آیا ہے کہ یہ کچھ کیسے ہوتا ہے؟ پھر کہا کہ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (35:27) پھر ایک ہی پانی سے کس طرح مختلف قسم کی یہ سبزیاں نباتات یہ پھل اگاتا ہے۔ کبھی اس پہ غور کیا ہے کہ یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں۔ ان پہ غور کرو۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (35:27)۔ اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں: کوئی سفید' کوئی سرخ' کوئی کالا بھجنگ۔ عزیزانِ من! اب وہ شعبہ آتا ہے جسے آج سے پہلے کبھی سائنس نے بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ علم الاحجار یعنی یہ پہاڑوں کی چٹانوں کے علم کا ہے۔ ہمیں خود بھی ان کا پتہ نہیں تھا' دیکھتے تھے تو یہی نظر آتا تھا کہ اے چٹی جئی آ گئی اے' اے دیکھو نا ایتھے اے سرخ ہیگا وااے کالا بھجنگ ہے دیکھو نا جی' [1] اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہونا چاہیے۔ ہمارا یہ عزیز ابھی آ رہا ہے' وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہے۔ اس نے اپنا موضوع ہی یہ لیا تھا اور اسی سے مجھے یہ چیزیں معلوم ہوئیں کہ یہ سائنس کا' یہ پتھروں کا علم' چٹانوں کا علم' کتنا وسیع موضوع ہوگیا ہے۔ میں چودہ سو سال پہلے کی قرآن کی آیت پیش کر رہا ہوں' عزیزانِ من! کہتا ہے وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ (35:27) کبھی ان پہ بھی غور کیا ہے کہ یہ چٹان سیاہ بھجنگ رنگ کی ہے' یہ سرخ رنگ کی ہے' یہ

---

[1] یہ کچھ سفید سا آ گیا ہے' یہ دیکھو' یہ یہاں سرخ رنگ کا ہے اور ادھر دیکھو' یہاں پہ یہ بالکل کالا بھجنگ ہے۔

سفید رنگ کی ہے۔ کبھی تم نے غور کیا کہ یہ اختلاف کیوں پیدا ہو گیا؟ یا اللہ! ایمان لانے کے لیے یہ بڑے دلائل دے رہا ہے' اور آگے کہتا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ (35:28)۔ اور اس پہ بھی غور کیا کہ یہ انسان کس طرح مخلوق بن گئی؟ یہ سارے چھوٹے چھوٹے جراثیم وغیرہ کیسے ہو گئے؟ مویشیوں کے اندر یہ اختلاف کیسے ہو گیا؟ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (35:28)۔ اسی طرح ان کی نوعیتیں مختلف' اقسام مختلف' خاصیتیں مختلف' رنگ مختلف۔ آخر کیوں؟ کیا کبھی صحیفہ فطرت کے ان اوراق پر بھی غور کیا؟

کائنات پر اس طریق سے غور کرنے والے علما کے سامنے خدا تعالیٰ بے نقاب ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے الم تر سے بات کی ہے کہ کبھی ان چیزوں پر غور کیا' کبھی تم نے ان چیزوں کو دیکھا اور سوچا بھی ہے؟ اور سنیے! کہا: تم کون تھے؟ کیا دیکھو گے؟ کیا سنو گے؟ ان پر غور و فکر کرو۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (35:28)۔ صحیفہ فطرت کے یہ اوراق' جو قوانین خداوندی کی شہادت ہیں' سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں' لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان شہادات پر علم و بصیرت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ''علماء'' کہلانے کے مستحق ہیں۔ یعنی جو لوگ ان پر غور و فکر کرنے والے ہیں ان کو علما کہتے ہیں اور کہتا ہے کہ ان علما کی یہ کیفیت ہے کہ جب ان کے سامنے چھپا ہوا وہ خدا دیکھتے ہیں تو بے ساختہ سجدے میں گر جاتے ہیں' کانپ اٹھتے ہیں کہ یا اللہ! کیا بات ہے تیرے جلال و جمال کی! وہ کانپ اٹھتے ہیں۔ وہ دیکھتے کیا ہیں؟ یہی کہ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (35:28) خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے اس کارگہہ کائنات کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا کیا سامان کر رکھے ہیں! اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (35:28)۔ اس کے ''عباد'' میں ''علماء'' ہی اللہ کے قوانین کی عظمت کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں' ان کے سامنے جھکتے ہیں کیونکہ وہ ان شہادات پر علم و بصیرت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہاں علما کا لفظ آیا ہے۔ عزیزانِ من! علماء ہی ہیں جو حقیقت میں خدا کو پہنچانتے ہیں۔ اور وہ ان ذرائع سے پہچانتے ہیں' پہچاننے کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بقول اِن کے خدا ان کے سامنے بے نقاب آ جاتا ہے اور اس ہئیت میں پھر وہ اس کے جلال کے سامنے' اس کی عظمت کے سامنے' کانپ اٹھتے ہیں۔ یہ ہیں جن کو علماء کہا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحب کا فتویٰ

عزیزانِ من! میں نے ابھی بتایا ہے کہ قرآنِ کریم نے انہیں علماء (Scholars) کہا ہے۔ اب ہمارے ہاں کے ان علمائے کرام کے علوم کی کیفیت کی ایک مثال آپ کے سامنے آتی ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب نیا نیا لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوا تھا۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے' ہم دلی میں تھے۔ یہاں تو ہر چیز جو نئی آئے تو ہم مکھیوں کی طرح اس کی طرف بھاگتے ہیں کہ صاحب! اس کے متعلق فتویٰ

دیکھیے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز' حلال ہے یا حرام ہے۔ [1] مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی' جواب کراچی میں ہیں' [2] دیوبند کے سب سے بڑے مفتی اعظم تھے۔ان کا فتویٰ ہندوستان بھر میں چلتا تھا اور کہتے تھے کہ باہر دنیا میں بھی چلتا ہے' تو گویا علماء کی جماعت میں چوٹی کے عالم تھے۔ان کے فتویٰ کے معنی ہیں کہ ان علوم پہ جو فیصلہ دیدے' وہ حرفِ آخر ہے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ لوگ اُن سے یہ پوچھ بیٹھے کہ جی! یہ ایک لاؤڈ اسپیکر نیا نیا آ گیا ہے' اسکے متعلق فرمایئے کہ اس کا استعمال شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ یہ سوال اور جواب ایک رسالے میں لکھا' اس لیے میں آج اس کا ذکر نام سے کرتا ہوں۔جب یہ لکھا گیا تو کسی نے کہا کہ صاحب! بالکل غلط کہتے ہو۔یہ کبھی ایسا نہیں کہتے' حوالہ دو' سند دو۔میں نے کہا کہ وہ تو ابھی زندہ ہیں ان سے پوچھ لو' مکر جائیں گے تو میں سند بھی دے دونگا۔گویا یہ بات ایسی تھی جو دوسرے کہتے تھے کہ نہیں' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ان کے رسالے کا نام تھا: البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ۔یہ اپنے نام بھی جناتی زبان میں رکھتے ہیں۔اور بات ساری اتنی ہے کہ یہ جو نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں تو ان کے متعلق صرف یہ پوچھنا تھا کہ یہ کس حد تک مفید ہوسکتی ہیں۔انہوں نے اس (رسالے) میں یہ لکھا ہے کہ ''مجھ سے پوچھا تو گیا' مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس آلے کی ماہیت کیا ہے اور یہ کس طرح کام کرتا ہے'' کام بڑا اہم تھا۔شریعت کے مطابق فتویٰ دینا تھا تو بغیر معلومات کے کیسے فتویٰ دیدیا جائے؟ بات بھی ٹھیک تھی۔اس (رسالے) میں لکھا ہے کہ میں نے اس کے لیے الیگزنڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال [3] صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ذرا مجھے بتادیجیے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟'' شریعت حقہ کے مطابق فتویٰ دینا تھا' وہ (مفتی صاحب) اِس ہائی اسکول کے سائنس ماسٹر' وہ بھی برج نندن صاحب جو کوئی مسلمان بھی نہیں' سے اس کے بارے میں معلوم کیا۔انہوں نے فرمایا کہ ''برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم

---

[1] اس نئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر ہندوستان کے علمائے کرام سے اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا تھا۔اس کے جواب میں ''جمعیت العلماء'' کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا تھا کہ: ''جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا' مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رخ کیے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہچانا مشکل ہے۔بحوالہ نقیب 11- 10- 1941ء'' اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا'' ص ص۔16-15 دارالعلوم (دیوبند) کے ایک بہت بڑے مفتی (محمد شفیع مرحوم) نے لاؤڈ اسپیکر کے خلاف ان فتاویٰ کا مجموعہ شائع کیا جن میں ''عباداتِ مقصودہ'' کے لیے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا۔(پرویز: سلیم کے نام جلد سوم' ادارۂ طلوع اسلام' لاہور' 1986' ص۔16)

[2] یہ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔

[3] مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 2003' ص 20 پر اس ہندو سائنس ماسٹر کا نام ''نرائن داس'' اور اس کے اسکول کا نام ''جوبلی ہائی سکول بنارس'' بتایا گیا ہے۔بحوالہ نقیب یہ بات 1941 کی ہے۔یہ خطاب 26 جنوری 1975 کا ہے۔اس فتویٰ کا تذکرہ سلیم کے نام جلد سوم کے تیسویں خط میں کیا گیا ہے جو کہ ستمبر 1956ء میں لکھا گیا تھا۔پرویزؒ اس ہندو سائنس ماسٹر سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

ازکم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔ معلومات کا جواب جو ملا ہے وہ برج نندن سے ملا ہے' اس جواب کے ملنے پر مفتی صاحب نے فرمادیا کہ ''اس کا استعمال حرام ہے' یہ ناجائز ہے'' اور آج مفتی صاحب شاید کوئی خطبہ ایسا نہ دیتے ہونگے جس میں سامنے لاؤڈ اسپیکر موجود نہ ہوگا۔

عزیزانِ من! میں عرض یہ کر رہا تھا جنہیں ہمارے ہاں علما کہا جاتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ فتویٰ دینے کے لیے کہ اس کی ماہیت کیا ہے وہ برج نندن صاحب اسکول ماسٹر صاحب کی طرف رجوع فرماتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ کہنا بھی مشکل ہے' وہ کہنا بھی مشکل ہے اور وہ شریعتِ حقہ کی رو سے فتویٰ دیدیتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے' اور ان دونوں (مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مفتی محمد شفیع مرحوم) کے باہمی اختلاف کا تو پوچھئے نہیں' عین اسی زمانے میں مفتی کفایت اللہ صاحب (مرحوم) نے فتویٰ دیدیا تھا کہ (لاؤڈ اسپیکر) جائز ہے۔ میں نے کہا کہ آج دونوں کے وہ فتاویٰ ایک طرف رکھ دیجئے' ہر مسجد کے اوپر چار چار لاؤڈ اسپیکر ٹانگے ہوئے ہوتے ہیں' یہ علما ہمارے ہاں کے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی سازش ہوئی ہے عزیزانِ من! یہ کوئی کم سازش نہیں ہے' کہ ان کے ہاں نصاب میں صرف نظری مباحث والے مضامین رکھے گئے ہیں' انسان کی عملی زندگی سے متعلق کوئی بھی نہیں۔ اس کے برعکس قرآنِ کریم وہ سارے علومِ سائنس سامنے لاتا ہے۔ ان پہ تحقیق وتدقیق وتفتیش کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ ہے صحیفۂ فطرت کے اوراق جن پر عبور پانے والوں کو ہی عالم کہا جائے۔ یہ ایک حصہ ہے جسے مظاہر فطرت کے علوم کہا جاتا ہے۔

جوقوم کائناتی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اس کے لیے اقدارِ خداوندی چہ معنی دارد؟

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ اب اگلا حصہ اقدار وحدودِ خداوندی کا آتا ہے جو قرآنِ کریم میں ہیں لیکن ان کا علم اس لیے ضروری ہے کہ سائنس کے علوم کی رو سے فطرت کی جو قوتیں آپ کو حاصل ہوں' ان کا استعمال حدودِ خداوندی کے مطابق کیا جائے گا' اس کے لیے ان اقدار وحدود کے علم حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی اور اگر آپ کو یہ قوتیں ہی حاصل نہ ہوں تو ان اقدار وحدود کا کیا فائدہ؟ یعنی جس دوکاندار کے ہاں بیچنے کی جنس ہی نہیں اس کا ترازو اور اس کے باٹ کس کام آئیں گے۔ اوتاہئیں تے ساڈے نال اے ہوندا پیا ہیگا کہ او سویرنوں اٹھ کے ترازو تے وٹے دھودھوا کے گنگا جلی نال اوہدے سامنے ہتھ جوڑ کے بیہ رہندا ہیگا اے۔ ❶ کوئی دوسری متاع تو دوکان میں ہوتی نہیں یعنی جو قوم فطرت کی قوتوں سے ہی محروم ہے اُس کے لیے یہ جاننا کہ اسے ہم نے کن حدود اللہ کے مطابق استعمال کرنا ہے' اُس کے لیے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب یہ حقائق اوجھل کر دیئے گئے تو اب ہم مسلمان افسانوں میں چلے گئے۔

---

❶ اسی لیے تو ہمارے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ صبح سویرے اٹھ کر اپنا ترازو اور باٹ دھو کر گنگا جلی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جا بیٹھتا ہے۔ (یاد رہے یہ ''گنگا جلی'' وہ برتن ہے جس میں گنگا کا پانی رکھا جاتا ہے۔)

عزیزانِ من! قرآن نے یہ کہا تھا کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس نے سب تمہارے لیے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ تمام انسانوں کے لیے مسخر ہے۔ اس کی تسخیر میں سب سے پہلے مومن آتا ہے۔ اللہ اکبر !

مومن کا فریضہ تسخیرِ کائنات تھا

عزیزانِ من! اسے ذہن میں رکھیے کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، خدا نے اپنی طرف سے تمہارے تابع تسخیر کر دیا ہے، یہ تسخیرِ کائنات مومن کا فریضہ تھا۔ اس کے لیے ہم نے مومن اور متقی بنانا تھا، یہ "جمیعاً منه" اس کی طرف سے ایسے ہی ہے جیسے یہ قرآن اس کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح اس نے یہ کہا ہے کہ تسخیر ارض وسما کا فریضہ اس کی طرف سے عائد کیا گیا ہے۔ یہ جمیعاً ہے صرف چاند اور مریخ ہی نہیں، وہ تو جمیعاً کہہ رہا ہے۔ آپ مومن کے علم کی کوئی حدود مقرر کر سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ یہ **جَمِيْعًا مِّنْهُ** (45:13) ہے یعنی اس ارض وسما میں سے سب کا سب۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ** (45:13)۔ یہ تو غور و فکر کرنے والی جو قوم ہے وہی اس بات کو سمجھے گی، مسخر کر دیا ہے۔ عزیزانِ من! آج چاند ان کے پاؤں کے نیچے آ گیا ہے، مریخ آ گیا ہے **سَخَّرَ لَكُمْ** (45:13) اس نے اسے مومنین کے لیے مسخر کر دیا ہے اور یہی چیز تھی جو اقبالؒ نے کہا کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

(بالِ جبریل)

کیا بات ہے اس شخص کی، یہ "لولاک" کے لفظ کو کہاں لایا ہے!

تو کیا اہلِ مغرب سائنس دان مومن ہیں؟

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اقوامِ مغرب نے تو سائنس کے یہ علوم بھی حاصل کر لیے، وہ تسخیرِ ارض تو پہلے کر ہی چکے تھے، اب وہ تسخیر سما کی طرف بڑھ رہے ہیں، تو کیا قرآنِ کریم کی رو سے آپ انہیں مومن اور متقی کہیں گے؟ کیا قرآن ان میں اور دوسروں میں فرق کرتا ہے؟ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کو سامنے رکھنا چاہیے۔ تسخیرِ فطرت یعنی فطرت کی قوتوں کو اپنے قبضے میں لانے کے لیے مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن نے آدم سے کہا تھا کہ **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا** (2:31)۔ اور انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی ہے کہ یہ اُن قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرمِ عمل ہیں یعنی اسے عام الفاظ میں یوں سمجھو کہ ہم نے آدمی کے متعلق کہا تھا کہ اُسے اشیائے کائنات کا تمام علم حاصل کرنے کی صلاحیت دیدی ہے۔

یہاں تک تو مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ کی مملکت کے اندر بھی مسلم یا نان مسلم سارے ہوتے ہیں' اب تو شاید نان مسلم کم ہوتے ہیں' ورنہ پہلے تو ان کی Majority (اکثریت) ہوتی تھی۔ بہرحال مسلمان ساری دنیا کے اندر موجود ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے میں جن کے مطابق یہ مختلف اشیائے کائنات رواں دواں ہیں مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ فرق کہاں جا کے پیدا ہوتا ہے؟ یہ وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے بعد انہیں استعمال کس طرح سے کیا جائے گا' یہاں ایمان اور کفر کا فرق پڑتا ہے۔ یہاں ایمان یہ ہے کہ ان قوتوں کو خدا کی مقرر کردہ حدود اور اقدار [1] کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے خرچ کیا جائے۔ یہ ہے ایمان اور ایسا کرنیوالے ہیں مومن۔ پہلی چیز یہ یاد رکھیے کہ فطرت کی قوتیں حاصل ہونے کے بعد انہیں خدا کے حدود اور اقدار کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ جسے یہ قوتیں حاصل ہی نہیں ہیں اس کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اِسے اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرے۔ ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی۔ [2]

قوت کے استعمال میں مومن اور کافر میں فرق

عزیزانِ من! مومن کا اور کافر کا' یہاں سے فرق پڑتا ہے۔ جو ان قوتوں کو حاصل کرتا ہے اور پھر انہیں اپنی مصلحتوں' مفاد کوشیوں اور خواہشات کے مطابق صرف کرتا ہے تو قرآن یہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے یہ علم بالحواس بھی حاصل کیا' فطرت کی قوتوں کو مسخر بھی کیا لیکن چونکہ انہوں نے حدودِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا' اس لیے ان پہ تباہی آ گئی اور اس تباہی سے انہیں یہ علومِ سائنس بھی نہ بچا سکے۔ اِس کے غلط استعمال سے پھر نقصان بھی تو ہوتا ہے اگر یہ ''قوت'' کم ہے تو پھر بڑے ہی کم پیمانے کا نقصان ہوتا ہے مثلاً کسی کے پاس صرف چاقو ہو اور وہ کسی سے لڑ پڑے تو بہرحال کچھ تھوڑا چھوٹا موٹا زخم آئے گا اور اگر اس کے پاس پستول ہو اور وہ سامنے آئے تو ایک گولی سے ختم کر دے گا اور اگر سٹین گن ہو تو پوچھو ہی نہیں کیا کرے گا' توپ ہو' تو گاؤں کو اڑا دے گا' ہوائی جہاز ہو تو ایک پورے کی پوری زمین اڑائے گا اور اگر ایٹم بم ہو تو پورا ہیروشیما اڑائے گا یعنی جتنی قوت زیادہ بڑھتی چلی جائے گی' اُس قوت کا غلط استعمال اتنا ہی زیادہ نقصان کرے گا۔ اگر ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا ہے تو ان کا نتیجہ تباہی ہوگا۔

---

[1] یہ وہ بنیادی حقائق ہیں جنہیں مستقل اقدار (Permanent Values) یا ابدی صداقتیں (Eternal Truths) کہا جاتا ہے۔ یہ ناقابل تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ انہیں عقل و فکر اور دلائل و براہین کی بنا پر بطور مسلمہ حقیقت ماننا ایمان کہلاتا ہے۔ ایمان Faith (عقیدہ) نہیں' Conviction کا نام ہے۔

[2] یہ مثل ہے کہ مفلس اگر حوصلے والا بھی ہو تو کیا خرچ کرے گا۔

مومن نوعِ انسانی کے امن کا ضامن ہوتا ہے

لو جی' عزیزانِ من! یہاں آ کے فرق پڑتا ہے۔ قوتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق استعمال کرنے والے کو مومن کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس کا ایک ہی ترجمہ ہے: ایمان لانے والا' انگریزی جس کا ترجمہ ہے: Believer۔ ان سے پوچھیے کہ خدا نے اپنی ایک صفت المومن بھی تو کہی ہے۔ ہم تو خدا پہ ایمان لاتے ہیں' ان سے پوچھیے وہ خدا کس پہ ایمان لاتا ہے؟ وہ المومن بھی تو ہے۔ یہ اس کا ترجمہ بھی مومن کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لفظ کا مادہ ہی 'امن' (ا م ن) ہے۔ مومن کے معنی ہیں: امن دینے والا' تمام نوعِ انسانی کے امن کا ضامن۔ وہ خدا ساری کائنات میں امن قائم رکھنے والا ہے تا کہ اس کائنات پر فساد برپا نہ ہو جائے اس کی کتاب (قرآنِ کریم) کی حامل یہ امت ہے۔ اسے کہا کہ تم نیچے درجے پر انسانوں کی زندگی میں ہمارے اس فریضہ المومن کو بجا لانے والے ہو۔ مومن اس لیے کہا جاتا ہے کہ مومن نوعِ انسانی کے امن کا ضامن ہوتا ہے اور جو اپنے امن کے لیے کفار کا محتاج ہو جائے' اسے کیا کہا جائے گا؟ یہ ہوا فرق کفر اور ایمان میں جو میں نے عرض کیا ہے۔

اقوامِ سابقہ کی بستیوں کے کھنڈرات نوحہ خواں ہیں

عزیزانِ من! اگر تسخیر فطرت کی' ان قوتوں کو اقدارِ خداوندی کے خلاف استعمال کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگی۔ اس موضوع پر بیسیوں آیات ہیں۔ ایک ہی آیت پیش کرتا ہوں: **وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ** (46:26) (اور وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا' ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع' سماعت بصارت اور قلب' حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے تھے' اس لیے ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئے (23:45) اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے' انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جب عقل انسانی وحی کی روشنی میں کام کرے تو اس کے نتائج بڑے خوش گوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی عقل و دانش ماؤف ہو جاتی ہے' جس طرح نشے کی حالت میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اقوامِ سابقہ کی تباہیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد قرآنِ کریم کہہ رہا ہے کہ اے رسول! ان سے کہو' یہ جو تمہاری مخاطب قوم (عرب) ہے کہ یہ جو کچھ انہیں حاصل ہوا ہے' یہ تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو' ان اقوام کو حاصل ہوا تھا' جن کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات آج ان کی زندگی پر نوحہ خواں ہیں' انہیں تو اس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں ہوا جتنا ان کو حاصل ہوا تھا۔ میں نے علم کی

Definition میں کہا ہے کہ انہیں سمع اور بصر اور فواد سب کچھ حاصل تھا' وہ یہ سب کچھ رکھتے تھے۔ ان کا علم ان سارے علوم پر محیط تھا' انہوں نے یہ قوتیں حاصل کر رکھی ہوئی تھیں لیکن فَمَآ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَآ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَآ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26) جب انہوں نے قوانین واقدارِ خداوندی سے اعراض برتا تو پھر ان کا یہ سمع اور بصر اور فواد' ان کے یہ سارے علوم' ان کے کسی کام نہ آئے اور جس تباہی سے انہیں وارن (آگاہ) کیا جاتا تھا اور وہ اس کی ہنسی اڑایا کرتے تھے' اس نے چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا۔

آج کے ترقی یافتہ دور کی زبوں حالی اور اندیشۂ فردا

عزیزانِ من! آج ساری دنیا علومِ سائنس میں اتنی ترقی کے باوجود جس جہنم میں اس وقت گھری ہوئی ہے تاریخ میں اس کی کوئی مثال بھی نہیں ملتی۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا کَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26)۔ جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے' انہوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہاں لفظ ہے اس چیز نے گھیر لیا کہ جسے ان سے کہا جاتا تھا کہ اتنی بڑی مہیب قوتیں اپنے قبضے' اپنی قدرت' اپنے قابو میں لا رہے ہو تو ان کے استعمال کا طریقہ بھی سیکھو۔ اگر یہ نہ کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے اور اگر ہر قوم نے اپنے اپنے ہی مفاد کی خاطر اِن قوتوں کو استعمال کرنا شروع کیا تو یہ اس قسم کے تصادمات کی جنگ ہوگی۔ اب وہ خطرہ ان کو پیدا ہو رہا ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھے تو پوری نوعِ انسانی صفحہ ارض سے ختم ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ تمہارے یہ علوم کسی کام نہ آ سکے۔ یہ ہے وہ انسان جس نے فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کیا' مگر انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کرنا نہ سیکھا۔ اور آج ایک مہیب تباہی کے دہانے پہ کھڑا الرزاں وترساں ہے۔

عقل انسانی کو نیّرِ تاباں کی حاجت

عزیزانِ من! یہاں میں اقبالؒ کے وہ تین اشعار بار بار پڑھا کرتا ہوں:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

یہ جو اقدارِ خداوندی پر ایمان رکھتا تھا' یہ نہ رہا' انسان نے فطرت کی ان قوتوں کو اپنی مصلحتوں کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا' عقل کی رو سے حاصل کردہ اس متاع کو خداوندی اقدار کے تابع صرف کرنے کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی' اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا ❶

زندگی کی شبِ تاریک کی سحر' عزیزانِ من! اقدارِ خداوندی کے نیّرِ تاباں کی روشنی سے ہی ہوسکتی ہے۔ تو ہمارے سامنے اقوام کے تین گروہی درجات آ گئے۔

اقوام کے تین مختلف درجات

عزیزانِ من! ایک وہ قوم ہے جو فطرت کی قوتوں کو' علوم سائنس کی رو سے' مسخر کرتی ہے' تسخیر فطرت کی ان قوتوں کو اپنے قبضہ میں لیتی ہیں اور پھر انہیں اپنی ہی مصلحت اور مفاد کوشیوں کی خاطر استعمال کرتی ہے۔ اس میں نیشنلزم ایک بدترین قسم کا مسلک ہے جو اختیار کیا گیا ہے۔ فطرت کی بے پناہ قوتیں ان کے ہاتھ آ جاتی ہیں۔ ان کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہی ہوتا ہے لیکن بہرحال فطرت کی قوتیں تو ان کے پاس ہوتی ہیں۔ دوسری قوم وہ ہے جو فطرت کی ان قوتوں کو حاصل بھی کرتی ہے اور پھر انہیں اقدارِ خداوندی کے تابع استعمال بھی کرتی ہے۔ انہیں مومنین کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے آپ بھی امن میں اور دنیا بھی ان کے ہاتھوں امن میں ہوتی ہے۔ یہ پھر ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہ تو آج چاند اور مریخ تک پہنچے ہیں لیکن عزیزانِ من! مومن کی دنیا کی تو کوئی حد ہی نہیں کہ یہ کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اقوام کی تیسری شق پھر ایک اور قوم کی صورت میں آتی ہے کہ جن کے پاس فطرت کی قوتیں ہی نہیں ہوتیں تو اقدارِ خداوندی کا سوال ہی ان کے سامنے نہیں آتا۔ پہلی شق اقوام کو اقوامِ مغرب کہیے' Scientists کہیے۔ دوسری کو جماعتِ مومنین کہیے' اور یہ جو تیسری ہے' اسے کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اس شق میں تو آج ہماری ہی قوم آتی ہے۔

عزیزانِ من! مومن کا مقام تو بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ قوم تو صفحہ آدمیت کے بھی اوپر آتی ہے' اس مقامِ آدم پہ آج اقوامِ مغرب کھڑی ہیں کیونکہ آدم کے متعلق کہا تھا کہ خدا نے آدم کو فطرت کے علوم کے حصول کی صلاحیت و استطاعت دیدی۔ اب جو قوم ان علوم پر ہی حاوی نہیں' جو فطرت کی قوتوں کو ہی حاصل نہیں کرتی' وہ تو مقامِ آدم پہ ہی نہیں آتی۔ بہرحال' اقوامِ مغرب مومن کے مقام پہ نہیں ہیں تو آدمیت کے مقام پر تو ہیں اور پھر مومن کا مقام تو ان سے بہت ہی آگے آتا ہے۔

آج اقوامِ عالم کا ایک گروہ وہ ہے جو پست ترین سطح آدمیت پہ ہے' مقامِ آدمیت پہ بھی نہیں پہنچتا۔ وہ مومن نہیں ہوسکتا۔ مقامِ آدمیت میں اس نے مظاہر فطرت کے ان علوم کو مسخر کرنا ہے' اس کے بعد اس نے ان تسخیر شدہ قوتوں کو خدا کی بتائی ہوئی حدود کے مطابق صرف کرنا ہے۔ مقامِ مومن یوں آ جائے گا۔ تو جس قوم کے حصے میں مقامِ آدم نہیں آتا' عزیزانِ من! اس قوم کے حصے میں مقامِ مومن

---

❶ اقبالؒ: زمانۂ حاضر کا انسان (در) ''ضربِ کلیم''، نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 93

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو بہر حال کچھ نام ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (7:71) کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں۔ تم اپنے بھی نام رکھ لیتے ہو' تمہارے بڑوں نے ایسے نام رکھ دیئے' انہوں نے عبدالرحمٰن رکھ دیا' تم نے عبداللہ رکھ دیا اور بس: اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (7:71) ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ یہ تم نے صرف نام رکھ لیے ہیں ورنہ یہ ہے ان کی Definition (تعریف) کہ یہ صرف اصطلاحی نام ہیں۔

مومن کبھی روٹی کے لیے دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا

عزیزانِ من! جس قوم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو بھی مسخر نہیں کرتی تو یہیں سے اس کا جہنم شروع ہو جاتا ہے۔ جہنم کی سب سے بڑی چیز محتاجی ہے۔ کوئی حیوان بھی کسی دوسرے حیوان کا محتاج نہیں ہوتا۔ اپنی روٹی کے لیے' جنگل کے ان جانوروں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے' جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ شیر مارتا ہے اور پھر یہ اس کا مارا ہوا کھاتے ہیں۔ جو قوم اپنی روٹی کے لیے بھی دوسروں کی محتاج ہوتی ہے وہ تو آدمی کی بھی پست ترین سطح پہ اپنی زندگی گزارتی ہے۔ عزیزانِ من! مومن کا تو مقام ہی بہت بڑا تھا' آج کی یہ مسلمان قوم تو مقامِ آدم پہ بھی نہیں آسکی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہماری عاقبت سنور رہی ہے یا نہیں' پہلی چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ تمہاری یہ دنیا سنوری ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ جس کی دنیا نہیں سنورتی' اس کی عاقبت بھی کبھی نہیں سنورتی کہ دنیا اور عاقبت دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں۔ جو پودا اٹھتے ہی' اُگتے ہی' مرجھا جاتا ہے' وہ کبھی پھل دار درخت بن ہی نہیں سکتا۔ قرآن نے بار بار یہ چیز کہی ہے کہ مَنۡ كَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72)۔ جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے' وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ اس لیے یاد رکھیے جو آج کا اندھا ہے وہ قیامت میں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہے آپ کے ہاں پرکھنے کی کسوٹی۔ اقبالؒ ہی کے پھر الفاظ میں کہ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامہء فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے [1]

جس کا آج کل جیسا گزرا' وہ تباہ ہو گیا: قولِ رسولؐ

عزیزانِ من! ہمارے نبی پاکؐ نبی اعلم الناس ہیں۔ وہ علم کی انتہائی بلندیوں پر تھے' افق اعلیٰ پر تھے۔ انہوں نے یہ چیز کہہ دی کہ

---

[1] اقبالؒ: آج اور کل (در) ''ضربِ کلیم'' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔163۔

یادرکھو! جس کا کل اور آج یکساں گزر گیا اور وہ آگے نہیں بڑھا، تباہ ہوگیا۔ ہم تو اپنے ہاں آج کی زندگی اور کل کی زندگی کہتے ہیں۔ حضورؐ نے تو یہ فرمادیا کہ اگر دو دن یکساں گزر گئے یعنی جہاں وہ کل کھڑا تھا، وہیں وہ آج کھڑا ہے تو سمجھو کہ وہ تباہ ہوگیا۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے خلاف بہت بڑی سازش ہوئی ہے کہ قرآن کے ان تمام مقامات کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کردیا اور دین کو مذہب بنا کر تمام رسوم وشعائر کو بے روح کر کے رکھ دیا۔ آج ہماری یہ نمازیں، یہ روزے، یہ اصطلاحات، یہ علوم، جو آپ کے دار العلوموں میں پڑھائے جاتے ہیں، ان بیچاروں کی ساری عمر ان میں صرف ہوجاتی ہے، یہ تمام بے روح بن چکے ہیں۔ عزیزانِ من! مجھے تو ان پر ترس آتا ہے، ویسے ہی وہ ترس کھانے والے ہی ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں جاکے دیکھیے۔ یہ بیچارے کہیں کسی کام کے قابل نہیں ہوتے۔ اوناں نوں ایس مدرسے اچ پادیندے ہیگے، یوں بھی غریبوں کے، یتیموں کے بچے وہاں آکے بھیک کے ٹکڑوں پہ پلتے ہیں۔ [1] ان پہ کیا سائیکلا جیکل (نفسیاتی) اثر پڑتا ہے، وہاں ان کے سات سات دس دس سال ضائع کردیتے ہیں، باہر وہ نکلتے ہیں تو ایک وقت کی روٹی کمانے کے قابل نہیں ہوتے۔ وہ بیچارے، مانگتے پھرتے ہیں، اور پھر ان کو سند علمائے کرام کی دیدیجاتی ہے۔ عزیزانِ من! دوسروں کا تو ایک طرف وہ بیچارے تو اپنے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ تھا قرآن کی رو سے علم! اسے کہتے تھے عالم!! یہ تھا مومن کا مقام!!! یہ سارا ہماری نگاہوں سے چھین لیا گیا اور ہمیں مطمئن کر کے بٹھا دیا کہ یہ ہے علم، اور وہ ہے جسے عبادت کہا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ دونوں درس اکٹھے کرلیے جائیں تو سرِدست اس موضوع پہ یہ بحث سیر حاصل ہوجائے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] انہیں اس مدرسے میں داخل کردیا جاتا ہے جہاں وہ غریبوں اور یتیموں کے بچے بھیک کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔

چھٹا باب: سورۃ الانبیاء (آیات 34 تا 38)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفۡسٍ
ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ۝۳۵ وَاِذَا رَاٰكَ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ يَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ‌ ۚ وَهُمۡ
بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۳۶ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا
تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ۝۳۷ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۸

عزیزانِ من! آج ستمبر 1976 کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیا کی آیت 34 سے ہو رہا ہے: (21:34) گزشتہ دونوں دروس خارجی کائنات میں بکھری ہوئی آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیوں پر مشتمل تھے۔

مافوق الفطرت شے کا تقاضا

اس سے پہلے بات یوں چلی آ رہی تھی کہ جیسا کہ ہر اہلِ مذہب نے اس سے پہلے کیا، رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اگر آپ ﷺ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو اس کی شہادت میں کوئی معجزہ دکھلایئے۔ معجزہ کے لفظی معنی ہیں: جسے دیکھنے کے بعد انسانی عقل عاجز آ جائے، مفلوج ہو جائے۔ اس کا تقاضا کرنے والے بھی عربی زبان کا لفظ آیت استعمال کرتے تھے یعنی وہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ نشانی دکھایئے جس سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ تم ایک آیت مانگتے ہو، یہ ساری کائنات اور اس میں بکھرے ہوئے جتنے بھی مظاہرِ فطرت ہیں، یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں۔ انہیں اس نے آیات اللہ ہی کہا ہے۔ اب دیکھیے کہ وہ مطالبہ کرنے والوں کی آیت اور قرآنِ کریم کی اس آیت کے مفہوم میں کتنا فرق ہو گیا۔ وہ کوئی مافوق الفطرت شے کا تقاضا کرتے تھے اور یہاں شروع سے آخر تک پورے کا پورا زور فطرت کے مظاہر پہ دیا جا رہا ہے۔ Super - natural یا مافوق الفطرت جو شے ہو گی اس میں Reason (عقل) کا تعلق نہیں ہو گا، اسی لیے تو اسے معجزہ کہا جاتا تھا۔ اس کا پہلا اثر یہ

کی عقل ماؤف ہو جائے' سمجھ نہ سکیں کہ یہ کیسے ہو گیا ہے۔ یہاں جو مظاہرِ فطرت ہیں ان کے متعلق یہ کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ" کائنات کیسے وجود میں آ گئی اس کے متعلق تو تمہاری عقل کام نہیں دے سکتی لیکن اس کے بعد جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ قوانینِ فطرت کے مطابق ہو رہا ہے اور ان کا سمجھ لینا تمہاری عقل کے بس کی بات ہے۔ اس لیے قرآن آیات اللہ کو پیش کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ زورِ عقل' فکر' علم اور بصیرت پہ دیتا چلا گیا یعنی معجزہ کا جو نتیجہ ہونا تھا' اس کی عین ضد ہے جسے قرآن نے پیش کیا۔ آپ دیکھیے کہ ایک ہی جست میں کس طرح قرآن مذہب کی Stage (اسٹیج) سے فوراً دین کی طرف آ جاتا ہے۔ کہا کہ ان پہ غور و فکر کرو۔

عالمِ مشیت اور عالمِ خلق کی وضاحت

عزیزانِ من! ضمناً ایک بات یاد رکھیے۔ اسی سلسلے میں وہ بڑی اہم ہے۔ یہاں دو چیزیں کارفرما ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کا عالمِ امر ہے جسے اس نے کہا ہے کہ اس میں اس کا ارادہ' اس کی مشیت' کارفرما ہے اور وہ کہتا ہے کہ اسے تو تم سمجھ نہیں سکتے کہ وہاں ہماری یہ تدبیریں جنہیں وہ امور کہتا ہے' جنہیں وہاں کے عالمِ امر سے تعبیر کرتا ہے' وہ کس طرح کارفرما ہوتی ہیں۔ کہتا ہے کہ تم انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ یہ اس لیے ہے کہ تم ہر اس Effect کو' اس نتیجہ کو' سمجھ سکتے ہو جس کا کوئی سبب تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ اور وہاں ہماری تدبیروں میں' ہمارے امور میں' ہمارے عالمِ امر میں Effect یا نتیجہ وہ ہے جس کے لیے Physical World یا طبعی کائنات میں اس قسم کا کوئی سبب نہیں ہوتا۔ Causes نہیں ہوتے ہیں مثلاً پہلی چیز یہ ہے کہ یہ ساری کائنات Nothingness (عدم) سے Being ہو گئی یعنی وجود میں آ گئی جبکہ اس کے لیے پہلے کوئی مسالہ موجود نہیں تھا۔ فکرِ انسانی سائنس کی انتہائی تجسس و تحقیق بھی اسے سمجھ نہیں سکتی بلکہ اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی کہ Without any previous cause' بغیر کسی پہلے سبب کے' یہ اس قدر عظیم کارگہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی۔ یہ سمجھا ہی نہیں جا سکتا اس لیے کہ اس کا جو سبب یا Cause ہے وہ اس کائنات کے جتنے اسباب یا Causes ہوتے ہیں ان سے متعلق نہیں ہے' وہ عالمِ مشیت ہے' عالمِ امر ہے جسے ہم نہیں جان سکتے لیکن جب کوئی چیز مخلوق ہو جائے گی یعنی اس Physical Universe کے اندر آ جائے گی تو یہاں اس نے کہا ہے کہ کوئی بھی نتیجہ' کوئی بھی Effect' کوئی بھی معلول' بغیر Cause (سبب) کے نہیں ہو سکتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک زمانے میں علمِ انسانی اتنی بلندی تک نہ پہنچا ہو کہ وہ اس کے Cause (سبب) کو معلوم کر سکے۔ اسے آپ یہ کہیں گے کہ وہ Cause (سبب) ابھی تک ہمارے علم کی سرحد میں نہیں آیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے لیے کوئی Cause نہیں ہے۔ یہاں تو اس نے کہا تھا کہ ہم نے ہر امر کو قَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (25:2) کر دیا یعنی اس نے ہر شے کے امکانات اور صلاحیتوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ وہاں جو ہمارا امر تھا وہ The effect without cause (بلا کسی سبب کے ایک نتیجہ) تھا' اسے ہم نے یہاں' اس کائنات میں' Cause (سبب) کا پابند کر دیا ہے۔ اس لیے یہاں پہلی چیز یہ سوچ رکھیے کہ یہاں جو کوئی بھی واقعہ سرزد ہو گا وہ Cause (سبب) کے

بغیر نہیں ہوگا۔ اب جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک دور میں علمِ انسانی اگر اس قدر بلند نہ ہوا ہو کہ اس Cause (سبب) کو معلوم کر سکے لیکن اس کا Cause (سبب) ضرور ہوگا۔ یہی ہیں وہ Causes (اسباب) جنہیں ہم معلوم نہیں کر سکے۔ انہیں ہم Chance (چانس) کہتے ہیں کہ جی وہ اتفاقیہ ایسا ہو گیا۔

اس کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کا کوئی Cause (سبب) نہ ہو

عزیزانِ من! جسے ہم کہیں کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا' یا جسے ہم ''خدا کا کرنا'' کہتے ہیں' یہ اُس میں فقرہ ''خدا کا کرنا ایسا ہوا یا خدا کا کرنا'' بڑا غور طلب ہے' یعنی ہم یہاں خدا کا کرنا اُسے کہتے ہیں جس کے متعلق ہمارے ذہن میں یہ ہو کہ اس کا کوئی سبب نہیں ہے حالانکہ جو خدا کا کرنا ہو' جس کا کوئی سبب نہ ہو' وہ تو اس کے عالمِ امر سے متعلق ہے۔ اس عالمِ خلق میں' اس Universe (کائنات) میں' اس کائنات میں' خدا کا کوئی کرنا ایسا ہوتا ہی نہیں' جس کے پیچھے کوئی Cause (سبب) نہ ہو۔ Cause (سبب) بھی اسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ یوں تو جو کچھ بھی یہاں واقعہ ہوتا ہے' وہ خدا ہی کا کرنا ہوتا ہے مثلاً آگ اگر حرارت پہنچاتی ہے' سورج اگر روشنی دیتا ہے' تو یہ بھی تو خدا ہی کا کرنا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ کہیں قرآنِ کریم اس چیز کو خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے' کہیں براہِ راست ان اسباب کا ذکر کر دیتا ہے۔ دیکھیے سورج' جس نے بنایا' جو ساری کائنات کو روشن کر دیتا ہے' Cause (سبب) کا یہاں واضح طور پہ ذکر کر دیا۔ کہیں ہے کہ دیکھیے ہم نے کس طرح سے سارے کرہ ارض کو منور کر دیا ہے۔ ہم نے کر دیا ہے بالکل ٹھیک ہے' لیکن جہاں جس چیز کے متعلق بھی خدا کہے گا کہ ''ہم نے کر دیا ہے'' تو وہ کسی Cause (سبب) کے Through (ذریعہ) ہوگا' یہاں خدا نے جو کہہ دیا کہ **خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ** (2:7)۔ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تو جب خدا نے ہی مہر لگا دی تو پھر یہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل یہ شے عالمِ خلق سے متعلق ہے۔ دیکھیے دوسری ہی جگہ کہہ دیا کہ یہ مہریں تمہارے اعمال کے زنگ ہیں جو تمہارے دل پہ لگ جاتے ہیں۔ وہاں Cause بتا دی۔ تو یاد رکھیے کہ اس عالمِ خلق میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس کے پیچھے کوئی Cause (سبب) نہ ہو۔ یہ ایسا Cause (سبب) ہوتا ہے جو علمِ انسانی میں آ سکتا ہے۔ یہ علمِ انسانی کی کسی خاص سطح تک ضرور ہوتا ہے' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ Cause (سبب) ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔

انسان کے لیے ہر Effect (نتیجے) کا Cause (سبب) معلوم کرنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! جیسا میں نے کہا ہے کہ وہ جسے ہم Chance یا اتفاق کہتے ہیں یا ہماری زبان کے محاورے میں اُسے ''خدا کا کرنا'' کہتے ہیں کہ ''اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی' اس کا کرنا ہی ایسا تھا'' تو یہاں اس کی ''یہ مرضی' براہِ راست اس کا یہ کرنا'' Without any Cause' بغیر کسی سبب کے کارفرما نہیں ہوتا۔ لہٰذا اب یہ انسانوں کا کام ہے کہ وہ اپنے علم کو اتنی وسعت دیتے چلے جائیں کہ ہر Effect (نتیجے) کا Cause (سبب) معلوم کریں۔ یہ جتنا زیادہ ہر Effect (نتیجے) کا Cause سبب معلوم کر لیں گے' اتنا ہی زیادہ وہ قانون' وہ

قوت' ان کے قبضہ وقدرت میں آ جائے گی۔ تو یہ ہے وہ طریق جو اس عالمِ خلق میں' اس Physical World (طبعی دنیا) میں کارفرما ہے۔ اس اصول کو یاد رکھیے کہ اِس عالمِ خلق میں خدا ہر Effect (نتیجے) کے Cause (سبب) کو براہِ راست اپنی طرف منسوب کرے یا اس کا Cause (سبب) خود بتادے وہ کسی Cause (سبب) ہی کا Effect (نتیجہ) ہوتا ہے۔ تو وہ جو Effect (نتیجہ) ہے اس پہ غور کرنے سے Cause (سبب) معلوم ہو۔ اور Cause (سبب) کے متعلق یہ ہے کہ وہ خدا کا ہی بنایا ہوا ہے۔ اس لیے یہ مظاہرِ فطرت' یہاں کے یہ حادثات وواقعات آیات اللہ کہلاتے ہیں۔ کائنات میں ان بکھرے ہوئے مظاہرِ فطرت یا قوانینِ فطرت کو آیات اللہ کہا گیا ہے۔ اس نے رسول کے متعلق یہ کہا ہے کہ ایک چیز ایسی ہے جو Effect (نتیجہ) ہے مگر اس کا Cause (سبب) آپ کو معلوم نہیں ہوسکتا اور وہ ہے جسے وحی کہا جاتا ہے' وہ انسان کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ قرآن اس کے متعلق کہتا ہے: **مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی** (53:3)۔ یہ رسول اپنی ذاتی فکر کی رو سے کچھ نہیں کہتا۔ بس یہ ایک چیز ہے کہ جس سے Effect (نتیجے) کا Cause (سبب) معلوم نہیں ہوتا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ سوال ہی نہیں ہے کہ یہ معلوم ہوسکے۔ اگلی بات قرآن نے انسان کو یہ کہی کہ عالمِ امر کے ذریعے دی گئی چیزوں کے متعلق اس حجاب میں یا مخمصہ میں نہ پڑو' پڑو بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آ گئی۔

نبوت کے بعد کوئی شخص خدا تعالیٰ سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا

عزیزانِ من! یہ چیز کہ اس کائنات میں ایک ذریعہ علم ایسا ہے اور اب تو میں کہونگا کہ ایسا تھا کیونکہ نبوت تو ختم ہوگئی کہ جہاں ایک Effect (نتیجہ) تو تھا' علم تو تھا' اس علم کا ذریعہ' سرچشمہ' Cause (سبب) جہاں سے ملتا تھا یہ انسانی فکر کی بات نہیں تھی۔ اتنا حصہ یاد رکھیے کہ اس کائنات میں یہ حصہ تو ایسا تھا کہ جس کا Cause (سبب) تو ایک طرف رہا' جسے یہ علم ملتا تھا' وہ بھی اتنا ہی کہتا تھا کہ مجھے خدا کی طرف سے یہ علم ملا ہے اور یہ صرف وحی کے لیے مخصوص تھا۔ اب اس کے بعد انسان کا کوئی علم ایسا نہیں ہے کہ جس کا Cause (سبب) یا ذریعہ اس کائنات میں Visible (مرئی) نہ ہو۔ یہ جو اس کے بعد آپ کے ہاں کے یہ دعوے ہیں کہ ہمیں خدا کی طرف سے براہِ راست یہ علم ملتا ہے' یہ بالکل غلط ہے۔ یہ صرف وحی کے لیے مختص تھا۔ اس کے بعد انسان کا جو علم بھی ہوگا وہ اس کی اپنی فکر کا نتیجہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود انسان کا اپنا جو علم یا فکر تھا اس کے متعلق بھی یہ ایک عرصے تک مخمصے میں رہا' کئی چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق اس کو خود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ مثلاً خوابیں کیسے آتی ہیں؟ یہی معلوم نہیں تھا۔ علم النفس والوں (Psychologists) نے جسے وجدان کہا ہے' Intution کہا ہے' اس کے متعلق علم نہیں تھا۔ اب علم ہوتا چلا جارہا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ اس ذریعہ علم میں ایک وحی تھی جس میں ایک Exception یا استثنیٰ تھی کہ وہ علم نبی کو براہِ راست ملتا تھا۔ اب اس کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب وہ کائنات جس طرح سے وجود میں آ گئی' یہ تو معلوم نہیں کہ کیسے وجود میں آ گئی لیکن اس کے وجود میں آنے کے بعد اب یہاں کی ہر شے وہ ہے' جو سمجھی جاسکتی ہے۔

انسانوں کے لیے وحی خداوندی اب ایک کائناتی شے ہے

وحی خدا کی طرف سے، کس طرح ملی، اس کو قرآن نے امر کہا ہے: یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ (17:85)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وحی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ ان سے کہہ دو کہ وحی کا تعلق خدا کے ''امر'' سے ہے، محسوس کائنات سے نہیں۔ یہ خلق نہیں ہے لیکن جو وحی مل گئی ہے، یہ اب کائناتی شے ہو گئی۔ یہ علم، ہمارے سامنے عربی زبان میں ہے، لکھا ہوا ہے۔ اب یہ علم ہے۔ جس طرح سے کہ باقی کائنات کے مظاہر کو، فکر سے، علم سے، بصیرت سے، تجربے سے، سمجھا جاتا ہے، اسی طرح قرآن کا متن جو ہے اس کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اب یہ عالمِ خلق میں آ گیا ہے۔ قرآن ہمارے سامنے کتاب کی شکل میں ہے، الفاظ کی شکل میں ہے، ایک زبان کی کتاب ہے۔ اس کے معنی، اس زبان کی رو سے متعین ہوتے ہیں، فکر کی رو سے اس کے حقائق سمجھ میں آتے ہیں، تو اب یہ عالمِ فطرت کی چیز ہو گئی۔

مذہب کی دنیا میں مقامِ نبوت کی حیثیت

عزیزانِ من! مذہب کی دنیا نے صرف وحی ہی کے متعلق نہیں کہا کہ وہ عالمِ فطرت سے اوپر کی چیز ہے، اس نے صاحبِ وحی یعنی نبی کے متعلق بھی یہ عقیدہ رکھا کہ وہ بھی اس عالمِ فطرت کا ایک فرد نہیں ہے بلکہ وہ بھی فوق الفطرت ہے۔ قرآن نے قدم قدم پہ اس کی تردید کی۔ کہا کہ اعلان کرتے چلے جاؤ کہ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110)۔ میری تو یہ کیفیت ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ ''انما'' کیا چیز ہے: میں نہیں ہوں بجز اس کے کہ ایک انسان ہوں۔ مثلکم: تمہاری طرح کا۔ وحی میں اس کا یہ کیسا فرق کر کے دکھا دیا، اس نے کہا کہ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ (17:85)۔ یہ وہ وحی پیش کر رہا ہوں، صرف اس کا تعلق خدا کے ''امر'' سے ہے، ورنہ میں تو بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (18:110) تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ لہٰذا اس بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ سے یہ تقاضا کرنا کہ کوئی فوق الفطرت بات کر کے دکھاؤ، یہ اس کی پوزیشن اور حیثیت کے خلاف ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ تقاضے پہ تقاضا کرتے ہیں، قرآن انکار پہ انکار کیے جاتا ہے۔ یہ بنیادی چیز تھی۔

آپؐ نے بھی انسانوں کی طرح موت کا ذائقہ چکھا

عزیزانِ من! اب رہی یہ چیز کہ نبی بھی دوسرے انسانوں کی ہی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ زندگی بھر انسانوں کو خدا بنا رکھیے، جو جی میں آئے کر رکھیے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر نبی پہ موت آئی ہے اور یہ ایک ایسا Touch (لمس) ہے کہ جس پہ موت وارد ہو جاتی ہے وہ Super natural (مافوق الفطرت) نہیں ہو سکتا، موت تو فطرت کے قوانین کے تابع واقع ہوتی ہے۔ نبی کی یہ زندگی بھی Subject to the Laws of Naure (قوانین فطرت کے ماتحت) تھی، قوانینِ فطرت کے تابع تھی۔ قرآن کہتا

ہے کہ دیکھو: یہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں جاتا ہے، اس کے بال بچے ہیں یہی چیز انسان ہونے کے لیے کافی تھی اور آخری چیز اس کے اوپر مہر لگادی کہ یادرکھو: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (21:34-35)۔ (رسول عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔) تجھ سے پہلے بھی ہم نے کوئی انسان ایسا نہیں بنایا جو ہمیشہ کے لیے زندہ رہا ہو۔ نہ ہی تیرے لیے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ پھر اگر تیرے لیے ایک دن مرنا ہے تو یہ کون سے ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں؟ دنیا میں ہر ذی حیات کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اس طرح نبی ﷺ سے کہلوادیا کہ تم سے میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ ان سے کہہ دو میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں مگر تم بار بار تقاضے کرتے چلے جاتے ہو کہ کوئی فوق الفطرت چیز دکھاؤ، اب آج تو میں کہتا چلا جاتا ہوں، مانتے نہیں ہو، کل دیکھ لینا جب میں مرجاؤں گا تو اس وقت تو مانو گے کہ واقعی انسان تھا۔ عزیزانِ من! یہ ایسی شہادت ہے کہ جس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ کہا: ان سے کہیے: لبشر۔ پہلے کہو کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) تمہارے جیسا بشر ہوں اور بشر کے متعلق تمہیں یہ معلوم ہے کہ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ (21:34) تم سے پہلے کوئی بشر ایسا نہیں ہے کہ جو ہمیشہ زندہ رہا ہو۔ تو بشر تو اس کی خصوصیت ہے۔ یہ چیز اسی کے لیے نہیں کہی۔ یہ چیز تو The man (انسان) کے لیے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں کے فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی تھی۔ وہاں بھی جب بشر کی Definition (تعریف) کی ہے تو بشریت کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ اس پہ موت وارد ہوتی ہے، تو یوں کہیے کہ قرآن نے بھی یہی دلیل دی ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (21:35) یہاں جو ہر سانس لینے والا ہے، اس نے مرجانا ہے اور آپ ﷺ کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (39:30) جس طرح تم نے مرجانا ہے، اسی طرح میں نے بھی مرجانا ہے۔

صرف خدا تعالیٰ ہی قانونِ فطرت سے بلند ہے

عزیزانِ من! کہا کہ یہ جو انسان ہونے کی حیثیت سے میری طبعی زندگی تمہارے سامنے ہے، یہ اسی طرح سے فطرت کے قوانین کے تابع ہے جیسے تمہاری زندگی ان کے تابع ہے۔ لہٰذا مجھ سے اس قسم کے مطالبات کرنا جو اس فطری زندگی کے تابع نہیں آتے، تمہارا غلط مطالبہ ہے اور میں اس کا دعویٰ ہی نہیں کر رہا بلکہ میں تو اس کیخلاف دعویٰ کر رہا ہوں، کتنے زور سے کہا گیا ہے کہ ان سے کہو کہ جس طرح تم نے ایک دن مرجانا ہے، میں نے بھی ایک دن مرجانا ہے، تو جو ایک دن مرجائے تو وہ بشر ہوتا ہے اس میں الوہیت نہیں ہوتی، جو (الحیّ) ہے وہ کوئی بشر نہیں ہوتا، وہ صرف خدا ہے جو قانونِ فطرت سے بلند ہے، اور میں تو دعویٰ الوہیت کر نہیں رہا بس یہ کہتا ہوں کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110)۔ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مافوق الفطرت ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔

اِن دینی حقائق کے برعکس مذہبی تصورات اور عقائد کی دنیا

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کو سامنے رکھتے ہوئے مروجہ مذہب کی طرف آ جائیے۔ پہلے تو یہ اہل مذہب سابقہ انبیاء کرام کے معجزات معجزات اور معجزات ہی گناتے چلے گئے پھر ہر نبی کے ان سب معجزات کو جمع کرنے کے بعد' پتہ نہیں' دوگنا کیا' دس گنا کیا اور یہ تمام کا تمام مجموعہ نبی اکرمؐ کے معجزات کے ذیل میں ڈال دیا حتیٰ کہ عقیدہ بنا دیا کہ معجزہ نبوت کی شہادت ہوتا ہے' نبی اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت کی شہادت میں معجزہ پیش کرتا ہے۔ باالفاظ دیگر اگر نبی معجزہ پیش نہ کرے تو اس کا وہ دعویٰ صادق نہیں مانا جا سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ یہ لوگ معجزات کی اس چیز کو کہاں لے گئے۔ اب رہی یہ بات کہ ایک دن میں نے بھی مر جانا اور سامنے والوں نے دیکھا کہ اس کے بعد حضور ﷺ نے وفات پائی' اب یہاں مشکل پیش آ گئی کہ صاحب! زندگی بھر تو یہ سارے فوق الفطرت واقعات' ہزاروں کی تعداد میں سرزد ہوتے رہے' آخر میں تو پھر یہ کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں ہے' حضرتِ مسیح علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ وہ مرے نہیں' وہ زندہ آسمان پہ ہیں' اور دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے' یہ ان کا عقیدہ تھا' یہ دونوں ہی چیزیں ایسی تھیں کہ جن کی تردید نبی اکرم ﷺ ساری عمر کرتے رہے: ہمیشہ محمد ابن عبداللہ تھے' یعنی باپ موجود۔ قرآنِ کریم نے وفات کے متعلق بار بار یہ چیز کہی کہ ہر ذی حیات نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اگر عیسائیوں کی فکر کے سامنے یہ بات کی تو انہوں نے یہی کہا کہ نبی بھی عام انسان کی طرح طبعی قوانین کے تابع ہوتا ہے اس واسطے نہ تو وہ بن باپ کے پیدا ہو سکتا ہے نہ وہ زندہ آسمان پہ جا سکتا تھا' اس طرح اگر یہی چیز رہتی تو ان کی ساری عیسائیت ختم ہو جاتی مگر اس کا تو مدار ہی انہی عقائد پہ ہے تعلیم تو اس کے ہاں ہے ہی نہیں۔

عیسائیت کے موجودہ مذہب میں سوائے طلاق کے کوئی قانون نہیں

عزیزانِ من! حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جو انجیل نازل ہوئی تھی اس کا تو ایک لفظ بھی آج دنیا میں کہیں نہیں ہے' جو ہے وہ محض وعظ ہے' دین نہیں' نظامِ حیات نہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں عیسائیت میں کوئی بھی Law (قانون) نہیں ہے' صرف ایک ہی قانون ہے کہ طلاق نہیں ہو سکتی' بس آج عیسائیت کی ساری انجیل میں کوئی Law' کوئی قانون نہیں ہے' وعظ ہے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ ہے جس پہ عیسائیت کی بنیاد اٹھی ہوئی ہے کہ وہ فوق الفطرت تھے' اگر قرآن سامنے ہوتا تو اِن کی طرف سے فوراً ان کی تردید ہو جانی تھی۔

دین خداوندی کے خلاف ایک گہری سازش

انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی ہی گہری سازش کی۔ جیسا کہ ہر سازش کرتی ہے انہوں نے اپنے یہی عقائد حدیثوں کی شکل میں آپ کی کتابوں میں درج کر دیئے: حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور بن باپ آئے ہوئے ہیں۔ اب آپ کے ہاں یہ دونوں

عقیدے ہیں اور اس کے لیے بکثرت حدیثیں آپ کی کتابوں کے اندر موجود ہیں جب کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ **مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ** (21:34) تم سے پہلے بھی کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جس کو ہم نے حیاتِ جاوید عطا کی ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خدا کے بیٹے ہونے کے متعلق تو قرآن نے بار بار یہ بات کہی اور ایسی دلیل دی ہے کہ میں جب بھی یہ بیان کرتا ہوں تو یہ حقیقت ابھر کر میرے سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن کریم بات ہی ایسے سمجھاتا ہے کہ وہ ایک بدو کے بھی سمجھ میں آ جاتی ہے اور ایک آئن سٹائن (1879-1955) کے بھی۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام میرا بیٹا تھا۔ ان سے پوچھو کہ بیوی کے بغیر کبھی بیٹا ہوتا ہے' ذرا میری بیوی کی بھی نشاندہی کر دیجیے: کون تھی' مسماۃ زوجہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ)؟ کہا کہ ذرا بتاؤ تو سہی' چار لفظوں میں بات ختم کر دی۔

عیسائیت کے سامنے مسلمانوں کا سرِ تسلیم خم ہو گیا

مسلمانوں کے ہاں روایات کے اندر دونوں ہی عقائد دیدیئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں اور زندہ ہیں۔ اب ان کے پاس مناظرے میں کوئی جواب نہیں' یہ دو ہی چیزیں عیسائیت پیش کرتی ہے۔ عزیزانِ من! عیسائیت یہی دو چیزیں پیش کرتی ہے۔ اِن کے ہاں یہ روایات تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم خود تسلیم کرتے ہو اور یہ اتنی پکی روایتیں ہو گئیں کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ حیات وفاتِ مسیح کا مسئلہ اتنا اہمیت اختیار کر گیا کہ اب کفر اور اسلام کا مدار ہی اس پہ ہے' یعنی اگر کوئی حیاتِ مسیحؑ سے انکار کرتا ہے تو اس پہ کفر کا فتویٰ لگ جاتا ہے۔ مزا آیا نا سازش کا' اور داد ہوئی نا کسی قوم کی حماقت کی' یعنی یوں ان کے فریب میں آئے ہوئے ہیں کہ انہوں نے یہ کفر اور اسلام کا مسئلہ بنا دیا اور آپ مزے سے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد عیسائیت کی تردید کرو اور دیکھو کہ مزہ کیا ہوتا ہے؟ اب یہ کچھ تو ہو گیا۔ وہ روایات تو اپنے ہاں داخل کر لیں۔ اب مصیبت پڑی یعنی اپنے ہی ہاتھ سے اندر بیٹھ کے کنڈی لگا لی اور رو رہے ہیں کہ ہم باہر کیسے نکلیں؟ صاحب' رو رہے ہیں' خود ہی اپنے ہاں یہ عقائد اپنی کتابوں کے اندر درج کرتے ہیں' ان کو سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں۔ اس کے بعد جب اِن پر اعتراض ہوتا ہے کہ صاحب! بتاؤ تو سہی کہ دونوں رسولوں میں سے کون سا رسول بڑا ہوا: ایک وہ ہے جو بن باپ پیدا ہوا اور اب تک زندہ ہے' ایک وہ جو باپ سے پیدا ہوا اور تمہارے سامنے مر گیا' یہ اس کی قبر ہے' بتاؤ دونوں میں سے کونسا رسول بڑا ہوا؟ بڑی مصیبت پڑی۔ دیکھتے ہیں ہتھاں دیاں دیتیاں فیر منداں نال کھولنیاں پیندیاں۔ اوناں نے تے دندوی نال مصنوعی لاتے سن کہ گنڈ کھولن لگے تے دندای باہر آ پین۔ [1] انہوں نے کہا کہ نہیں' رسول اللہ ﷺ نور تھے۔ وہ ٹھیک ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے' حضور ﷺ تو نور تھے بشر نہیں تھے اور پھر ان کے ہاں یہ حدیث اول ما خلق الله نوری یعنی سب سے پہلے خدا نے میرا نور پیدا

---

[1] آپ دیکھتے ہیں ہاتھوں کی لگائی ہوئی گانٹھ منہ سے کھولنا پڑتی ہے۔ اب انہوں نے تو دانت بھی مصنوعی ہی دیئے ہیں اگر ان سے گانٹھ کھولیں تو بتیسی ہی باہر نکل آئے۔

کیا۔ دیکھتے ہیں کہ آج کل یہ بحثیں بڑے زور سے چلی ہوئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بشر تھے یا نور تھے؟ وہ یہی ہاتھ کی دی ہوئی گانٹھیں ہیں جو دانتوں سے کھولنی پڑ رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ بشر نہیں تھے جی' مگر قرآن ان سے کہے جا رہا ہے کہ ان کہدو کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (18:110)۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ یہ کہتے ہیں' انہیں کہنے دیجیے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ میں کون ہوں' اصل میں انکساری کے طور پہ فرما رہے تھے' پھر آپ ﷺ کو بھی پتہ نہیں تھا (توبہ توبہ توبہ) یہ تو نور تھے' یہ ان سے بچنے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ یہ بشر تھے ہی نہیں۔ وہ تو زندہ ہیں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔

ہمارے ہاں حیات النبی کا عقیدہ

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں حیات النبی کا عقیدہ موجود ہے۔ اس پہ بھی روز مناظرے ہوتے ہیں' روز بحثیں ہوتی ہیں کہ آپ ﷺ زندہ ہیں' امت میں سے ہر فرد کے احوال سے واقف ہیں۔ صرف یہی نہیں ہے' میرے پاس درس میں وقت نہیں ہے کہ میں ان کی کتابوں سے آپ کو بتاؤں کہ یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے پاس بجسد عنصری تشریف لاتے ہیں' اسی طرح سے جسم کی حالت میں آتے ہیں' باتیں کرتے ہیں' ہمیں چیزیں دیتے ہیں' اور بتاتے ہیں کہ مثلاً فلاں واقعہ دیکھیں کہ اس پر مصیبت پڑی تو اس میں آپ ﷺ تشریف لائے۔ کہتے ہیں کہ میرے پاس تو روز آتے ہیں' یہ تو خیر ان کے پاس روز رات کو ہوتے ہی ہیں۔ وہ اسی طرح' اسی جسم میں' تشریف لاتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ وہ بجسد عنصری زندہ ہیں' موجود ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میلاد کی مجلس میں جب سلام پڑھتے ہیں تو آخر میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ کیوں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں؟ عقیدہ یہ ہے کہ سلام پڑھنے کے وقت رسول اللہ ﷺ خود اس محفل میں تشریف لاتے ہیں' تو ان کی تشریف آوری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم احتراماً' ان کی تعظیم کے لیے اٹھیں۔ یہ عقیدہ ہے۔ بیک وقت ساری دنیا میں میلاد کا انعقاد تو ایک طرف رہا' اس شہر لاہور میں بھی کوئی سو مقام پر محفلِ میلاد منعقد ہوتی ہے اور بیک وقت سلام پڑھا جاتا ہے' بیک وقت رسول اللہ ﷺ ہر محفل کے اندر تشریف لاتے ہیں' کہنے لگے کہ ہاں صاحب! آپ کو اس کا کیا علم؟ وہ تو رسول ہوئے جی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ آگے بڑھیے تو رسول اللہ ﷺ کے معجزات آتے ہیں۔ پھر ان کے ہاں کے یہ جتنے اولیاء اللہ ہیں' ان کی کرامات ہیں یعنی ایک لفظ کو بدل دینے سے کہدیا کہ نہیں' اس میں اور اس میں فرق ہے: رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی تھی' انہیں کشف ہوتا ہے' صرف لفظ کا فرق ہے کہ انہیں الہام ہوتا ہے' ٹھیک ہے' نبی کو معجزات ملتے ہیں اولیاء اللہ کو کرامات ملتی ہیں۔ جی' ذرا دونوں میں فرق کر دیجیے۔ کہنے لگے: جی' فرق یہ ہے کہ وہ معجزہ ہوتا ہے' یہ کرامت ہوتی ہے کہ جی یہ فرق ہو گیا۔ بھئی' وحی کے بعد تو خدا سے براہِ راست علم کا یہ دعویٰ ہے یہ تو ختم نبوت کے خلاف ہے' کیا فرق ہے؟ کہنے لگے: جی نہیں' نہیں وحی نہیں آتی ہے' وہ اصل میں الہام ہوتا ہے' کشف ہوتا ہے۔ چل بھئی' اتنا بڑا فریب ہے جو آپ کو دے رہے ہیں لیکن اس فریب سے کیا ہوتا ہے! اب اولیاء اللہ

آئے۔ انکے ہاں کے یہ سارے فقیر' داتا صاحب' خواجہ معین الدین چشتی' یہ جتنے بھی بڑے بڑے نام ہیں ان کی کرامات تو آپ کے سامنے موجود ہیں عقیدہ یہ ہے کہ وہ بھی زندہ ہیں۔

زیرِ زمین سیکٹریٹ کا تصور اور میری اپنی کیفیت

عزیزانِ من! آپ لوگوں نے تو ان کے ہاں کی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں۔ اِس فقیر [1] نے تو زندگی کے پہلے اتنے عرصے تک نہ صرف یہ کتب پڑھی ہیں بلکہ ان کو پڑھایا بھی ہے: یہ زندہ ہیں' اس دنیا کا نظم و نسق جو بظاہر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے' جو گورنر ہیں' چیف منسٹر ہیں' پرائم منسٹر ہیں' یہاں کا ایس پی ہے' یہاں کا کمشنر ہے۔ ان افسران کے متعلق عقیدہ ہے کہ یہ سب کٹھ پتلیاں ہیں' Stage (اسٹیج) کے Actors (اداکار) ہیں' درحقیقت یہ سارا اسی طرح سے سیکریٹریٹ زیرِ زمین موجود ہے۔ یہ لوگ آپ کو نام لے کے بتائیں گے کہ پنجاب کا گورنر یہ ہے' کمشنر یہ ہے' ڈپٹی کمشنر یہ ہے' وہاں سے احکام صادر ہوتے ہیں اور جو یہ لوگ ہیں یہ تو عالمِ مجاز میں ہیں۔ اس لیے ان کے قلم سے وہ احکامات صادر ہوتے ہیں اور یہ جو ہر روز ناانصافیاں اور دھاندلیاں ہوتی ہیں' یہ کہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے جی او تھلے بیٹھے ہوئے اے وی نئیں روک سکدے ہیگے' تے او انتظام کا ہدا کردے نیں فیرا ے تھلے بیٹھے ہوئے۔ [2] یہ انکے عقائد ہیں۔ جب یہ فقیر [1] بھی پہلے پہل بٹالہ سے لاہور آیا تھا تو یہاں کے یہ جو نظم و نسق کا سیکریٹریٹ تھا: لاہور کا کمشنر کون ہے' ڈی سی کون ہیں' جو بڑے بڑے تین چار اوپر والے تھے ان کے متعلق ہمیں ایڈریس دیدیئے گئے تھے۔ ہم ان سے ملے' ہمارا بھی یہی عقیدہ تھا۔

عقیدے کے سلسلہ میں دیوبندی اور بریلوی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے

عزیزانِ من! یہ جو یوں قبروں پہ جاتے ہیں تو یہ بات نہیں ہے کہ وہ قبر ہوتی ہے جس پہ یہ جاتے ہیں اور اس پہ جا کے یہ کچھ کہتے ہیں۔ عقیدے یہ ہیں کہ وہ زندہ ہیں' سنتے ہیں' اور پھر ہماری مرادیں برلاتے ہیں۔ جب ذرا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو خدائی اختیار ہے تو پھر اس میں تسلط برت لیتے ہیں بس بریلوی اور دیوبندی میں اتنا سا یہ فرق ہے۔ آپ کو معلوم نہیں یہ دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں بس فرق یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جی نہیں' یہ براہِ راست نہیں کرتے' یہ خدا سے کروالاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایک ہی دفعہ اختیارات Delegate (تفویض) کردیئے ہیں۔ بس ان میں اتنا سا ہی فرق ہوتا ہے۔ جس کا کام ہے اسے اس سے کیا غرض ہے کہ یہ براہِ راست اپنے تفویض شدہ اختیارات کے تابع Sanction (منظور) کردیتا ہے یا Sanction لکھ کر اوپر سے اللہ میاں کا انگوٹھا لگوا

---

[1] یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی طرف ہے۔

[2] اگر وہ زیرِ زمین ان ناانصافیوں کو بھی نہیں روک سکتے تو پھر وہ کس کا انتظام وانصرام کرتے ہیں؟ نیچے بیٹھے ہوئے کس کا نظم و نسق چلاتے ہیں؟

لاتا ہے۔ اس کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے' اُسے تو اپنے کام ہو جانے سے غرض ہے۔ لیکن بقول اِن حضرات کے ان کے بغیر تو کوئی براہِ راست خدا تک جا ہی نہیں سکتا۔ خدا ان کے بغیر حکم ہی صادر نہیں کرتا' جانا تو ان تک پڑتا ہے۔ تو بات تو وہی ہو گئی۔ اُسے تو اپنے کام ہو جانے سے غرض ہے۔ یہ سب زندہ مانے جاتے ہیں اور ان کی کتابوں میں صفحوں پہ صفحے لکھے ہوئے ہیں کہ فلاں مقام پر یہ ہور ہا تھا اور وہاں جب ذرا مشکل پڑی تو فلاں صاحب تشریف لے آئے۔ اسی طرح سے' اسی بدن کیساتھ اور بخود آ کر انہوں نے یہ کام کر دیا۔ اے کھڈ چ گڈاں پھسیاں ہو یاں ان کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ بالکل نہیں نکلتی تھی تو وہ مرید جو تھا اس نے یہ کہا کہ جا حضرت میں تو مصیبت میں آ گیا وہ حضرت فوراً آ گئے کندھا دتا' تے گڈ باہر کڈ دتی جیویں گاما پہلوان آ گیا ہیگا۔ ❶ عزیزانِ من! یہ چیزیں یوں مذاق کی نہیں ہیں' ان کے ہاں کی مستند کتابوں میں ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ فقیر تو آدھی عمر یہی کچھ پڑھتا رہا' پڑھاتا رہا۔ یہ مدد کے لیے زندہ ہیں آتے ہیں' یہ سب کچھ کرتے ہیں اور اس میں آپ کے ہاں کا کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں جو مستثنیٰ ہو۔ کسی نہ کسی شکل کے اندر یہ سب مانتے ہیں۔

''پرویز کافر ہے'' کی حقیقت

اب ظاہر ہے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ہیں اور یہ تو کھلا ہوا شرک ہے تو اس کو کافر قرار دینے میں کونسا فرقہ ایسا ہے جو پیچھے رہے گا۔ یہ بات تھی جو ایک ہزار ''علما'' نے پرویز کے خلاف فتویٰ دیدیا اور یہ کہدیا کہ صاحب! اتنا بڑا فتویٰ اس سے پیشتر کسی کے خلاف نہیں ہوا۔ میں نے کہا: آپ کا بہت بہت شکریہ' یہ تو بہت بڑا مقام ہے صاحب! او کیوں؟ یہ اس لیے ہوا کہ یہ سب اس لیے متفق ہیں کہ یہ سب کسی نہ کسی شکل میں ان چیزوں کو مانتے ہیں جب کہ قرآن ان چیزوں میں سے ہر شکل کو شرک قرار دیتا ہے' کفر قرار دیتا ہے۔ جب قرآن کا طالبعلم اٹھے گا تو پھر یہ چیزیں اس کو کہنی پڑیں گی اور جب وہ کہے گا تو ان میں سے کون ہے کہ جو پھر اسے کافر قرار دے کر اس کے اوپر فتوے نہ لگا دے۔

کفر اور ایمان کا فیصلہ تو خدا کے مقرر کردہ میزان کے مطابق ہوگا

عزیزانِ من! یہ فتاویٰ تو لگیں گے لیکن یہ اس کا فرض ہے کہ کفر اور ایمان کی یہ میزان اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے' ان کے ہاتھ میں نہیں دی۔ وہ تو وہاں کا فیصلہ بھی یہی ہوگا کہ کیا یہ چیز میری بھیجی ہوئی کتاب کے مطابق تھی' اگر وہ اس کی بھیجی ہوئی کتاب (قرآنِ کریم) کے مطابق تھی تو ان کے ہزار فتوؤں کے باوجود وہ ایمان ہے' اور اگر اس کے خلاف تھی تو ان کے ہزار دعویٰ ایمان کے باوجود وہ کفر

---

❶ یہ گاڑیاں کھڈوں (Ditches) میں جا پڑی تھیں۔ اب ان کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ یہ قطعاً نہیں نکل رہی تھیں مرید آیا' حضرت کو پکارا: یا حضرت مصیبت پڑ گئی ہے۔ وہ حضرت فوراً آئے' کندھا دیا تو گاڑی کو یوں جا باہر کیا کہ گویا گاما پہلوان نے یوں کندھا دیا ہے۔

ہے' وہ شرک ہے۔ یہ چیزیں باقی ممالک میں بھی تھوڑی تھوڑی ہیں' ہمارے ہاں یہ چیزیں بہت زیادہ عام ہیں اس لیے کہ یہ شاہین ہزار سال تک ان کرگسوں کے اندر رہا یعنی ہم ان ہندوؤں کے اندر رہے اور ہمارے ہاں کا' میرا خیال ہے' کہ نوے پچانوے فیصد تو وہ ہیں جو انہی کی اولاد ہیں' ہندو سے Convert (تبدیل) ہوئے ہیں۔

میں خود تین پشتوں سے مسلمان ہوا ہوں

عزیزانِ من! یہ جو آپ کے سامنے بیٹھا❶ ہوا ہے' یہ جسے میر ❷ نے گدائے میکدہ کہا ہے' یہ خود ان ہندوؤں کی اولاد ہے۔ اِسے مسلمان ہوئے تین ایک پشتیں ہوئی ہیں۔ جنہیں آپ راجپوت کہہ رہے ہیں یہ تو سارے کے سارے ہندوؤں کی اولاد ہیں۔ عرب سے تو کوئی راجپوت آ ہی نہیں سکتا تھا' اور بھی جو ہمارے ہاں کے ہیں یا ان کی اولاد سے ہیں' ہم ہندوؤں سے Convert (تبدیل) ہوئے ہیں اور Convert (تبدیل) ہونے والوں کی اگر صحیح تعلیم و تربیت ساتھ کیساتھ نہ ہو تو بس اتنے کے بعد اتنی ہی واجبی سی Convertion (تبدیلی) ہوتی ہے کہ اوہدی گت کٹدے نیں تے مونڈن توڑ دیندے نیں۔ باقی اوٗ او سے طراں دا' او سے طراں رام داس ہوندا اے او۔❸ میرے اپنے گھروں میں دیکھیے: میرے دادا علیہ الرحمۃ کو تو چھوڑ دیجیے کہ وہ صاحبِ شریعت بھی تھے اور اہلِ طریقت بھی تھے اور باقی گھروں کے اندر میرے ننھیال کے ہاں والدہ وہاں رہتی تھیں' ہم وہاں پرورش پاتے تھے' صبح سے شام تک نوے فیصد جو وہاں مراسم ہوتے تھے وہ سارے کے سارے ہندوانہ ہوتے تھے۔

ہم میں سوائے نام کے ہر شے مشترک چلی آ رہی ہے: وہاں وہ سرتاپا کفر تھا اور یہاں یہ عینِ اسلام ہے

عزیزانِ من! بس اس میں جو Convertion (تبدیلی) ہوئی تو وہ صرف ایک نام تھا جو انہوں نے بدلا کہ وہ رام داس تھا تو انہوں نے اب عبدالرحمٰن نام رکھ لیا۔ اسی طرح سے وہ جو پرانے سارے مسالک آتے تھے ان کے صرف نام بدلے۔ مجھے یاد نہیں کس نے لکھا' بڑا عمدہ لکھا تھا کہ ''یہ انکے ہاں کے بت کھڑے ہوتے تھے ہم نے انکو لٹا دیا''۔ یہ ساری قبریں لٹائے ہوئے بت ہیں۔ جو انہوں نے کہا' بہت اچھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ الفاظ' یہ نام' بدلے ہوئے ہیں' وہاں ''استحقاق'' تھا ہمارے ہاں یہ ''آستانہ'' ہوا' وہ وہاں ان کی یاد میں ''یاترا یا درشن'' کرنے جاتے تھے' ہم ''زیارت'' کرنے جاتے ہیں' وہ وہاں جاکے ''پرنام'' کرتے تھے' ہم ''سلام'' کرتے ہیں' وہ ''ڈنڈوت'' کہتے تھے ہم ''سجدہ تعظیمی'' بجالاتے ہیں' وہ ان کے ''پھیرے'' لیتے تھے ہم ''طواف'' کرتے ہیں' وہ وہاں

---

❶ یہ پرویزؒ کا اپنی طرف اشارہ ہے۔

❷ میر تقی میر (1721-1810)

❸ کہ کسی کی چٹیا کاٹی اور کسی کی مونڈن' باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہا' وہی رام داس اور وہی رام رام۔

''پرشاد'' بانٹتے تھے ہم ''تبرک'' بانٹتے ہیں' وہ ''بھجن'' گاتے ہیں' ہم ''قوالیاں'' کرتے ہیں۔ کہنے لگے گل اکوای [1] : وہ سرتاپا کفر' یہ عینِ اسلام۔ یہ سارا کچھ یوں ہو رہا ہے اور یہ کچھ کہنے والا کافر' جب کہ یہ مومن کے مومن اور وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ تم اکثر یہ دیکھو گے کہ مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ یہ عزیزانِ من! قرآن میں ہے' اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

ایک تاریخی واقعہ

میں ابھی عرض کر رہا تھا کہ حیات النبی پہ بحث بڑے زوروں پہ چلی' جو آج [2] کل بھی چل رہی ہے: زندہ ہیں' حیات ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' نبی اکرم ﷺ کی وفات (632ء) پر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ سوال بھی اٹھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اعراب یا بدو باہر کے قبائل ہوں جن کے متعلق قرآن کریم نے خود کہا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں' یہ صرف یہ کہیں کہ ہم نے اس اسلامی مملکت کی عظمت کو دیکھا' اس سے ہم متاثر ہوئے' مرعوب ہوئے ہیں اور ہم اس کے سامنے جھک گئے' اپنے آپ کو Surrender کر لیا۔ ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ایمان لے آئے اس لیے کہ **فی قلوبھم** ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ہے۔ ہم سب مسلمان اس کیٹگری میں ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ یہ جو اعراب تھے ان کے دل میں بھی وہ باتیں ہوں جو یہ کل تک کرتے تھے کہ نبی مرتا نہیں ہے' اسے موت نہیں آتی ہے' ہوسکتا ہے کہ ان میں سے انہوں نے بھی یہ بات کہی ہو کہ نہیں یہ مت کہو کہ رسول وفات پا گئے۔ میں یہ اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں' تاریخ ہے پتہ نہیں اس میں سے کتنا حصہ صحیح ہے کتنا غلط ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ایسی بات ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ بصیرت

عزیزانِ من! اس روایت میں' تاریخ میں' یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644 A.D) بھی تلوار سونتے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جو کہے گا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے' میں اس کا سر قلم کر دونگا۔ گویا یہ جو حیات النبی ﷺ والے عقیدے ہیں ان کی شہادت میں یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ جیسا شخص' جو قرآن پہ اتنا زیادہ عبور رکھنے والا تھا' وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی کہا کہ نہیں' رسول اللہ ﷺ وفات نہیں پا گئے۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو یہ تو بڑی عظیم چیز ہے اور واقعی نظر آتا ہے کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ (581-644 A.D) کی نگاہیں یہاں جاسکتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ مملکت بالکل نئی نئی بنی ہے' ابھی بالکل کچے دھاگے ہیں اور یہ اتنا اضافہ ہوا ہے یہ جو صحابہ مہاجرین اور انصار مدینے میں ہیں بہت تھوڑی تعداد میں تھے' یہ باہر کے سارے کے سارے قبائل یہی مانتے تھے' سلطنت کی قوت اور شوکت کو دیکھ کے انہوں نے صرف Surrender کیا تھا اور عین اس وقت جب یہ مملکت ابھی اسی حالت میں تھی

---

[1] کہنے لگے کہ بات تو ایک ہی ہے۔

[2] یہ 5 ستمبر 1976ء کی بات ہے۔

حضور ﷺ وفات پا گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644 A.D) کی نگاہ دُور اندیش تھی، انہیں معلوم تھا کہ کسی مملکت کا اگر Head of the State (سربراہِ مملکت) کسی وقت موجود نہ رہے، بغاوت ہو جاتی ہے تو انہوں نے یہ بات سوچی کہ سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ (سربراہِ مملکت) منتخب کرے اور اس وقت تک یہ خبر باہر نہ نکلے کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ کیا بات ہے اس شخصیت کی صاحب! عزیزانِ من! چودہ سو سال پیشتر کی سیاست میں یہ دُور نگہی، آج کے سیاستدان اس کو Appreciate (اظہار پسندیدگی) کریں گے کہ اس چیز کو کیوں پوشیدہ رکھا جاتا ہے کہ ان کی وفات نہیں ہوئی، اب یہ کتنے کتنے عرصے تک اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہیں، وفات نہیں ہوئی، جب تک وہ دوسرا انتظام نہ کرلیں اور اس کے بعد پہلا انتظام یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے اس کا جو Successor (جانشین) ہے اس کو منتخب، نامزد، مقرر جو بھی کیجیے، اس کا اعلان کر دیا جائے پھر وہ جو پہلے فوت ہو گیا ہے اس کا اعلان کیا جائے۔ یہ وہ چیز تھی جو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے کی۔

آپ کی وفات کے بعد فوری طور پر جانشین کا انتخاب کیوں ضروری تھا

عزیزانِ من! اگر یہ روایت صحیح ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس نکتہ نگاہ سے بالکل صحیح ہے، اس میں یہ عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح کردار نظر آتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہاں بیٹھے ہوئے یہیں مسجد کے اندر بات رہے۔ اگر کسی نے اس قسم کی ایک بات بھی باہر کی تو میں اس کا سر اڑا دونگا۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیا کرنا ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر پہلا کام یہ ہے کہ حضورؐ کے جانشین کا انتخاب کرو۔ وہ جو آج تک الزام دیا جاتا ہے کہ صاحب! حضور ﷺ کی لاشِ مبارک جو ابھی بے گور تھی اسے چھوڑ کے، دفن بھی نہیں کیا اور ان کو خلافت کی پڑ گئی۔ عزیزانِ من! پڑ نہیں گئی تھی بلکہ اس کے اندر یہ عظیم نقطہ پنہاں تھا کہ پہلا کام یہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ تو خدا کی طرف سے مامور من اللہ تھے، انہیں نامزد کرنے کا، منتخب کرنے کا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو ان کا معاملہ شوریٰ کا تھا، اب تو رسول اللہ ﷺ کا جانشین انتخاب کے ذریعے مقرر ہونا تھا۔ تو انہوں نے پہلا کام یہ کہا کہ قبل اس کے کہ یہ بات باہر نکلے کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے، پہلا کام یہ کرو کہ آپ کے جانشین کا انتخاب عمل میں آ جائے اور اس لیے یہ بات تھی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی تدفین کا بھی انتظام پہلے نہیں کیا، پہلے وہ کام کر لیا اور یہ کہا کہ جھگڑے اٹھیں گے۔ اگر آپ کا کوئی مرکزِ ملت، حضورؐ کا جانشین موجود نہ ہوا تو امت میں اس جھگڑے کو کون نپٹائے گا، اسی بات پر یہاں سے اختلافات شروع ہو جائیں گے۔ وہ مرکزی اتھارٹی پہلے موجود ہونی چاہیے پھر باقی کام کیے جائیں گے۔ اور میں سمجھتا ہوں، یہ سیاستِ فاروقی رضی اللہ عنہ تھی کہ بات پیدا ہو گئی: پہلا سوال یہ پیدا ہو گیا کہ حضورؐ کو کہاں دفن کیا جائے؟ اس میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اگر یہ خلیفۃ المسلمین، اگر یہ امیر المؤمنین، یہ مرکزِ ملت، منتخب ہو کے اتھارٹی نہ سنبھالے ہوئے ہوتے تو اس کا کوئی بھی فیصلہ نہ ہونے پاتا۔ اسی Issue (مسئلہ) پر آپس میں اختلاف ہو جاتا اور تلواریں چل پڑتیں۔ جب یہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین،

حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ! آپ کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مجھے یاد ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور جگہ بھی وہی صحیح ہے کہ جس مقام پہ حضورؐ نے وفات پائی ہے' حجرہ حضرت عائشہؓ میں' یہیں حضورؐ دفن ہونگے۔ اور سب نے تسلیم کرلیا۔ کیوں تسلیم کرلیا؟ یہ ایک فرد کی رائے نہیں تھی۔ یہ ہیڈ آف دی سٹیٹ (مملکت کے سربراہ) کا فیصلہ تھا۔ لہٰذا یہ بات تھی جو یہ تلوار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ باقی رہا عقیدے کا سوال؟ تو جب یہ بات اٹھی تھی تو وہ عقدہ تو اسی منتخب ہونے والے نے حل کرکے رکھ دیا تھا۔ جب یہ بات اٹھی تھی' انہیں نظر آتا ہوگا کہ اب یا تو یہ عقیدہ ہے یا ان کے ذہن میں جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں کہ ایک نبی بشر نہیں ہوتا' وہ وفات نہیں پاسکتا' اس عقیدے کا بھی زائل کرنا ضروری تھا اور یا اگر یہ بات ہے کہ ان کے ذہن میں تھا کہ یہ جیسے نبوت ختم ہوگئی' اسی طرح سے تو اس خیال کی تردید بھی نہایت ضروری تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632ء)[1] کے بعد یہ معاملہ بڑا اہم تھا اور ان دونوں چیزوں کے لیے' یہ جانشینِ رسول' یہ خلیفۃ الرسول' یہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ' یہ یارِ غار رضی اللہ عنہ' آئے اور آکے انہوں نے حمد وصلوٰۃ کے بعد قرآنِ کریم کی اس آیت کی تلاوت کی کہ خدا کا ارشاد ہے' مومنین سن رکھیے کہ **وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ** (3:144)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں تھے کہ خدا کے ایک پیغامبر تھے۔ **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ** (3:144)۔ ان سے پیشتر بھی اسی طرح خدا کے رسول اپنا اپنا فریضہ سرانجام دینے کے بعد دنیا سے تشریف لے گئے۔ **اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ** (3:144)۔ لہٰذا اگر یہ پیغام رساں (محمدؐ) بھی کل کو مر جائے یا قتل کردیا جائے' تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہوگیا' اور اُس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ عزیزانِ من! اسے پھر سن رکھیے۔ یہ قرآن کی آیت ہے' کہ اگر یہ رسول بھی کل کو وفات پاگئے یا قتل کردیئے گئے تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ دین' یہ اسلام' یہ سب کچھ' تو اس کی ذات سے تھا' جب یہی نہیں رہا تو یہ سارا سلسلہ ختم ہوگیا تو پھر تم اپنے اسی پرانے مسلک کی طرف لوٹ جاؤ گے' وہی عہد جاہلیت کا مسلک اختیار کرلو گے کیونکہ تم سمجھو گے کہ دین تو اس کی ذات سے وابستہ تھا' یاد رکھو! دین کسی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا' یہ دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھا' دین اللہ ہے۔

یاد رکھو! یہ دینِ خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تک محدود نہ تھا

کبھی آپ نے اس پہ غور کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہمیشہ اس کو دین اللہ کہا ہے۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خود تجویز کردہ دین نہیں تھا' خدا کا عطا کردہ دین تھا' جسے حضورؐ نے متشکل کرکے دکھایا تھا۔ اسی لیے یہ دین اللہ تھا' تو یاد رکھو کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ تو تھا اور آپؐ وفات پاگئے' لہٰذا یہ سلسلہ ختم ہوگیا' اسے سمجھنا چاہیے کہ اس کے دل میں یہ نہایت غلط خیال ہے۔ یہ خدا کا دین ہے' یہ شخصیتوں کا محتاج نہیں ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ ان کی ذات کے ساتھ تھا اور اس کے بعد وہ چاہتا ہے کہ اپنے پرانے مسلک کیطرف لوٹ جائے۔ وَ

---

[1] Rauf, Abdur Dr: History of Islam, Ferezsons (PVT) Ltd, Lahore 1994, P.20

وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ (3:144) جو اس طرح پلٹ جانا چاہتا ہے' جاؤ' پلٹ جاؤ' خدا کی یہ مملکت تمہارے ووٹوں کی محتاج نہیں ہے' کہ تم آج یہاں سے فلور کو کراس کر جاؤ گے تو ہمارے ووٹ کم ہو جائیں گے' اس کے بعد دوسری پارٹی آ جائے گی' یہ تو اللہ کا دین ہے' خدا کا تم کچھ نہیں بگاڑو گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قرآنی بصیرت

عزیزانِ من! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634 A.D) نے یہ آیت تلاوت کی اور اس کے بعد وہ روایت کہتی ہے' کیا بات ہے' کہا کہ سن رکھو! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا معبود اور الہ مانتا تھا وہ یہ سمجھ لے کہ اس کا معبود واقعی مر گیا ہے اور جو خدا کو الہ مانتا تھا اسے یقین ہونا چاہیے۔ **هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ** (2:255)۔ وہ ہمیشہ زندہ ہے اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ ہم خدا کو الہ مانتے ہیں' ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو الہ نہیں مانتے۔ یہ ہے اسلام۔ اور پھر سکوت طاری ہو گیا۔ یہ تھے وہ لوگ' عزیزانِ من! تربیت یافتگانِ آغوشِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ان کی نگاہ قرآن کے اوپر تھی۔ یہ اس قبیل کے سارے واقعات ہمارے سامنے یہ لوگ پیش کرتے ہیں جو اس کے بعد اس پر مصر ہوتے ہیں کہ آپؐ زندہ ہیں' فوت نہیں ہوئے۔ حیات النبی یا وفات النبی پر بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ اس آیت کے بعد گنجائش کہاں رہتی ہے۔ عزیزانِ من! جس طرح سے یہ دین نبی اکرمؐ کا خود ساختہ نہیں تھا' خدا کا دین تھا' جو حضورؐ نے پہنچا دیا' پوری طرح سے اطمینان کر لیا' خدا نے اس اہتمام کی تکمیل کر لی' اس کی حفاظت کا وعدہ لے لیا' وہ شخصیتؐ فطری قوانین کے مطابق جسدِ عنصری تھا' نہ یہ اس کا دیا ہوا دین تھا' نہ اس جسد کے نہ رہنے سے کچھ دین کا بگڑتا تھا' اس دین نے اسی طرح سے آگے چلنا تھا' دین تو قرآن کے اندر تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634) کی قرآنی بصیرت سے یہ نازک مسائل حل ہو گئے۔

ملت اسلامیہ کے تمام افراد سے ایک دردمندانہ اپیل

عزیزانِ من! وہ جو ایک فقرہ ہے' میں سمجھتا ہوں کہ واقعی وہ ستاروں کی کرنوں سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ (581-644) نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ طیبہ کے آخری سانس میں کہا تھا۔ وہ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (571-632) [1] نے کہا تھا کہ کاغذ قلم دوات لاؤ۔ میں اس واقعہ کو کبھی تفصیل سے بیان کروں گا۔ ہاں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644) نے اس وقت یہ کہا تھا کہ قرآن تکمیل تک پہنچ گیا' خدا نے اس کے متعلق اعلان کر دیا کہ **تمت کلمت ربک صدقًا و عدلاً لا مبدل لکلمت الله** ۔ اس قرآن میں' خدا کا ضابطۂ قوانین' تمام صداقتوں کو لیے' اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا

---

[1] Rauf, Abdur Dr: History of Islam, Ferezsons (PVT) Ltd, Lahore 1994, P.20

کرتے ہوئے، مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر وتبدل کرنے والا نہیں یعنی یہ ایسا مکمل ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں۔ اور خدا کا کہنا ہے کہ **اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ** (15:9) ہم نے اسے نازل کیا اور پھر ہم نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔ اب یہ مکمل، غیر متبدل، محفوظ کتاب ہے اس کے بعد اور کس چیز کی ضرورت ہے! اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ** [1] آپ کو معلوم ہے آج یہ کہنا کہ **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ** [1] کتنا جرم ہے۔ اس کے خلاف اتنی موٹی کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کا مقدمہ بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ شیعہ حضرات کی ایک کتاب ہے۔ اس کی وہی بنیاد ہے جیسے ہمارے ہاں کی بخاری ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ شائع ہوا۔ اس کا مقدمہ لکھا گیا اور اس میں یہ چیز ہے کہ کوئی کچھ کہے، اس میں پرویز کا نام تو ضرور آنا ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، ہم خوش ہیں، کئی لوگوں کے دل تک تو یہ بات پہنچ جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ ہے کون؟ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ کہاں تک پہنچتے ہیں۔ الشافی اس کتاب کا نام ہے، اس کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب شیعہ حضرات کی طرف سے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ ان علماء حضرات کو مخاطب کرتا ہے کہ تم لوگوں نے اس دَور کے اندر (حسبنا کتاب اللہ) [1] کی بات اٹھانے والے پرویز کے خلاف تو کفر کے فتوے لگا دیئے لیکن (معاذ اللہ) جس سرچشمہ سے یہ بات چلی ہے اس کے خلاف کچھ کہنے کی تمہیں جرأت کیوں نہیں پڑتی۔ جی، لیکن مجھے ان سے گلہ نہیں ہے، گلہ ان پہ ہے، انہوں نے بھی میرے خلاف کفر کا جو فتویٰ لگایا تھا، اس میں یہ کہا تھا کہ یہ (حسبنا کتاب اللہ) [1] کہتا ہے۔ اس نے ٹھیک کہا ہے، کہ اگر جرم یہی حسبنا کتاب اللہ [1] کہنا ہے اور اس پہ اس کی وجہ سے اس کے خلاف یہ فتویٰ لگ رہا ہے تو ان سے وہ کہتا ہے کہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ تو پرویز کا خود ساختہ نہیں ہے، اس کے دماغ کی بات نہیں ہے، کہو کہ جہاں سے یہ بات شروع ہوئی تھی، جس سرچشمہ سے یہ بات نکلی تھی اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

میں کیا عرض کروں، عزیزانِ من! کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ انہوں نے یہ بات کہی۔ حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ (573-634) نے منبر پہ کھڑے ہو کے یہ بات دہرا دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی موت اور حیات سے دین پر کچھ اثر نہیں پڑتا، ان کا فریضہ تھا: دین کا پہنچا دینا، عملی شکل میں اس کو دکھا دینا۔ انہوں نے یہ کر دیا، دین خدا نے قرآن میں محفوظ کر دیا، قرآن ہمیں وہ دے گئے ہوئے ہیں۔ اب ان کے بعد یہ سلسلہ چلے گا، اسی طرح سے چلے گا، آپ کے جو جانشین ہونگے جن کو آپ خلفائے رسول کہیں گے، ان کے ذریعے سے یہ دین، اس شکل کے اندر قائم رہے گا اور چلتا جائے گا۔ فرق یہ ہوگا کہ وحی اب ختم ہوگئی اس لیے کہ وہ اس کے اندر مکمل ہوگئی ہے، مکمل ہونے کے بعد، محفوظ ہونے کے بعد، اور غیر متبدل ہونے کے بعد، اب کچھ اور لکھوانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

---

[1] ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

ختم نبوت کامل انسان کے لیے باعث شرف ہونے کی دلیل ہے

عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے کہ یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ پہ نبوت ختم ہوگئی اور اس پہ جو ہم کہتے ہیں کہ صاحب! یہ حضورؐ کا بہت بڑا شرف ہے، شرف تو ایک طرف رہا، اس کی دلیل یہ ہے کہ کتاب خدا کی جو مکمل غیر متبدل محفوظ ہو جائے اس کے بعد مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی، یہ مکمل ہے کہ اضافے کی ضرورت نہیں، غیر متبدل ہے کہ تبدیلی کی ضرورت نہیں، محفوظ ہے اس لیے یہ بھی نہیں کہ کوئی اس میں کسی قسم کا حذف کر دے گا یا ضائع کر دے گا، تو اس کے بعد نبوت کی ضرورت نہیں تھی، ٹھیک کہا اقبالؒ (1877-1938) نے کہ قرآن کی تکمیل نے ختمِ نبوت کے لیے خود دلیل پیش کر دی، اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، قرآن موجود تھا، اس کے بعد قرآن کو چلانے والی ایک مرکزی اتھارٹی کی ضرورت تھی، وہ حضور ﷺ کے جانشین تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی جگہ لے لی، مرکزی اتھارٹی کی حیثیت سے، نبی ہونے کی حیثیت سے نہیں، وہ تو معاملہ ختم ہو گیا، انہوں نے آگے چلانا تھا، یہ تھا اکرام آپ کا بڑا سیدھا سادہ سا۔ جب تک یہ سلسلہ قائم رہا، دین قائم رہا۔

دینِ خداوندی کی عملی شکل امت واحدہ کی تشکیل ہے

عزیزانِ من! دین یہ نہیں کہ اس قسم کے عقیدے یوں آئے اور اِدھر سے یہ آیا اور اُدھر سے یہ آیا اور یوں اس میں خلط مبحث ہو گیا، یہ آنے والی باتیں تو اس دور کے اندر بھی تھیں۔ دروازے کون بند کر سکتا ہے، وہ یہ چیز تھی کہ دین کی شکل یہ ہے، سن رکھیے! ایک امت اور پھر اگلی بات چھڑ گئی تو پھر پرویز کے خلاف کفر کا فتویٰ آ جائے گا، قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ دین کی بنیاد وحدتِ امت ہے، یہ ایک امت ہے، اس میں فرقوں کا سوال ہی نہیں، یہ قرآنِ کریم ایک ضابطہ حیات، ہے اس میں مختلف فقہوں کا سوال ہی نہیں، ایک مملکت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انتظامی ضروریات کے ماتحت جیسے مثلاً آپ مملکتِ پاکستان کہیے، اس کو صوبوں میں، کمشنریوں میں، ڈپٹی کمشنریوں میں، تحصیلوں میں، ضلعوں میں بانٹ رکھا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس مملکت کو آپ انتظامی ضروریات کے لیے مختلف ولایات (اس زمانے میں ولایات صوبوں کو کہتے تھے) میں تقسیم کر دیں، مملکت ایک، ایک امت، کوئی فرقہ نہیں، ایک کتاب کوئی الگ الگ فقہ نہیں، ایک مملکت الگ الگ مملکتیں نہیں، مسلمانوں کی ایک مرکزی اتھارٹی، خلیفۃ الرسول جانشینِ رسول اللہ ﷺ امت کو اس دین پہ چلانا تھا، وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ (42:38)۔ تمام امور کے فیصلے، قوانین خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے امت کے باہمی مشورے سے ہوں گے اور یہ تھا وہ دین، کہیے کہ اس میں کسی کی موت و حیات سے کوئی فرق پڑتا ہے۔

امت واحدہ کا یہ شیرازہ کیونکر بکھرا

عزیزانِ من! اب آگے چل کے فرق اس لیے پڑا تھا کہ ایک ایسا خلیفہ فوت ہو گیا کہ پھر اس کے بعد ان کو خلیفہ ہی نہیں ملتا تھا، کیا

کرتے؟ ہوا یہ تھا کہ دین کا یہ جو نظام تھا وہ اکھیڑ لیا گیا' ایک امت نہ رہی' فرقوں میں بٹ گئے۔ جونہی یہ امت واحدہ فرقوں میں بٹ گئی ان کے ہاں کی فقہیں الگ ہوئیں' ان کے ہاں کی حدیثیں الگ ہوئیں۔ ہم آگے بڑھے تو ایک مملکت کی جگہ مختلف مملکتیں وجود میں آ گئیں' آپ کی کوئی ایک سنٹرل اتھارٹی نہ رہی۔ آپ کے ہاں پھر دین میں کوئی سنٹرل اتھارٹی تو رہی نہیں تھی' ایک چھوڑ کے الگ الگ بھی نہیں رہی تھیں۔

دنیاوی امور اور مذہبی امور کی ثنویت کفر ہے' دین نہیں

دین مذہب میں تبدیل ہو گیا' سلاطین نے سلطنت اپنے قبضے میں لے لی۔ امورِ مملکت' دنیاوی امور' اور مذہب کے امور' دین سے الگ کر دیئے' یہ اعتقادات وعبادات Personal Laws وغیرہ (شخصی قوانین) ہے۔ یہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دیئے۔ فرقہ بندی سے زیادہ شرک یہ ہے کہ انسانی معاملات کو ان دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: (۱) شخصی قوانین (Personal Laws) اور (۲) مملکتی قوانین (Public Laws) یہ سیکولرازم ہے' یہ کفر ہے۔ دین دو حصوں میں نہیں بٹ سکتا' مگر یہاں دین کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ یہ مذہبی امور یعنی شخصی قوانین کا حصہ ان کے حوالے کیا' ان میں سے ہر فرقے کے مذہبی پیشوا تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی فقہیں مرتب کیں Personal Laws (شخصی قوانین) اعتقادات وغیرہ ان تک رہے' امورِ مملکت (Public Laws) مملکت کے حصے میں۔ مملکتیں مختلف ہو گئیں: وہ مصر اور شام اور الجیریا اور وہ اردن اور وہ فلسطین۔ اس زمانے میں بھی یہ صورت تھی: مصر کی اور شام کی اور باقیوں کی اور سپین کی۔ یہ الگ الگ ہو گئیں اور آپ کی ایک اتھارٹی باقی نہ رہی۔ یہ وہ چیز ہے جس سے آپ کے ہاں دین باقی نہیں رہا۔ یہ مناظروں کی بات نہیں ہے' یہ عقائد کی بات بھی نہیں ہے۔

مذہب پرست قوم کبھی امت واحدہ نہیں بن سکتی

عزیزانِ من! اگر اس قسم کا نقشہ آپ دوبارہ قائم کر سکتے ہیں تو پھر تو یہ دین ہوگا' ورنہ دین نہیں ہے' آج ہم مذہب کے پیرو ہیں' صرف ہماری قانونی حیثیت مسلمان کی ہے ہم **اسلمنا**[1] (49:14) کے تحت آ جاتے ہیں' یہ دین نہیں ہے' اور آپ یہ جتنی کوششیں کر

---

[1] یہ اشارہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف ہے:
قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (49:14)۔ (اسلامی مملکت میں داخل ہونے والوں کے مدارج کا تعین ذاتی جوہر اور سیرت وکردار کی بلندی کے معیار کے مطابق ہوگا۔ مثلاً) یہ صحرانشین بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اس لیے ہم مومنین کے زمرہ میں شامل ہوں گے۔ ان سے کہو کہ تم ابھی مومن کے درجے پر نہیں پہنچے۔ تم نے صرف اسلامی حکومت کی فرماں پذیری اختیار کی ہے' اور مومن وہ ہے جس کے دل کی گہرائیوں میں اس نظام خداوندی کی صداقت اتر جائے۔ تمہاری ابھی یہ حالت نہیں ہوئی۔ تم نے محض اس نظام کا غلبہ دیکھ کر اس کی اطاعت قبول کی ہے (لیکن اس سے تمہارے اعمال کے بدلے میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔)

رہے ہیں کہ مسلمان مذہب پرست بن کر رہے اور پھر ان میں وحدت یا اتحاد پیدا ہو جائے' یہ عمل کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کا نتیجہ اور ایک مرکزی اتھارٹی کی اہمیت

آپ نے اسلامی سربراہی کانفرنس ❶ کر دیکھی۔ اس میں ساری مملکتوں کے نمائندے یہاں (لاہور میں) جمع ہوئے تھے۔ ٹھیک ہے' نیک نیتی تھی۔ کوشش تھی لیکن یہ کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ وہ جتنے یہاں آئے تھے' انہوں نے آپس میں ''چھیاں پایاں سن جنوں کیندے ہیگے او گلے ملے تھے۔'' ❷ اور ماتھے چومے تھے یہ ایک نظارہ بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس اختلاف کے باوجود' ایک مسجد میں' ایک امام کے پیچھے ان سب نے جا کے نماز بھی پڑھ لی تھی' یہ کچھ بھی کر لیا تھا لیکن یہاں سے جانے کے بعد یہ سارے وہی کے وہی ہیں۔ جو آج اردن میں' شام میں' مصر میں' الجزائر میں اور خود آجکل اس بیروت کے اندر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ ساری مسلمان مملکتیں ہیں جن کے سربراہ یہاں آئے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملے تھے۔ یہ آج کیا ہو رہا ہے؟ کوئی اور بھی آپ کے ہاں اتھارٹی ہے جو ان کو کسی ایک جگہ پہ اکٹھا کر دے یا حکم دیدے کہ اس چیز کو ختم کرو' یاد رکھو! جب قرآن کی اتھارٹی موجود تھی تو کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ کبھی ایسا امکان ہو جائے کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے اندر اختلاف پیدا ہو جائے اور جنگ بھی ہو جائے تو تمہیں چاہیئے بلکہ تمہارے لیے ضروری ہوگا تمہیں یا تمہارے سے مراد یہ امت کی مرکزی اتھارٹی تھا کہ فوراً جا کے ان میں صلاح کراؤ اور اس کے بعد ان میں سے جو فریق بھی اس کی سرتابی کرے' اس کے خلاف مملکت کی طرف سے اعلانِ جنگ کر دو۔ یہ ہے اس کا طریقہ۔ آج یہ اتھارٹی موجود نہیں ہے۔ آج ہر ایک اپنی اپنی جگہ اتھارٹی بنا ہوا ہے' دین نہیں رہا۔

---

❶ یہ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کی طرف اشارہ ہے جو کہ فروری 1974ء میں لاہور (پاکستان) کے تاریخی شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ اب تک اس اسلامی سربراہی کانفرنس (OIC) کی 10 میٹنگ ہو چکی ہیں۔

1- پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس 1669ء رباط (مراکش) 2- دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس 1974ء لاہور (پاکستان)

3- تیسری // // 1981ء طائف (سعودی عرب) 4- چوتھی // // 1984ء کاسابلانکا (مراکش)

5- پانچویں // // 1987ء کویت سٹی 6- چھٹی // // 1991ء ڈاکار (سینی گال)

7- ساتویں // // 1994ء کاسابلانکا (مراکش) 8- آٹھویں // // 1997ء طہران (ایران)

9- نویں // // 2000ء دوہا (قطر) 10- دسویں // // 2003ء دوہا (قطر)

اسلامی سربراہی کانفرنس (OIC) کا سیکریٹریٹ سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم ہے۔

❷ بغل گیر ہوئے' جسے کہتے ہیں۔ گلے ملے۔

خود ساختہ روایات نے ہماری سوچ کا رخ ہی بدل دیا

عزیزانِ من! بات یہاں سے چلی تھی کہ ان سے کہہ دو کہ میں فوق البشر نہیں، میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں اور اس کا ثبوت تمہیں کل ہی مل جائے گا۔ جس طرح تم میں سے ہر ایک پہ موت وارد ہوگی مجھ پہ بھی موت وارد ہو جائے گی۔ باقی رہی یہاں کی زندگی اور اس کے حوادث، سو اس میں تم سب **وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً** (21:35) اچھی بری حالتوں کی کٹھالیوں سے گزرتے ہو تا کہ تمہاری مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔ کوئی بات نہیں ہے۔ **تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ** (3:139)۔ انسان کی ساری تاریخ، مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں تکلیف اور شکست و فتح کی گردش دولابی کا ریکارڈ ہے۔ اِس طرح تمہارے ساتھ ہماری مزاحمت ہے، جنگیں بھی ہو رہی ہیں، مخالفتیں بھی ہو رہی ہیں، مقابلے بھی ہو رہے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ کبھی ہمیں بھی شکست ہو جاتی ہے، کبھی تمہیں بھی کامیابی ہو جاتی ہے۔ یہ چیزیں اس Physical World (طبعی دنیا) میں طبعی قانون کے ماتحت ہو رہی ہیں۔ ٹھیک ہے، شر اور خیر کی کٹھالیاں ہیں، تکلیفیں بھی پہنچ سکتی ہیں، فتح بھی ہو سکتی ہے۔ یہ چیز بھی کوئی دلیلِ نبوت نہیں ہے کہ شکست ہوگئی ہے تو یہ نبی نہیں رہا، یا یہ کہ اگر اس کو کامیابی ہوگئی ہے تو اِسے ضرور ہی نبی مان لیا جائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ آپ کے ہاں تو روایات میں بھی یہ چیز ہے کہ جنگِ بدر (سترہ رمضان 2ھ بمطابق 13 مارچ 624ء) ان مجاہدین کے خون کا صدقہ نہیں تھی۔ وہاں بھی ایک معجزہ رونما ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے: حضورؐ نے پھر وہ مٹھی بھر کنکریاں اٹھائیں اور پھینک دیں۔ وہ دشمنوں کی آنکھوں میں پڑیں۔ وہ اندھے ہو گئے تو پھر اس سے فتح ہوگئی۔ قرآنِ کریم اس موقعہ پہ تو نہیں بلکہ وہ جنگِ احزاب (5ھ) کے موقع پہ کہتا ہے کہ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (33:21)۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین ماڈل ہے۔ تو کیا ماڈل اب یوں ہوگا کہ جہاں تم میدانِ جنگ میں دیکھو کہ شکست ہونے لگی ہے تو تم وہاں سے مٹھی بھر ریت اٹھاؤ اور پھر وہ تم ان کی طرف پھینک دو! کہا کہ صاحب! نہیں، وہ تو رسول اللہؐ تھے، رسول تھے، تو پھر وہ ﷺ ہمارے لیے اسوہ کیسے بن گئے؟ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

جنگِ احزاب میں مجاہدین کی حالتِ زار مقامِ نبوت اور فتحِ حق

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس مقام پہ آیا ہے۔ یہ آیت جنگِ احزاب میں ہے۔ وہاں بھی قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کو بتایا ہے کہ تم پہ وہ مصائب اور مشکلات اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھیں۔ باہر سے دشمن کی مخالفت سیلاب بلا کی طرح امنڈ کر آ رہی تھیں اور اندر سے منافقین کی فریب کاریاں اور حیلہ سازیاں، قدم قدم پر پریشانی کا موجب بن رہی تھیں۔ نامساعدت حالات کی اس شدت میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ ایسا وقت آ گیا تھا کہ کلیجے اچھل کے حلق میں آ رہے تھے، آنکھیں پھٹ رہی تھیں، میدانِ جنگ سے تم بھاگے جا رہے تھے اور اس میدانِ جنگ کی افراتفری، بھاگم بھاگ میں، اور اس شکست کے طوفانِ بلاخیز میں ایک شخصیت تھی

جو چٹان کی طرح اپنے مقام پہ کھڑی ہوئی تھی، تم لوگوں کو آواز دے رہی تھی کہ تمہیں اپنے مقصد کی صداقت پہ یقین نہیں ہے جو بھاگے جا رہے ہو۔ میں خدا کا رسول ہوں، مجھے اپنے مقصد کی صداقت پہ یقین ہے، میں اپنے مقام سے نہیں ہلوں گا اور اس آواز نے جب ان بھاگتے ہوؤں کو واپس بلایا، تو وہاں قرآن نے کہا ہے کہ **لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ** (33:21) تمہارے لیے اس رسول کی زندگی میں اسوۃ حسنہ ہے۔ یہ اسوہ وہ ہے جو ہر میدان کے لیے اسوہ حسنہ بن سکتا ہے، ہر لڑائی میں اسوہ حسنہ بن سکتا ہے۔ فوج بھاگ رہی ہے تو وہ نہ بھاگے بلکہ اپنے مقام پر جم کے کھڑا ہوا اپنی اس فوج کو آواز دے، یہ اسوہ حسنہ۔ عزیزانِ من! اگر آپ اس طرح کریں تو میدانِ جنگ جیتے جاتے۔ کونسا جرنیل ہے جس کے لیے وہ اسوہ حسنہ نہ بن سکے! یہ تھی وہ حالتِ زار جس میں کہا تھا کہ **نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً** (21:35)۔ (یہاں کی زندگی اور اُس کے حوادث میں تم سب) اچھی بری حالتوں کی کٹھالیوں سے گزرتے ہو تا کہ تمہاری مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔

یہاں ذہن وفکر میں ایک تخیل نے انگڑائی لی کہ پھر تو یہی عام سی بات ہوگئی کہ کبھی تمہیں شکست ہے، کبھی فتح ہے۔ یہ دن رات ایسے ہیں جیسے یہ پنگھوڑا ہوتا ہے: اوپر چلے گئے، نیچے آگئے، تو پھر یہ تو وہ بات ہوگئی۔ یہاں کہا کہ نہیں۔ یہاں طبعی قوانین کارفرما ہیں، یہاں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ **وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ** (21:35)۔ آخری نتیجہ ہمارے ہی قوانین کے مطابق مرتب ہوگا۔

میدانِ جنگ میں غور وفکر کی اہمیت

عزیزانِ من! جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنی زندگی اختیار کرے گی آخر کار فتح اُسی کی ہوگی۔ اس جنگ وجدل میں، اس مخاصمت میں کبھی یہ بھی ہوگا کہ تمہیں شکست بھی ہو جائے لیکن آخرالامر تم دیکھو گے یہ جو **وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ** (21:35) ہیں، یعنی اُن کی ہر نقل وحرکت کا رخ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف ہے، فتح ان کی ہوگی۔ وہ اس قانون سے ہٹ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ لیکن ہمارے ہاں تو مرنے کے وقت یہ پڑھا جاتا ہے کہ **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** (2:156)۔ جہاں خدا ہے، وہاں جا رہے ہیں۔ قرآن کریم کے اس جملے کا مطلب ہے کہ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں، ہمارا ہر قدم نظامِ خداوندی کے قیام کے نصب العین کی طرف اٹھے گا، وہی ہمارا مقصود و منتہی ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کے آنا ہوگا، وہ تو مرنے کے بعد کی زندگی پہ ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ جو چیز قرآن کہتا ہے کہ یہ ساری چیزیں ہونگی، کبھی شکست ہوگی، کبھی کامیابی ہوگی، یہ ساری چیزیں ہوتی رہیں گی، جب شکست ہو، تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ قریش کو بھی شکست ہوتی ہے، دشمنوں کو بھی ہوتی ہے، تو وہ گھر جا کے یہ سوچتے ہیں کہ شکست کیوں ہوئی؟ اور اس کے بعد وہ جذباتی طور پہ کام نہیں کرتے جیسے یہ کہتے ہیں کہ جنگ تو ہوتا ہی جذبات کا نام ہے۔ جس میں وہ یہ بتا رہے ہیں کہ صاحب! فلاں نہیں گیا تھا، فلاں نے فلاں کے خلاف حسد کیا اور یہ کہ ہمارے ہاں اتنے آدمی کم ہو گئے، یہ سامان کم ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ سب ٹھیک ہے۔ کہا کہ ان کو شکست کی وجہ معلوم نہیں۔ سنیے عزیزانِ من! میرے ہاں اس وقت درمیان میں مجاہد اور سپاہی بیٹھے ہوئے ہیں وہ

بھی اس کی تصدیق کریں گے۔ کہا کہ شکست کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے میدانِ جنگ میں غور وفکر سے کام نہیں لیا' (یتفکرون)۔ وہاں انہوں نے صرف جذبات سے کام لیا' فکر سے کام نہیں لیا' ان سے کہو کہ اس لیے شکست ہوئی ہے' دشمن کیوں بتائے گا' ہم بتاتے ہیں کہ تمہیں یہ کیوں شکست ہوئی ہے؟ لہٰذا ایک جرنیل کے لیے یہ ہے اسوہ حسنہ کہ وہ میدانِ جنگ کے اس ہجوم کے اندر بھی ہوش وخرد کو نہ کھو دے۔ اگر جرنیل اس مقام کے اوپر سوچنا چھوڑ دے تو بڑی سے بڑی فوج بھی شکست کھا جائے' وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (21:35) کے معنی یہ ہیں کہ یہ یاد رکھو کہ اس ہنگامے کے دوران کچھ بھی ہو کہیں ہمارے قوانین سے الگ نہ ہٹ جانا' وہاں سے تمہارے قدم نہ ڈگمگا جائیں کیونکہ آخری فیصلہ ان کے مطابق ہونا ہے۔ جب تو ان سے یہ باتیں کرتا ہے کہ آخری فیصلہ ان کے مطابق ہونا ہے اور اس دین کو غالب آ کے رہنا ہے' اور انہیں یہ کہتے ہو کہ یاد رکھو! تمہاری اتنی بڑی قوت' تمہاری اتنی بڑی افواج اور لشکروں کے باوجود' تم فتح حاصل نہ کر سکو گے' کیونکہ تمہارے قوانین صحیح نہیں ہیں' صرف نظامِ خداوندی کو غالب آنا ہے کہ اس کے قوانین صحیح ہیں تو وہ کھسیانے ہو کر وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (21:36) تیرا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ ہے وہ جو تمہارے معبودوں کا (اس طرح) ذکر کرتا ہے۔ (اور ان کی الوہیت کا انکار کرتا ہے! تجھے تو اپنے باطل معبودوں کے انکار پر ہدفِ استہزا بناتے ہیں اور اپنی یہ حالت ہے کہ) خدائے رحمان' جو حقیقی الٰہ ہے' کا نام سننے کے روادار نہیں۔ اس سے یکسر انکار کرتے ہیں۔

اپنی تباہی پر یقین نہ کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت

عزیزانِ من! یہاں (21:36) میں قرآن نے فرمایا کہ جب تو یہ بات کہتا ہے تو یہ بجائے اس کے کہ بیٹھ کے ذرا سنجیدگی سے سوچیں' ذرا غور تو کریں کہ کہیں یہ ٹھیک نہ کہتا ہو' دلیل ان کے پاس ہوتی نہیں' یہ مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ آنا ذرا دیکھنا جناب! اس جیسے شریف کو (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ ہمارے معبودوں کے خلاف زبان کھولتا ہے' ہاں' ہمارے خلاف نہیں' ہمارے خداؤں کے خلاف۔ ذرا ان کی جرأتوں کا اندازہ لگائیے' یہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اور اپنی یہ کیفیت ہے کہ جب تو خدائے رحمٰن کا ذکر کرتا ہے تو اس کا یہ بیشک مذاق اڑائیں' یہ کوئی جرم نہیں ہے البتہ جب ان کے بتوں کے متعلق اگر کوئی بات کی جائے تو ان کے نزدیک وہ بہت جرم ہے۔ کہا: یہ بار بار کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے تم دھمکیاں دے رہے ہو' وارننگ دے رہے ہو' ڈرا رہے ہو کہ آخر تمہیں شکست ہوگی' یہ تمہاری ساری قوتیں پاش پاش ہو جائیں گی' یہ قمر جو تمہارے جھنڈے (Flag) کا نشان ہے' یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔ یہی شق القمر [1] ہے۔ تمہاری سیاستیں

---

[1] قمر قریش کے پرچم کا نشان تھا۔ اس سے مراد ہے کہ ان مخالفین عرب (قریش) کی قوت وشوکت ختم ہو جائے گی اور ان کا پرچم (جس پر قمر کا نشان ہے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ (54:1)

اور یہ امارتیں ختم ہو جائیں گی' اے رسول! جب تم یہ کہتے ہو تو یہ مخالفین عرب کہتے ہیں کہ اچھا' کہو یہ کب ہوگا؟ تمہارے یہ تیرہ برس تو مکے میں یہ کہتے کہتے' گزر گئے۔ یہ سات برس مدینے کے کہتے کہتے گزر گئے صاحب' کہا: ٹھیک ہے یہ سب اس لیے ہے کہ انسان دور تک نگاہ نہیں لے جاتا۔ یہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط (21:37)۔ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔ یہ اسباب و علل کی کڑیاں نہیں ملاتا' یہ ہتھیلی پہ سرسوں جمانا چاہتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ ابھی کیوں نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے اس ''عجل'' کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے کَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً (17:11)۔ یہ جلد باز واقع ہوا ہے اور بات بھی یہی ہے کہ جلد باز واقع ہوا ہے اور جونہی کوئی قوم یوں جلد باز واقع ہو جائے اس کے لیے اسباب و علل کی کڑیوں کو سامنے نہ رکھے' جو وقفہ ہے وہ اس کا انتظار نہ کرے' اس کا پورا پروگرام نہ بنائے' تو پھر وہ شکست کھا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ جوان کے اس طرح تقاضے ہیں' یہ اس لیے ہیں کہ یہ لوگ بڑے جلد باز واقع ہوئے ہیں اور پھر یہ کہ چونکہ ان کے اس انکار و سرکشی کی وجہ سے ان پر فوری گرفت نہیں ہوتی اس لیے یہ تیری تنذیرات کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ان سے کہو کہ سَاُورِیْکُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ (21:37) یوں جلدی مت مچاؤ۔ وہ دن دور نہیں جب تم اپنی آنکھوں سے اس دعوے کی صداقت کی نشانیاں دیکھ لو گے' یہ نشانیاں آپ کو آخر الامر فتح مکہ کے دن نظر آئیں گی۔ کہا: ان سے ایک بات اور پوچھو کہ یہ جو کہتے ہیں: جلدی کیوں نہیں آتی' یہ کہتا ہے تمہیں شکست ہو جائے گی' ختم ہو جاؤ گے' مغضوب ہو جاؤ گے' تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ جلدی لاؤ جلدی لاؤ۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ کونسا عید کا چاند ہے' جسے یہ جلدی منگا رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ کوئی ایسی قوم بھی ہے جو اپنی تباہی کے متعلق کہے کہ صاحب! وقفہ نہ دو' جلدی لے آؤ۔ اس کے اندر تمہارے لیے کونسی خوشخبریاں ہیں کہ جلدی مچا رہے ہو۔ یہ پاگل واقع ہوئے ہیں۔ بڑا خوب انداز ہے قرآن کا۔ ہاں' اور اگلی آیت ہے کہ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (21:38)۔ یہ تم سے بار بار پوچھتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بتاؤ متعین طور پہ تاریخ بتاؤ' مہینہ بتاؤ' دن بتاؤ' وقت بتاؤ' کہ یہ کب ہوگا؟ کہا: یہ لمبے پروگرام ہیں۔ یہ نہیں بتائے جاتے' کہ یہ کب ہوگا؟ بتاتے ہم یہی ہیں کہ ہم خدا کے قوانین کے تابع چلتے ہیں' آخر الامر کامیابی ہماری ہوگی' یہ تو ہم نہیں بتا سکتے ہیں کہ کب ہوگی؟ کس وقت ہوگی؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ پروگرام کے مطابق ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الانبیا کی آیت 38 تک ہم آ گئے' 39 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورۃ الانبیاء** (آیات 39 تا 50)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَوۡ یَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا حِیۡنَ لَا یَکُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡہِہِمُ النَّارَ وَ لَا عَنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ وَ لَا ہُمۡ
یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ بَلۡ تَاۡتِیۡہِمۡ بَغۡتَۃً فَتَبۡہَتُہُمۡ فَلَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ رَدَّہَا وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدِ
اسۡتُہۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۴۱﴾ قُلۡ مَنۡ
یَّکۡلَؤُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ مِنَ الرَّحۡمٰنِ ؕ بَلۡ ہُمۡ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّہِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۲﴾ اَمۡ لَہُمۡ اٰلِہَۃٌ
تَمۡنَعُہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِنَا ؕ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَ اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَا ہُمۡ مِّنَّا یُصۡحَبُوۡنَ ﴿۴۳﴾ بَلۡ مَتَّعۡنَا
ہٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَہُمۡ حَتّٰی طَالَ عَلَیۡہِمُ الۡعُمُرُ ؕ اَفَلَا یَرَوۡنَ اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُہَا مِنۡ
اَطۡرَافِہَا ؕ اَفَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۴۴﴾ قُلۡ اِنَّمَاۤ اُنۡذِرُکُمۡ بِالۡوَحۡیِ ۫ۖ وَ لَا یَسۡمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا
یُنۡذَرُوۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ لَئِنۡ مَّسَّتۡہُمۡ نَفۡحَۃٌ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّکَ لَیَقُوۡلُنَّ یٰوَیۡلَنَاۤ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۴۶﴾ وَ نَضَعُ
الۡمَوَازِیۡنَ الۡقِسۡطَ لِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَیۡئًا ؕ وَ اِنۡ کَانَ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ
اَتَیۡنَا بِہَا ؕ وَ کَفٰی بِنَا حٰسِبِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَ ضِیَآءً وَّ ذِکۡرًا
لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَ ہُمۡ مِّنَ السَّاعَۃِ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَ ہٰذَا ذِکۡرٌ مُّبٰرَکٌ
اَنۡزَلۡنٰہُ ؕ اَفَاَنۡتُمۡ لَہٗ مُنۡکِرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

عزیزانِ من! آج ستمبر 1976 کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیا کی آیت 39 سے ہو رہا ہے: (21:39)۔

سابقہ درس، سابقہ اتوار کو قائداعظم علیہ الرحمۃ ((1876-1948 کی برسی کے سلسلے میں خصوصی درس یا خطاب تھا۔ پہلے درس سے تسلسل قائم رکھنے کے لیے میں کہوں گا کہ بات یہ چلی آ رہی تھی کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ دین پیش کر رہے تھے اور اس دین کی مخالفت میں سب سے قریب یہ قریش تھے۔ عرب میں یہی ایک قبیلہ تھا جو ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ قبائل تو بہت سے تھے لیکن مکہ کی مرکزیت پہ یہی

اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں' یہ مذہب بن چکا ہے' اس لیے ہمارے ہاں جو ٹکراؤ بھی ہوتا ہے یا ہوتا تھا' اس سے پہلے بڑے شد و مد سے وہ مذاہب میں ہوتا تھا اور اس کے لیے مناظرے ہوا کرتے تھے۔ ان مناظروں میں پھر یہ ہوتا تھا کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلے میں بڑا افضل ہے اور اسی کو فتح مندی اور کامرانی تصور کیا جاتا تھا' حالانکہ اسلام تو مذہب ہے ہی نہیں۔ جب یہ اسلام مذہب ہی نہیں ہے تو اسے افضل ثابت کرنے سے حاصل کیا تھا! اب تو خیر' میں نے کہا ہے کہ مناظروں کا وہ دَور ختم ہو گیا' ورنہ پوچھو نہیں ہمارے ابتدائی دَور کے اندر ہم خود اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ بڑے بڑے معرکے پڑا کرتے تھے لیکن ان معرکہ آرائیوں سے ہوتا کیا تھا: ایک جھوٹا سا اطمینان اپنے آپ کو دلا لیا جاتا تھا کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ باقی مذاہب کے مقابلے میں اسلام بہت افضل ہے۔ مذہب کا تو لفظ ہی قرآن میں کہیں نہیں آیا۔

قریش کی دینِ خداوندی سے ٹکراؤ کی وجہ جواز

قرآن نے تو یہ کہا تھا کہ ہم نے یہ اس لیے بھیجا ہے کہ **هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ** (9:33) اللہ نے اپنے رسول کو دین دیکر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ یہ دین' دنیا کے تمام نظاموں پر غالب آئے۔ دین کا معنی ہوتا ہے نظامِ مملکت' ضابطہ حیات۔ یہ دین زندگی کے ایک نظام کا نام ہے اور وہ نظام اپنی ایک آزاد مملکت کے اندر ہی قائم ہو سکتا ہے' یہ تھا مقصد جس کے لیے پہلے یہ مکے کے تیرہ برس تیاری میں گزرے پھر مدینے میں آ کر اس دین نے اپنے صحیح نظام کی شکل اختیار کرنا شروع کی۔ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ مذہب تک ہی ہوتا تو اس کی مخالفت کیوں ہوتی۔ اسی عرب میں' اسی حجاز میں' انہی مکے مدینے کی بستیوں میں' عیسائی بستے تھے' یہودی بستے تھے' مجوسی بستے تھے۔ ان سے تو کبھی بھی قریش نے ٹکراؤ نہ کیا' تعرض بھی نہ کیا' مناظرے بھی نہ کیے۔ یہ بستے تھے' ان سے تو کوئی بھی دشمنی نہیں تھی۔ اگر یہ دین بھی اسی قسم کا ایک اور مذہب تھا تو اس کے وہ اس قدر دشمن کیوں ہو گئے' اس قدر اس حد تک دشمن' کہ حضور نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ کے متبعین مکہ کو چھوڑ کے مدینہ چلے گئے۔ اس زمانے کا تین سو میل کا فاصلہ تھا۔ اندازہ لگائیے! یہاں سے چلے گئے' اب انہیں کیا تعرض تھا۔ یہ قریش یہاں سے اٹھ کے ان کے خلاف جنگ کرنے کیلیے مدینے تک پہنچے۔ یہ بڑی غور طلب چیزیں ہیں۔ اس کے بعد بھی مسلسل سات آٹھ برس تک ان کے ساتھ جنگوں میں گزرے۔ بڑی جنگ اور چھوٹی لڑائیوں کو گنا دیا جائے تو تاریخ میں آیا ہے کہ ان کی تعداد اسی بیاسی کے قریب ہے۔ اتنی بڑی اہم جنگوں کا ذکر تو خود قرآنِ کریم [1] میں آیا ہے۔

---

[1] وہ یہ ہیں: (1) جنگِ بدر (17/رمضان 2ھ بمطابق 13/مارچ 624ء)
(2) جنگِ احد (14/شوال 3ھ بمطابق 29/مارچ 625ء)
(3) جنگِ احزاب (ذیقعدہ 5ھ' 627ء) [باقی اگلے صفحے پر]

سوال یہ ہے کہ یہ ان کے خلاف کیوں لڑی گئی تھیں۔ وہاں یہودی بھی بستے تھے، عیسائی بھی بستے تھے، ان کے خلاف تو انہوں نے ایک بھی جنگ نہ کی۔ سوال مذہب کا نہیں تھا۔ یہ دین زندگی کا ایک نظام تھا اور اس نظام کے قائم ہونے کے بعد یہ جتنے بھی باطل نظامِ حیات تھے، وہ سارے کے سارے، خود بخود، تباہ ہو جاتے تھے۔ جب حق آ جاتا ہے تو باطل رہتا ہی نہیں ہے۔ یہ تھا ان کا نظام۔ قریش کا اپنا سرمایہ داری نظام تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ ان کا یہ سارا کاروبار اسی نظام کے تحت تھا اور مذہبی پیشوائیت کے لیے کعبہ، جیسے مرکز کے وہ متولی تھے، اس مرکزیت سے اور تولیت سے ان کو ایک اتنا بڑا اعزاز حاصل تھا کہ عرب کی سرزمین میں، جہاں دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے تھے، قریش کے قافلوں کی طرف کوئی نگہ بد سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ یہ کعبے کے متولیوں کے قافلے ہیں۔ یہ اتنا بڑا اعزاز تھا۔ اب یہ سارا ختم ہو جاتا تھا۔ اگر اسلام کا نظام کسی ایک خطہ زمین میں بھی متمکن ہو جائے تو اس کے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ❷ (110:2) ہو جانا تھا۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ انسانیت جوق در جوق اس کی طرف آ جائے گی، تو وہ مخالفین کا نظام تو ختم ہو جاتا تھا۔ یہ تھا ٹکراؤ! یہ تھا تصادم!! پہلے انہوں نے کوشش کی کہ مکہ کی زندگی میں انہیں سخت تکالیف پہنچا کر، مصیبتوں میں گرفتار کر کے، ان کے حوصلے توڑ دیئے جائیں تو اس طرح یہ باز آ جائیں، جب یہ بھی نہ ہوا اور انہوں نے مکہ بھی چھوڑ دیا تو انہیں خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہاں تو اس نظام کے تمکن کے لیے فضا بڑی سازگار ہے۔ یہ ہجرت تھی جس کا مقصد تشکیل دین کے لیے سازگار ماحول کی تلاش کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہجرت کا مقصد دینی پروگرام کی تشکیل کے لیے سازگار ماحول کی تلاش ہوتا ہے

عزیزانِ من! ہجرت کہتے ہی دینی پروگرام کی تشکیل کے لیے سازگار ماحول کی تلاش کو ہے۔ یہ سٹیٹ ازم نہیں ہوتی، نری Migration (ملک چھوڑ دینا) نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں اس کے یہ ترجمے ہو گئے۔ یہ تو ایسے ماحول سے جہاں اس نظام کے قیام کے

[گزشتہ سے پیوستہ] ---------------------------------

(4) جنگِ حدیبیہ (ذیقعدہ 6ھ، 628ء)

(5) غزوۂ خیبر (7ھ 629ء)

(6) فتح مکہ (رمضان 8ھ بمطابق جنوری 630ء)

(7) جنگِ حنین (شوال 8ھ بمطابق جنوری 630ء)

(8) غزوہ تبوک (رجب 9ھ بمطابق نومبر 631ء)۔ تبوک کی یہ مہم عہد نبوی کے سلسلۂ غزوات و سرایا کی آخری کڑی تھی۔ مورخین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی رو سے عہد نبوی میں 82 مرتبہ جنگی مقاصد کے لیے نقل و حرکت کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان میں 19 میں خود نبی اکرمؐ نے شرکت فرمائی۔ انہیں اصطلاح میں غزواۃ کہتے ہیں اور بقایا میں حضورؐ تشریف نہیں لے گئے۔ انہیں سرایا کہتے ہیں۔ ان تمام غزواۃ و سرایا میں کل 259 مسلمان شہید ہوئے اور 759 مخالفین (کل 1018)۔ اس تعداد کو اگر 82 پر پھیلایا جائے تو اوسط قریباً 12.5 نکلتا ہے۔

❷ لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

امکانات ذرا بعید ہوں ایسے ماحول کی طرف جانا ہوتا ہے جہاں اس کے لیے حالات مساعد ہوں۔ یہ تو وہ ہے جسے میدانِ جنگ میں پینترا بدلنا کہا جاتا ہے۔ یہ پینترا بدلنا ہوتا ہے۔ جنگ میں تو کئی دفعہ پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے' پیچھے ہٹنا شکست خوردگی نہیں ہوتا' ہتھیار چھوڑ دینے نہیں ہوتے' یہ اس نظام کے اندر ایک Strategy (حکمت عملی) ہوتی ہے۔ تو یہ وہاں مکے سے سمٹ کے مدینے آ گئے۔ اِن مخالفین عرب (قریش) نے اس پہ بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اِن قریش نے مکے میں تیرہ برس جنگ نہیں کی تھی کہ انہیں نظر آتا تھا کہ یہ دین تو ایک نظری سی ہی بحث ہے جو چل رہی ہے۔ اگر یہ ایسے نظام کے قیام کا کچھ کہتے بھی ہیں تو اسے تو ہم یہاں قائم ہی نہیں ہونے دیں گے۔ اِن کے وہاں مدینے جانے کے بعد' انہوں نے دیکھا کہ وہ جو ایک خواب تھا' اب ایک محسوس شکل اختیار کر رہا ہے اور انہیں پتہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی جگہ بھی قائم ہو گیا تو ہمارا نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ تھی وہ لِم' عزیزانِ من! جس کی بنا پہ یہ لوگ اتنی مخالفت پر اترے ہوئے تھے کہ وہاں مدینہ میں جا کر انہوں نے لڑائیاں لڑیں۔ پہلی لڑائی (2ھ مطابق 624ء) تو مدینے کے پاس بدر کے مقام پہ ہوئی تھی' پھر دوسری لڑائی (3ھ 625ء) احد کے مقام پہ ہوئی یہ ادھر کی بھی جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ ان لڑائیوں کو یورپ والوں نے اور آپ لوگوں نے بھی فتوح البلدان کا ہی نام رکھا یعنی یہ شہروں کا فتح کرنا ہی تھا' ہمارے ہاں بھی یہی کہا گیا' لیکن یہاں تو سوال ہی نہ تھا جوع الارض کا اور نہ ہی شہروں کا فتح کرنا تھا' یہ تو دلوں کو فتح کرنا تھا اور ایک نظامِ خداوندی کو قائم کرنا تھا جس نظام میں انہوں نے خود بھی اسی طرح اس نظام اور قانون کی اطاعت کرنی تھی جس طرح سے دوسروں نے اطاعت کرنی تھی' بلکہ ان پہ تو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذمہ داریاں اور پابندیاں عائد ہوتی تھیں۔ یہ حکومت کاہے کی تھی؟ یہ تو پہلے کے مقابلے میں محکومیت کی ایک شدید شکل تھی۔ پہلے تو آزادی تھی' قریش کو تو بڑی آزادی حاصل تھی۔ ان میں سے جو مسلمان ہو جاتا تھا اس پہ تو ہزار قسم کی پابندیاں عائد ہوتی تھیں اور پہلی پابندی تو یہ رمضان کی ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس مہینے میں' میں نے اس کے متعلق کچھ نہ کہا کیونکہ ہر سال یہ کہتا ہی چلا آ رہا ہوں' شاید تھوڑا سا وقت باقی ہوا تو چند باتیں اس کے متعلق بھی عرض کرونگا۔ تو یہ تھی وہ چیز جس کے متعلق حضور ﷺ بار بار ان سے یہ کہتے تھے کہ تمہارا نظام باطل ہے اور جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا' یہ باقی نہیں رہے گا' از خود اسے تسلیم کر لو اور اپنی روش کو بدل لو تو اس قسم کی خوں ریزیوں سے اور فساد انگیزیوں سے بچ جاؤ گے۔ اگر یہ نہ ہوا' تم نے مقابلہ کیا اور میدانِ جنگ تک آ گئے تو اس میں تو پھر بہر حال ہمیں بھی نکلنا پڑے گا' تو کیوں تباہیاں مول لیتے ہو؟ کیوں بربادیوں کو آواز دے دے کر بلاتے ہو؟ یہ ہے وہ انذار و تنذیر جو نبی کی طرف سے یا رسول کی طرف سے ہوتا تھا۔

بڑی سے بڑی سلطنت کے نظام کو الٹ دینے والا نظامِ حیات

عزیزانِ من! یہ بات قوت کے نشے میں بدمست دماغوں میں جلدی سے سما نہیں سکتی تھی۔ مذاق اڑاتے تھے' ہنسی اڑاتے تھے کہ:

ذرۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر

مٹھی بھر جماعت ہے‘ بے سروسامانی کا یہ عالم ہے کہ پہلی دفعہ جنگ [1] میں آئے ہیں تو پوری تلواریں بھی پاس نہیں۔ اور یہ داعیہ یہ ہے کہ ہم نے ایک نیا نظام قائم کرنا ہے جو اس دنیا کے نظاموں کی بساط کو الٹ دے گا‘ عرب اور قریش کا ہی نظام نہیں‘ بلکہ ایران اور روما کی سلطنتوں کو بھی جو ہزاروں سال سے دنیا میں دھاک بٹھائے ہوئے تھیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس زمانے کے رشین (روسی) اور امریکن (امریکی) بلاک کو بھی یہ چیلنج بھیج دیا گیا تھا کہ اگر تم اپنے محنت کشوں اور کسانوں پر ظلم کرنے سے باز نہ آئے تو ان کی مظلومیت کا کفارہ تم سے لیا جائے گا۔ یہ نظام باقی نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اندازہ لگائیے‘ ساری جمیعت تو تین سو کے قریب تھی جو بدر کے میدان میں آئی تھی اور کیفیت یہ تھی۔ اس لیے کہ ان کا ایمان تھا کہ خدا نے کہا ہے کہ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33)۔ دین حق کے اس نظام نے تمام نظامہائے عالم پر غالب آ کر رہنا ہے‘ بشرطیکہ صحیح روزے رکھے گئے۔ وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے‘ ہنسی اڑاتے تھے۔ سابقہ درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (21:38)۔ وہ تم سے بار بار کہتے تھے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو بتاؤ کہ ہماری جس تباہی کے متعلق تم اکثر دھمکیاں دیتے رہتے ہو‘ وہ کب آئے گی؟ ان سے کہا کہ اے پاگلو! یہ کوئی عید کا چاند ہے جو تم انتیس کو ہی چھت پہ کھڑے ہو کے دیکھنے کھڑے ہو جاؤ کہ صاحب! وہ آتا ہے نظر یا نہیں آتا اور اس کے بعد پھر دوسرے دن جشن منانے ہیں‘ او یہ تو تمہاری تباہی اور بربادی کی بات ہو رہی ہے اور اس پہ کہہ یہ رہے ہو کہ پھر وہ آتا کیوں نہیں؟ جلدی کیوں نہیں آتا؟ کیا تمہارے لیے بڑا جشنِ مسرت ہے جس کے لیے تم نے ''اڈی کالی پائی ہوئی اے'' [2] اور تم کہتے ہو کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ (21:38)۔ وہ تباہی و بربادی کب آئے گی؟ اس کے لیے کہا کہ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (21:39)‘ اے کاش تمہیں پتہ چل جائے کہ جس کے لیے یہ اتنی جلدی مچا رہے ہیں وہ جب ٹکراؤ آ گیا اور جنگ کی آگ بھڑک اٹھی تو پھر وہ سامنے سے بھی آئے گی‘ پیچھے سے بھی آئے گی۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ دائیں سے بھی آئے گی اور بائیں سے بھی آئے گی اور اس کے شعلوں کی لپک سے کہیں حفاظت کی جگہ نہیں مل سکے گی۔ کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ یہ ہے وہ جس کے متعلق میں تم سے کہتا ہوں کہ اس سے ڈرو‘ باز آ جاؤ‘ اب بھی اس کا وقت ہے‘ اپنے اوپر ایسی تباہی نہ آنے دو اور تم ہو کہ اس کے لیے جلدی مچا رہے ہو کہ صاحب! وہ تباہی و بربادی آتی کیوں نہیں ہے۔ اگر وہ آئی تو پھر تمہاری یہ کیفیت ہو جائے گی۔

---

[1] یہ اشارہ جنگ بدر (17/رمضان ھ مطابق 13/مارچ 624ء) کی طرف ہے۔

[2] تمہیں اتنی جلدی ہے‘ اتنا شور مچا رہے ہو۔

ہم نے ہر بات کو قیامت تک اٹھا رکھا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو چونکہ اب اس دین کے غالب آنے کا' اسلام بحیثیت دین کا' وہ تصور ہی چلا گیا ہے' اِسے اب مذہب بنا دیا گیا۔ ہمارے ہاں تو اب جہاں بھی **النار** آئے گی' اس کا ترجمہ دوزخ ہو جائے گا' اور اسے قیامت پر اٹھا رکھا جائے گا۔ قیامت اور اس کا دوزخ اور جنت ہمارا اجزوِ ایمان ہے۔ ہم مرنے کے بعد کی زندگی مانتے ہیں' لیکن یہ جو کچھ بھی ہے' اسے قیامت تک اٹھانے کی بات نہیں تھی۔ یہ اسی زندگی کے اندر تصادمات تھے' اسی دنیا کے اندر یہ ٹکراؤ تھے۔ **النار** کا یہ لفظ تو ان کے ہاں جنگ کے لیے بولا جاتا تھا۔ آج بھی تو آپ کہتے ہیں کہ وہ توپیں آگ کے گولے برسا رہی تھیں' جنگ کی آگ بھڑک اٹھی' جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ہر زبان میں یہ لفظ ہوتا ہے' اور ان کے ہاں تو یہ لفظ عام تھا۔ ویسے بھی ان کی قوم کے اس زمانے میں Communication یا مواصلات کے ایسے انتظام تو ہوتے نہیں تھے۔ جنگ کا نشان ہوتا تھا: وہ پہاڑ کے اوپر آگ جلا دیا کرتے تھے' النار اس قسم کی جنگ کی علامت تھی' اس لیے قرآنِ کریم میں جہاں یہ چیزیں ہیں تو وہاں سیاق وسباق کو دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کیا مفہوم ہے۔

بات پہلے سے آ رہی ہے کہ یہ کچھ ہوگا یہاں تمہاری تباہیاں ہونگی' باز آ جاؤ۔ وہ کہتے ہیں: یہ کب کچھ ہوگا؟ اور اس کے بعد کہا جائے گا کہ کیوں جلدی مچاتے ہو' جب آگ بھڑکے گی تو اس سے کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ تو ظاہر ہے کہ اس میں قیامت یا دوزخ کی آگ کا سوال نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بتاؤ کب آئے گی؟ اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ وہ قیامت میں جا کے آئے گی تو ان پہ اس کا کیا اثر ہوگا؟ صاحب! دیکھا جائے گا مگر وہ تباہی وبربادی تو چار دن کے بعد آ گئی تھی۔ اس لیے کہا کہ **بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ** (21:40) اگر وہ شعلے اچانک بھڑک اٹھے جس طرح کہ تم ان کے لیے ایندھن جمع کر رہے ہو اور اسکے بعد اس کے ایندھن کو ایک ہی سلائی دکھائی گئی اور وہ بھڑک اٹھے تو تمہارے ہوش وحواس گم ہو جائیں گے' اس وقت مبہوت رہ جاؤ گے۔ یاد رکھو! پھر اسے روک نہیں سکو گے' اور اس وقت پھر تمہیں مہلت بھی نہیں مل سکے گی کہ اُس کی زد سے بچنے کے لیے ایک طرف ہو جاؤ۔ آج تم مذاق اڑا رہے ہو اور جب حقیقت میں وہ ٹکراؤ سامنے آ گیا جو تم نے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے' تو ہوش ٹھکانے آ لگیں گے۔ پہلے مفاد پرستیوں کے ٹکراؤ' مفاد پرستیوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ تم نے حق کی علمبردار جماعت کے ساتھ ٹکراؤ آج تک دیکھا ہی نہیں ہے' تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک میدانِ جنگ میں بہا دیا کرتے ہیں' پیٹھ نہیں موڑا کرتے۔ اب وہ آنے والا انقلاب یوں دفعۃً سامنے آئے گا کہ مبہوت رہ جاؤ گے۔

ہر دور میں سابقہ قوموں کی تاریخ کو بطور شہادت سامنے رکھنا ہوگا

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ یہ جنگ اپنی نوعیت کی نئی جنگ ہوگی۔ اس لیے یوں جلدی نہ مچاؤ۔ جو میں کہہ رہا ہوں' اس پہ ذرا غور کرو'

میں تمہیں یہ کچھ حقائق بیان کرتا ہوں' اقوام سابقہ کی شہادات پیش کرتا ہوں' Reason' عقل کے ذریعے' دلائل کے ذریعے' تمہیں سمجھاتا ہوں کہ تمہارے نظام کی یہ بنیادیں بڑی ہی کمزور ہیں۔ زور سے ایک بارش ہوگئی تو تمہاری چھ چھ منزلہ عمارتیں ختم ہوجائیں گی' اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اس کے بعد تم مذاق اڑاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی طرف سے یہ استہزا اور استخفاف ❶ کوئی نئی چیز نہیں۔ **وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ** (21:41)۔ نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی تمہارے جیسی قومیں موجود تھیں جو اسی طرح سے نشۂ اقتدار میں بدمست تھیں' ان کی طرف بھی خدا کے پیغامبر آئے تھے۔ انہوں نے بھی یہ بات کہی تھی کہ یادرکھو۔ جو نظام باطل کی بنیادوں پہ استوار ہوتا ہے' وہ اپنے بوجھ سے نیچے آ گرا کرتا ہے اور وہ بھی تمہاری طرح سے ان چیزوں کا مذاق اڑاتے رہے۔

حالات کی زبوں حالی اور حضور ﷺ کی تگ وتاز کی اہمیت

عزیزانِ من! آپ' قرآنِ کریم میں جتنی بھی انبیاء کرام کی داستانیں آئی ہیں' انہیں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جب بھی انہوں نے پہلی آواز اٹھائی ہے تو ان کے ساتھ بڑے ہی کمزور اور ضعیف و ناتواں سی جماعت ہوتی تھی' وہ کوئی بادشاہت کے مالک یا کوئی اتنی بڑی بڑی فوجیں لے کے نہیں آیا کرتے تھے۔ انہوں نے تو اسی معاشرے میں مسلسل تذکیر سے' مسلسل تبلیغ سے' حق کو آگے پہنچانے کے بعد دلائل و شواہد سے مطمئن ہوجانے والے کچھ قلوب اکٹھے کرنے ہوتے تھے۔ تیرہ سال کے اندر زیادہ سے زیادہ کوئی اڑھائی تین سو کے قریب افراد اکٹھے ہوئے ہیں اور اکٹھے کرنے والی وہ ذات ہے کہ جن کی کئی سالہ نبوت نے قیامت تک پھیلنا تھا' ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا اس تئیس سالہ نبوت کے زمانے میں تقریباً کوئی تیرہ سال یعنی 60% کا زمانہ تو مکے میں گزرا تو وہ تین سو کے قریب سارا ماحصل ہے۔ وہ اس لیے مذاق اڑایا کرتے تھے کہ ان کے داعی اور ان کے عزائم ملاحظہ فرمایئے گا۔ کہا کہ یہ کچھ ہوتا رہا کہ تجھ سے پہلے رسولوں کی بھی اسی طرح ہنسی اڑائی جاچکی ہے۔ لیکن ان کی اس ہنسی کا نتیجہ کیا نکلا؟ **فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ** (21:41) یہی کہ وہ جن باتوں کو مذاق سمجھا کرتے تھے' انہوں نے سچ مچ آکر' انہیں گھیر لیا۔ آج تم خود دن رات ان اجڑے ہوئے کاشیانوں اور بستیوں کے کھنڈرات سے گزرتے ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ جن جن چیزوں کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے' انہوں نے اس طرح آکر ان کا احاطہ کیا اور ان کے ہاتھوں سے ان کا حشر کیا ہوا۔ یہ تو تمہاری آنکھوں دیکھی چیزیں ہیں' میں کوئی افسانے نہیں بیان کررہا' یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے انہی انبیاء کے حالات بیان کیے ہیں جو عرب اور اس کے گردونواح کی بستیوں میں تھے انہی قوموں کے احوال بیان کیے ہیں' جو وہاں شام فلسطین یا عرب کے اندر تھے تو باقی دنیا کے اندر کیا کوئی رسول ہی نہیں آیا تھا؟ تو بات یہ نہیں۔ دراصل قرآن نے تو یہ بتایا ہے کہ دنیا میں تو کوئی بستی ایسی نہیں جہاں ہمارا رسول نہ آیا ہو' کوئی زمانہ ایسا

---

❶ استخفاف۔ خِفت' سبکی' بے وقر جاننا

نہیں جہاں ہمارے رسول نہ آئے ہوں' لہٰذا قرآن اُن کی داستانیں اس لیے بیان کر رہا تھا۔ کہ ان کی بستیوں کے کھنڈرات سے وہ مخاطب عرب خود دن رات گزرا کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں

عزیزانِ من! قرآن کوئی رسالت کی' نبوت کی یا اقوام سابقہ کی History (تاریخ) نہیں لکھ رہا تھا' اس نے تو اپنے ان دعاوی کی شہادت کے لیے تاریخی شواہد پیش کرنے تھے۔ وہی پیش کیے جا سکتے تھے جن سے وہ لوگ واقف تھے۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ دس ہزار سال پہلے چین کے اندر ہوانگ شینگ نے کیا کیا تھا' تو وہ پوچھتے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انہیں تو کہا یہ تھا' قرآن کہتا ہے کہ تم دن رات ان راستوں پہ چلتے رہتے ہو کہ تم دیکھتے نہیں ہو ان کے دائیں بائیں یہ جو کھنڈرات پڑے ہیں' ان کی داستانیں اور افسانے ان کے گھر گھر میں' ان کے بچے بچے کی زبان' پہ تھے کہ وہ کیسے تباہ ہوئی تھیں؟ انہی کی طرف توجہ دلائی جا سکتی تھی' تو کہنے لگے ان کو تم دیکھتے نہیں کہ ان کا کیا حشر ہوا؟ **قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ۭ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (21:42) کہا کہ اے رسول! ان سے ذرا یہ پوچھو' دن ہو یا رات۔ کوئی ایسی قوت ہے جو خدا کی گرفت سے بچانے کے لیے تمہاری حفاظت کر سکے؟ لیکن (یہ اس کا جواب کیا دیں گے) یہ تو اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات سے یکسر منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان مخالفین کو واضح طور پر بتا دیا کہ وہ تصادم کی بات تو آگے آئے گی۔ میں جو زندگی کے اصول بتاتا ہوں' اس سے تو جو تہذیب و تمدن ہے وہ یا تو ختم ہوتی ہے اور یا برقرار رہتی ہے۔ ذرا سوچو کہ یہ جو تمہاری طبعی زندگی ہے' یہ کس کے قوانین کے سہارے قائم ہے؟ کیا تم نے یہ انتظام کر رکھے ہیں کہ فضا میں ہوا ہونی چاہیے' یہ سانس رک جائیں تو موت آ جاتی ہے۔ کہا کہ کیا یہ سب تمہارے بنائے ہوئے ہیں؟ یہ پانی جو اس انداز سے چلا آ رہا ہے یہ تمہارا پیدا کردہ ہے؟ یہ زمین سے جو تمہاری غذا پیدا ہوتی ہے تو کیا تم نے کوئی ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ اس طرح سے یہ زمین اگلتی چلی جائے۔ یہ بتاؤ تو سہی۔ یہاں عزیز مِ من! **بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ** (21:42) آیا ہے۔ یہ نکتہ بڑا ہی غور طلب ہے۔ اس پہ ذرا سوچو تو!

صفت رحمانیت کے مفہوم کے لیے رحمِ مادر کی لازوال مثال

عزیزانِ من! قرآن کی کیا بات ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو ''رح م'' یعنی رحمت ہے۔ جہاں سے رحمٰن و رحیم ہے' اس کے معنی ہیں: اس طرح پرورش کرنا جیسے رحمِ مادر میں بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ وہاں نہ ماں کو کوئی پتہ ہوتا ہے کہ میں کیسے اس کا انتظام کروں۔ بچے کی پیدائش کے بعد تو اس کے پہلے رونے پہ سارا گھر تڑپ جاتا ہے اور فوراً یہ آواز آتی ہے: لیا فیڈر۔ کتھے ہیگا او؟ دودھ پلاؤ۔ چھیتی کر ❶

---

❶ فیڈر لاؤ' اسے کہاں رکھا ہے؟ اسے دودھ پلاؤ۔ جلدی کرو۔

''پہلے germ (جرثومہ حیات) سے لے کر پورا بچہ بننے تک جب تین چار ماہ کے بعد اس کی حرکت بھی محسوس ہونے لگ جاتی ہے' اس کے دل کی دھڑکن بھی سنی جاسکتی ہے' یہ سارا سامانِ نشوونما جسے وہ سامانِ حفاظت کہہ رہا ہے' یہ کس طرح ملتا ہے' اس کے لیے لفظ رحمت ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ رحمت وہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ اس کا صرف انداز ہی بدلتا ہے۔ وہ کونسی مشینری تم نے ماں کے سینے کے اندر نصب کررکھی ہوتی ہے کہ جونہی بچہ پیدا ہو' نہایت عمدہ قسم کا وہ Milk Board' آپ کو ملک سپلائی کرے۔ معاف رکھیے میں نے Milk Board کہہ دیا' وہ تو بچے کو تین دن دیدیا جائے تو پھر چالیس دن علاج کرنا پڑتا ہے۔ یعنی کیسی عجیب سی بات ہے کہ یہ بتاؤ کہ کون یہاں حفاظت کرتا ہے؟ کیفیت یہ ہے۔ کہیں یہ ڈاکٹروں' طبیعات والوں سے' پوچھیے کہ انسانی زندگی کے کتنے دشمن یہاں پھیلے ہوئے ہیں' ایک ایک سانس میں کروڑوں بیکٹیریا آپ اس طرح سے اندر لے جاتے ہیں کہ جو آپ کی موت کے لیے ایک سانس کافی ہوتا ہے۔ یہ جو پانی پیتے ہو' کتنا ہی چھان کے پیو' اس کے اندر کتنا کچھ یہ ہوتا ہے۔ جسم کے اندر یہ جو آپ کے ہاں ہر آن ایک سلسلہ جاری ہے جسے (Metabolism) کہتے ہیں' انسان کی ہلاکت کے لیے کچھ وقت ہی نہیں لگتا لیکن کہا کہ ان تمام چیزوں سے تمہاری کون حفاظت کرتا ہے اور یہاں لفظ رحمٰن آیا ہے: بلا مزد و معاوضہ۔ یہ وہ مشینری ہے جو خودکار ہے۔ یہاں ایسی خودکار مشینری کام کررہی ہے جو ان تمام ہلاکت آفریں عناصر سے تمہاری حفاظت کررہی ہے۔ کہا کہ میں وہ اسی قسم کی مشینری' رحمت کے یہ اصول تمہاری انسانی زندگی کے لیے پیش کررہا ہوں۔ یہ طبعی زندگی کا سامان تو اس رحمٰن نے از خود کردیا' ایک تمہاری انسانی زندگی بھی ہے اور انسانی زندگی کا جہنم تو پوچھیے نہیں کہ اس سے شعلوں کی لپک کتنی دُور تک جاتی ہے۔ **تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَه** (104:7)۔ وہ دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے۔ میں تمہیں اس سے بچانے کا' اس کی حفاظت کا' انتظام کرتا ہوں اور یاد رکھو' وہ انتظام بھی رحمٰن نے ہی کیا ہے۔

انسانی ذات کے لیے الرحمٰن علم القرآن کی نعمت عظمٰی

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم کے متعلق یہ **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (55:1-2) کیوں آیا ہے؟ جس طرح اس کی بے پایاں صفتِ رحمانیت بچے کی نشوونما کررہی ہے' انسانی زندگی کے جو بچے ہیں ان کے لیے بھی اسی رحمٰن نے ایک ضابطہ دیا ہے جسے قرآن نے **اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** کہا ہے۔ غور طلب یہ چیز ہے کہ وہاں رحمٰن ہی کیوں کہا گیا ہے؟ یہ تمہاری کاریگری تو نہیں تھی۔ رحمِ مادر میں بچے کا پال لینا' تمہاری کاریگری تو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس قسم کا ضابطہ حیات کا مل جانا بھی تو تمہاری کاریگری نہیں ہوسکتا۔ کہا: تم تو ان سے یہ کہتے ہو' اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ **بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ** (21:42) یہ تو اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات سے یکسر منہ پھیرے ہوئے ہیں' یہ اس کا نام تک نہیں سننا چاہتے۔

اس کرۂ ارض پر نظامِ ربوبیت انسان کو خود ہی قائم کرنا ہوگا

عزیزانِ من! یہاں (21:42) میں ''رب'' لفظ آیا۔ پھر رحمانیت تو وہ تھی کہ جواز خود ملتی تھی؛ چنانچہ انسانی زندگی کے لیے ضابطہ اور راہنمائی تو اس کی طرف سے ملتی ہے لیکن جو نظامِ ربوبیت ہے' یہ انسان نے خود قائم کرنا ہوتا ہے۔ وسائلِ ربوبیت تو اس رحمانیت کی رو سے ملتے ہیں' زمین اگلتی چلی جاتی ہے' یہ غذا کے لیے ہی جو زراعت یا کھیتیاں یا اجناس وغیرہ اُگتے ہیں' یہ بھی کم رحمانیت نہیں ہے' لیکن وہ جو سیلابِ زر آ گیا ہے صحراؤں کے اندر سے کھجوروں کی گٹھلیوں پہ گزارا کرنے والی جو قومیں تھیں آج دیکھتے ہیں کہ وہ تمام صحراؤں والے ممالک میں سے یہ جو تیل کے چشمے برآمد ہوئے ہیں ان کی دولت کا اندازہ ہی کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ سارے کس کے پیدا کردہ تھے۔ رحمانیت کی طرف سے ملے تھے' اس کے بعد جب وہ باہر آئے ہیں تو اس کا چاہیے تھا کہ وہ نظامِ ربوبیت قائم کرتے۔ پہلے رحمٰن کا لفظ آیا ہے اور آگے ہے کہ **عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهِمۡ** (21:42) یہ اب اس کا نام تک نہیں سننا چاہتے' اس کا ذکر تک نہیں سننا چاہتے کہ جس کے قوانین کے تابع یہ ربوبیت یہاں ملنی تھی:

از ضعیفاں ناں ربودن حکمتش

چنانچہ اب کاریگری اور سیاست یہ ہے کہ کمزوروں سے روٹی کیسے چھین لیجائے؟ **عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ** (21:42) یہ تو اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات سے یکسر منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ یہ جو سارا کچھ ہے' میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کائنات کا ایک رحمٰن و رحیم ہے جسے ہم الٰہ یا اللہ کہہ کے پکارتے ہیں وہ تمہاری طبعی زندگی میں تو بلا مزدومعاوضہ یہ کچھ دئے چلا جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کی نشوونما کے لیے تمہیں خود ایسا نظام قائم کرنا ہوگا۔ ذرا سوچو تو!

نظامِ ربوبیت کے لیے خدائے رحیم کا عطا کردہ نظامِ حیات اور اس پر کنٹرول

عزیزانِ من! اگر انسان کا کہیں زندگی کی بنیادی اساس پانی ہوا' وغیرہ پر کنٹرول ہو جائے تو یہ جو پانی کی ایک ایک بالٹی پر اتنا اتنا کچھ لیا جاتا ہے تو کوئی ایک سانس کی بھی قیمت ادا نہ کرسکے۔ کہا: بتاؤ تو سہی کہ کوئی اور بھی ذی اقتدار ایسے ہیں جو تمہارے لیے یہ کچھ کرسکیں۔ دوسرے مقامات میں بھی ہے کہ کہو کہ اگر یہ ہوا سلب ہو جائے اور پانی موجودہ قانون کے خلاف اوپر کی بجائے نیچے جانا شروع ہو جائے تو کیا تم ایک دن بھی زندہ رہ سکو گے؟ اور اس دنیا میں کوئی ایسا ذی اقتدار ہے جو تمہارے گرد اتنی بڑی فضا پیدا کردے جس کے اندر تم سانس لیتے ہو اور وہ فضا کبھی ختم ہی نہ ہو؟ اب تو ایسا عجیب وغریب نظام ہے کہ سانس اندر جائے گا تو اس سے آکسیجن وغیرہ آپ کی زندگی کا باعث بنے گی اور اس کے اندر جو ہلاکت آگین کاربن گیس ہے' وہ باہر آتی ہے اور اندر جتنا حصہ زندگی بخش ہوتا ہے' وہ جذب ہو جاتا ہے اور ہلاکت آفریں کاربن ڈائی آکسائڈ باہر آجاتا ہے۔ اگر کروڑوں اربوں انسانوں کا سانس اس طرح سے ہی باہر آنا

شروع ہو جائے' دوسرا کوئی اور انتظام نہ ہو' جو اس زہریلی گیس کو تبدیل کر کے پھر سے آکسیجن نہ مہیا کر دے تو دو چار دس صدیوں میں نہیں بلکہ دو چار دس روز کے اندر ہی یہ ساری فضا زہر آلود' جراثیم آلود ہو جائے' اور انسان مر جائے۔ کسی بند ہال کے اندر دیکھتے ہیں جو حشر ہوا کرتا ہے' دم گھٹ کے مرتے ہیں۔ ہوتا کیا ہے؟ یہ جو کاربن ڈائی آکسائڈ گیس ہوتی ہے یہ باہر آتی رہتی ہے اور کمرہ بند ہوتا ہے' یہ باہر جاتی نہیں ہے' اس کے جذب کا سامان اندر نہیں ہوتا' تھوڑے سے عرصے کے بعد ساری ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے' وہاں انسان مر جاتا ہے۔ یہ انتظام ملاحظہ فرماؤ کہ یہاں ان سب سے جو سانس باہر جاتی ہے' یہ جتنی نباتات ہے' ان کی زندگی کا دارومدار اس پر ہوتا ہے۔ ہمارے لیے وہ گیس ہلاکت آفریں' ان کے لیے حیات بخش' ہم زہر اگلتے ہیں اور اس سے ان کی زندگی کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ اسی لیے یہ نباتات' یہ درخت وغیرہ زندگی کے لیے بڑے ضروری ہیں۔ کہتے ہیں ان سے ہوا صاف ہوتی ہے۔ صاف اس طرح سے ہوتی ہے کہ ہمارا جتنا سانس باہر جاتا ہے وہ سارے کا سارا یہ جذب کر لیتے ہیں' جسے کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں' یہ سب جذب کر لیتے ہیں۔ اس سے پھر آپ کے لیے کہیں پھول اگ آتے ہیں' پھل آتے ہیں' جو آپ کی نگاہ کے لیے فردوس سامانی پیدا کرتے ہیں۔ آپ کے سانس کا زہر آلود حصہ یہ کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ کہا اگر یہ انتظام باہر نہ کیا گیا ہو' تو ہے کوئی ایسی قوت جو تمہارے خود ہی باہر نکالے ہوئے' زہر آلود سانس سے تمہاری حفاظت کر دے؟ کس انداز سے رحمٰن بات سمجھاتا چلا جاتا ہے! بات ''رب'' سے شروع ہوئی۔ یہ یونہی دو لفظ ہیں: رحیم اور رحمٰن دیکھتے ہیں قرآن نے کیسے سمجھا دیا۔

دنیا کا کوئی شخص اس نظامِ کائنات کا بدل پیدا نہیں کر سکتا

عزیزانِ من! میں نے کہا ہوا ہے کہ قرآن کریم کے کسی لفظ سے بھی یونہی آگے نہ بڑھ جایئے۔ اس کے بعد کہا کہ **اَمۡ لَهُمۡ اٰلِهَةٌ تَمۡنَعُهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِنَا** (21:43) کیا (یہ سمجھتے ہیں کہ) فی الواقعہ کوئی قوتیں ایسی ہیں جو انہیں ہماری گرفت سے بچا لیں گی؟ کہو: ہمارے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار ایسا ہے جو ان چیزوں سے تمہاری حفاظت کا سامان کر سکے؟ تو ہم پرستی کے زمانے کے بتوں کو تو چھوڑ دیجیے' اس دور کے جتنے بڑے بڑے آپ اربابِ اقتدار سمجھتے ہیں' ذرا ان سے کہیے تو سہی کہ یہ جو ان کا نظام ہے' کیا یہ کسی طرح سے انہیں بچا سکے گا؟ ان کی تو یہ حالت ہے کہ تمہاری مدد کرنا تو رہا ایک طرف **لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ نَصۡرَ اَنۡفُسِهِمۡ** (21:42) یہ تو اس کے خلاف اپنی مدد کی بھی استطاعت نہیں رکھتے' اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ انہیں بھی زہر آلود ہوا کے اندر سانس لینا پڑ جائے تو ان کی بھی موت ہو جائے۔ مگر کہا کرتے ہیں: صاحب! یہ کیا کہا؟ دیکھیے' ہم جن کو خدا مانتے ہیں' یہ اپنے کام کاج تو آپ کرتے ہیں' مگر اس نے یہ کہا تھا **يَكۡلَؤُكُمۡ بِالَّيۡلِ وَالنَّهَارِ** (21:42) اس کائنات میں ہلاکت آفریں عناصر کام کر رہے ہیں' وہ تمہارے لیے بھی ہلاکت آفریں ہیں۔

یہ پوری کی پوری کائنات ایک وحدت ہے

عزیزانِ من! میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک وحدت ہے۔ اس میں کسی ایک کے لیے اگر کوئی چیز ہلاکت آفریں ہے تو بعینہٖ وہی چیز کسی دوسرے کے لیے زندگی بخش ہوتی ہے۔ رحمانیت کا تو یہ نظام ہی عجیب ہے۔ وہ تو ہمارے علم کی کمی ہوتی ہے کہ جتنی چیزیں ہمارے ہاں ہلاکت آفریں ہیں ان کی نفع بخشیوں کے متعلق ابھی تحقیق ہی نہیں ہوئی، ہم سمجھتے ہی یہ ہیں کہ ہلاکت آفریں چیزوں میں ہلاکت ہی ہلاکت ہوتی ہے۔ مثلاً سانپ کے متعلق ہمیں بس یہی پتہ ہے کہ صاحب! یہ ڈستا ہے اور انسان مرجاتا ہے۔ اور پھر اسی پر یہ فلسفہ چلا کہ شر (Evil) بھی خدا کا Create (پیدا) کیا ہوا ہے۔ اور خیر (Good) بھی اسی کا۔ یہ شر Create (پیدا) کیا ہوا ہے، کیسے ہے؟ کہنے لگے: دیکھیے، وہ سانپ شر ہی شر ہے، ڈستا ہے، انسان مرجاتا ہے، تم نے یہی دیکھا ہے۔ لیکن یہ نکتہ بڑا عمیق ہے اور گہری سوچ کا متقاضی ہے۔

زندگی کا ایک ایک سانس قوانین خداوندی کا ہی محتاج ہے

عزیزانِ من! شاید آپ کو معلوم ہے، میں سنایا بھی کرتا ہوں، میں نے کچھ اور بھی دیکھا ہے۔ میرے آپریشن کے بعد وہ وقت آ گیا کہ میرا خون بہنا بند نہیں ہو رہا تھا اور ڈاکٹروں سمیت یہ ''فتویٰ'' لگ گیا کہ اب زندگی کے کچھ ہی سانس باقی رہ سکتے ہیں۔ احباب اور گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ڈاکٹر وہ تھے۔ جنہیں مجھ سے قلبی تعلق تھا۔ وہ اس پریشانی میں پاگل ہوئے جا رہے تھے، ڈاکٹر کے گھر کی بچیوں نے بھی اس وقت مصلے بچھا لیے۔ کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی۔ جب یہ صورتِ حال ہوئی سپیشلسٹ (ماہرین) آئے۔ انہوں نے کہا: ہاں، ایک انجیکشن ہے، سو وہ لگا دیا۔ اس طرح دوبارہ زندگی مل گئی۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ تریاق کیا چیز ہے کہ ایسی حالت میں بھی یہ کچھ دکھایا؟ کہنے لگے: سانپ کے زہر کا انجیکشن تھا۔ جی، یہ ہے اس کی رحمانیت، یہ ہے اس کی ربوبیت۔ ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے کہ سانپ ڈستا ہے تو مرتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے زہر میں اور کیا ہے؟ سچ کہا قرآن کریم نے کہ وہ انہیں کیا بچائیں! ان کی تو یہ حالت ہے کہ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ (21:43) وہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔ وہ بھی اگر ہمارے ہی قانون کے مطابق کچھ کریں گے تو ہوگا، ورنہ وَلَاهُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ (21:43) ہم بھی ان کی حفاظت نہیں کریں گے۔ اور اگر یہ ہمارے قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہے تو پھر انہیں زندگی نہیں مل سکے گی۔ ہماری حفاظت انہی کو حاصل ہوتی ہے جو ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر اس سانپ کے زہر کا تریاق انہوں نے نہ بنایا اور وہ سانپ ہی کی شکل میں باقی رکھا اور اس نے ڈس لیا تو پھر روز موتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کہا کہ ان سے کہو کہ اس چیز کو سمجھو اور سوچو۔

باطل نظامِ حیات کا نتیجہ! جسم صحت منداور زندگی جہنمی

عزیزانِ من! قرآن کریم نے طبعی زندگی کے متعلق مثالیں اس لیے دیں تا کہ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ دراصل بات تو اگلی بتانی ہے کہ تمہاری طبعی زندگی کتنی ہی خوشحال وصحت مند کیوں نہ ہو‘ اگر معاشرہ باطل ہے‘ نظام باطل ہے‘ تو تم صحت مند جسموں کے باوجود‘ اتنے بڑے جہنم کے اندر رہتے ہو۔ لہٰذا میں تو تمہیں اس جہنم کا علاج بتا رہا ہوں۔ کہا کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اس طرف کیوں توجہ نہیں دیتے‘ بے نیاز کیوں ہو رہے ہو؟

قانون خداوندی کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے کون لوگ ہیں؟

آپ کو پتہ ہے کہ کونسا طبقہ اس قسم کے مسائل سے بے نیاز ہوتا ہے؟ او جناں دی کوٹھی اچ دانے ہوندے نیں‘ [1] جن کے پاس جاگیریں ہوتی ہیں‘ سرمایہ ہوتا ہے‘ دولت ہوتی ہے‘ جائیدادیں ہوتی ہیں۔ اور ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ چل اوئے۔ چل دیکھی جائے گی آ گیا ہے‘ [2] ۔ ہمیں کون ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ ہم پہ کون ہاتھ ڈال سکتا ہے‘ ہم پہ کیا تباہی آ سکتی ہے! سب سے زیادہ اور سب سے بڑی مخالفت تو اسی طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہر قوم کی داستان میں یہ لکھا ہوا ہے کہ حضراتِ انبیاء کرامؑ نے اس قانون کی دعوت دی۔ مترفین نے سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی۔ مترفین تو کہتے ہی ان کو ہیں‘ جو بلا محنت مشقت دوسروں کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر قوم میں یہ چیز ہے کہ انہوں نے مخالفت کی ہے۔ اس نظام کی سب سے پہلی زد ان پر پڑتی ہے کیونکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)۔ انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جن کے لیے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ جیسی جدوجہد‘ اسی قسم کے اس کے نتائج۔ خدائی پیمانے کے مطابق محنت کا معاوضہ ملے گا۔ جو محنت نہیں کرتا اس کو کچھ نہیں مل سکتا‘ سرمایہ پہ معاوضہ نہیں مل سکتا۔

جاگیرداری نظام کے اثرات

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ جب جاگیرداریاں آباؤ اجداد سے آتی چلی جا رہی ہوں تو ان کا یہ یقین اور پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمیں کوئی نہیں چھیڑ سکتا‘ او صدیوں سے گاؤں کے اندر بھی جو سردار چلے آ رہے تھے‘ وہ تو سردار ابنِ سردار ابنِ سردار تھے۔ ان کے ہاں سرداریاں وراثت میں آ رہی تھیں‘ اس بنا پر وہ سارے اس تکبر اور سرمستی کے نشے میں مدہوش تھے۔ اب بھی ہمارے ہاں جو سرداریاں

---

[1] وہ جن کے ہاں کثیر دولت وثروت ہوتی ہے۔

[2] چل بے چل، دیکھا جائے گا۔

قائم ہوتی ہیں، جو جاگیرداریاں قائم ہوتی ہیں، اور وہ خاندانوں میں متوارث چلی آتی ہیں، ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ وہ اپنے گاؤں میں دوسرے انسانوں کو کمین ہی سمجھتے ہیں۔ انسان نہیں سمجھتے۔ کبھی کوئی سردار کسی کمی کمین ❶ کو برابر چارپائی پہ نہیں بیٹھنے دیگا۔

قرآن حکیم تو اسی نظام کی بیخ کنی کرنے کے لیے آیا تھا

قرآن یہی نظام الٹنے کے لیے آیا ہے۔ آپ گاؤں میں جا کے دیکھیے، انسان نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو کمی ❶ کہہ دیا گیا ہے۔ مثلاً نائی، دھوبی، حجام، کمہار، لوہار، آئیں گے تو تخت کے نیچے زمین پہ بیٹھیں گے، سردار صاحب جو زمیندار، جاگیر ہیں، وہ پلنگ پہ بیٹھیں گے۔ کسی کی یہ جرأت نہیں کہ کوئی ان کے برابر بیٹھ بھی جائے۔ کمی ہیں، کمی کام کرنے والے۔ یعنی وجہ ذلت کیا ہے؟ کام کرنا۔ یہ سردار کیوں ہے؟ کام نہیں کرتا اور کھاتا ہے۔ لؤ قرآنِ کریم کا نظام اسی کو تو الٹنے آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ **لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى** (53:39) جو کام نہیں کرتا ہے اس کو کچھ نہیں مل سکتا: جا تیری ایسی کی تیسی۔ ❷ قرآن نے اس ذہنیت کی بساط الٹ کے رکھ دی۔ عزیزانِ من! یہ جن کو کمی کہا جاتا تھا، ان سب کو حبیب اللہ، حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو محنت کرنے والا ہے وہ اللہ کا پیارا ہے۔

عزیزانِ من! خدا نے یہ کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کیوں کان لپیٹ کے چل دیتے ہیں، کیوں مذاق اڑا رہے ہیں، کیوں استہزاء کر رہے ہیں؟ **بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ** (21:44)۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤاجداد کو، زندگی کا ساز و سامان ایسی فراوانی سے مل گیا کہ یہ اس کے نشہ میں مدہوش ہوں گے۔ اور اس پر عرصہ گزر گیا کہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ ان کے باپ داداؤں نے کسی طرح سے یہ چھین جھپٹ کے یہ کچھ حاصل کر لیا اور پھر وہ صدیوں تک متوارث چلا آ رہا ہے، خاندانی جاگیردار یہ بنے چلے آ رہے ہیں، امیر بنے چلے آ رہے ہیں، اتنا لمبا ان کے اوپر عرصہ گزر گیا کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قلعہ بڑا مستحکم ہے اور یہ وجہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

جاگیرداری نظام کے خاتمے کے سلسلے میں ایک غور طلب آیت

عزیزانِ من! اس سے اور آگے ایک آیت ہے۔ جس کا مفہوم کسی کو اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آیا، بلکہ یوں کہیے کہ سمجھا ہی نہیں گیا۔ کہا کہ **اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا** (21:44)۔ کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم معاشی ذرائع (ارض) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر، ان کی مقبوضات کو کس طرح کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ دیکھیے گا کہ یہ وارننگ کہاں آئی ہے کہ ان کے آباؤاجداد نے یہ ساری جاگیریں اکٹھی کر لیں اور قلعے مستحکم کر لیے اور انہوں نے سمجھا کہ ہمیں کوئی چھیڑ

---

❶ نچلی ذات کا، کام کرنے والا۔

❷ کام بگاڑنا، بھلا برا کہنا۔

نہیں سکتا۔ اس کے آگے یہ ہے۔ میں پہلے لفظی طور پہ بتاتا ہوں کہ "کیا یہ دیکھ نہیں رہے کہ ہم زمین کے اطراف کو کس طرح سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔" ہمارے ہاں اس کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔ کہ ہم زمین کو کناروں سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ پہلے تو ان دونوں کے درمیان اس کا کوئی ربط ہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار' یہ بڑے بڑے زمیندار' یہ بڑے بڑے دولتمند' یہ سب مست بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ چیز تو صدیوں سے چلی آرہی ہے اور اس کے بعد یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ اس زمین' کُرّہ ارض کے کناروں کو ہم کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے ہاں یہی ترجمہ ہورہا ہے۔ یہی تفسیر۔ زمین کے کنارے کہیں گھٹتے تو نظر ہی نہیں آرہے اور وہاں ہے: اَفَلَا یَرَوْنَ (21:44) کیا یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے نہیں کس طرح زمین کے کناروں کو ہم کم کرتے چلے جاتے ہیں۔ گول چیز کا' کنارا تو ہوتا ہی نہیں' اور پھر یہ کہ اس کے کناروں کو کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ آج بھی ہمارے ہاں جو سائنس کا دَور ہے وہ بھی یہ چیز کبھی نہیں بتارہا کہ زمین کے کناروں کو کم کرتے چلے آرہے ہیں۔ کیا ہوا؟ اب پھر وہی کہیں گے کہ صاحب! جی ہاں' ہزار برس میں کسی نے نہ سمجھا' یہ نئے آئے سمجھانے والے صاحب! اوبابا کہیں الہام تو ہوا نہیں ہے' یہ تو دعویٰ ہی نہیں کہ خدا کی طرف سے یہ ایک الہام و کشف کے ذریعے سے یہ معنی تھے جو ہماری سمجھ میں آئے اور اس نے ہمیں سمجھائے۔ برادرانِ عزیز! اپنی کتابوں کے اندر' ان کے لغت کے اندر' ان کی زبان سے ذرا پوچھو تو سہی۔ چلے جارہے ہو' بھیڑوں کی طرح سے ایک کے پیچھے دوسرے۔ یہ قرآن جو لسانِ عربی مبین میں نازل ہوا ہے' اس نے کہا ہے کہ مجھ سے پوچھ لو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ عربی زبان کے اندر "طرف" کی جمع [1] اطراف ہے' اور اطراف الارض کے معنی "ملک کے سردار اشراف اور بڑے بڑے سرداروں کے ہیں"۔ کہا کہ بعد کی بات تو بعد میں سہی' ابھی حال ہی میں تمہارا یہ نظام ذرا سا ہی متشکل ہوا ہے اور یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ بڑے بڑے سرداروں کی جاگیریں کس طرح سے کم ہونی شروع ہوگئی ہیں۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ اسے پھر یاد رکھیے کہ اطراف کے معنی ہی بڑے بڑے سردار' بڑے بڑے زمیندار' بڑے بڑے لوگ ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ بولتے ہیں۔ ان کی زبان میں یہ استعمال ہوتا ہے اور یہ جو چیز تھی کہ واقعی ان کی زمینداریاں اسی دَور کے اندر سمٹنا شروع ہوگئی تھیں' جہاں بھی یہ نظام قائم ہوا تھا۔ یہ پہلی سیدھی سی بات ہے کہ بٹائی پہ زمین کا دینا تو ناجائز قرار دیدیا گیا' اب رہ گئی سمٹ کے اتنی زمین جتنی کوئی خود کاشت کرے۔ خود کاشتی کے لیے اس زمانے میں ٹریکٹر اور مشینیں تو تھی نہیں۔ اس طرح ان کی جاگیرداری سمٹ کر رہ گئی۔ آج تو صورتِ حال دوسری ہے۔ آج تو چار ٹریکٹر منگالیے اور ہزار ایکڑ زمین خود کاشت کرلی۔ اس زمانے میں تو اپنے ہی ہل سے خود کاشت ہوتی تھی' تو اس نظام میں پہلی یہ چیز آئی تھی۔

---

[1] اطراف آنکھ' نگاہ (تاج العروس)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ "طرف" مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں: (۱) کسی عضو کا حرکت کرنا اور (۲) کسی چیز کا کنارہ۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اطراف اصل میں "پلکیں جھپکنے کو کہتے ہیں۔" اطراف الارض ملک کے سردار اور اشراف (تاج العروس، صحاح اور البستان) نیز طرف کے معنی گروہ اور جماعت کے بھی ہیں (قاموس)۔ الطرف منتخب چیز تو بڑے بڑے سردار اور لیڈر بھی ہوسکتے ہیں۔ (تاج العروس)

قرآن کی روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عراق کی مفتوحہ زمینوں کا فیصلہ

عزیزانِ من! خیبر کے معاہدے میں اور ذرا آگے چلیے' جب حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے (634-645ء) میں عراق اور شام کی زمینیں آئیں تھیں' تو یہ بالآخر طے ہوگیا کہ مفتوحہ زمینوں کی تقسیم میں صرف احتیاج (ضرورت مندی) شرطِ لازم ہے۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنے دیا جائے اور اس کے انتظام کے متعلق یہ ہے کہ اسے موجودہ کاشتکاروں کے پاس رہنے دیا جائے اور ان سے خراج وصول کرلیا جائے تا کہ یہ آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جاسکے اور اس کے ذریعے فوج کے اخراجات نیز موجودہ اور بعد میں آنے والی نسلوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے۔ حضورِ اکرم نے اسلامی معاشی نظام آہستہ آہستہ نافذ فرمایا۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ حضورؐ نے اس طریق کی ممانعت فرمائی جس کی رو سے ایک شخص زمین کا مالک قرار پاتا تھا اور دوسرا شخص اس کی زمین کاشت کرتا تھا اور اس کے عوض مالک اراضی اس مزارع سے یا زمین کی پیداوار میں سے ایک حصہ (بٹائی) لے لیتا تھا یا نقد کرایہ (پٹہ)۔ اسے اصطلاح میں مزارعت کہتے تھے۔ حضورِ اکرم نے اصولاً یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ ''جس شخص کے پاس زمین ہو۔ وہ اس میں خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دیدے۔'' جس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی' وہ عہدِ فاروقی (634-645ء) میں کئی منزلیں آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گیا تھا جہاں اراضیات کو مملکت اپنی تحویل ❶ میں لے لیتی ہے۔ یہ انقلاب By Stages (مرحلہ وار) ہوتا ہے' یہ بتدریج ہوتا ہے' یہ سارا نظام جو بدلا جاتا ہے' وہ Overnight (شباشب) کبھی نہیں بدلا جاتا۔ یہ سوال اس وقت زیرِ غور آیا جب شام اور عراق کا علاقہ فتح ہوا۔ عراق میں دجلہ وفرات کی وادیاں صحیح معنوں میں زرخیز (سونا اگلنے والی) تھیں۔ اس قسم کی اس قدر وسیع اراضیات جب مفتوح قرار پائیں تو ان کی تقسیم کا سوال سامنے آیا۔ اس سے پیشتر مفتوحہ زمینوں کو بھی مالِ غنیمت قرار دیا جاتا تھا اس لیے وہ سپاہیوں میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ مگر حضرت عمرؓ کا خیال اس سے مختلف تھا اور دوسری بات یہ کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حجاز کے اندر تو یہ مزروعہ زمینیں بڑی ہی تھوڑی تھوڑی ہوتی تھیں۔ کہیں نخلستان ہوا' پانی تھوڑا سا ہوا تو اتنا سا ٹکڑا زمین کا ہوا۔ اس کے برعکس عراق کی ساری کی ساری مزروعہ زمینیں تھیں۔ وہ زمینیں جب فتح ہوئی ہیں تو یہ سوال اٹھا' کیا زمینیں سپاہیوں میں بانٹنی چاہئیں؟ مہینہ بھر اس سوال پہ وہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان مذاکرہ ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کی شہادت سے یہ ثابت کیا کہ نہیں' زمین ذریعہ رزق ہے' وہ ایک فرد تو ایک طرف رہا' کسی دَور کے گروپ کی بھی ملکیت نہیں ہوسکتا' وہ قیامت تک نوعِ انسانی کے رزق کے لیے ذریعہ ہے' اسے آزاد رہنا چاہیے' اس کا مملکت انتظام کرے گی' ان زمینوں پہ ملکیت کسی کی بھی نہیں ہوگی۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ زمین کسی کی بھی ملکیت نہیں ہوسکتی' مملکت کی تحویل میں رہیں گی تا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ہر ایک کو رزق پہنچتا رہے' تو عزیزانِ من! یہاں تو زمین کے کنارے سمٹنے شروع

---

❶ ان نکات کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے؟ پرویزؒ: شاہکارِ رسالت۔ عمر فاروقؓ۔ ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1987ء ص ص 390-380۔

ہوئے تھے۔حضور ﷺ کے زمانے میں ان سے یہ کہا کہ یہ جو جدی پشتی آباؤ اجداد سے اتنے اتنے بڑے زمیندار ہیں اور اتنے اتنے بڑے جاگیردار بنے پھرتے ہیں۔ان سے کہو کہ ابھی تو ابتدا ہے۔ اسی میں دیکھ نہیں رہے کہ ان کی جاگیروں کے کنارے سمٹ سمٹ کے کہاں چلے جا رہے ہیں۔

اسلامی مملکت میں ذرائع رزق کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوں گے

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (21:44) کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم معاشی ذرائع (ارض) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر ان کی مقبوضات کو کس طرح کم کرتے چلے جا رہے ہیں اور آگے ہے کہ کیا اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (21:44)۔ یہ بالادست رہیں گے اور ہمارا نظام ان پر غالب نہیں آ سکے گا؟ اس لیے ان سے پوچھو کہ انہوں نے کیا کر لیا جن کی جاگیروں کے کنارے سمٹ گئے تھے اور تم کیا کر لو گے؟ ذرائع رزق کو تمہارے ہاتھوں میں نہیں رہنے دیا جائے گا' اسی کی بناء پہ تو تم دوسروں کو اپنا محتاج اور محکوم بناتے ہو' مغلوب اور مفتوح بناتے ہو' کمی کمین بناتے ہو۔اب یہ عمل نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ان کی جاگیروں کے کناروں کو سمٹانے کا Process (عمل) شروع ہو گیا۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کی خصوصیت اور ربوا کی تعریف

عزیزانِ من! کیا بات ہے۔کہا کہ قرآن کا Process (عمل) شروع ہو گیا ہے' یعنی اس نظام کا آغاز ہو گیا ہے' ابھی سے تم دیکھو۔وہ کہتا ہے کہ یہ ایک قانون تھا کہ زمین بٹائی پہ نہیں دی جا سکتی۔اور یاد دلاتا ہے کہ دیکھو زمین کے کنارے سمٹ سمٹ کے پوچھو نہیں کتنے کتنے رہ گئے' اور وہ بھی کتنی تحدی سے کہتا ہے۔قرآنِ کریم نے اسے (ربوا) کہا ہے' اور یہ کہ ربو حرام ہے۔ربوا ہی کے متعلق یہ کہا ہے کہ اگر یہ لوگ ربوٰ کی اس روش سے باز نہیں آتے تو ان سے کہو کہ پھر اسلامی مملکت کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے' یہ جرم بھی اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ اسے مملکت کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک کہ اسلامی نظام یا قرآنی نظام کی بنیاد ربوبیت ہے' اور ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ ذرائع رزق کے اوپر کسی کی ملکیت نہ ہو۔ اگر کوئی نظام ایسا ہے جو بلا محنت کے سب کچھ لے جانا چاہتا ہے تو وہ اس نظام کے خلاف ایک دوسرا نظام قائم کرتا ہے۔یہی تو بغاوت ہے۔اس لیے قرآن نے کہا ہے کہ پھر یہ سمجھ لیں کہ ہماری طرف سے ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔اعلانِ جنگ تو ایک بغاوت کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ربوٰ کا یہ نظام بغاوت ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اسی لیے اس نظام کو مملکت کے خلاف بغاوت کہا ہے۔ جسے آپ بٹائی کہتے ہیں' وہ کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ زمین کسی کی ملکیت' محنت کوئی کرتا ہے اور یہ گھر بیٹھے اس میں سے آدھا لے جاتا ہے' اسی لیے حضور ﷺ نے کہا کہ یہ ربوا ہے۔تو اس Process (عمل) کی ابتداء حضور ﷺ کی زندگی میں ہی تو ہو گئی تھی۔اسی لیے قرآن کریم نے کہا تھا کہ اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ

نَـنْـقُـصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُـمُ الْغٰلِبُوْنَ (22:44)۔کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم معاشی ذرائع (زمین) کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر' ان کی مقبوضات کو کس طرح کم کرتے چلے جا رہے ہیں۔(13:41)(کیا اس کے باوجود یہ سمجھتے ہیں کہ) یہ بالا دست رہیں گے اور ہمارا نظام ان پر غالب نہیں آ سکے گا؟ کیا کہا پوچھوان سے یہ غالب آ جائیں گے؟ وہاں تو پھر بھی لمبا عرصہ لگا۔

کتاب 'مسئلہ ملکیت زمین' ❶ پر ایک نظر

عزیزانِ من! آج آپ کے ہاں پہلے مسئلہ ملکیتِ زمین میں یہ لکھا کہ زمین کا بٹائی پر دینا جائز ہے۔ دراصل یہ کتاب ان زمینداروں نے لکھوائی تھی' کہ اسلام میں زمین کی حدِ ملکیت میں ذرا سی کمی کرنے کا کسی کو بھی حق اور اختیار نہیں ہے۔ یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب ''مسئلہ ملکیت زمین'' میں موجود ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن لیجیے گا جو ہمارے پاس ہے' اور پھر دیکھیے کہ اسلام تو بدلتا رہتا ہے۔ اس کے بعد پارٹی نے یہ اعلان کیا کہ زمین کی تحدید ہوگی' یعنی حد بندی ہوگی۔ انہوں نے پچھلے انتخاب کے وقت خود جو اپنا منشور دیا ہے' اس میں یہ کہا ہے کہ حدِ ملکیت ڈیڑھ سو ایکڑ تک رکھ دی جائے گی' اس سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی کتاب موجود ہے کہ زمین کی حدِ ملکیت میں ذرا سی کمی کرنے کا بھی کسی کو حق حاصل نہیں اور یہ بھی منشور موجود ہے کہ حدِ ملکیت ڈیڑھ سو ایکڑ ہے۔

آخر کار قرآنی حقائق کو قبول کرنا ہی ہوگا

عزیزانِ من! غور کیجیے قرآن یہ کہتا ہے کہ اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (21:44) ہمارے نظام کا غلبہ دیکھ نہیں رہے؟ خود اپنے منہ سے کہہ رہے تھے کہ حدِ ملکیت میں ایک انچ کی بھی کمی نہیں کی جا سکتی' اب خود منشور دے رہے ہیں کہ ڈیڑھ سو ایکڑ سے زیادہ ملکیت نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ زمین کے کنارے سکڑے نہیں ہیں؟ قرآن تو مار مار کے اس طرف لے آتا ہے' اسی لیے اس نے کہا تھا کہ اگر تم بطیّب خاطر اس طرف نہیں آتے تو یاد رکھو' تمہیں کرھاً آنا پڑے گا۔ وہ تو ہوتا ہی یہ ہے۔ اب سنیے کہ یہ کرھاً کیسے ہوتا ہے؟ وہ نمبر دار تھا۔ اس نے سردار جی کو بلایا کہ زمین کا مالیہ لگان داخل کرو۔ کہا کہ جی' میرے پاس تو ہے نہیں۔ تحصیلدار نے کہا کہ اس کو مارو جوتے۔ پیسے داخل کرنے کی بات جو تھی۔ اس کو سمجھایا گیا۔ اسے یہ کہا گیا کہ یہ سو پیاز ہیں' یا تو تمہیں یہ کھانے ہوں گے یا اس کے عوض تمہیں ایک جوتا کھانا ہوگا۔ کہا کہ میں تو پیاز نہیں کھاتا۔ اس نے کہا: لگاؤ جوتا۔ جوتے لگائے تو ایک پیاز کھا لیا صاحب! کہنے لگا: کھاؤ دوسرا۔ کہنے لگا کہ جناب نہیں کھاتا' کہنے لگا: اس کے ایک اور جوتا لگاؤ۔ پھر جوتا لگایا' پھر ایک پیاز کھا لیا۔ سوگنڈا وی کھادا تے' سو جوتیاں وی کھادیاں ❶۔ یہ اس طرح قرآنِ کریم کی طرف آتے ہیں۔ یہ اس نے کہا تھا کہ ان سے کہو کہ وہ بطیبِ خاطر آ جائیں' عزتاں محفوظ

---

❶ سو پیاز بھی کھائے اور سو جوتے بھی۔

رہن گیاں'❶ اور اگر ایسے نہ آئے تو پھر ہمارا قانون تو یہ نہیں کہ بدل جائے' یہ تو پھر قائم ہو کے رہے گا' تو اس وقت پھر سوچ لو کہ ''سو گنڈے وی کھانے پڑیں گے تے' سو جوتیاں وی۔ تے فٹے منہ اوس آن دا تہاڈے تے'❷۔ ان سے کہو کہ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (21:44) کیا ہمارے اس نظام پر غالب آ جائیں گے؟ پھر کہا کہ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ (21:45) ان سے کہو کہ میں جو تمہیں' تمہاری روش کے انجام وعواقب سے آگاہ کرتا رہتا ہوں تو وہ میرے ذاتی قیاسات پر نہیں ہوتا۔ میں یہ سب کچھ وحی خداوندی کی بنا پر کہتا ہوں۔ اس لیے اس میں شک وشبہ یا غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! یہ منشور کسی انسان کا مرتب کردہ نہیں اور ان سے یہ بھی کہہ دو کہ یہ کسی انسان کی تصنیف کردہ ''مسئلہ ملکیت زمین''❸ کی کتاب نہیں ہے' آج یہ لکھ دے اور کل وہ لکھ دے۔ میں تو اپنی طرف سے کچھ کہہ ہی نہیں رہا' یہ تو خدا کی وحی ہے جو بیان کر رہا ہوں اور یاد رکھیے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:116)۔ اب ان قوانین خداوندی میں کوئی تغیر وتبدل کرنے والا نہیں۔ یعنی یہ ایسا مکمل ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کل کو اگر تم یہ کہہ دو چلو آؤ' جی کچھ مفاہمت کر لیں' ڈیڑھ سوا یکڑ پہ ہی راضی ہو جائیں' کہا یہ میرے بس میں ہوگا ہی نہیں' میرا اپنا منشور ہو تو میں اس کو ہر انتخاب کے زمانے میں بدل لوں' یہ منشورِ خداوندی ہے۔ اس میں تو ایک حرف کی تبدیلی بھی میرے اختیار میں نہیں۔ لہٰذا مجھ سے یہ توقع نہ کرو کہ یہ کچھ ہو جائے گا' تو آگے چل کے ذرا مفاہمت کا راستہ نکل آئے گا' مفاہمت کا راستہ نہیں نکلا کرتا' میں تمہیں وحی کی بات بتا رہا ہوں' تمہارے بھلے کی بات بتا رہا ہوں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ (21:45) تم بالکل بہرے بن جاتے ہو' اور ہر بات ان سنی کر دیتے ہو۔ اس لیے میرا اقتدار تمہیں کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ تیرہ برس سے سنا رہا ہوں۔ مجھے اس سے بھی زیادہ عرصہ اب گزر گیا اور تم ہو کہ بار بار کہتے چلے جاتے ہو کہ وہ انقلاب کب آئے گا' جلدی کرو' کرا کے دکھاؤ اس کو۔ کہا کہ انہیں بتا دو کہ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:46)۔ اس آنے والے انقلاب کا عذاب اس قدر شدید ہے کہ اگر انہیں اس کی ایک لپٹ بھی چھو جائے (تو ان کا سارا نشہ ہرن ہو جائے) اور یہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ ہم واقعی زیادتی کیا کرتے تھے۔ یہ تباہی ہم پہ آنی چاہیے تھی۔ لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اس وقت تو تم بڑے پھنے خاں بنے پھرتے ہو۔ اگر اس عذاب کی ایک تھوڑی سی لپٹ بھی آ گئی تو اسی وقت گڑگڑانے لگ جاؤ گے کہ خدا کے لیے بچا لو صاحب! بچا لیجیے'

---

❶ عزت وآبرو قائم ودائم رہے گی۔

❷ سو پیاز بھی کھانے پڑیں گے اور سو جوتے بھی۔ تو پھر تف لعنت اس آنے پر

❸ یہ اشارہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب ''مسئلہ ملکیت زمین'' کی طرف ہے۔

ہم واقعی ظالم تھے' واقعی زیادتی کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم تو بچنے کے لیے یہ کچھ کرلو گے۔ میں مفاہمت نہیں کرسکوں گا کہ تمہارے فیصلے تمہارے اپنے فیصلے ہونگے' میرا فیصلہ میرا اپنا فیصلہ نہیں ہے۔ میں تو خدا کے فیصلے تم تک پہنچا رہا ہوں' تو اس وقت بھی یہ صورت ہوگی کہ اس سزا کی ذرا سی لپیٹ آ کے لگے گی تو اس وقت گڑ گڑاتے ہوئے آ ؤ گے۔ کنی شرم دی گل اے ❶ یعنی یوں بات کہنے کی ہے' کہ وہ ہے تو وہ ہندی لیکن ہے بڑا کام کا شعر۔ کہا:

دُکھ میں تو ہر ❷ کو بھجیں ❸ اور سکھ میں بھجیں نہ کو
جو سُکھ میں ہر کو بھجیں تو دُکھ کاہے کو ہو

تکلیف اور مصیبت کے زمانے میں تو ''یا اللہ'' ہر ایک کی زبان پہ آتا ہے' خوشحالی کے زمانے میں بھول جاتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اگر خوشحالی کے زمانے میں' زبانوں پر اللہ ہو' تو پھر بدحالی آئے ہی کیوں؟ کہا کہ اس کا کیوں انتظار کرتے ہو کہ اس عذاب کی وہ لپیٹ آ جائے تو پھر تم گڑ گڑاتے ہوئے آ ؤ لیکن اُس وقت بھی میں تو تمہاری مدد نہیں کرسکوں گا۔ اگر معاملہ دو سلطنتوں کا' دو مملکتوں کا' ہو تو ہوسکتا ہے کہ آپس میں کچھ معاہدہ کرلیا جائے' Compromise (مصالحت) کرلیا جائے لیکن یہاں یہ کچھ نہیں ہوسکتا۔

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انصاف کے ترازو کی کیفیت

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ یہ سارا سوال تو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا ہے: نہ میرا نہ تمہارا۔ اس میں تو ایسی کوئی بحث ہی نہیں ہے اور یہ انقلابی عذاب یونہی اندھا دھند واقع نہیں ہوجائے گا۔ ہمارے ہاں سے کچھ بھی اندھا دھند نہیں ہوتا۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ **وَ نَضَعُ الۡمَوَازِیۡنَ الۡقِسۡطَ لِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَیۡـًٔا ؕ وَ اِنۡ کَانَ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ اَتَیۡنَا بِہَا ؕ وَ کَفٰی بِنَا حٰسِبِیۡنَ** (21:47)۔ ہم ظہورِ نتائج کے وقت عدل کی میزانیں کھڑی کردیں گے اور کسی کے ساتھ ذرا بھی بے انصافی نہیں ہو گی۔ اگر کسی نے رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ کیا ہوگا تو اسے بھی وزن میں لے لیا جائے گا۔ جب ہم خود حساب کرنے والے ہوں تو پھر کون سی چیز ہے جو حساب سے باہر رہ سکتی ہے (99:7-8)۔ یہاں یہ واضح کردیا کہ یہ تو قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ ہر ایک کے عمل کا ذرہ ذرہ' خواہ وہ رائی برابر بھی کیوں نہ ہو' اس کے میزان میں تلتا جاتا ہے اور اس کا میزان اور ترازو دھرم کانٹا ہے: **فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ**

---

❶ کتنی شرم کی بات ہے۔
❷ خدا۔ ''ہر'' ہندی میں (۱) وشنو کرشن اور (۲) خدا کو کہتے ہیں۔ جیسے ہر کو بھجے سو ہر کا سوئے۔ ذات نہ پوچھے کوئے۔ (مثل) جو شخص خدا کی بندگی کرتا ہے' وہی اس کا پیارا ہوتا ہے۔ اللہ کے نزدیک ذات پات کی کوئی قدر نہیں۔
❸ پرستش کرنا۔

خَيۡـرًا يَّـرَهٗ وَمَـنۡ يَّـعۡـمَـلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ❶ (99:7-8)۔ تعمیری کاموں کا بھی ایک ایک ذرہ اپنی طرف وزن رکھتا ہے‘ تخریبی کاموں کا بھی ایک ایک ذرہ وزن بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اس کو دھرم کے کانٹے میں رکھ دیا جاتا ہے: نَـضَـعُ الۡـمَـوَازِيۡـنَ (21:47)۔ ہم انصاف کے ترازو کھڑے کر دیں گے‘ قادرِ مطلق اپنی قوت کی بنا پر یہ کچھ نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ انصاف کے ترازو کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ عزیزانِ من! انصاف کے ترازو میں تو ترازو کھڑے کرنے والے کا بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اگر وہ کانٹا دھرم کا نٹا ہے تو جس کی دوکان پہ کانٹا ہے‘ وہ بھی اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کتنی بڑی چیز اس میں کہی گئی ہے۔ ہم یونہی تمہارے فیصلے نہیں کر دیں گے‘ ہم ترازو کھڑا کریں گے۔

عزیزانِ من! انصاف کا یہ Concept قرآن ہی دے سکتا ہے‘ کہ انصاف کرنے والا بھی Objectively باہر کھڑا ہوتا ہے‘ اس وقت کانٹا اس کے ہاتھ میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہے نَـضَـعُ الۡمَوَازِيۡنَ (21:47)۔ ہم میزان گاڑ دیں گے‘ میزان کھڑی کر دیں گے لٹکا دیں گے اور وہاں ایک ایک ذرہ تلے گا‘ ہم بھی کچھ نہیں کریں گے‘ تم بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ رسول کہتا ہے کہ میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ دوسرے مقام پہ تو رسول یہ کہتا ہے کہ اگر میں بھی اس کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ عزیزانِ من! انصاف کا ترازو کھڑا کرنے کے یہ معنی ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہ جو ترازو کھڑا کرنے والا ہے‘ وہ بھی وہاں کچھ نہیں کرتا‘ کر سکنے کے باوجود نہیں کرتا کیونکہ اس نے انصاف کا ترازو کھڑا کیا ہے‘ دھرم کا نٹا کھڑا کیا ہے‘ ایک ایک ذرہ کے برابر وزن کیا جاتا ہے۔ اس وزن کرنے کے متعلق کہا کہ فَـلَا تُـظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡـئًا (21:47)۔ ذرا کمی نہیں کی جائے گی‘ ذرا کسی کے اوپر ظلم نہیں ہوگا صاحب! یہ فیصلہ وہاں ہو جائے گا۔ تو کہا کہ بھائی! وہ جو وقت ہے اس سے ڈرو جب تمہارے اس غلط نظام کے تباہ کن نتائج محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ جائیں گے اس وقت میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا تم تو ایک طرف رہے۔ اس کے آنے سے پہلے ہی اپنی یہ روش بدل دیجیے۔ خدا نے یہ کہا کہ ہم میزانیں کھڑی کر دیں گے۔ اس کے بعد اتنا ہی دیکھنا ہوگا کہ یہ وزن کتنا ہوا‘ اور اس کے بعد یہ بتا دیا کہ مَـنۡ ثَـقُـلَـتۡ مَوَازِيۡنُهٗ (101:6)۔ جس کا تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری ہوگا‘ فَهُـوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ (101:7)۔ اس کی زندگی‘ اس کی حسین آرزوؤں کے مطابق خوش آئند ہوگی‘ وہ جنت کی زندگی‘ جسے کہتے ہیں‘ وہ لے گا۔ مَـنۡ خَـفَّـتۡ مَوَازِيۡـنُـهٗ ۝ فَـاُمُّـهٗ هَاوِيَةٌ (101:8-9)۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا‘ وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا‘ جہاں اس کی یہ حالت ہوگی کہ اس کا دل و دماغ کچھ کام نہیں دے گا

---

❶ جو ذرا برابر بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کرے گا اس کے حسنِ عمل کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آ جائے گا اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرے گا‘ اس کی سزا پائے گا۔ یہ سب کچھ اس دنیا میں بھی ہوگا جب قرآنی نظام قائم ہوگا (جیسا کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اور اس کے بعد پھر ویسا ہی ہوگا)۔ اور آخرت میں بھی‘ جب انسان کا ہر عمل‘ نتیجہ بن کر سامنے آ جائے گا۔

اور وہ پریشان حال مارا مارا پھرے گا یعنی اس میں آپ دیکھیے کتنا کچھ Objectively ہو رہا ہے۔ ترازو کھڑا کر دیا جا رہا ہے' پلڑوں میں یہ ڈالا چلا جا رہا ہے بس اتنی سی بات ہی ہے۔ و کفیٰ بنا حٰسبین اور کوئی اس میں تیسرا دخل نہیں دے گا' ہم حساب کر لیں گے۔

یہ دھرم کانٹا متعلقہ شخص کو دکھا بھی دیا جائے گا

عزیزانِ من! ایک دوسرے مقام پہ ایک اور بات بھی کہی گئی ہے کہ اس وقت ہم تمہیں کہیں گے کہ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا (17:14)۔ لو! اپنا نامۂ اعمال خود پڑھ لو۔ یعنی ہم تمہیں کہیں گے کہ بھئی! آ کے اپنا حساب آپ دیکھ لو' "مگروں نہ کینا' پئی جی ایویں وچ کوئی رولا پادتا گیا سی۔" ❶ تم خود حساب کر لو۔ اس وقت یہ ہوگا کہ یہ بات میرے بس کی بھی نہیں ہو گی کیونکہ خدا کہتا ہے کہ کَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ (21:47)۔ ہم حساب کرنے والے ہیں۔ ٹھیک ہے یہ انصاف کا اتنا بڑا ترازو ہے۔ کیسا معیار ہے' عزیزانِ من! کہ جس میں دنیا کے یہ لوگ' کسی کے حامی مددگار' یہ پیشوائے طریقت' یہ بزرگ' یہ تو ایک طرف' یہ رسول بھی دخل نہیں دے سکتا۔ اور آگے بڑھیے تو عزیزانِ من! خدا بھی دخل نہیں دے رہا' حساب پہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اب یہ امت آ گئی' کہا کہ جی' ٹھیک بات ہے' حساب کرنے والی بات ہے' ہم بھی مانتے ہیں' ہمارا ایمان ہے' یہ حساب ہے' کہا کہ بات یہ ہے:

میرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت
الٰہی تو ہی بتادے حساب کر کے مجھے

خدا نے یہی کہا کہ ہم حساب کریں گے' تو جواب دیا کہ ٹھیک ہے ہم تو کچھ نہیں کہتے' تو ہی حساب کر کے بتا دے کہ میرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت۔ چل بھئی! میرے گناہ زیادہ یا تیری رحمت' میں کچھ نہیں کہتا' الٰہی تو ہی کہہ دے' حساب کر کے مجھے' کیونکہ تو نے کہا تھا کہ کَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ (21:47)۔ تو حساب کر دے۔ تو اب' چل بھئی! اور وہ اس کے بعد خوش ہو گئے۔ اس کا نتیجہ دیکھ لو جو حالت ہو رہی ہے اور ان سے پھر یہ کہا کہ چھوٹے موٹے تو ایک طرف رہے' وہ داستانِ بنی اسرائیل اور فرعون تو تمہارے سامنے ہے۔ یہ یہودی یہاں بس رہے ہیں۔ اسی قسم کے انقلابات انبیائے سابقہ کے ہاتھوں بھی وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً موسیٰ اور ہارون کے ہاتھوں وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِکْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ وَھُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (21:48-49)۔ جنہیں ہم نے وہ ضابطہ قانون عطا کیا تھا جو صحیح اور غلط کو نکھار کر الگ الگ کر دینے والا' اور ان لوگوں کے لیے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں' مشعلِ ہدایت اور وجہِ شرف تھا۔ یعنی ان لوگوں کے لیے جو قانونِ خداوندی کے اَن دیکھے نتائج سے ڈرتے تھے اور اس طرح آنے والے انقلاب کے تصور سے لرزتے تھے۔ اس طرح کہا کہ داستانِ بنی اسرائیل فرعون ہی کو دیکھ لیجیے' اس

---

❶ پھر نہ کہنا کہ یونہی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا تھا۔

سے بڑا کوئی جھنڈے گاڑنے والا نہیں۔ اس سے کہا گیا ہے کہ اس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے‘ اس بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم بھی کوئی نہیں تھی‘ دونوں میں عجیب تضاد تھا‘ اسی لیے داستان کو پیش کیا‘ اسی قسم کا ایک ضابطہ حیات ہم نے موسیٰ کو دیا تھا۔ اس ضابطہ کی روشنائی میں اس نے اپنی قوم کی ہدایت کی تھی‘ راہنمائی کی تھی‘ مقابلے میں فرعون [1] اور اس کے جنود اور ہامان اور وہ قارون [1] سارے اکٹھے تھے ‘ملوکیت سرمایہ داری‘ پیشوائیت سب اکٹھے تھے۔ کیا ہوا؟ ان یہودیوں سے پوچھو تمہارے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ تم نے سمجھ لیا کہ وہ سارا صدقہ اس ایک کتاب کا تھا جو ہم نے موسیٰ کو دی تھی: وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (21:50)۔ اور یہ اسی قسم کا ایک مبارک ذکر قرآن اب ہم نے نازل کیا ہے: اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (21:50)۔ تو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟ واہ واہ کس طرح کڑی سے کڑی ملاتا ہوا قرآن لا رہا ہے۔ یہاں اس قرآن پہ لانا ہے۔ کس انداز سے لا رہا ہے‘ عزیزانِ من! اور اس کے بعد پھر ملتِ واحدہ کا حضرتِ ابراہیمؑ کا ذکر آ رہا ہے‘ مگر یہاں بات دوسری شروع ہو جائے گی۔

جشنِ نزولِ قرآن کا دن اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! ہم سورۃ الانبیاء کی آیت 50 تک آ گئے۔ ابھی وقت میں دس منٹ ہیں اور میں اسے بھی حساب کر کے بہتر طور پر استعمال میں لا رہا ہوں۔ کہتے ہیں‘ اگلے اتوار کو عید ہو گی اس لیے اگلے اتوار کو درس نہیں ہو گا۔ عید‘ قرآن کی رو سے‘ جشنِ نزولِ قرآنِ کریم‘ کا ایک ہی تہوار ہے جس کے منانے کے متعلق قرآن نے بھی کہا ہے۔ یہ قرآنِ کریم کے نازل ہونے کی خوشی کا ایک تہوار ہے۔ یہ اتنی بڑی چیز ہے‘ عزیزانِ من! کہ خود خدا نے اس کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس پہ جشن مناؤ۔ یہ ہے ہی بڑی چیز۔ ہمیں کیا اندازہ کہ یہ کیا ہے! میں نے کہا ہے کہ اس تہوار سے بڑی چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک تہوار ہے اور اس کے منانے کے لیے خدا خود یہ کہہ رہا ہے۔ سورۃ یونس کی آیت 57 ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ (10:57)۔ پوری نوعِ انسانی سے کہا گیا ہے یہ صرف مسلمانوں کا ہی جشن نہیں ہے۔ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (10:57)۔ اے نوعِ انسانی! دیکھو تو سہی‘ کیا تمہاری طرف چیز آ گئی! اوغور تو کرو‘ کیا بھیجا ہے ہم نے‘ زندگی کی راہیں روشن کرنے والا‘ زندگی کے راستے روشن کرنے والا‘ جگمگا دینے والا‘ تمام نفسیاتی امراض کا علاج‘ رحمت! یہ سب کچھ اس کے اندر ہے اور پھر اس کی تم سے ہم نے کوئی قیمت نہیں لی۔ قل بفضل الله و برحمته (10:58)۔ ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ حیات کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اور اتنی بڑی چیز اور مفت مل رہی ہے‘ مولانا غلام رسول نے ”یوسف زلیخا“ میں لکھا ہے کہ زلیخا سے زیادہ اتنی بڑی خوش نصیبی‘ اتنی بڑی صاحبِ نصیبہ اور کون ہو سکتی ہے جب وہ مصر کے بازار میں‘ اس کہانی کے

---

[1] فرعون‘ قارون اور ہامان کی تشریح و تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل‘ زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ‘ لاہور‘ 2004‘ ص ص۔ 109 (فٹ نوٹ 1)‘ 124 (فٹ نوٹ 1 اور 2)

مطابق یوسف نیلام ہو رہا تھا' زلیخا کا یہ محبوب تھا' خوابوں میں آنے والا تھا' وہاں یہ لکھتے ہیں کہ یہ یوسف کو خریدنے کے لیے گئی تھی۔ پہلے بھی کبھی کبھی یہ شعر آتا ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے جہاں وہ کہتے ہیں' کہ سنیے:

جس نوں یار وکیندا لبھے تے قیمت ہووے پلے ❶

عجیب چیز کہہ گیا ہے!

جس نوں یار وکیندا لبھے تے قیمت ہووے پلّے
اس دے جیڈ نہ طالع کوئی اس دے بھاگ سولّے

یہ ''بھاگ سولے''❷ پنجابی ہی کہہ سکتا تھا' بڑا سستا سودا ہے' یار وکیندا لبھے' ❸ بکتا ہوا ''وہ'' بازار میں ملے اور جیب میں قیمت ہو اس سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں کہا گیا ہے کہ یار مل رہا ہے' قیمت کا سوال نہیں ہے: **بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ** (10:58)۔ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے' یہ کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ مفت دے رہا ہوں تمہیں' اسے تو صرف زلیخا خرید سکتی تھی کہ عزیزِ مصر کی بیوی تھی' اس کے پاس وہ خزانہ تھا۔ کہا کہ مفت لٹا رہا ہوں' او مفت دے رہا ہوں۔ کہا کہ کہیے یہ اس قابل ہے یا نہیں' کہ اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ **فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا** (10:58)۔ اوہ! اس پہ جشن مناؤ! او تمہیں پتہ بھی ہے کہ یہ کیا چیز ہے!! یہ دو لفظوں میں بتا دیا کہ **ھُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ** (10:58)۔ یہ ہر اس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔ یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر۔ تم اگر ساری دنیا کی دولتیں اور نعمتیں اکٹھی کر لو تو بھی یہ اس سے زیادہ بہتر چیز ہے اور مفت دے رہا ہوں۔ یہ Occasion (موقعہ) اس قابل کیوں ہے کہ اس پر جشن مناؤ اور سب جشن مناؤ کیونکہ **شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ** (2:185)۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ وہ قرآن ہے جو **ھُدًی لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡھُدٰی وَ الۡفُرۡقَانِ** (2:185)۔ تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور ابھری ہوتی ہے' اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ اس لیے جشن مسرت مناؤ۔

---

❶ جسے محبوب On Sale (بکتا ہوا) ملے اور اس کے پاس ادا کرنے کے لیے قیمت بھی موجود ہو۔
❷ تو اس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہو سکتا۔
❸ محبوب بکتا ہوا ملے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ الانبیاء** (آیات 51 تا 68)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ
التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٤﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ بَلْ
رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَتَاللّٰهِ
لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ
اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٨﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٩﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى
يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا
فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓي اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ
اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1976ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 51 سے ہو رہا ہے:(21:51)
پچھلے اتوار کو عید کی وجہ سے درس کا ناغہ رہا' آج صبح موسم کی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہوگئی لیکن بہرحال درس اب شروع کرتے ہیں۔
پیچھے سے بات چلی آ رہی تھی کہ یہ انقلابی پیغام کن کن ادوار میں سے گزرا ہے' اس سے متعلق پہلی آیت تھی: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ (21:48) ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو وہ ضابطۂ قوانین عطا کیا تھا جو صحیح اور غلط کو نکھار کر الگ الگ کر دینے والا ہے۔

لفظ رشد کا مفہوم اور مقامِ ابراہیمی

اب یہاں آج کے اس درس میں آگے یہ بات آتی ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ (21:51) ان سے بھی پہلے ابراہیم کو ہم نے رشد عطا فرمایا تھا اور ہم اس کی پوری سیرت' اس کے جتنے بھی اعمالِ حیات تھے' جو بھی اس کا پروگرام تھا' جو کچھ کارنامے اس نے سرانجام دیئے' ہمیں ان کا پورا پورا علم ہے۔ رشد قرآنِ کریم کی' ایک بڑی جامع اصطلاح ہے' ویسے تو یہ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (2:256) آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے (وحی کے ذریعے) صحیح اور غلط راستے واضح کر دیئے ہیں یعنی اس طرح یہ لفظ صحیح راستے کے لیے آتا ہے' اور غلط اور صحیح میں جو تمیز کرنے کی صلاحیت ہے' اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے' بنیادی طور پہ یہ صلاحیت تو خدا کی صلاحیت ہے' یہ اس کی صفت ہے' اسی لیے قرآنِ کریم نے خدا کو مرشد کہا ہے اور رشد اس کی طرف سے عطا کرنے والی چیز۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ رشد ملتا ہے جو حق اور باطل' جائز اور ناجائز' میں تمیز کرنے کی نگاہ عطا کر دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا ہے کہ اسے رشد عطا ہوا۔ قرآن کی رو سے انبیاء کرامؑ کے متعلق ہمارا یہ ایمان ہے کہ **لا نفرق بین احد من رسله** ان کے رسول ہونے کی صنف سے کسی میں تفریق نہیں کی جا سکتی کہ یہ رسول تھا اور وہ رسول نہیں تھا' اس میں تو ہم تفریق ہی نہیں کر سکتے' لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ہی نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (2:253) ان میں سے ایک کو دوسرے پہ اس کے منصب کے اعتبار سے کچھ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ فرائض کے اعتبار سے' پروگرام کی وسعتوں کے اعتبار سے' ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے۔ جس انداز سے قرآن نے ابراہیمؑ کا تذکرہ کیا ہے' اس کا بڑا ہی بلند مقام نظر آتا ہے۔ بلند کا لفظ بھی اصل میں ایسا جامع نہیں جو ان کی صحیح شخصیت کو منعکس کر سکے۔ میں یوں سمجھا کرتا ہوں جیسا ایک بزرگِ خاندان ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ملتِ ابراہیمیؑ کے اتباع کا خود حکم دیا ہے' وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ علیہ السلام (4:125) تو میں نے جو کہا تھا کہ وہ بزرگ خاندان نظر آتے ہیں۔ قرآن نے خود کہا ہے' کہ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ (22:78)۔ یہ وہی نظام ہے جسے تمہارے مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ کے ہاتھوں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ جو حجاز کے عرب یا قریش یا وہ سارے قبائل جن کو آپ اسماعیلی عرب کہہ سکتے ہیں اولیں مخاطب تھے' وہ ان کے جدِ امجد بھی تھے لیکن قرآنِ کریم نے یہ صرف انہی کے لیے نہیں کہا ہے' ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کا اتباع جو ہے وہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی کہا ہے' مخاطبین عرب کے لیے بھی کہا ہے' ہمیں بھی اس کی تلقین کی ہے' اور وہ اس لیے کہ قرآنِ کریم میں دو شخصیتیں ہی ہیں جن کی زندگی کو قرآن نے اسوہ حسنہ یا بہترین ماڈل کہ کر پیش کیا ہے۔ دو شخصیتیں: ایک حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' ایک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو اس اعتبار سے بھی آپ دیکھیے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا بلند مقام ہے۔ ایک خصوصیت نمایاں طور پہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی ہے کہ وہ غلط کو غلط کہتے تھے' دھڑلے سے کہتے تھے' جرأت سے کہتے تھے' بیباکی سے کہتے تھے۔ ان کی پیدائش اس گھرانے میں ہوئی کہ آج تو ہم بظاہر آزر کو

بت تراش کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جیسے وہ پتھر کی مورتیاں گھڑا کرتے تھے' زیادہ سے زیادہ انہیں ایک پجاری کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ان بتوں کے پجاری تھے۔ بات یہ نہیں ہے' ہمارے زمانے میں تو یہ پجاری' پادری' یہ ملا' اور شاید گاؤں والے تو جانتے ہیں کہ یہ مسجد کا ''ملوانہ'' جو ہوتا ہے' یہ جو مردم شماری کے رجسٹر میں' یا ویسے ہی رجسٹر کے اندر جو خانہ کمیوں کا ہوتا ہے' جسے کمی کہتے ہیں' یہ ایک مسجد کے ملا کو وہاں شمار کیا جاتا تھا۔ اور ہمارے ہاں تو گاؤں میں جب 'ویاہ'[1] شادی' میں وہ کمیوں کے جو لاگ[2] نکلتے تھے' ان کا بھی لاگ نکلتا تھا' یعنی ہمارے ہاں تو ان کا یہ مقام تھا۔ اسی طرح سے ہندوؤں کے ہاں مندروں کے پجاری پنڈت اور برہمن کا بھی کچھ ایسا ہی مقام ہو جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دَور میں مذہبی پیشوائیت کا مقام بلند

عزیزانِ من! دَورِ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو دور ہی عجیب تھا۔ ان کے ہاں وہ جسے آپ پروہت کہتے ہیں' وہ تو اس منصب کا ہیڈ پریسٹ (Head Priest سربراہ پروہت) ہوتا تھا۔ اس کا مقام تو بادشاہ سے بھی اوپر ہوتا تھا' یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی اس سے پوچھ کر چلنا پڑتا تھا۔ اس کا تو مقام اتنا بلند تھا۔ ہامان[3] کوئی چھوٹے اختیارات کا حامل انسان نہیں تھا' ان لوگوں کے جنود تھے' ان سے سلطنتیں کانپتی تھیں۔ اس میں کلیسا نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ دولت کے اعتبار سے بادشاہ ان کے مقروض ہوتے تھے' ان کے اختیارات کی وسعتوں کی یہ کیفیت تھی کہ جب تک یہ راجہ کے ماتھے پر تلک نہ لگا دیں' وہ گدی پہ نہیں بیٹھ سکتا تھا' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام[4] کے والد اس بلند مقام پہ تھے۔ یہ واقعی بہت بلند مقام ہے اور وہ مقامِ بلند حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو وراثت میں ملنے والا تھا۔ اس طرح شہزادہ ولی عہد اس کا تھا' جی وہ ہمارے ہاں تو پیر جی کے خلیفہ ہی اپنے غرور و تکبر اور عہدے کچھ کم نہیں ہوتے۔ یہ تو ولی عہد تھا شہزادہ تھا' بڑا مقام تھا۔

---

1. شادی
2. شادی بیاہ وغیرہ کے مواقع پر خدمت گاروں کو نیک شگون کے طور پر دی جانے والی رقم۔
3. مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ
4. توریت کے بیان کے مطابق نوحؑ کی آٹھویں پشت میں نحور پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے دادا تھے۔ توریت کے ہی بیان کے مطابق یہ سلسلہ یوں قائم ہوا تھا: حضرت نوحؑ ' سام' ارفکسد' سلح' عبر' فلج ' رعو' سروج' نحور' تارح' حضرت ابراہیمؑ۔ تاریخ کے اشارات کچھ یوں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا خاندان' کلدانیوں کے شہر اور میں آباد تھا۔ خود لفظ اُور کے معنی ''شہر یا بستی'' کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ توریت کے اُور سے مراد بابل وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ کلدانیوں (بابل) کا تمدن تاریخ کے اوراق پر اُبھرے ہوئے حروف میں نظر آتا ہے۔ توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے جس میں شنعار (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل درج ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بادشاہ وہی ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین بابل کے مینارہ پر کندہ ملے ہیں۔ اس قیاس کی رو سے حضرت ابراہیمؑ کے والد ایک بہت بڑے پجاری (آدار) تھے۔

پیغامِ خداوندی کی دعوت گھر سے شروع کی

قرآن اس مقام کی حامل شخصیت کی داستانِ حیات کو یہاں سے شروع کرتا ہے کہ گھر میں سب سے پہلے تو اس نے اپنے اس عہد جلیلہ پر فائز باپ سے کہا کہ یہ تم کیا کرتے رہتے ہو؟ تم صاحبِ اختیار وارادہ اور عقل وفہم کے مالک انسان ہو اور اپنے ہی ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے جھکتے ہو۔ اتنی بڑی تذلیلِ انسانیت کے مرتکب ہوتے ہو۔ یہ کچھ اس باپ سے کہا جا رہا ہے۔

کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت کروائے

عزیزانِ من! اسوہ حسنہ کی یہ پہلی چیز ہے۔ بعد میں مذہب والوں نے آ کر یا بڑوں نے چھوٹوں سے اپنی اطاعت لینے کے لیے وہ ایک مفروضہ گھڑ دیا کہ ماں باپ کی اطاعت یا بزرگوں کی اطاعت یا اسلاف کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ اطاعت کے تصور میں آپ اپنے اختیار وارادہ سے کچھ نہیں کر سکتے' وہ تو دوسروں کے احکامات کو ماننا ہوتا ہے۔ تو پہلی چیز جو اس اسوہ حسنہ میں ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے کہ کسی انسان کی یا کسی فرد کی اطاعت کی جائے' اطاعت حق کی اطاعت ہے' مگر یہاں باپ کہے تو اس کی اطاعت' اسلاف میں سے کوئی کہیں تو اس کی اطاعت۔ یہ ان کی اطاعت نہیں حق کی اطاعت ہے۔ اگر دیوآنند بھی یہ کہے کہ تم سچ بولا کرو تو یہ دیوآنند کے قول کی اطاعت نہیں ہے' یہ اس حق بات کی اطاعت ہے کہ سچ بولنا حق ہے' اور اگر باپ بھی یہ بات کہے کہ نہیں' جھوٹ بولا کرو تو یہ اس کی بھی اطاعت نہیں کیونکہ وہ باطل کی بات کہہ رہا ہے' تو اسوہ ابراہیمی علیہ السلام نے پہلا اصول تو یہ بیان کر دیا کہ اگر باپ بھی غلط راہ پہ ہو تو بیٹے کا حق ہے کہ اس کو روک دے۔ جہاں جہاں بھی یہ آیا ہے' حضرت ابراہیمؑ عجیب بڑے دبنگ انداز سے' دبدبے سے' یہ بات کہتے ہیں' کہ اپنے ہی ہاتھ کی مورتیوں کے آگے جھکنا تو بڑی تذلیل انسانیت ہے۔ وہ یہ بات دبے ہوئے انداز میں نہیں کہتے۔ باپ کہتا ہے کہ ابراہیم اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہیں نکال باہر کرونگا۔ یہ وہی ہے جسے آج آپ کہتے ہیں کہ عاق کر دونگا۔ تو وہ عاق کر دینا دراصل اس منصب جلیلہ سے محروم کر دینا تھا جس کے وہ وارث بن رہے تھے۔ یہ بہت بڑی دھمکی تھی' وہ مسکرا کر کہتے ہیں: ابا جان! بس یہی ہے آپ کے اختیار کی بات! کیا اتنے سے' میں حق کہنا چھوڑ دوں کہ اس منصب سے الگ کر دیا جاؤنگا؟ تم یہ کہو کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں' اس کا جواب دو۔ اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ آپ مجھے عاق کر دیں گے' دھونس اور دھاندلی سے تو باز نہیں آ سکتا۔ پہلی چیز ہے جو باپ کے خلاف آ رہی ہے۔

بھیڑوں کی مانند بغیر سوچے سمجھے ایک ہی طریق پر چلتے جانا انسانیت کی تذلیل

عزیزانِ من! حق وباطل کے اس سفرِ حیات میں آگے بڑھتے ہیں۔ اگلی چیز یہ ہے کہ جتنے بھی مندروں کے بڑے بڑے پروہت اور پجاری تھے' ان کا ایک جنود کہا گیا ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک لشکر ہوتا تھا۔ ان تمام سے' ایک ایک سے' جا کے' یہ للکار کر کہتے ہیں کہ تم کرتے

کیا ہو: کبھی کھڑے ہو کے سوچتے بھی ہو کہ پتھر کا ایک ٹکڑا' بالکل پتھر ہے۔ اس میں خود کچھ بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تم اسے جو جی چاہے بنا دیتے ہو۔ پہلے خود ہی تم اس کو ایک شکل دیتے ہو تو پھر اس کو کہتے ہو کہ یہ دیوتا ہے اور پھر اس دیوتا کے سامنے سجدے کرنے لگ جاتے ہو۔ کبھی کھڑے ہو کے سوچو تو سہی۔ لیکن انکا تو ایک ہی جواب ہوتا ہے اور وہ جواب ہر مذہب پرست کا جواب ہوتا ہے کہ ''ہم کچھ نہیں جانتے' ہمارے اسلاف کا یہ مسلک ہے' ہم اس پہ چلے آ رہے ہیں' بھیڑوں کی مانند بغیر سوچے سمجھے''۔

اسلاف کے مسلک پر تنقید کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہاں اسلاف کی بات آ گئی۔ حضرتِ ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ اگر وہ غلط راستے پہ چل رہے ہوں تو بھی تم ان کا راستہ اختیار کیے جاؤ گے؟ تمہیں خدا تعالیٰ نے اپنی بھی کوئی شد بد دی ہوئی ہے یا نہیں؟ یا تم بھی بھیڑیں واقع ہوئے ہو کہ پہلی بھیڑ جہاں چلی جا رہی ہے تم بھی ادھر ہی چلے جا رہے ہو؟ او کھڑے ہو کے سوچو' جو میں کہتا ہوں اس کا جواب دو۔ یہ جواب نہیں ہے کہ اسلاف کا مسلک ہے۔ برادران عزیز! اسلاف کے مسلک پر تنقید کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے' وہ پوری قوم سے' پورے معاشرے سے' کہتے ہیں کہ تم بھی کبھی کھڑے ہو کے سوچو۔ ہزاروں کی تعداد میں' انسان کی حیثیت سے' کھڑے ہو' سمجھتے ہو' سوچتے ہو' تو سمجھ سوچ کے بات کرو جو میں کہتا ہوں' حتیٰ کہ اس بات کے ساتھ آپ ﷺ بڑھتے بڑھتے بادشاہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس زمانے کا بادشاہ' ملوکیت کا مجسمہ تھا۔ یہ بات مذہب کی نہیں ہو رہی' یہ تو اس کی ملوکیت کے خلاف کچھ بات ہو رہی ہے۔

کج بحثی کی ایک مثال کا توڑ

عزیزانِ من! آپؑ اس کے سامنے جا کے کھڑے ہوئے کہ کیا ہیں تمہارے اختیارات جو تم انسانوں کو اپنا مطیع و طابع فرمان بناتے ہو' اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ پتھر کے گھڑے ہوئے بتوں کے سامنے جھک جاتے ہو جو خود پر بیٹھی مکھی بھی آپ نہیں اڑا سکتے؟ اب اس کے ساتھ دربار میں کھڑے ہوئے' باہم ایک دوسرے کے ساتھ مناظرہ ہو رہا ہے اور رشد کی کیفیت یہ تھی۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: تمہارا خدا کون ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا ہے' مارتا ہے۔ اس نے کہا: یہ اختیار تو مجھے بھی حاصل ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ شخص کج بحثی پہ آ گیا ہے اس نے فوراً ایہ کہنا تھا کہ یہ پھانسی پانے والا جو قیدی ہے' جسے دو گھنٹے کے بعد یا گھنٹے بھر کے بعد موت آ جانی ہے' میں اسے رہا کرتا ہوں' زندگی دیتا ہوں اور ادھر یہ چلتا پھرتا انسان ہے' کہہ دیتا ہوں ''اس کو قتل کر دو'' تو وہ تو اس زمانے میں ہر یہ چیز کی جا سکتی تھی۔ پھر کس زمانے میں یہ چیز نہیں کی جا سکتی۔ صرف بہروپ بدلا ہوا ہوتا ہے' الفاظ بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس نے وہ دلیل دی۔ سمجھ لیا! رشد یہ ہوتا ہے: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ (16:125) (تم اس وقت ان سے الجھو نہیں بلکہ) اپنے خدا کے راستے کی طرف' حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیتے چلے

جاؤ۔ یعنی قوانین خداوندی کی غرض و غایت اور اخلاقی اقدار کے منشاء و مقصود کو سامنے رکھتے ہوئے۔ مگر اس کے برعکس یہ کج بحثی پر اتر آئے ہیں۔ تم کبھی اس لائن پہ نہ جانا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ تم یہ کہتے ہو' چھوڑ و اس قصے کو' میں کہتا ہوں کہ میرا خدا اس سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' آپ اسے مغرب سے نکال کے بتا دیجیے بات ختم ہو گئی۔ اسے رشد کہتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ ٹکراؤ کہاں کہاں لیا جا رہا ہے: گھر سے بات شروع ہوتی ہے' بادشاہ تک جا پہنچتی ہے اور ہر مقام پہ اپنا مؤقف اس دھڑلے سے بیان کرتے ہیں۔ اور جہاں کہا ہے کہ تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں اسوہ حسنہ ہے' وہاں بھی یہی چیز ہے۔ کہا ہے کہ: **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ** (60:4) تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں' طرزِ عمل میں' بڑا ہی حسین ماڈل ہے۔

عزیزانِ من! سنیے! یہ جملہ کہاں کہا ہے' ابھی تو یہ فقرہ ختم بھی نہیں ہوا' یہاں صرف (Comma) وقفہ [1] ہے۔ آگے ہے کہ: **اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ** (60:4) جب انہوں نے اپنی پوری قوم کو مخاطب کر کے کہا تو اس میں بادشاہ' برہمن' پجاری اور یہ ارباب سارے ہی آ گئے۔ کہا کہ **اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (60:4) تم اور تمہارے یہ تمام معبود جنہیں تم خدا کو چھوڑ کے پوجتے ہو' میں ان سب سے سخت بیزار ہوں' **كَفَرْنَا بِكُمْ** (60:4) میں تمہارے اس غلط مسلک کا یکسر انکار کرتا ہوں۔ تمہارے اس مسلک سے سرکشی اختیار کرتا ہوں اور یاد رکھو کہ **وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا** (60:4) تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھلی عداوت ہے' کھلی ہوئی دشمنی ہے' کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ میں مقابلے میں آتا ہوں' تصادم ہے' تزاحم ہے' تمہارے ساتھ کوئی Compromise (مفاہمت و مصالحت) نہیں ہے۔ اور یاد رکھو! یہ دشمنی اور عداوت **بَدَا** (60:4) ہے یعنی میں چھپی چھپائی بات نہیں کرتا' بالکل کھلی ہوئی بات کرتا ہوں' ظاہر ہے اور نمایاں ہے۔ پوری قوم کو للکار کے ایک شخص کہہ رہا ہے کہ یہ **ابدًا** ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ سوال یہ تھا کہ کیا کسی طرح سے گنجائش بھی ہے کہ پھر آپس میں مل جائیں؟ کہنے لگے کہ ایک شرط ہے: **حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ** (60:4) بجز اس کے کہ تم بھی اس ایک خدائے واحد پر ایمان لے آؤ تو پھر یہ عداوتیں' یہ نفرتیں' یہ خصومت ختم ہو جائیں گی۔ ذاتی نہیں ہے' کوئی اور مفاد نہیں ہے۔ یہ وجہِ خصومت ہے۔ یہ کچھ ہو جائے گا۔ خصومت دور ہو جائے گی۔ اس دھڑلے اور جرأت سے یہ چیز کہی جا رہی ہے۔ اور یہاں وہ کہا ہے کہ ابراہیمؑ کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

قوموں کی تباہی کی وجہ جواز

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ایک کہنے والا تھا' بڑے ہی حکیمانہ انداز میں بات کہتا تھا کہ ''ملائمت ہونی چاہیے' مزاحمت ہونی

---

[1] علامتِ وقف (') جس کے ذریعے جملہ میں خیال کی روانی یا نحوی ساخت میں مختصر ترین وقفہ/سکتہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ وقفِ توضیحی کا ایک ٹکڑا یا چھوٹا حصہ ہوتا ہے جس کے ذریعے خیال میں روانی' گہرائی اور گیرائی پیدا کرنا مقصد ہوتا ہے۔

چاہیے''۔ اسوہ ابراہیمی علیہ السلام تو آپ کو یہ بتا رہا ہے کہ غلط روکو روکنا ہے' ٹوکنا ہے' لیکن اس کے لیے جو طریق آپ استعمال کیجئے' اس کی صورت حکیمانہ ہو۔ ذاتیات پر مبنی نہ ہو۔ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب غلط روکو کوئی ٹوکنے والا باقی نہ رہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایسے لوگ ہوتے نہیں ہیں جو غلطی کو غلطی نہیں سمجھ رہے۔ ایسے لوگ ناجائز کو ناجائز نہیں سمجھ رہے' ہوتے ہیں لیکن یہ جرأت نہیں کرتے کہ اس سے کہہ دیں کہ تم غلط کام کرتے ہو۔ اس کا نام رکھا جاتا ہے کہ صاحب! معاشرے کے اندر انسان کو حسنِ خلق سے پیش آنا چاہیے یعنی منافقت کا نام حسنِ خلق ہے۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ صاحب! یہ نہ کیا جائے: توں اپنی سنبھال' تینوں ہور نال کی۔ چل بھئی![1] حضرتِ ابراہیمؑ للکار کر کہتے ہیں کہ جب تک خدائے واحد پر ایمان نہیں لاتے' ہماری تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھلی عداوت ہے۔ یہ ان کے بلند کردار کا ایک رخ ہے' جسے میں نے ابھی عرض کیا ہے اور یہ ہے جہاں کہا ہے کہ سیرت ابراہیمی میں تمہارے لیے اسوہ ہے۔ چلیے ذرا' اب انہی آیات میں قرآن نے جو پیش کیا ہے اسے دیکھیے اور اسی حضرتِ ابراہیمؑ کے متعلق جو عقیدہ چلا آ رہا ہے پھر آگے اس کو بھی سنیئے' یعنی چیز وہ کہی ہے کہ بادشاہ کے سامنے بھی وہ لگی لپٹی نہیں رکھ رہا ہے۔ آپ کی شخصیت میں اتنی جرأت ہے کہ ہر بات کھلے انداز میں کہہ رہے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ (21:51) اور ہم نے (موسیٰؑ اور ہارونؑ سے بھی) پہلے ابراہیم علیہ السلام کو وہ سمجھ بوجھ عطا کر دی تھی جو اس کے منصب کے شایان شان اور فرائض کی سرانجام دہی کے لیے ضروری تھی جو اس کے سپرد کیے جا رہے تھے اور ہم اس کی حالت سے خوب واقف تھے۔

دین کے مقابلے میں اہل مذہب کا ایک دیرینہ جواب

اب سنیے بات' گھر سے شروع ہوتی ہے: **اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ** (21:52) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے یہ کہا کہ **مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ** (21:52) یہ کیا مورتیاں ہیں جس کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ گئے ہو' اور جن کے تم مجاور بن رہے ہو؟ ذرا عقل وبصیرت سے کام لو اور سوچو کہ تم بڑے ہو جنہوں نے انہیں بنایا ہے یا یہ مورتیاں بڑی ہیں؟ عزیزانِ من! بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ اس نے یہ سوال کیا ہے کہ یہ مورتیاں کیا ہیں' جن پر تم جمے بیٹھے ہو لیکن یہاں پر یہ لفظ ''**مَا هٰذِهٖ**'' ہے۔ اس لفظ کے معنی تنقید ہوتی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں' کہ ارے یہ کیا ہیں! یہ وہ چیز ہوتی ہے۔ جہاں یہ ماھذہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی بالآخر یہ ہیں کیا' ذرا سوچو تو سہی؟ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں: توں ہیں کیا[2]؟ کیا ہیں؟ یہ سوچو تو سہی! ہر مذہب پرست کے پاس دلیل کا جواب ہوتا ہی نہیں: **قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ** (21:53) انہوں نے کہا (ہم ان باتوں کو) کچھ نہیں جانتے۔ ہم نے

---

1. تو اپنے آپ کو دیکھ اور سنبھل' تجھے دوسروں سے کیا! خس کم جہاں پاک!!
2. تم کس باغ کی مولی ہو۔

اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا کہ وہ ان کی پرستش کیا کرتے تھے، ہم بھی کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ اس کو دہرایا ہے کہ جب بھی ان سے کہو کہ تم حق کی طرف کیوں نہیں آتے، تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمارے آباؤ اجداد کا مسلک ہے جس پہ ہم چلے آرہے ہیں اور اس کو ہم چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مذہب پرست طبقے کی طرف سے، یہ جواب حضرتِ نوحؑ سے شروع ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ کے عہد ہمایوں تک آجاتا ہے، قرآن میں موجود ہے اور وہاں سے پھر آج تک چلا آرہا ہے، اور جب تک دنیا کے اندر مذہب رہے گا یہی دلیل چلی آئے گی گو کہ یہاں دلیل کا تو نام لینا، دلیل کے لیے باعثِ شرم ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ یہی وہ دلیل ہے جو چلی آئے گی۔

زندوں سے نفرت بلکہ عناد اور مُردوں سے محبت

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اسلاف کا مسلک چلا آرہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اسلاف کے نام کے ساتھ (آگے یا پیچھے) کچھ لگایا اور ان کو خدا بنا کے رکھ دیا۔ ان لوگوں کے ہاں، یہ عجیب چیز ہے۔ ان کے ہاں کوئی ''زندہ'' ہوتا ہے تو روز اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، اس پہ اعتراض بھی کرتے ہیں، اس پہ فتوے بھی لگاتے ہیں، اور جب مر جاتا ہے تو رحمۃ اللہ علیہ ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کے نام کے ساتھ لفظ ''امام'' لگا دیتے ہیں۔ اب تو اس کے خلاف آپ کوئی ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اب وہ اسلاف میں داخل ہو گیا۔ قرآنِ کریم یہ چیز بار بار کہتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے کی بات ہے کہ ان سے کہا جاتا ہے کہ بابا! تم ذرا عقل و فکر سے کام لے کر اس کے متعلق فیصلہ کرو، اس کے خلاف کوئی دلیل ہے تو لاؤ۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111;27:64) ان سے کہو کہ ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر، علم و بصیرت کی رو سے بات کریں، اور اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کریں۔ حقائق کے فیصلے خوش آئند جذبات کی رو سے نہیں ہوا کرتے، علم و برہان سے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا جواب یہ ہے کہ نہیں صاحب! یہ اسلاف کا مسلک ہے، وہ ہمارے اتنے اتنے اسلاف، رحمۃ اللہ علیہ، بزرگ، امام، محدث اور مفکر، وہ بہتر سمجھتے تھے یا آپ قرآن کو بہتر سمجھتے ہیں؟ چل بھئی! بات ختم ہو گئی۔ خود ان کے متعلق تو یہ کہا اور وہ جو اپنے ہاں کے معتقدین کے جنود بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے کہا: دیکھتے ہیں کہ یہ فلاں بزرگ کی شان میں کیا بکواس کر رہا ہے، ان کی زبان گدی سے نکال دو، پکڑ کر انہیں چیر کے رکھ دو، اس بدتمیز کا۔ کیا بات کہہ رہے ہو؟ اگر فلاں کی شان میں کچھ کہہ دیا ہے تو، وہ چلے گئے اور بات ختم ہو گئی، لیکن اگر یہ کہہ دیا کہ صاحب! یہ بات جو آپ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں قرآن کے خلاف ہے۔ اب یا تو وہ بات انکی ہو نہیں سکتی اگر ہے تو پھر قرآن کریم کا فرمان ہے کہ: تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) وہ لوگ تھے جو یہاں سے چلے گئے، ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ وہ میرے لیے سند کیسے بن سکتے ہیں؟ تو بس اب آپ کی شامت آ گئی۔

شاید آنے والا دَور میری اس آواز کو قبول کرے

عزیزانِ عزیز! میرے لیے سند تو وہی کتاب ہے جس پہ ایمان لانے کے لیے میں مکلّف ہوں۔ سیدھی سی بات ہے۔ زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ عزیزانِ من! میری' آواز غنیمت ہے' محفوظ ہو رہی ہے جب تک یہ سلسلہ رہے گا میں یہ کام کرتا رہوں گا۔ آج کے دَور میں کوئی اس کو نہیں سنے گا ❶ مجھے اس سے غرض نہیں' نہ سنے' آنے والے دَور میں شاید کوئی ان چیزوں سے فائدہ اٹھالے۔ میں یہ عرض کرونگا کہ جب تک یہ ذہنیت نہیں بدلی جائے گی اس وقت تک آپ کبھی دین کے راستے پر نہیں آسکتے۔ وہ ذہنیت اسلاف پرستی ہے۔ آپ کے ہاں کی تمام روایتوں کی کتابیں' ساری کی ساری' کتب' تفسیریں' ان کے متعلق تمام فتوے' آج انہی اسلاف کی طرف منسوب ہیں۔ ان کے بعد پھر یہ اہلِ طریقت آتے ہیں۔ ان کا تو پوچھو ہی نہیں کہ کس طرح سے' ان کا وہ شجرہ چلتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسلاف پرستی کے اندر داخل ہوئیں۔ جب تک یہ قائم ہیں' آپ کبھی دینِ حق کے راستے پر آ نہیں سکتے۔

خدا کسی دوسرے کے متعلق ہم سے پوچھے گا ہی نہیں

عزیزانِ من! اپنے ان اسلاف کی تحقیر اور تنقید نہیں کر رہا۔ ان کا مقام صرف انسان کا مقام ہے۔ ٹھیک ہے وہ ہمارے جیسے انسان تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:141) وہ لوگ تھے جو یہاں سے چلے گئے۔ وہ جیسے بھی تھے' ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کس روش پر چلتے تھے اور کیسے کام کرتے تھے۔ تم سے تو یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کیے تھے۔ یہاں قرآن کہتا ہے۔ کہ تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ان کے اعمال کیا تھے۔ یہ لوگ تو اپنے اپنے وقت میں چلے گئے' اپنا اپنا اعمال نامہ اپنے ساتھ لے گئے' ہم تم سے یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا' ہم تم سے یہ پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ سوال تو ہم سے یہ ہوگا۔ یہ جواب کہ صاحب! انہوں نے یہ کیا تھا' اس لیے میں ان کی تقلید میں یہ کرتا چلا آ رہا ہوں' وہ کوئی جواب نہیں۔ یہاں تو آپ اس کا منہ بھی بند کر سکتے ہیں' عدالتِ خداوندی میں' تو قرآن کہتا ہے' ہم تم سے یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا' یہ سوال ہی نہیں کریں گے۔ یہاں ساری عمر مذہب کی اسی بحث میں گزر جاتی ہے کہ فلاں بزرگ نے کیا کہا' فلاں نے یہ کہا' دیکھیے صاحب! اس کی سند میں ان کا یہ قول نقل کرتا ہوں' ان کی کتاب میں یہ لکھا ہے۔ ہماری ساری عمر اسی میں گزر جاتی ہے کہ انہوں نے کیا کیا تھا اور اس کو دین کی بہت بڑی خدمت قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق خدا یہ کہتا ہے کہ ہم تم سے یہ

---

❶ اک صدا گونجتی رہتی ہے' کوئی زندہ ہے؟ میں کہے جاتا ہوں' ہاں ہے! کوئی سنتا ہی نہیں

سوال بھی نہیں کریں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ٹیسٹ کے اندر جو سوال آنے ہیں' ان کا تو ہمیں کوئی فکر نہیں۔ٹیسٹ سے باہر' جس کے متعلق وہ کہہ رہا ہے کہ صاحب! ہم پوچھیں گے ہی نہیں' آپ کی ساری عمرانہی مباحث میں گزر جاتی ہے' ان بحثوں میں' جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ہم سوال ہی نہیں کریں گے تم سے۔ تو اب جو پہلی چیز آتی ہے وہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں' جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھے ہو اور جن کے تم مجاور بن رہے ہو؟ ذرا عقل و بصیرت سے کام لو اور سوچو کہ تم بڑے ہو جنہوں نے انہیں بنایا ہے یا یہ مورتیاں بڑی ہیں؟ قرآن بتاتا ہے کہ: **قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ** (21:53) انہوں نے سامنے سے جواب میں کہا کہ (ہم ان باتوں کو کچھ نہیں جانتے) ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا کہ وہ ان کی پرستش کرتے تھے (ہم بھی ویسا ہی کرنے لگ گئے)۔وہ جس کی زندگی کو ہمارے لیے اسوہ قرار دیا' اسے سامنے سے یہ جواب ملتا ہے۔ **قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** (21:54) ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم بھی کھلی ہوئی گمراہی میں ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں تھے (جو اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ مورتیوں کے سامنے جھکتے تھے اور اس طرح شرفِ انسانیت کو خاک میں ملا دیتے تھے)۔اس طرح یہ تو بڑی ہی کھلی ہوئی گمراہی ہے' ضلال ہے اور ضلال مبین ہے۔ارے! ذرا بھی سوچو تو پتہ چل جائے کہ اپنے ہاتھ سے ہی پتھر گھڑ کے' اس کو معبود بنا دینا' پھر اس کی پرستش شروع کر دینا۔عزیزانِ من! مطمئن نہ ہو جایئے کہ صاحب! ہم تو اپنے ہاتھ سے کوئی معبود نہیں بناتے اور پھر اس کے سامنے نہیں جھکتے۔دراصل بدل کے بھیس زمانے میں' پھر سے آتے ہیں' وہی لات و منات۔ ❶

مغربی جمہوریت کے بت کی پوجا

عزیزانِ من! مغربی جمہوریت کے بت کدے میں یہی معبود ووٹنگ کے ذریعے سے پناہ لیتے ہیں۔کوئی اپنے ہاتھ سے اتنا بڑا پتھر نہیں تراشتے اور پھر آپ جس طرح اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں' یہ پرستش نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ''اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات۔ ❶ سب اپنے اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں' خاور کے ثوابت ہوں یا مغرب کے ہوں سیار' ❷ یہ سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہیں' اور اس زندانی کی بدترین شکل مغرب کی جمہوریت ہے' یعنی آپ ہی

---

❶ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر یوں ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں ... اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات (ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 60)

❷ ڈاکٹر محمد اقبال' مفکرِ قرآن کے یہ اشعار ''مہدیٔ برحق'' کے عنوان سے ''ضربِ کلیم'' میں یوں درج ہیں:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ... خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں ... نے جدّتِ گفتار ہے' نے جدّتِ کردار ہے

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ ... شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار (ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 67)

ایک دن پہلے انہیں ووٹ دے کر یہ کچھ کر لیتے ہیں' پھر آپ ہی یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ان کو پوچھتا کون تھا؟ انہیں کوئی نہیں پوچھتا تھا' آپ نے ہی تو یہ کچھ کیا ہے پھر ان سے یہ کہتے ہیں کہ:

تمہیں تو ''تم'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''جناب'' ہم نے بنایا' ''حضور'' ہم نے کیا

اب کیا ہے تو بھگتو۔مغربی جمہوریت کے بت کدے میں یہ جو چیز ہے۔

آخر کار سند خدا کی کتاب کو ہی ماننا ہوگا

عزیزانِ من! آج یہ ہے جو کچھ آپ کر رہے ہیں اور جو کچھ آپ مان رہے ہیں۔اس کے لیے آپ کے پاس دلیل اور سند خدا کی کتاب ہونی چاہیے۔عقل وفکر کی رو سے' دلیل سے' سند خدا کی کتاب ہی ہے۔آپ جیسے کچھ بناتے ہیں تو وہ جوہرِ ذاتی کی بناء پر ہی اس کو بناتے ہیں' لہٰذا جسے خدا کی صفات کہا جاتا ہے ہم پہلے خدا کی ان صفات کو مانتے ہیں پھر اسے خدا مانتے ہیں۔حضرت ابراہیم کا کہنا یہ تھا کہ **قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ** (21:55) انہوں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ جو کچھ آپ یہ کہہ رہے ہیں' کیا یہ سچ مچ کہہ رہے ہیں یا یونہی مذاق ہے؟ ایمانداری سے کہو کہ کیا آپ ہم سے Serious (سنجیدہ) ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔'' Are you serious? ❶ یعنی یہ چیز کہنا کہ تمہارے یہ دیوتا پتھر کے گھڑے ہوئے بت ہیں کچھ اور تو ہے ہی نہیں' اور پھر تمہارے آباؤ اجداد کا مسلک گمراہ کن تھا۔اس پر کہا کہ تم ہمیں اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو۔لو! ہم تم سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ یونہی ہنسی مذاق ہی ہو رہا ہے جیسا کہ جوانی کے زمانے میں شہزادے کیا کرتے ہیں۔یہ کوئی ایسی ہی بات نظر آتی ہے یا کیا واقعی تم Serious (سنجیدہ) ہو؟

بغیر کسی مسالے کے پوری کائنات کو وجود میں لانے والی ذات اور قوت

عزیزانِ من! ان کے اس انداز پر قرآن کریم نے کہا کہ **قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِىْ فَطَرَهُنَّ** (21:56) کہا کہ میں جو کہہ رہا ہوں' Seriously (سنجیدگی سے) کہہ رہا ہوں۔یہ **فَطَرَهُنَّ** (21: 56) عجیب چیز ہے کہ ''رب'' وہ ہوسکتا ہے جو پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں' سب کچھ کو اور دوسری چیز یہ کہ اس کے بعد وہ پتھر جن کو تم نے گھڑ کے یہ بنایا' یہ سارا کچھ اور پھر تم سب کو بغیر پہلے کسی مسالے کے عدم سے وجود میں لے کر آیا ہے۔ ''رب'' ہونا اس کو زیب دیتا ہے۔یہ معبود بڑی عجیب چیز ہے۔**فطرھن** نے یہاں یہ بات کہدی کہ صاحب! وہ اس شے کو وجود میں لے آیا جو پہلے کچھ نہ تھی' اس کے لیے کوئی میٹریل پہلے نہ تھا اور وہ اسے وجود میں لے آیا۔یہ **فطرھن** ہے۔یہ ہے جسے غالب کہا جاتا ہے۔کہنے لگا بتاؤ تو سہی' تم یا میرے ابا جان'

---

❶ کیا آپ سنجیدہ ہیں؟

اتنے بڑے جو بنے پھرتے ہو اگر یہ پتھر موجود نہ ہوتا تو تمہارے یہ خدا کہاں سے آتے‘ یہ معبود اپنی اس ہئیت کے لیے اس پتھر کے ایک ٹکڑے کے محتاج تھے‘ جو پہلے موجود تھا۔ اگر پہلے وہ موجود نہ ہوتا تو یہ موجود ہی نہ ہوتے۔ تم بھی انہیں نہ بنا سکتے‘ تم بھی مجبور تھے‘ کسی کو خدا بنانے کے لیے پہلے سے کچھ ہونا چاہیے۔ اور ’’رب‘‘ وہ ہوسکتا ہے کہ جو اپنی تخلیق میں کسی شے کا محتاج نہ ہو۔ یہاں اسی لیے قرآن **فطرھن** لایا ہے۔ تم نے جو کہا ہے‘ اس کی دلیل یہ لائے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد اس قسم کی چیز مانتے چلے آ رہے تھے‘ ہم بھی مانتے چلے آ رہے ہیں۔ تو یہ بتاؤ کہ اگر یہ پتھر کا ٹکڑا نہ ہوتا تو تم معبود کہاں سے لاتے؟

میرا علیٰ وجہ البصیرت رب کو رب ماننا شہادت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ تم میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ میرا دعویٰ ایمان علی وجہ البصیرت ہے۔ تمہارے پاس‘ تمہارے مسلک کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمہارے آباء واجداد ایسا کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن **وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ** (21:56) میں اپنے اس دعوے پر خود گواہ ہوں اور اس طرح خود مشاہدے کی بنا پہ یہ بات کہہ رہا ہوں‘ سنی سنائی بات نہیں کہہ رہا‘ تقلیداً انہیں کہہ رہا‘ آباؤ اجداد کا مسلک نہیں بیان کر رہا‘ یہ تو **الشّٰھدین** ہے۔ اپنی شہادت کی بنا پر ہے۔ اور جس قسم کی شہادت چاہو‘ پیش کر سکتا ہوں۔ سوچو کہ کس کی شہادت زیادہ قابلِ اعتماد ہوسکتی ہے؟ عزیزانِ من! ایک شہادت ہم بھی دیتے ہیں کہ **اشھد ان لا الہ الا اللہ** کہہ دیا۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ کبھی آپ نے اس پر سوچا بھی ہے؟ یہ الفاظ اب تو ہماری زبانوں پہ بھی نہیں آتے‘ صرف اذان میں آتے ہیں اور وہ بھی ان کا لہجہ کچھ ایسا بگڑا ہوا سا ہوتا ہے: یعنی وہاں تلفظ بھی ہمارے سامنے صحیح نہیں آتا۔ ورنہ آپ سوچیے تو سہی کہ کسی عدالت میں کھڑے ہو کے جب یہ کہیں کہ میں اس کی شہادت دیتا ہوں‘ تو کتنی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ذرا سا بھی اس میں نقص نکل آئے اور یہ پتہ چلے کہ آپ کے ذاتی علم میں نہیں ہے تو خود آپ مجرم قرار پا جاتے ہیں۔ اس کے لیے شہادت یہ چیز ہے۔ شہادت کے لیے آپ کے ہاں Evidence Act (قانونِ شہادت) بنایا ہوا ہے۔ آپ کہیں جا کر کوئی بات کہیں کہ صاحب! میں نے تو نہیں دیکھا‘ میں نے سنا ہے کہ سارے یہ کہہ رہے تھے‘ آپ کو اسی وقت باہر نکال دیا جاتا ہے کہ یہ شہادت نہیں ہے۔ شاہد تو کہتے ہی اس کو ہیں جو خود کسی چیز کو دیکھے‘ جس کا براہِ راست اس کو علم ہو۔ شہادت اس چیز کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اب تو ہمیں روزمرہ کی زندگی میں **اشھدوا ان اللہ** کے الفاظ بھی نصیب نہیں ہوتے‘ کبھی کبھی جنازے میں یہ الفاظ آ جاتے ہیں۔ اب اس جنازے میں بھی آپ دیکھیے گا کہ ابھی کوئی پرانے زمانے کا بوڑھا ساتھ چلا جا رہا ہو تو وہ کہتا ہے: کلمہ شہادت‘ ورنہ پیچھے سے کوئی آواز بھی نہیں آتی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جب الفاظ اپنا صحیح مفہوم کھو دیتے ہیں تو پھر وہ کچھ اور بن جاتے ہیں‘ ورنہ یہی چیز جو تھی کہ **اشھد ان لا الہ الا اللہ** میں اپنے دعوے کی شہادت خود دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی محکومیت نہیں ہے اور یہ سب یوں ہے کہ علی وجہ البصیرت اپنے

مشاہدے کی بنا پہ اعلان کرتا ہوں کہ یہاں سوائے خدا کے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ مذہب کی دنیا میں یہی ہوسکتا تھا کہ ان کے ہاں کے جو بانیانِ مذاہب تھے انہوں نے انہیں اپنا معبود بنالیا تھا۔ ہر ایک کو الوہیت کا درجہ دیدیا تھا۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ اس میں اس قدر تاکید اور احتیاط برتی گئی کہ ایک سانس میں کہا کہ **اشھد ان لا الہ الا اللہ** کوئی صاحبِ اقتدار اور اختیار نہیں سوائے خدا کے اور اسی سانس میں کہا: حتیٰ کہ محمد ﷺ جس کو باقی دنیا والے مقامِ الوہیت پہ ضرور پہنچا دیتے' میں اس کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ **اشھد ان محمدًا عبدہ و رسولہ** محمد جیسی ہستی بھی اس کا غلام' اس کا بندہ' ایک پیغامبر ہے۔ عزیزانِ من! یہ شہادت ہے۔ کون مدعیِ ایمان' مائی کا لال' چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے آج یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں' الہ تو پوچھیے نہیں کہ ہم نے کون کون سے تراش رکھے ہیں: اس اقبال کو وہاں حرم میں خدا کے گھر نہ جانے دینا' ذرا اس کی آستیں جھاڑ کے دیکھو کہ یہ حریمِ کعبہ میں کتنے خدا چھپا کے ساتھ لایا ہوا ہے۔ باقی رہی دوسری شہادت کہ محمد ﷺ بھی خدا کے عبد ہیں' صرف اس کے پیغامبر تھے' تو اس کے لیے بھی سنیے کہ اب تو مذہب میں بھی یہی کچھ ہونے لگا ہے۔ پہلے تو خیر مجلسوں میں ہوتا تھا' اب تو اعلانیہ مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکروں پہ ہو رہا ہے کہ

وہی جو مصطفوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

سوچیے' کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی!

مذہب انسانی سوچ اور فکر کو مغلوب کر دیتا ہے

عزیزانِ من! یہ کچھ اس قانونِ شہادت کیساتھ ہے۔ اذان میں بھی **اشھد ان محمدًا عبدہ و رسولہ** کہتے ہیں یعنی **اشھد ان لا الہ الا اللہ** کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کہا کہ **وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکُمْ مِّنَ الشّٰھِدِیْنَ** (21: 56)۔ میں اپنے اس دعوے پر خود گواہ ہوں اور جس قسم کی محکم شہادت چاہو' پیش کرسکتا ہوں۔ یہ وہی کچھ ہے۔ جسے [1] آپ There eye witness (چشم دید شہادت) کہتے ہیں۔ صحیح الفاظ ہیں۔ یہ اب رہے' یہ جنہیں تم اتنے بڑے اختیارات اور اقتدارات کا مالک سمجھتے ہو' یہ تمہارے پتھر کے بت ہیں۔ ان کے متعلق دلائل سے کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ لہٰذا اب ذرا ایک اور طریقہ اختیار کیا جائے گا جس سے شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے۔ بات تو یہی سمجھانی تھی کہ یہ بے اختیار ہیں' محتاج ہیں' ان میں کچھ بھی اختیار نہیں' ایک چیونٹی میں بھی اتنی صلاحیت اور قوت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی مزاحمت کرے تو اور کچھ نہ کرے تو بھی وہ چیونٹی ذرا سا تو کاٹ لیتی ہے' سامنے سے کچھ تو مزاحمت کرتی ہے۔ کہا ذرا دیکھنا تو سہی جنہیں تم خدائی اختیارات کے مالک سمجھے بیٹھے ہو' ذرا دیکھنا تو سہی' ان کے

---

[1] ان کا چشم دید گواہ

اقتدارات اور اختیارات کی کیفیت یہ ہے۔ دلائل میں نے دیئے تو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں۔ ٹھیک ہے' سونیار دی اک ہن لوہار دی وی دیکھو۔ اس دن تہانوں پتہ چلے گا جس دن مشاہدہ کرلوگے اس گل دا ❷۔ یہ ہے نا شہادت۔ آؤ' اب مشاہدے پہ آؤ۔ کہا کہ تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ جو شخص ان بتوں کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی کرے' یہ اسے تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمہارا یہ عقیدہ کسی قدر غلط ہے' اور تمہارے یہ معبود کس قدر بے بس ہیں' کہا کہ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (21:57) میں تمہارے چلے جانے کے بعد' انہیں ٹھکانے لگا دوں گا۔ پھر تم دیکھ لینا کہ میں تمہارے ان مٹی کے معبودوں کا کیا حشر کرتا ہوں' اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بت کس قوت کے مالک ہیں! یہ جو بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (21:57) ہے یعنی تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہ اس لیے ہے کہ اگر میں تمہاری موجودگی میں ان پر ہاتھ اٹھایا تو تم ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوگے اور پھر لوگوں کو یہ کہہ کر فریب میں مبتلا کر دو گے کہ یہ شخص تمہارے معبودوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہاری عدم موجودگی میں معاملہ میرے اور ان بتوں کے مابین ہوگا اور یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں خود اپنی حفاظت کی قوت بھی نہیں۔ یہی تمہارے یہاں کے چلے جانے کے بعد کرنے میں حکمت اور رشد ہے جی! وہ چاروں طرف سے سیلاب آیا' تباہیاں مچ گئیں' شہر الٹ گئے قلعوں تک کو اس نے مسمار کر دیا' بڑے بڑے پختہ محلات باقی نہ رہے' مگر حضرت صاحب کے مزار کو کوئی گزند نہیں آیا۔ اس لیے کہ اس کو بچانے کے لیے پوری فوج کی فوج متعین تھی' اور یہ کہہ دیا کہ یہ حضرت صاحب کی کرامت ہوگئی ہے۔ اس لیے کہا کہ تم نہ ان کی مدد کو آؤ' پھر دیکھو کہ ان میں ایسی قوت ہے کہ یہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

تنہا علیحدگی میں اِن خداؤں کا خدا کے بندے سے مقابلہ

عزیزانِ من! اس بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (21:57) میں یہ حکمت اور رشد پوشیدہ ہے کہ اگر تم یہاں ہوئے تو مجھے پتہ ہے' میں تم میں اکیلا ہوں۔ تم مجھے روک دو گے اور بعد میں یہ ہوگا کہ دیکھا صاحب! بہت دھڑلے سے دعویٰ کیا تھا کہ "دیکھو' میں کیا کرتا ہوں کہ اب آؤ دیکھو' سب اسی طرح سے صحیح سلامت موجود ہے۔ یہیں ختم ہوگیا۔ کہا: مجھے تمہاری یہ دلیل بھی قبول نہیں۔ تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ' ان خداؤں کا اب خدا کے اس بندے کے ساتھ مقابلہ ہونے دو' پھر آ کے مشاہدہ کرنا کہ ہوتا کیا ہے۔ عزیزانِ من! انہوں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تو مذاق ہی کر رہا ہے۔ بہرحال' درمیان میں جو کچھ ہوا قرآن تو اس ساری تفصیل کی کڑیاں نہیں دیتا۔ یہ ہمارے Imagination (تخیل وتصور) پہ بھی کچھ چھوڑ دیتا ہے۔ پھر آگے قرآن نے کہا کہ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ

---

❶ سوسنار کی' ایک لوہار کی۔ اس بات کا تمہیں اس دن پتہ چلے گا جس دن تم خود اس کا مشاہدہ کرو گے۔

اِلَیۡهِ یَرۡجِعُوۡنَ ❶ (21:58) ابراہیم علیہ السلام نے موقع پایا' مندر میں جو' ان کے چھوٹے چھوٹے بت تھے' ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے' مگر ان کے ہاں جو سب سے بڑا بت بر ہما تھا' اس کو چھوڑ دیا۔ اسے بھی ایک مصلحت کے تابع چھوڑا کہ لَعَلَّهُمۡ اِلَیۡهِ یَرۡجِعُوۡنَ ❷ (21:58) وہاں کوئی ان کا خدا بھی سامنے ہونا چاہیے جس کے متعلق میں یہ کہوں کہ صاحب! ذرا اس خدا سے تو پوچھ لو' یہ تو ثابت و سالم موجود ہے' اور سب سے بڑا بھی ہے' اسی سے پوچھو تو سہی کہ یہ کس نے کیا؟ کیوں تم مٹی کے مادھو بنے بیٹھے ہوئے چپ رہے؟ کیا تم سے بھی کچھ نہ ہو سکا؟ اس لیے انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب لوگ معبد میں آئے تو اپنے معبودوں کا یہ حشر دیکھا: قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ (21:59)۔ کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ کس نے کیا؟ جس کسی نے بھی کیا ہے' وہ بڑا ہی ظالم اور سرکش ہے۔ عزیزانِ من! ذرا داستاں کی پچھلی کڑی کو ساتھ ملا لیجیے کہ انہوں نے اعلانیہ ان پروہتوں سے کہہ دیا تھا کہ وَتَاللّٰهِ لَاَكِیۡدَنَّ اَصۡنَامَكُمۡ بَعۡدَ اَنۡ تُوَلُّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ (21:57) جسے ہم خدا کی قسم کہتے ہیں وہ ہے تاللہ۔ یعنی پختہ طور پہ ان سے کہا تھا کہ یاد رکھو' تم یہاں نہیں ہو گے تو میں دیکھوں گا کہ تمہارے ان بتوں کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ تو ان کو تو یہ علم تھا۔ انہوں نے ہی کہا تھا' یہ کچھ ہوا ان کے علم میں تھا۔ اب اس کے بعد یہ قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ هٰذَا (21:59) آیا ہے۔ ❸ یہ کیا بات ہوئی؟ اگر یہ بچاری بتا دیں کہ اس نوجوان نے ان کے سامنے ان کو للکارا تھا۔ تو قوم ان کا گلا دبا دے گی کہ تم سے کیوں ان کی حفاظت کا انتظام ہی نہ ہو سکتا؟ وہ تمہیں للکار کے چلا گیا تھا کہ میں یہ کچھ کرونگا تو تم کہاں تھے؟ پھر یہ کیا کرتے؟ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ یہ ہے پروہت پن! کہ کہاں ہے وہ؟ کون کر گیا ہے یہ؟ بھئی کس نے کر دیا؟ یہ پکڑو' مارو' دیکھو بھئی یہ کون کر گیا؟ جی' ایک ہی آیت ہے جو بتا رہی ہے کہ وہ للکارتے گئے' کون کر گیا ہے؟ یہ کون کر گیا ہے؟ دہائی مچا دی کہ بڑی زیادتی کی ہے۔ لوگوں میں مشہور کر دیا کہ ذرا پتہ دینا' دیکھنا' کون کر گیا؟ اصل یہ ہے کہ معبد کے بچاریوں کو اس کا علم تھا لیکن انہوں نے دانستہ بات کو چھپایا کیونکہ اگر وہ یہ بتا دیتے کہ ابراہیمؑ نے ان سے یہ کچھ پہلے ہی کہہ دیا تھا تو عوام ان کے پیچھے پڑ جاتے کہ جب تمہیں اس کا علم ہو چکا تھا تو تم نے ان کی حفاظت کی طرف سے غفلت کیوں برتی؟ اس لیے وہ خاموش رہے لیکن قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًی یَّذۡكُرُهُمۡ یُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِیۡمُ (21:60) ❹ عوام نے یہ چیز کہی کہ یہ تو

---

❶ چنانچہ ابراہیم نے تنہائی میں' ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بت' جو ان میں سب سے بڑا تھا' چھوڑ دیا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں (یعنی ان سے کہا جا سکے کہ یہ تمہارا سب سے بڑا ''معبود'' موجود تھا' اس سے پوچھو کہ یہ کیا ہوا ہے اور اس کی موجودگی میں کیسے ہوا ہے؟ اگر اس بت کو بھی توڑ دیا جاتا تو اس دلیل و حجت کی گنجائش نہ رہتی۔)

❷ تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

❸ انہوں نے کہا کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ کس نے کیا؟

❹ عوام (میں سے بعض نے) کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو' جسے ابراہیم کہہ کر پکارتے ہیں' ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے سنا ہے (شاید یہ اسی کی حرکت ہو۔)

ہم بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس نے کر دیا ہے۔ یہاں ایک نوجوان چلتا پھرتا ہے۔ وہ بتوں کی شان میں اس قسم کی کچھ گستاخیاں کیا کرتا ہے' شاید اس نے یہ کچھ کیا ہو۔ اب یہ جو مجرم تھے' جو حفاظت نہ کر سکے تھے' انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے کہا ہے کہ میں ان کے ساتھ یہ کچھ کرونگا' اب وہ مجرموں کے ٹولے سے نکل کر عدالت کی کرسی پہ بیٹھ گئے: **قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ** (21:61) انہوں نے کہا کہ اس شخص کو' ملزم کی حیثیت سے بلاؤ' ہمارے حضور کھڑا کرو' اسے ان لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ یہ اس ملزم کے سامنے اس بات کی گواہی دیں۔ یعنی اب جو چور ہیں وہ معصوم ہو کے بیٹھ گئے' یہ عدالت ہو رہی ہے کہ لاؤ' لوگ اس کے خلاف شہادت دیں' ملزم قرار دیں۔

قرآنی حقائق باور کروانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے طریقِ کار کی بلاغت

عزیزانِ من! اب ذرا جگر تھام کے بیٹھیے' بڑا نازک مقام آرہا ہے۔ وہ نازک مقام کہ جس ذاتِ اقدس کی زندگی کو' قرآنِ کریم' خدا تعالیٰ اسوہ حسنہ قرار دے رہا ہے' اس کے متعلق ہم نے کیا کیا؟ پہلے یہ سن لیجیے کہ یہاں کیا بات آئی؟ **قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ** (21:62) انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: اے ابراہیمؑ! کیا تو نے یہ کچھ ہمارے بتوں کے خلاف کیا ہے؟ کہو! تم اس الزام کے جواب میں کیا کہنا چاہتے ہو؟ فردِ جرم عائد کر دی۔ فیصلہ سنانے سے پہلے ملزم سے' ابراہیمؑ سے' پوچھا گیا کہ کیا ہمارے ان معبودوں کے ساتھ یہ کچھ تم نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً ہی یہ نہیں کہا کہ چورو! میں تو تم سے یہ کچھ کہہ گیا تھا تو وہ ایک دم اودھم مچا کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتے۔ اور اس بات پر عوام ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ یہ پیچ کا معاملہ تھا جس کے لیے یہ سارا کچھ' پتھر کی مورتیوں کو پتھر کی مورتیاں ثابت کرنے کے لیے بتایا گیا تھا۔ بیچ میں سے یہ بات نکل جاتی۔ رشد اس کو کہتے ہیں۔ میں' پہلے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو یہ صحیح جواب ہے' اسے پیش کرتا ہوں' پھر میں عرض کرونگا جو میں نے کہا تھا کہ یہ ذرا نازک مقام آرہا ہے۔ **قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ** (21:63) عزیزانِ من! یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ اس میں عربی زبان کا ہی اسلوب اختیار کیا ہوا ہے۔ عرب اتنے فصیح البیان اور ذکی الفہم تھے کہ معاملوں کے اندر' زبان کے اندر' استعارہ' اشارہ' کنایہ' تشبیہ' کی یہ چیزیں ان کے ہاں عام تھیں اور ایک عام انداز وہ تھا کہ جس بات کو وہ سمجھتے تھے کہ دوسرا خود سمجھ جائے گا' یہ اس کو حذف کر دیتے تھے' یعنی اپنے ہاں کے لوگوں کے ذہن وفہم کے متعلق بھی ان کا صحیح گمان تھا کہ مثلاً جتنی بات ہم سمجھیں کہ یہ فریق مقابل کی ذہنی سطح ہے تو وہ اسے اتنے سے ہی سمجھ جائے گا۔ اگر اور زیادہ تفصیل سے سمجھائیں تو واقعی اس کی سبکی ہوتی ہے۔ او پھر کہندا' مینوں ایناں وی پتہ نئیں ہیگا۔ اگلی گل کر۔ ❶ انہوں نے اپنے ہاں' یہ انداز اپنایا تھا' اور چونکہ وہ زیادہ تو شعر کی زبان میں بات کرتے تھے' شعر میں تو ویسے ہی بہت سی چیزیں حذف کی جاتی ہیں' مثلاً'

---

❶ تو پھر وہ کہتا ہے کہ کیا مجھے اتنا بھی علم نہیں! اگلی بات کرو۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی

اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے ❶

اس شعر میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ ''اوجیہڑ یاں جتیاں پیاں ❷ ناں، اونہاں دا کوئی لفظ نئیں اوتھے کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ ان کے ذہن کی رسائی ہے۔ اگر وہ ساتھ یہ بھی کہے اور پھر اس کے اندر یہ بھی کہے کہ مری جو شامت آئی، اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے''، تو اس سے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بھئی! یہ کونسی کوئی ایسی بات ہوگئی۔ لیکن وہ جو ''شامت آئی'' کہہ گیا ہے تو اسی شعر میں سارا قصہ آجاتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں یہ چیز بھی بڑی بلاغت پر پہنچی ہوئی تھی۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ ان کے ہاں بیان میں یہ چیز پھر ایسے آتی ہے۔ سنیے! کیا آتی ہے! عام زبان میں وہ چیز یوں آتی ہے: **قال بل فعله من فعله** او! جس نے کیا، تم اس بات کو تو چھوڑو کہ یہ کس نے کیا۔ جس نے بھی کیا، اگلی بات پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ کیا کیا ہے؟ یہ بعد میں فیصلہ کریں گے کہ کس نے کیا؟ جس نے بھی کیا یہ بتاؤ کہ کیا کیا؟ بالکل ہمارے ہاں بھی یہ چیز ہے کہ اس بات کو ذرا تم چھوڑ و ایک منٹ کے لیے ٹھہر جاؤ، کہ وہ کس نے کیا؟ جس نے بھی کیا، یہ بتاؤ کہ کیا کیا؟ وہ ایسے مقام پہ یہ کہتے ہیں کہ **بل فعله من فعله**. یعنی ٹھیک ہے بھئی! یہ بعد میں طے کریں گے کہ یہ کس نے کیا؟ جس نے کیا، جس نے بھی کیا: کیا، کیا ہے؟ **كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ** (21:63) ان میں سب سے بڑا ثابت و سالم تو یہ کھڑا ہے، اسی سے پوچھ لو۔ اگر یہ جواب دیا کرتے تھے کیونکہ تمہارا دعویٰ یہ تھا اور تم جہلا کو ساری عمر یہ کہتے رہے کہ یہ ہمیں غیب کی خبریں بتادیا کرتے ہیں، جو کچھ تم ہم سے پوچھتے ہو، ہم ان سے پوچھتے ہیں اور یہ ہر بات کا جواب دیتے ہیں، جو یہ جواب دیتے ہیں، ہم وہی جواب تم تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لیے اس بڑے سے پوچھ لو۔

اس سلطانی گواہ سے ہی پوچھ لو

تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ بت جواب دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو یہ تو خیر ٹوٹ چکے، صحیح جواب نہ دیں، یہ جو سب سے بڑا کھڑا ہے، یہ تو ثابت و سالم ہے۔ اس سے ہی پوچھو۔ اگر یہ جواب دیا کرتا تھا تو اس سے پوچھو کہ کس نے توڑا ہے؟ یہ ہے رشد، یہ ہے حکمت، یہ ہے اصلیت: چھوڑو اس قصے کو کہ کس نے کیا ہے؟ اندر سے تمہیں بھی معلوم ہے اور مجھے تو خیر پتہ ہی ہے، تمہیں بھی پتہ ہے ان کے سامنے کچھ بنتے ہو، میں بھی یوں تمہاری یہ چال نہیں چلنے دونگا کہ تم اس کا رُخ موڑ دو، دوسری طرف کردو۔ میں نے تو یہ بات کہنی تھی کہ تمہارا جو یہ دعویٰ ہے کہ یہ بت ہم سے باتیں کیا کرتے ہیں، تمہارے سوالات کا جواب دیا کرتے ہیں، تم کہتے ہو، جواب دیا کرتے ہیں، تمہارا یہ

---

❶ غالب، مرزا اسد اللہ خاں: دیوانِ غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، 2002، ص۔ 203

❷ وہ جو وہاں جوتے پڑے تھے، ان کا ایک لفظ تک نہیں کہا گیا۔

جوسب سے بڑا ہے' وہ سب سے بڑا ہی جواب دیا کرتا ہوگا۔ یہ موجود ہے' پوچھو اس سے اور یہ بات بھی کوئی چھوٹی نہیں ہوئی جو تم کہہ دو کہ نہیں صاحب! وہ سمجھتا ہے کہ یہ بات درخور اعتنا نہیں کہ میں اس کا بھی جواب دوں۔ یہ جواب دے کہ اس کے سامنے یہ ان کا سارا کچھ تباہ ہو گیا' یہ جتنے بھی رفقا تھے' ان کا یہ کنبہ' وہ سب تہس نہس ہو گیا' یہ بیٹھا ہے' پہلے تو یہ دیکھتا ہی رہا' اس کے اختیار کا یہ عالم ہے۔ **قال بل فعله من فعله** . یعنی چھوڑو کس نے کیا او جس نے بھی کیا اس سے تو پوچھو کہ یہ بیٹھا ہوا کیا دیکھتا رہا تھا' چلیے جی! وہ چھوٹے چھوٹے تھے' ان میں تو اتنی قوت نہیں تھی' یہ تو مہابت ہے سب سے بڑا بہادر تھا' یہ بھی دیکھتا رہا' اس کرنے والے کا منہ تکتا رہا' عزیزانِ من! آپ دیکھیے اگر کرنے والے کی بات پہلے کہہ دیتا تو یہ بات کوئی آگے نہ چلتی' اس کے اندر عجیب حسن ہے اور اگلی بات یہ ہے کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ باتوں کا جواب دیا کرتے ہیں: اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (21:63) ساری بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعی باتوں کا جواب دیا کرتے ہیں تو ان سے پوچھ کے دیکھ لو' مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ عزیزانِ من! یہ ہیں الفاظ قرآن کے۔

حضرت ابراہیمؑ کے سامنے مذہبی پیشوائیت کی شرمندگی

بات تو یہ اتنی سی ہوئی' لیکن یہ بات اگلے کو لاجواب کر دینے والی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے ان سوالات نے پجاریوں کی پوزیشن عجیب کر دی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ **فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ** (24:64)۔ وہ **مجمع** سے الگ ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ سچ تو یہ ہے کہ زیادتی ہم سے ہی ہو گئی ہے۔ یعنی اسے دوسرے الفاظ میں آج کے انداز میں یوں سمجھو کہ وہ ادھر سے ہٹ کے اپنے چیمبر میں چلے گئے اور آپس میں انہوں نے کہا کہ بڑی غلط چال چلی ہے' وہ ہم کو کہتے تھے کہ اس کو مجرم قرار دیدیں' اس نے تو ہم کو ان عوام کے سامنے اکٹھا کر لیا' جن کے سامنے ہم ساری عمر یہ دعوے کر کے اپنے آپ کو بھی منواتے رہے' ان کو بھی منواتے رہے کہ یہ باتوں کا جواب دیدیتے ہیں' اسنے تو وہ بات کہہ دی ہے کہ یہ سارا بھانڈہ ہی پھوٹ گیا' لٹیا ہی ڈبو دی۔ انہوں نے کہا کہ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (21:64) یہ زیادتی تو ہم سے ہی ہو گئی' کیا کر بیٹھے یہ؟ پھنس گئے۔ وہ کہتا ہے کہ پوچھو اگر یہ جواب دیتے ہیں' لوگ سامنے کھڑے ہیں۔ عزیزانِ من! بات ہوئی کرنے کی! وہ حقیقت کے قائل تو ہو گئے لیکن پیشوائیت کی مسندیں کھلے بندوں اس کے اعتراف کی کب اجازت دیتی ہیں۔ وہ نظر و فکر کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد' پھر جہالت و توہم پرستی کی انہی پستیوں میں آ گرے۔ یہاں قرآن کہتا ہے کہ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ (21:65) بڑے ہی شرمسار ہوئے' سرنگوں ہوئے' نگاہیں زمین کے ساتھ گڑ گئیں' علیحدگی میں حضرت ابراہیمؑ کو بلایا اور کہا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ (21:65) ابراہیم تم اس چیز کو جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں ہیں' تم تو جانتے ہو۔ پھر ہم سے کیوں پوچھتے ہو۔ کہا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ تم نے مجھ سے کہا ہے کہ تم تو جانتے ہو۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے؟ تم بھی جانتے

ہو‘جس نقطہ پہ میں پہنچانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ (21:66) اس پر ابراہیمؑ نے کہا کہ کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ تم نے ”اللہ کو چھوڑ کر“ جانتے بوجھتے ان چیزوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے‘ جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتی ہیں‘ نہ نقصان پہنچانے کی۔ اس طرح میں تو یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے سامنے صاحبِ اختیار وارادہ انسان کیوں جھکے جن کی کیفیت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں‘ نہ اپنے ساتھیوں کو بچا سکیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ کس نے کیا ہے تو وہ مٹی کے مادھو بن کے بیٹھے رہیں‘ اتنی بات کا بھی جواب نہ دیں۔ میں تو تمہارے سامنے‘ تمہارے ان تمام معتقدین کو یہ بتانا چاہتا تھا۔ کہ ان کی کیفیت یہ ہے۔ اور کھل کر کہا اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (21:67) تو ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر! کیا تم ذرا بھی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے؟ اُن کے پاس حضرت ابراہیم کے ان دلائل کا جواب اس کے سوا کیا تھا جو ہر دھاندلی باز گروہ کا جواب ہوتا ہے! قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (21:68)۔ انہوں نے عوام کو مشتعل کیا اور کہا کہ اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو اٹھو‘ اور اس شخص کو‘ جس نے تمہارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے‘ زندہ جلا دو‘ اور اِس طرح اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کردو۔

عزیزانِ من! ہم سورہ 68 تک آ گئے۔ اگلی آیت 69 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀......❀

نواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 69 تا 80)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿٧٠﴾
وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ
نَافِلَةً ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ
الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۗءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا
وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰۗىِٕثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ
فٰسِقِيْنَ ﴿٧٤﴾ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا
لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٦﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٧٧﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ
نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا
حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿٧٩﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ
لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿٨٠﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1976ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 69 سے ہو رہا ہے: (21:69)۔

حضرت ابراہیم کے سامنے مذہبی پیشوائیت کی بے بسی

سابقہ آیات میں حضرتِ خلیل اکبر ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ جلیلہ کی بات چلی آ رہی تھی کہ جس میں ان کی اس حکمت و موعظت اور رشد کے طریقے پر پتھر کی مورتیوں کی بے بسی کا اظہار تھا۔ اس کے متعلق ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ پجاریوں کے

اب ہمیں لوگوں کے سامنے یہ پوچھ کر کیوں شرمندہ کرتے ہو کہ پوچھو ان بتوں سے اور ان کے ٹکڑوں سے اور یہ جو ابھی اسی طرح صحیح و سالم بیٹھا ہوا' ان کا سب سے بڑا سرغنہ ہے' ان سے پوچھو کہ تمہارے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ تمہیں غیب کی خبریں بتایا کرتے ہیں' لوگ اِن کے پاس اپنی مرادیں لے کر آتے ہیں اور تم ان سے کہا کرتے ہو: کچھ ٹھہریئے' ہم ذرا ان خداؤں سے پوچھ لیں اور اس کے بعد پھر آ کے تم کہا کرتے ہو کہ تمہارے متعلق اس نے یہ کہا ہے' تمہارے متعلق یہ کہا ہے۔ یہ سارا فریب جو تم ان سے کرتے ہو اس کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ اگر یہ سب کچھ لوگوں کے متعلق بتاتے تھے تو جو خود ان کے ساتھ ہوا ہے یہ اس کے متعلق کیوں نہیں مانتے۔ جیسے کہتے ہیں انہیں تو بھائیں بھائیں کرا ٹھنا چاہیے تھا اور اگر ایسا نہیں ہے تو بہر حال چلیے' جایئے' ذرا پوچھیے تو سہی اس سے کہ یہ ہوا کیا ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم خود جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر اس کا اعترافِ اعلان و اقرار لوگوں کے سامنے کیوں نہیں کرتے لیکن لوگوں کے سامنے یہ کچھ کیسے کریں۔

حقائق کا برملا اعتراف کرنے کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار

عزیزانِ من! یہ کچھ دَورِ ابراہیمی علیہ السلام کی مذہبی پیشوائیت کا ہی انداز نہیں ہے بلکہ ہر دَور کی مذہبی پیشوائیت کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ان لوگوں کے سوا کہ جو بیچارے بالکل پکی روٹی کے مُلّا ہوتے ہیں یہ سب جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں غلط ہے' جھوٹ ہے' فریب ہے لیکن ہر اس دوکاندار کی طرح جو ملاوٹ کر کے بیچتا ہے اور کہتا ہے بالکل خالص ہے وہ جانتا تو ہے۔ اس نے تو خود ملاوٹ کی ہوتی ہے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' یہ سارا تصنع ہے' ملمع ہے' اس طرح جھوٹ ہے' کذب ہے' اور تنہائیوں میں اس کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام تم خود جانتے ہو کہ یہ نہیں بولتے اور اس کے بعد پھر یہ تھا کہ پھر وہ علیحدگی میں بیٹھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کس قدر غلطی کی کہ اس تماشے کو یہاں تک لے گئے' لوگ باہر جمع ہیں' سوال کر رہے ہیں۔ اب ان کا تقاضا ہو رہا ہے کہ جس نے یہ کیا ہے اس کو پھانسی دیدو' صلیب پہ چڑھا دو' کھال کھینچ دو' زندہ جلا دو اور اندر یہ صورتِ حال ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں' یہ تو اندر ہی بات ہوئی ہے۔ لوگوں سے جا کر کہو کہ یہ ہے وہ شخص جس نے یہ کچھ کیا ہے۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ اسے پکڑو' مارو' کھینچو' قتل کرو' صلیب پہ لٹکاؤ' زندہ جلا دو۔ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (21:68) اُن کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے ان دلائل کا جواب اس کے سوا کیا تھا جو ہر دھاندلی باز گروہ کا جواب ہوتا ہے! انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور کہا کہ اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو اٹھو' اور اس شخص کو' جس نے تمہارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے' زندہ جلا دو' اور اس طرح اپنے دیوتاؤں کا بول بالا کر دو۔ عزیزانِ من! دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ انہوں نے کہا کہ اس Demonstration سے کیا فائدہ ہے' خالی نعرے لگا رہے ہو' اس سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے تو اسے پکڑو' اس کو زندہ جلا دو۔ چنانچہ ان لوگوں کو یہ اشتعال دلایا گیا۔ اب اس کے بعد دو تین

مقام پہ قرآنِ کریم میں یہ چیز آتی ہے۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ (21:69) وہ ابراہیم علیہ السلام کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ کو یوں بھڑکا رہے تھے اور ہم ایسا انتظام کر رہے تھے کہ اس آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں اور وہ ابراہیم علیہ السلام کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔

عزیزانِ من! ان کے تراجم اور تفاسیر میں بات یہاں تک ہی ہے کہ انہوں نے عوام کو اشتعال دلایا کہ اسے پکڑو اور خوب مارو۔ یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یونہی عوام میں سے کوئی عام آدمی نہیں تھے۔ یہ بہت بڑے بلند منصب باپ کے بیٹے تھے اور ان کا مقام بھی اس قوم کے اندر بہت بڑا تھا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو شخص بادشاہ کے سامنے جا کر اس سے اس قسم کا مناظرہ کرتا ہے تو یہ مسجد کا کوئی عام مُلّا تو نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہت بڑی پوزیشن ہے اس لیے یوں نہیں تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ کچھ کیا ہے اور عوام نے پکڑا اور اس کی بوٹی بوٹی کر دی۔ اس کے متعلق تو پھر کچھ سوچنے کی بات تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں جلائی جانے والی آگ کی حقیقت

قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں جلائی جانے والی آگ کی حقیقت واضح کی۔ مگر ہمارے ہاں اس آیت (21:69) کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے اس آگ سے کہا کہ تو ابراہیم علیہ السلام کے اوپر سلامتی والی ٹھنڈی ہو جا۔ یہ ترجمے تو بہرحال ہمارے ہاں بعد میں ہوئے، پہلے تو اس کی تفسیریں آئیں، درحقیقت یہ بھی بعد میں آئیں۔ پہلے تو زیبِ داستان کے لیے یعنی لطف پیدا کرنے کے لیے روایات وضع ہوئیں۔ وہ جو میں نے آپ کو ایک دفعہ واقعہ سنایا تھا، اسے پھر سنیے۔ یہ دلی میں مولانا اسلم جیراجپوری ؒ کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہاں دلی میں ہمارے ہاں کے دو مولوی مناظر تھے۔ ان میں سے ایک اکثر اپنے ہاں مناظرے میں شعر بہت پڑھا کرتے تھے تو وہ بھی ایک محفل میں آئے جو دراصل مناظرہ نہیں تھا بلکہ جامعہ ملیہ کی بہت بڑی شستہ محفل تھی تو اس میں ان مولوی صاحب نے حالی کا شعر اس طرح پڑھا: ''یہ تھا سبق پہلا کتابِ خدا کا''۔ وہ ایسے ہی پڑھا کرتے تھے تو مولانا نے آتے ہوئے، تنہائی میں، ہم ساتھ تھے، ان سے کہا کہ مولانا! میرا خیال یہ ہے کہ آپ کی تقریر بڑی شستہ ہوتی ہے مگر اس میں آپ شعر نہ پڑھا کریں کیونکہ اس میں ذرا اور بھی اہلِ زبان ہوتے ہیں۔ ان مولانا کے سامنے یہ ''تھا سَبَق پہلا کتاب خدا کا''۔ جبکہ وہ اصل تلفظ تو سَبَق ہے یعنی ''سبَق تھا یہ پہلا کتابِ خدا کا''۔ انہوں نے کہا تھا یہ سَبق پہلا۔ انہوں نے کہا کہ مولانا آپ شعر نہ پڑھا کریں۔ ان کے ساتھ دوسرے انہی جیسے ایک اور بڑے بلند مرتبہ مولوی صاحب تھے۔ وہ بھی مناظر تھے، کہنے لگے جی نہیں، شعروں سے لُطف بڑھ جاتا ہے، مولانا (اسلم جیراجپوری ؒ) نے کہا پھر دونوں مل کر پڑھا کریں۔ مولانا کی جگتیں بڑی شگفتہ ہوتی تھیں۔ کہنے لگے: دُونوں مل کے پڑھا کرو۔ اب پھر وہاں سے بات چلی کہ ہاں صاحب! بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستان کے لیے:

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا انتظام

عزیزانِ من! بقول ان کے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنا ہے۔اب روایات آ رہی ہیں کہ چالیس دن تک ساری قوم لکڑیاں اکٹھی کرتی رہی۔ یہ احادیث میں ہے اور ہر تفسیر میں آپ کو یہ ملے گا۔انہیں جلانے کے لیے چالیس دن تک وہ قوم لکڑیاں اکٹھی کرتی رہی۔ کتنے میل لمبا' کتنے میل چوڑا' کتنے میل اونچا' پھر وہ لکڑیوں کا انبار اکٹھا کیا۔اس کے گرد چار دیواری بنائی کہ کہیں نکل کے بھاگ نہ جائے۔اب ان لکڑیوں کو آگ لگاتے ہیں۔آگ نہیں لگتی تھی' بڑی مشکل پڑی' وہ آگ بھڑکتی نہیں تھی اور جب تک آگ بھڑکے نہیں تو اس میں کس کو ڈالا جائے۔ناکام ہو گئے' سمجھ میں کچھ بات نہ آئی۔جنگل سے یہ ایک گرگٹ آیا۔آ ''کرلا'' جنوں کیندے نیں۔ ❶ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس کے گلپھڑے اس طرح پھولا کرتے ہیں جس طرح قلعی گر اپنی دھونکنی پھونکتا ہے۔ ہاں تو جنگل سے گرگٹ آیا۔ ''اونے کیا او پچھاں ہٹو''۔ ❷ اور اس نے آ کر آگ میں اپنی دھونکنی پھونکی اس لیے آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ بخاری شریف میں ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ گرگٹ جہاں کہیں بھی تمہیں ملے' اسے مار دیا کرو کیونکہ اس نے تمہارے جدِ امجد کے اوپر آگ کو بھڑکایا تھا یعنی وہ کسی ایک گرگٹ نے اس زمانے میں بھڑکایا اور قیامت تک جو گرگٹ کی نسل ہے تم اس سے بدلا لیا کرو۔ بہرحال آگ کے اتنے شعلے ابھرے کہ آسمان تک بھڑک اٹھے۔دیوار چاروں طرف بنائی تھی۔سمجھ میں نہ آئے کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں کیسے ڈالیں۔دیواراں جے اوچیاں اوچیاں چنی بیٹھے سن۔ ❸ تو شیطان نے انہیں آ کر ایک اسکیم بنا کر دی۔اس زمانے میں یہ کرین نہیں ہوتے تھے۔ پہلے زمانے میں جنگ کے دوران وہ اس قسم کا ایک آلہ ❹ سا بناتے تھے تو وہ دُور سے اس سے جیسے کسی چیز کو پھینکتے ہیں تو وہ پھینکا جاتا تھا۔وہ چونکہ پہلی بار بنانا تھا لہٰذا اس موقع پہ شیطان نے آ کر انہیں ایک ترکیب بنا کے دی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کو اس منجنیق میں رکھ کر اوپر دُور سے اس آگ کے اندر ڈالا۔ چالیس دن تک وہ اس آگ کے اندر رہے اور آگ گلزار بن گئی۔ پھر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام وہاں سے نکل کے فلسطین کی طرف چلے گئے۔ یہ ساری تفصیل احادیث کی رو سے تفاسیر میں آئی تو پھر آپ کے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہوا۔اس ترجمے سے آپ نے یہ پڑھا کہ آگ ٹھنڈی ہو گئی اور اس کی تفسیر آپ کو یہ معلوم ہوئی۔

---

❶ جسے ''کرلا'' کہتے ہیں۔

❷ اس نے کہا! پیچھے ہٹو۔

❸ کیونکہ بڑی ہی اونچی اونچی دیواریں تعمیر کر چکے تھے۔

❹ یہ آلہ بشکل۔منجنیق (مِنْ۔ جَ۔ نِیْق) تھا جس سے بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا

عزیزانِ من! اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (21:70) چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ابراہیم علیہ السلام کے خلاف جو تدبیر سوچی تھی ہم نے اسے بیکار کر دیا اور یوں وہ سب اپنے منصوبے میں ناکام رہ گئے (29:24;37:98)۔عزیزانِ من! یہاں پہلا تو لفظ ہی ”ارادوا“ ہے کہ انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا۔سارے قرآنِ کریم میں کہیں نہیں ہے کہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا۔جہاں بھی یہ ذکر آیا ہے وہاں ”ارادوا“ والی بات ہے۔انہوں نے کسی چیز کا ارادہ کیا۔وہ ارادہ کیا تھا' وہ تو میں ابھی عرض کرتا ہوں مگر یہاں ہے کہ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (21:70) ہم نے ان کا جو ارادہ تھا اسے ناکام بنا دیا۔سوال یہ ہے کہ وہ ارادہ کس چیز کا تھا؟ وہاں لفظِ ''كَيْدًا '' رکھا ہے۔''مکر اور کید' دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔عام طور پر ان کے اندر فرق کیا جاتا ہے۔''کید'' اس تدبیر کو کہتے ہیں جو خفیہ طور پر کسی کے خلاف کی جائے' خاص طور پہ کسی کے خلاف جنگ کرنے کی جو تدبیر ہوتی ہے وہ تو بڑی خفیہ رکھی جاتی ہے۔اس کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔تو دو لفظ اس میں آ گئے۔پہلے تو آ گیا ''ارادوا''۔انہوں نے ارادہ کیا' ارادہ بھی خفیہ کیا اور وہ خفیہ ارادہ یا تدبیر تھی۔زبان کے اعتبار سے بھی ''کیدًا'' میں جنگ کا تصور آتا ہے۔''نار'' عربی زبان کا لفظ ہے۔یہ آتشِ انتقام' غصے کی آگ' حسد کی آگ کے لیے آتا ہے۔یہ آگ تو روز بھڑکتی ہے خود آپ کی زبانوں (Languages) میں بھی ہے جسے آپ اشتعال دلانا کہتے ہیں' شعلہ تو خود اس کا مادہ ہے۔یہ شعلے بھڑکانا اور اشتعال دلانا تو آپ روز بولتے ہیں۔یہ جو آپ تقریروں میں اشتعال دلاتے ہیں کیا وہاں آپ عوام کے سروں پہ مٹی کا تیل ڈال کے ماچس دکھا دیا کرتے ہیں؟ یہاں ہے کہ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (21:68) اُن کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کا جواب اس کے سوا کیا تھا جو ہر دھاندلی باز گروہ کا جواب ہوتا ہے! انہوں نے عوام کو مشتعل کیا اور کہا کہ اگر تم میں ہمت ہے تو اٹھو اور اس شخص کو جس نے تمہارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے' زندہ جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔نظر آتا ہے کہ وہ عوام کو اشتعال دلا رہے تھے' اندر کوئی خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔اب اس تدبیر کے اندر کیا کچھ ہو رہا تھا' قرآن نے اس کی تفصیل نہیں دی۔اس میں ایک ''کید'' کا لفظ بتا دیا اور وہ بھی ''ارادوا'' ہے کہ اس کے متعلق کچھ ارادے باندھ رہے تھے' وہ سوچ رہے تھے کہ کچھ ایسا کیا جائے یعنی خفیہ طور پہ سوچ رہے تھے اور اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جسے جنگ کہا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے والد یا ان کے ہاں کا وہ کنبہ یا ان کے ہاں کے جو ساتھی ہیں اعتقادات کے افتراق کے باوجود جب اگر ایسی صورت پیدا ہو تو جنگ کی صورت پیش آ سکتی ہے لہٰذا وہ ساری چیزیں ان کے سامنے تھیں اور مسئلہ اتنا اہم تھا کہ وہ خفیہ طور پر کچھ اس کے متعلق ارادے کر رہے تھے۔ان کی اہمیت نظر آ رہی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات تھی ورنہ کسی ایک فرد کے خلاف کچھ کرنا یا اس کو لے کر جلا دینا' کونسا ایسا مشکل مسئلہ تھا جس کے لیے خفیہ سازشیں اور تدبیریں کرنا پڑتیں اور پھر وہ تو ارادہ ہی ارادہ ہے۔

یہ سارا سلسلہ ہی کفار کی آتش انتقام کا تھا

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں کہیں بھی نہیں ہے کہ انہوں نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا۔قرآن کہتا ہے کہ یہ جوان کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکائی جارہی تھی' ہم نے اسے ٹھنڈا کردیا۔**وَسَلٰمًا عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ** (21:69)اورابراہیم علیہ السلام کومحفوظ رکھااوراسی لیے آگے ہے**وَنَجَّیْنٰہُ وَلُوْطًا** (21:71)اورابراہیم علیہ السلام اور(اس کے ساتھی)لوط علیہ السلام کوان لوگوں کی سازشوں اورفتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھا۔عزیزانِ من! نجات کے معنی کسی عذاب میں ڈال کر وہاں سے نکالنا ہی نہیں بلکہ کسی کواس سے شروع سے محفوظ رکھنا کے بھی اس کے معنی ہوتے ہیں'اس سے محفوظ ہی رکھنا۔حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے ذکر کے اندر بھی یہ چیز آئی ہے کہ ان کوتو غرق کردیااورنوح علیہ السلام اورانکے ساتھیوں کوہم نے''نَجینہ''اس سے محفوظ رکھا۔یہ نہیں کہ وہ بھی ڈوب گئے تھے یاڈبکیاں کھارہے تھے کہ ہم نے ان کوسرے سے پکڑ کے نکال لیا۔یہ لفظ کسی کومحفوظ رکھنا کے لیے آتا ہے اور پھر یہاں دوسری بات بھی ہے۔یہاں بقول ان کے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کوتو یہ ہوا کہ آگ میں ڈال دیااور پھر ہے نجینہ۔وہاں سے انہیں نکال دیامگر یہاں تو**وَنَجَّیْنٰـــہُ وَلُوْطًا** (21:71) ہے یعنی ساتھ ان کے بھتیجے کا بھی ذکر آرہا ہے۔اس زمانے میں یہ ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔کہا جاتا ہے کہ حضرتِ لوط علیہ السلام' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور یہ ان پہ ایمان لائے ہوئے تھے۔تو گویا نظر آیا کہ یہ بھی ممتاز شخصیت تھے۔یہ'' نجینہ'' کا لفظ صرف ابراہیم علیہ السلام کے لیے نہیں ہے''و لوطًا'' بھی ہے اور پھر وہاں آگ سے ہی نجات نہیں ہے وہاں تو ہے کہ انہیں ان لوگوں کی سازشوں اورفتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھ کر' **اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْھَا لِلْعٰلَمِیْنَ** (21:71) ہم نے ان کواس ارضِ مقدس کی طرف سلامتی کے ساتھ بھیج دیا جو بڑی سرسبز وشاداب واقع ہوئی ہے۔یہ اس مقام پر ہے۔قرآن میں دو اور مقام ہیں جہاں یہی ذکر آیا ہے۔اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ہرجگہ یہی کہا گیا ہے۔کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیااور وہاں آگ گلزار بن گئی اور پھراس کے بعد وہ یہاں سے نکل کے چلے گئے۔اگر انہوں نے ان کے خلاف کچھ کرنا ہی تھا تو چلیے آگ گلزار بن گئی'اس نے نہیں جلایا تو ان کو ماردینے کا کوئی اورطریقہ ان کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔یہ دیکھتے رہے کہ وہ چالیس دن تک آگ میں جل نہیں رہے ہیں اور پھر اگر یہ ٹھنڈی بھی ہوئی ہے تو چالیسواں کر کے پھر وہ وہاں سے آگ ٹھنڈی ہوگئی' وہ نکل آئے اوراتنا بڑا معجزہ دیکھ کے بھی وہ قوم ایمان نہیں لائی۔یعنی یہاں تو وہ بھنگڑ فقیر جومنہ میں ذراسی فاسفورس رکھ کے فوہ کرکے شعلہ نکالتا ہے تو پوچھو نہیں۔وہ تو ایک طرف' اس کے مزار تک کی پرستش ہونے لگ جاتی ہے اور وہاں اس قوم نے اتنا بڑا معجزہ دیکھا ہے۔چالیس دن تک اتنا بڑاانبار جل رہا ہے۔اس میں وہ ایک شخص ڈالا ہوا ہے۔اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔چالیس دن کے بعد وہ آگ پھول بن جاتی ہے۔اس میں سے وہ مسکراتا ہوا باہر نکل آتا ہے اور قوم ویسے ہی کافر کی کافر ہی رہتی ہے۔

ہجرت کا عمل تقریباً ہر نبی کی زندگی کا حصہ رہا ہے

عزیزانِ من! یہ باتیں تو سوچنے کی ہیں اور ''سوچنے کا جرم'' تو مذہب کے اندر ہوتا ہی نہیں ہے۔ دوسری جگہ اس کا ذکر (29:26) میں آیا ہے۔ وہاں بھی فَـاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ (29:26) آیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی تمام تلقین وتنذیر کے باوجود اس قوم میں سے (اُس وقت) صرف لوط علیہ السلام ان پر ایمان لائے۔ انہیں اُس وقت' ہنوز' نبوت نہیں ملی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھیں کہ اس وقت حضرتِ لوط علیہ السلام ان پہ ایمان لائے ہوئے تھے۔ اب جو کچھ یہ ہوا وہ کیا تھا؟ قریب قریب ہر نبی یا ہر رسول کی زندگی یوں قرآن میں آتی ہے کہ پہلے تو وہ جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے وہیں انہیں مخاطب کرتا ہے' انہی تک تبلیغ کرتا ہے' انہی تک پیغام پہنچاتا ہے' پھر وہ دیکھتا ہے کہ اس کا Reaction یعنی ردِعمل کیا ہے۔ ان میں سے ایسے جوہر' جن کے دلوں میں صداقت کے لیے تڑپ ہوتی ہے وہ اس حقیقت کو پا لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں لیکن ہر مقام پہ قرآن نے دکھایا یہ ہے کہ یہ پروسیس (Process) یعنی یہ طریق بڑا ہی سست رو ہوتا ہے' Convertion کی یہ چیز بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے' مخالفت بہت تیز ہو جاتی ہے۔ ایک وقت کے بعد جب وہ نبی یہ دیکھتا ہے کہ یہاں کی فضا اس پیغام کے لیے سازگار نہیں ہے تو وہ دوسرے مقام پہ منتقل ہو جاتا ہے جس کی فضا اس پیغام کے لیے سازگاری ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہاں یہ یاد رکھیے کہ یہ Escapism نہیں ہے' یہ فرار نہیں ہے۔ ہجرت کے متعلق جو عام طور پہ ہمارے ہاں تصور ہے' اس کی رو سے مغرب کے جتنے بھی آپ کے ہاں کے یہ قرآن کے Translation (ترجمہ) کرنے والے یا آپ کی تاریخیں لکھنے والے ہیں' ان کے نزدیک ہجرت اپنی جان بچا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ جانے کے تصور میں لیا جاتا ہے۔ وہ اسے Escapism (فرار) کہتے ہیں۔ اس کو Migration کہتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تو مشیت کے پروگرام کے اندر کی ایک کڑی ہوتی ہے کہ جس مقام پر نبی پہلے اپنے پروگرام کا آغاز کرتا ہے' وہاں پوری پوری محنت کرتا ہے کہ وہی قوم اس کو Accept (قبول) کرلے' وہیں یہ دین متمکن ہو لیکن ایک خاصا عرصہ وہاں گزارنے کے بعد جب وہ وقت آتا ہے' جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس طریق سے اب ان کے اندر اور کوئی جوہر ایسے نہیں رہے ہیں جو منتقل ہو کر ادھر آ جائیں گے اور یہ سرزمین' یہ خطہ زمین' اس نظام کے تمکن کے لیے' جس کی خاطر میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں' مساعد نہیں ہے تو وہ کسی ایسے خطہ زمین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جہاں کی فضا اس کے لیے سازگار ہوتی ہے' چنانچہ ہر نبی کے ضمن میں یہ چیز آئی ہے۔ ان کے تذکرے تفصیل سے قرآن میں آئے ہیں۔ یہ انتقالِ مکانی ہے۔ اس کے بعد جس نئی سرزمین میں' جس نئی فضا میں' وہ جاتا ہے وہاں دلوں میں یہ چیز بارآور ہو جاتی ہے۔ نبی کا کام یہی نہیں ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو Convert کرے ان کو اس طرح سے مسلمان کرتا چلا جائے' مقصد تو اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جس کی بناء پر اس دین کو ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کر سکے۔ عملی شکل میں متشکل کرنے کے یہ الفاظ اپنی ایک مملکت قائم کرنا ہوتا ہے۔ دین متمکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ہو' خواہ وہ چھوٹے سے ہی قطعے یا خطے کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ دین کے احکام کو بحیثیت قوانین نافذ ہونا ہوتا ہے

اوران کا نفاذ تو اپنے خود مختار خطہ زمین کے اندر ہی ہوسکتا ہے' دوسرے کے ہاں تو ہو ہی نہیں سکتا۔

مذہب کی عمل داری کے لیے خود مختار مملکت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی

یہ مذہب ہے کہ جس کے اوپر ہر جگہ عمل کیا جا سکتا ہے۔ انگریز کی عملداری میں آپ اندازہ لگایئے کہ ہندوستان کی محکومیت کے اندر ایک [1] شخص یہ دعویٰ لے کر آتا ہے کہ میں خدا کی طرف سے آیا ہوں اور وہ ہوں جس کے لیے پہلے سے بہت سے دعوے خدا نے کیے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آئیں گے' ایک مہدی بھی آئیں گے' مامور من اللہ بھی آئے گا۔ وہ کیا پیغام لے کر آتا ہے؟ پیغام لے کے آتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ کا اتباع' فرمانبرداری اور محکومیت خدا کی طرف سے تم پر فرض قرار دی گئی ہے۔ حکومت نے تم کو آزادیاں دی ہیں' ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں۔ دوسرا حکم جو خدا کی طرف سے' بقول اس کے' آیا وہ یہ تھا کہ اب جہاد منسوخ ہو چکا ہے۔ جس حکومت نے تمہیں اتنی خوشحالیاں بخشیں اور مذہبی آزادی بخشی ہے' اس کے خلاف جہاد کا تو خیال بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال۔ یہ تمہارے لیے حرام ہے' اب جنگ اور قتال حرام ہے۔ یہ خدا کی طرف سے کہہ رہا ہے اور یہ تو آپ کے ہاں مامور من اللہ تھے۔ جب تحریکِ پاکستان کی جنگ تھی' اس میں علامہ اقبالؒ (1877-1938) اور یہ آپ کے ہاں کے تمام نیشنلسٹ علمائے کرام شامل تھے۔ جنگ کس بات پہ تھی؟ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957) مرحوم جیسا شخص جس کے متعلق تصور آتا ہے کہ وہ اتنا بڑا دیو بند جیسے دارالعلوم کا دین کا جاننے والا عالم ہے۔ وہ جو ان کی آپس میں وہاں جنگ ہو رہی تھی یا مخاصمت تھی اس میں ان کی طرف سے ان کے بیانات موجود ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بابا! یہاں حکومت مشترکہ ہوگی ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب کی۔ اور اس میں وہ نماز' روزے' حج' زکوٰۃ کی آزادی کی آپ کو گارنٹی دے رہے ہیں تو اور پھر تمہارا اسلام کی بناء پہ تقاضا کیا ہے تو اسی کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

تحریکِ آزادی کی بنیاد تو نظامِ صلوٰۃ کا قیام تھا

یہ سجدے کی اجازت تو پہلے ادوار کے انبیائے کرامؑ کے زمانے میں بھی مخالفین دیا کرتے تھے۔ اس سے کوئی نہیں روکتا تھا۔ وہ تو کئی دفعہ آ چکا ہے جیسے حضرتِ شعیب علیہ السلام کا واقعہ تو قرآن نے اسی لیے بیان کیا ہے کہ انہوں نے صلوٰۃ کے متعلق کہا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب! ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے' ٹھیک ہے کر لیا کرو۔ یہ ترجمہ میں کر رہا ہوں۔ انہوں نے ''پڑھ لیا کرو'' ہی کہا ہوگا اگر انہیں پتہ ہوتا کہ یہ کر لیا کرو ہے تو وہ کبھی بھی یہ نہ کہتے کہ کر لیا کرو۔ انہوں نے پڑھ لیا کرو ہی کہا ہوگا تو ان سے انہوں نے صلوٰۃ کی رضامندی لے لی۔

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف ہے۔

اجازت کا لفظ تو میں نہیں کہونگا۔ اب جب صلوٰۃ شروع ہوئی تو انہوں نے کہا کہ شعیب علیہ السلام یہ کیا کر رہے ہو؟ کہنے لگے: کیوں' تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ ہم معترض نہیں ہونگے' تم صلوٰۃ قائم کرلیا کرو۔ کہنے لگے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ کوئی پوجا پاٹ کی ہی قسم ہے۔ ہم گھنٹی بجاتے ہیں' تم ڈھول بجالیا کرو گے لیکن تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی سے خرچ کرسکیں۔ جی! کہا کہ ابھی تو نظامِ صلوٰۃ کی ابتداء ہے' ذرا آگے چلیے تو سہی اس سجدے کی اجازت' جو حکومتِ برطانیہ دے سکتی ہے یا جو ہندوؤں کے ہاں تحریک آزادی تھی وہاں بھی اس کے بعد اس کی آپ کو اجازت مل سکتی تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملا کی نماز کی اجازت تو ہر جگہ مل سکتی ہے' یہ اجازت آج بھی وہاں موجود ہے' یہ اجازت مکے میں موجود تھی' یہ اجازت تو وہاں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو بھی شاید موجود ہوگی۔ اُن کو اعتراض تو یہ تھا کہ ان کے بتوں کے خلاف یہ نہ کیا جائے اور یہ کچھ نہ کہا جائے۔ اپنے دَور کی بھگتی اور پوجا کے متعلق تو بات ہی نہیں ہے۔ وہ بھی اجازت دیتے ہیں لہٰذا اصل سوال تو یہاں سجدہ کرنے کی اجازت کا نہیں ہے۔

عزیزانِ من! یہ آسمانی انقلاب کے داعی تو ایک نظام قائم کرنے کے لیے آتے تھے علی الرغم ساری دنیا کے نظاموں کے خلاف' اور اس کی اجازت کوئی نظام بھی نہیں دے سکتا۔ بات میں بات آ گئی۔ ابھی ہمارے ہاں Convention (کنونشن) آنے والی ہے جو اکتوبر کی 21 سے 24 تک منعقد ہوگی۔ میں نے اسمیں اپنے ایک خطاب کا عنوان ہی یہ رکھا ہے کہ وہاں کس چیز کی اجازتیں دیجاتی ہیں اور کیا مقصد تھا تحریکِ پاکستان کا؟ نماز روزے ہی کی بات ہوتی تو یہ جنگ ہوتی ہی کیوں۔ تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہجرت اپنی جان بچا کر ایک جگہ سے بھاگ جانے کا نام نہیں ہے۔ باقی رہا یہ کہ وہ اس کے لیے بھی اتنا اہتمام' اتنی حفاظت' اتنی احتیاط' کیوں کی جاتی تھی؟ اس لیے کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ انہوں نے دوسرے مقام پر جا کے اگر اس قسم کا نظام قائم کرلیا اور اس کے درخشندہ نتائج سامنے آئے تو یہ ہمارا سارا معاشرہ اور اس کا نظام ڈھیر ہو کے رہ جائے گا۔ یہی نہیں کہ وہ اپنے ہاں اسے قائم نہیں کرنا چاہتے تھے' وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ کسی اور جگہ بھی یہ نظام قائم ہو اور یہ واقع ہے کہ اگر اسلام بحیثیت دین کے آج بھی' عزیزانِ من! دنیا میں کسی ایک چھوٹے سے خطے کے اندر بھی متمکن ہو جائے آپ دیکھیے کہ یہ سارے ازم کس طرح سے راکھ کا ڈھیر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ انسان تو اس نظام کے لیے تڑپ رہا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم یا اشتراکیت کے نتائج کے بعد دنیا ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے

آپ کے ہاں کا کیپٹل ازم (نظامِ سرمایہ داری) فیل ہوا' ان میں تڑپ پیدا ہوئی حالانکہ وہ مسئلہ حیوانی سطح کا ہے' صرف روٹی کا لیکن یہ مسئلہ بھی یہ نظام حل نہیں کرسکا تو انہوں نے پھر ایک نیا نظام کمیونزم یا اشتراکیت' یا سوشلزم دیا اور اس قدر اس کے لیے ڈھنڈورا پیٹا گیا' آسمان تک غلغلہ بلند ہوا' اب اس کے بعد' اس کی ناکامی کے بعد' اب تیسرا ایک نظام جو ہے اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ اب تھرڈ ورلڈ کے اندر ایک تیسرا نظام قائم کرنے کے لیے سوچا جا رہا ہے تو اگر یہ نظام کہیں چھوٹے سے خطے میں بھی قائم ہو جائے جہاں انسانیت کو کچلے بغیر انسانوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی چلی جائیں تو کونسی دنیا ہے جو کھنچ کے نہیں آئے گی! اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ o وَ

رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا (110:1-2) جب' قانون خداوندی کے مطابق' تجھے غلبہ ونصرت حاصل ہو جائے اور ان لوگوں کی مخالفت ختم ہو کر' دین کے دروازے ہر طرف سے کھل جائیں اور تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ لوگ کس طرح جوق در جوق' اس نظام میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں (19:96) دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ پھر دیکھا کہ نصرتِ الٰہی کیسے آتی ہے۔ عزیزانِ من! برسات کے زمانے کی جب بارش ہوتی ہے تو ہر جگہ ہریالی پیدا ہو جاتی ہے' اسے نصرت کہتے ہیں۔ دیکھا' ہمارے صحابِ کرم کے یہ چھینٹے یوں سرسبز وشاداب ہوئے اور برگ وبار لائے کہ دنیا فوج در فوج اس نظام کی طرف چلے آ رہی ہے!

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات جنگوں کا محتاج نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ جو کہا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کو جنگیں لڑنا پڑیں' اس کے لیے ابتداً وضعی روایتیں آئیں اور پھر یورپ کا پروپیگنڈہ آیا کہ یہ جنگیں مسلمان کرنے کے لیے' اسلام پھیلانے کے لیے ہو رہی تھیں' یہ سب کچھ تلوار کے زور پہ ہو رہا تھا تو اس سے نہ کوئی نظام متمکن ہو سکتا ہے' نہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ جو مخالف گروہ تھے جو اس نظام کو یہاں مدینے میں بھی قائم نہیں رہنے دینا چاہتے تھے جو عرب کے اندر بھی اسے قائم نہیں رہنے دینا چاہتے تھے' یہ ان کی سرکشی کو کچلنے کے لیے جنگیں لڑنی پڑی تھیں' وہاں جا کے لوگوں کو مسلمان کرنے کے لیے نہیں جنگیں لڑنی پڑی تھیں وہ تو ہجرت کر کے مدینے آ گئے تھے۔ اب قصہ ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ قریش کو اس پہ اب کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا۔ اس زمانے کا مدینہ مکے سے تین سو میل کی مسافت پر تھا۔ آج چاند پہ جانا بھی آسان ہے۔ اس زمانے میں مکے سے مدینے پہنچنا کتنا دشوار ہوگا۔ یہ لوگ وہاں آ گئے اور کوئی اشتعال کی بات نہیں' کوئی ان کی مخالفت نہیں' مخاصمت نہیں' کچھ نہیں کیا' صرف آرام سے یہاں بیٹھ گئے۔ سوچنے کی بات ہے' عزیزانِ من! ان خطوط پہ آپ کی کوئی تاریخ ہی نہیں لکھی گئی کہ پھر یہ کیا تھا کہ دوسرے ہی سال یہ اپنی پوری قوت کے ساتھ' تین سو میل کا فاصلہ طے کر کے' مدینے پہ چڑھائی کرنے آ گئے کیا بات تھی؟ یاد رکھیے! دین کا تمکن' کسی خطہ ارض کے اندر بھی باطل کا نظام پسند نہیں کرتا اور اس دفعہ میں اس کنونشن میں یہی بتانے والا ہوں کہ پاکستان کی تحریک کی جو مخالفت تھی وہ صرف اس لیے نہیں تھی کہ اس سے ہندوستان کا ایک اتنا حصہ کٹ جائے گا اور مسلمان وہاں بس جائیں گے۔ ٹھیک ہے سیاسی طور پہ یہ چیز بھی تھی۔ ہندوستان کی اتنی بڑی مملکت میں سے کوئی اتنا گاؤں بھی کسی کو نہیں دینا چاہتا لیکن اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں کے بڑے بڑے چوٹی کے لیڈروں نے یہ بات کہی تھی کہ خطہ زمین الگ لے لو' مملکت بنا لو لیکن اگر تم وہاں اسلامی یا قرآنی مملکت بنانا چاہتے ہو تو ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ آپ کو مملکت بنانے کی اجازت دیں۔ بنگلہ دیش پر قبضہ کرنے کے باوجود ہندوستان پھر پیچھے کیوں ہٹ گیا ہے۔ اس اعلان سے ہٹا ہے کہ ہم یہاں سیکولر حکومت قائم کریں گے۔ انہوں نے کہا: بسم اللہ۔ پھر پیچھے کیوں ہٹا۔ یہ چیزیں سوچنے کی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآن یہ کچھ کہتا ہے۔ اور اب کیوں مخاصمت ہو رہی ہے؟ کیونکہ انہیں پھر سے اندیشہ ہو رہا ہے کہ ان کا رخ پھر اس نظریئے کی طرف آ رہا ہے جس کا مقصد اس نظام کا قیام ہے۔

مملکتِ پاکستان کی مخالفت کی اصل وجہ

1971ء کی جنگ کے بعد انڈیا نے قبضہ تو کرلیا تھا' انہیں اس کی خوشی تھی۔ اندرا گاندھی کا پارلیمان کے اندر اعلان تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے وہ فتح کرلیا ہے لیکن یہ فتح ہماری فوج کی فتح نہیں' ہمارے ملک کی فتح نہیں' ایک سلطنت کی دوسری سلطنت کے خلاف فتح نہیں' یہ پاکستان کی تحریک کے باطل نظریئے کے خلاف ہمارے نظریئے کی بلندی کی فتح ہے۔ یہ کوئی نہیں برداشت کرسکتا خواہ وہ کسی خطہ زمین میں بھی کیوں نہ ہو۔ پاکستان کے خطہ زمین میں بھی قرآنی نظام کی بات ہو تو رشیا بھی مخالفت کرے گا' امریکہ بھی مخالفت کرے گا' سارا یورپ مخالفت کرے گا' بھارت مخالفت کرے گا' یہاں بسنے والے جن کے سینے میں مسلمانوں کے خلاف آتشِ حسد ابھی تک ٹھنڈی نہیں ہوئی' وہ بھی مخالفت کریں گے۔ آپ ان معانی میں اسلامی قانون بناتے چلے جاؤ کہ جمعہ کے دن کی چھٹی ہونی چاہیئے' پینٹ اور کوٹ کی بجائے شیروانی' کرتہ اور شلوار پہننی چاہیئے یہ کچھ بناتے چلے جاؤ۔ یہ تو انڈیا میں آج بھی مسلمانوں کو اس کی اجازت ہے پھر ہجرت کرنے کے لیے کیوں کہتے تھے۔ عزیزانِ من! یہ جتنی بھی میں نے اس وقت تفصیل کہی ہے وہ تو دو لفظوں میں آجاتی ہے۔ اس آگ کی جو چتا تیار کی گئی تھی' اس سے محفوظ ہونے والے ابراہیم علیہ السلام کو جب یقین ہوگیا کہ یہ قوم صحیح راستے پر آنے کے لیے تیار نہیں' تو وہ وہاں سے دامن فشاں اٹھا اور اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ **قَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ** (29:26)۔ وہ یہ کہہ کر الگ ہوگیا کہ میں اس فضا کی تلاش میں جا رہا ہوں جو میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے سازگار ہو۔ عزیزانِ من! کیا ہی خوب کہا: "الٰی ربی" اپنے خدا کے نظامِ ربوبیت کی طرف۔ وہ رب تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ **ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ** (57:4) تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہاں خدا موجود ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے رب کی طرف لوٹنے کے معنی

عزیزانِ من! حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ اس میں لفظ مہاجر ہے۔ پھر ترجمہ بھی یہی کرونگا: الٰی ربی یعنی اپنے رب کی طرف۔ او بھئی رب تمہارا یہاں نہیں ہے؟ جی نہیں ہے؟ ٹھیک ہے وہ ذات کے اعتبار سے تو ہر جگہ موجود ہے لیکن وہ مقام کہ جہاں ربوبیت صرف اسی کی ہو' جہاں انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے صرف اس کی ذات کا محتاج ہو کسی انسان کا محتاج نہ ہو' کہا کہ میں کسی ایسے خطہ زمین کی طرف جا رہا ہوں جہاں یہ کچھ ہو' جہاں حکومت صرف میرے خدا کی ہو' کسی اور کی نہ ہو۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ **مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ** (29:26) اب ہمارے ہاں ہجرت کے معنی بھی Migration (ہجرت) ہو رہے ہیں۔ اس کے تو بنیادی معنی "ترک کردینا' چھوڑ دینا ہے۔" جب بھی آپ اس نظام کی طرف آئیں گے اس کے علاوہ جتنے بھی اور نظام ہیں وہ تو باطل کے نظام ہیں۔ باطل کے ہر نظریئے کو چھوڑنا پڑے گا' ہجرت میں ہر عقیدے کو چھوڑنا پڑے گا' ہجرت میں آباؤاجداد کے ہر

مسلک کو چھوڑ نا پڑے گا۔ ہجرت کی خاطر یہ جتنے بھی باطل نظام کی طرف سے نہایت پرکشش مناسک اور دولت' مال' اہل وعیال اور عزت اور تکریم کے ذرائع ہونگے' انہیں چھوڑ نا پڑے گا۔ اور جب آخر میں یہ دیکھا جائے کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا خطہ زمین ہے جہاں اس نظام کے قیام کے امکانات زیادہ روشن ہیں' اس وطن کو چھوڑ دینا یہ بھی ہجرت ہے۔ ہجرت یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔

ہجرت صرف نقل مکانی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک طویل پروسیس (عمل) ہے

ہجرت کسی خاص واقع کا بیان نہیں ہے یہ تو ایک پروسیس (عمل) چلا آ رہا ہے جس کی ایک کڑی یہ بھی ہے اور اس کے لیے اس کی خاص اہمیت بتائی گئی کہ انسان اتنا کچھ ترقی کرنے کے باوجود اس کے پاؤں میں جو زنجیریں پڑی ہوئی ہیں وہ زنجیریں آج بھی اتنی سخت ہیں کہ کچھ چیزوں کو چھوڑ بھی دے لیکن نظریاتی اور حاکمانہ زنجیروں کو انسان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ جو آپ کی نیشنلزم ساری دنیا میں ہے' یہ وطن کی محدودیت یا اس کی زنجیروں کی بناء پہ قائم ہے اور یہی وہ وجہ ہے کہ حاکم قوم' محکوم قوم کے فرد کو وطن بھی چھوڑنے نہیں دیتی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے جا کر کیا کہا تھا؟ یہی کہا تھا کہ میں تمہارا کچھ چھیننے کے لیے نہیں آیا' میں تمہاری مملکت نہیں لینا چاہتا' تمہیں یہ سب کچھ مبارک ہو' میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ جو محکوم قوم ہے اس کو اس وطن سے لے کے نکل جاؤں' تمہارا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ کہنے لگے: جی! کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر محکوم قوم یہاں سے چلی جائے تو ہم حکومت کس پہ کریں گے۔ وہ ریت کے ٹیلوں پر وطن نہیں چھوڑنے دیتے۔ آپ نے کہا تھا کہ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (29:26) میں اُس فضا کی تلاش میں نکل کر جا رہا ہوں جو میرے خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لیے ساز گار ہو۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے یہ تو اس سلسلہ ادراک کی یوں کہیے کہ کم از کم اس وطن میں یہ آخری کڑی تھی۔ ابتدا کس سے ہوئی تھی' وہی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے کہ یہ جتنے بھی خدا تھے آج ان کا اقتدار چمک رہا ہے' کل ہی ختم ہو جائے گا اور میں کبھی انہیں خدا نہیں بنا سکتا۔ جو آج ہیں کل ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) میں ہر شے کی طرف سے قطع تعلق کر کے' اپنا رخ موڑ کر' اس ایک نصب العین کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جو میرے اس خدا کا متعین کردہ ہے' جو بغیر کسی پہلے ساز و یراق کے' کائنات کو وجود میں لایا اور اس طرح ہر طرف سے قطع علائق کرنے کے بعد میں ایک کا ہوتا ہوں وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (6:79) میں اس کے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یوں میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں مشرک نہیں ہوں۔ مشرک وہ نہیں ہوتا' عزیزانِ من! اور اگر اس کو بھی ساتھ رکھا ہوا ہے اور اُس کو بھی ساتھ رکھا ہے تو یہ تو توحید نہیں ہے۔ پہلا اعلانِ ابراہیمی علیہ السلام پہلا اعلانِ ہجرت یہ ہے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا (6:79) اس آیت میں حَنِیْفًا آیا ہے۔ ناک کی سیدھ جانے والا جو ہے اسے حنیفاً کہتے ہیں: اِدھر

اُدھر جو دیکھے بھی نہیں، چلتے ہوئے راستہ بدلنا تو ایک طرف رہا، نگاہ کا رخ بھی اِدھر اُدھر نہ ہو وہ ہوتا ہے حنیف۔ یہ چھوٹی ہجرت ہے۔ ہر ایک سے قطع علائق، ایک منزل کیطرف رخ موڑ لینا، یہ اعلانِ ابراہیمی علیہ السلام ہے۔ آج بھی آپ کے ہاں یہ اعلان کیا جاتا ہے یہی آیت پڑھی جاتی ہے، آپ شاید یہ دیکھنے کے لیے انتظار کر رہے ہوں کہ یہ کہاں کیا جاتا ہے، اِسے کون کرتا ہے۔ عزیزانِ من! اسے آپ کرتے ہیں، میں کرتا ہوں، ہر جگہ ہوتا ہے، پانچ وقت ہوتا ہے۔ یہ جو نماز کی نیت ہوتی ہے اس نیت میں پہلے یہ کہنا ہوتا ہے کہ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ (6:79) میں اپنی تمام تو جہات کا مرکز صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو سمجھتا ہوں جو...... عزیزانِ من! مشکل اے پئی ہوئی ہوندی ہیگی اے، پئی اے امام جیہڑا ہیگا، اے اوقرآت دے آخری لفظاں تے ہونداائے تے اونے چلئے جانا ہوندا رکوع اچ، تے مسئلہ اے ہیگا اے کہ رکوع تیکر اگر رَل جائے نال تے، فیر تے اک رکعت جیہڑی اے، اونچ جاندی اے، تے جے اور رکوع توں اٹھ کھلووئے تے آ رکعت وی بھگتنی پیندی اے پہلی رکعت والی وی۔ او آخری لفظاں تے ہونداائے رکوع اچ جان والا ہوندا ائے یا گیا ہو یا ہوندا ہیگا اے۔ نظر اوندا اے پئی ہور رکعت پڑھنی پے جانی اے، اونا نیت وی کرنی اے، فیر اللہ اکبر بھی کہنا ہے۔ تے فیر جس طرح نال ایہدا جھکنا ہوندا اے نا[1]۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ (6:79) بچ گئی، اک رکعت بچ گئی، بال بال بچ گئے وہ۔ وہ اعلانِ ابراہیمی علیہ السلام آج بھی ہو رہا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ یہ آپ بھی کرتے ہیں، آپ کے ساتھ میں بھی کرتا ہوں۔ عزیزانِ من! بات یوں چلی آ رہی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ لو سنبھالو تم اپنے تخت و تاج اور مناصب کو اور اپنے اس بت کدے کو بھی۔ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (37:99) میں اپنے رب کی طرف چلا، آؤ، روکو، جس میں ہمت ہے روکنے کی۔ میں اپنے رب کی طرف چلا کس بھروسے پہ چلا ہوں: سَیَهْدِیْنِ (37:99) اس بھروسے پہ کہ وہ مجھے سیدھا راستہ دکھاتا جائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین کی طرف ہجرت

یہ تھی عزیزانِ من! وہ نارِ ابراہیمی علیہ السلام اور یہ تھی اس سے نجات، یہ تھا اس سے مقصود۔ اور یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام اب اس خطہ سے منتقل ہو کے اس سرزمین کی طرف چلے گئے جو بٰرَکْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ (21:71) بڑی برکات والی زمین ہے، بڑی سرسبز و شاداب ہے، جس میں بڑے حسین امکانات مضمر ہیں اور پھر یہیں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی انتقالِ مکانی ہے، جہاں یہ پھر اس خطہ فلسطین کے اندر چلے گئے

---

[1] دشواری یہ درپیش ہوتی ہے کہ یہ جو امام ہوتا ہے وہ قرأت کے آخری الفاظ پڑھ رہا ہوتا ہے، پھر اسے رکوع چلے جانا ہوتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر رکوع تک اس (امام) کے ساتھ شامل ہو جائے تو پھر اس کی ایک رکعت بچ جاتی ہے۔ اگر وہ رکوع کے بعد کھڑا ہو جائے تو اسے پہلے والی رکعت بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ وہ (امام) آخری الفاظ پہ ہوتا ہے، رکوع میں جانے والا ہوتا ہے، نظر آتا ہے کہ ایک اور رکعت بھی پڑھنی پڑھے گی، پھر نیت بھی کرنی ہے پھر اللہ اکبر بھی کہنا ہے تو پھر جا کر، جس طرح یہ (امام) جھکتا ہے، اسی کے ساتھ اسے جھکنا ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اس آیت کو پڑھنے سے اور ایک رکعت ادا کرنے سے بچ گئے۔

جہاں اتنے انبیائے کرام علیہم السلام کا سلسلہ آیا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے انبیائے کرام علیہم السلام جن کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے اسی خطہ زمین کے اندر مبعوث ہوئے۔ یہ شام فلسطین کے علاقے اسی میں شامل تھے۔ آج تو ہم فلسطین کو یوں الگ کہتے ہیں۔ یہ اتنا ٹکڑا نہیں ہے یہ شام کا علاقہ' یہ اردن کا علاقہ یہ فلسطین کا علاقہ' یہ سارے علاقے اس زمانے میں ارضِ بابرکت کہلاتے تھے: سرسبز وشاداب زمین۔ یہ صحراؤں کے' بنجر زمینوں کے' رہنے والوں کے لیے سرسبز خطہ زمین تھا جہاں پانی اتنا بافراط ہو' دجلہ اور فرات بہہ رہے ہوں' وہاں آ کے شام کے سرسبز علاقے' فلسطین کے علاقے' ویسے گویا رہائش کے لیے بھی یہ نہایت عمدہ علاقے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہاں پھر ہم نے ان کو مملکت عطا کی تھی' ابراہیم علیہ السلام کو ملک عظیم عطا کیا۔ لفظ ''ملک'' آیا ہوا ہے۔ وہاں نبوت دی تھی اور ملکِ عظیم دیا تھا۔ یہ ہے ہجرت کا نتیجہ عزیزانِ من! حضرت ابرہیم علیہ السلام نے شام کے سرسبز وشاداب میدانوں میں ایک نئی زندگی شروع کی۔ وہ وہاں اپنے مشن میں بھی کامیاب ہوا اور وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ط وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً (21:72) ہم نے پھر اسے اسحٰق علیہ السلام جیسا بیٹا دیا اور یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا عطا کیا یعنی حضرتِ اسحاق علیہ السلام جیسا بیٹا اس کا پھر آگے بیٹا یعقوب علیہ السلام جیسا نسلِ ابراہیمی علیہ السلام۔ اور وہ صرف طبعی طور پہ ہی یہ بیٹے یا پوتے نہیں ہوئے بلکہ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ (21:72) ہر ایک ان میں سے عمدہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ صاحب! نبوت تو وہی چیز تھی' وہ بھی ہم دیتے چلے گئے اور انہیں عمدہ صلاحیتوں کے مالک بنا دیا وَ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (21:72) اور ہم نے انہیں لوگوں کی امامت (لیڈر شپ) عطا کی۔ وہ ہمارے قوانین کے مطابق' ان کی راہ نمائی زندگی کے صحیح راستے کی طرف کرتے تھے۔ پہلی چیز کیا تھی؟ صالحین کی پہلی علامت لیڈر شپ۔ یہ ان کے حصے میں آئی' امامت ان کے حصے میں آئی' وہاں وہ صرف عوام میں سے بن کے ہی نہیں رہ گئے بلکہ ان کی امامت (لیڈر شپ) کی۔

خدا تعالیٰ کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ بلند

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق دوسرے مقام پہ یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام ان تمام مقامات میں جہاں جہاں ان کی صلاحیتوں کا ٹیسٹ ہو رہا تھا پورے اترے تو اس کے بعد یہ ہے کہ اے ابراہیم علیہ السلام! ہم نے تمہیں نوعِ انسانی کی امامت کے لیے چن لیا ہے۔ اسلامی نظام بڑی چیز ہے۔ جہاں یہ اسلامی نظام قائم ہو وہاں کا رہنے والا سربراہ ہی نہیں وہ پوری قوم اور پوری امت کا امام ہوتا ہے۔ وہاں یہ نہیں ہوتا کہ ہیڈ آف دی اسٹیٹ صرف امام ہوتا ہے' وہ پوری کی پوری قوم ہوتی ہے' یہ باقی نوعِ انسانی کی امامت کے لیے ان کی امام ہوتی ہے۔ کس قوم کے حصے میں یہ لیڈر شپ آتی ہے؟ اس کے حصے میں جو يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (21:73) ہماری وحی کے مطابق ان کی راہ نمائی زندگی کے صحیح راستے کی طرف کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت کاہے کے لیے عطا ہوتی ہے؟ کیا اچھے بھلے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے؟ کہا کہ نہیں' بلکہ غلط رستے پہ چلنے والوں کو يَهْدُوْنَ (21:73) صحیح راستہ دکھانے کی لیے۔ یہ ہوا مقصد اس مملکت کے قیام کا۔ یعنی

صحیح راستہ دکھانے کے لیے۔ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِمۡ (21:73) اور وہ وحی کے ذریعے صحیح راستہ دکھایا جاسکتا ہے۔ ہم نے ان کی طرف وحی کی۔ اس میں کیا چیز رکھی؟ کہا کہ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ (21:73) یہ ''خیر'' کا لفظ بڑا جامع لفظ ہے۔ وہیں سے یہ خیر اور خیرات کا لفظ آیا ہوا ہے اور یہیں اس خیر سے اختیارات کا لفظ بھی تو ہے۔ قرآن کے اعتبار سے اگر یہ خیر خیرات یا اختیار والی بات آئے گی تو یہ لفظ تو شر کے مقابلے میں ہماری زبان میں بھی ہے اور قرآن کے اندر بھی آتا ہے: فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَهٗ (99:7-8) یہاں شر ہے۔ اس کا ترجمہ Evil کیا جاتا ہے۔ Evil کے خلاف جو کچھ بھی ہوگا' وہ خیر ہوگا۔ میں نے کہا ہے کہ اس مملکت کو اختیارات بھی اسی لیے دیئے جاتے ہیں کہ یہ شر کو رد کرے اور خیر کو پھیلائے۔ یہاں کہا ہے کہ اوحینا (21:73) ہم نے ان کی طرف وحی کی۔ یہ نہیں ہے کہ جسے تم خود ہی خیر سمجھ لو' اسے خیر کہنا شروع کر دو۔ نہیں' بلکہ اس کے لیے ہم نے تمہاری طرف وحی کی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ پنجابی میں آ کے تو یہ چیزیں ذرا موٹی موٹی سی ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک بڑی کھردری قسم دی قوم ہیگی اے۔ اے خیر جیڑا اسی کھیر آ گیا: پا ئیں کڑیئے فقیر نوں کھیر۔ اے کھیر ہے او ہی قوم بھک منگوں کی ہوندی اے۔ خیرات کے معنی آٹے دی چٹکی۔ آٹے دی چٹکی' اوہدے وچ پا دیویں تے تیسرے کمرے اچوں فیر نانی اماں دی آواز اوندی اے: اے ہون دیاں تازیاں روٹیاں اچوں نہ دئیں' رات بچی پئی ہوئی ہیگی اے' اوہدے اچوں ٹکر پا توں۔ سیدھی جئی گل اے' عزیزانِ من![1] جو مانگنے کے لیے جاتا ہے کہ Beggers are no choosers۔ ان میں تو اختیار ہوتا ہی نہیں' وہ تو خیر کو پہلے پیچھے چھوڑ کے آتے ہیں' جب جھولی پھیلاتے ہیں تو ٹھیک ''جیہی روح ایہو جئے فرشتے خیر منگن والے او ہے جئے' خیر پون والے بھی او ہے جئے۔ اور اے ترجمہ اور اے تصور ہو گیا خیر دین تہاڈے۔[2] قرآنِ کریم نے کہا تھا: فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ (21:73) اور خیر سے ذرا آگے۔ حسین ادبی زبان میں' وہ تو خیرات ہے اور خیرات کے کام۔ اور خیرات کا آپ کو پتہ ہے کہ اس کا ترجمہ Charity ہوا۔ چل بھئی بھک منگوں کی قوم بنی یعنی یہ جو اختیارات تھے ان کا تو قصہ ہی ختم ہوا' زیادہ سے زیادہ ''کھیر'' نہ سہی' خیرات تو آپ جانتے ہیں کہ پھر کیا ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں خیرات کا مروجہ مفہوم

آپ کے ہاں خیرات سب سے بڑی نیکی ہے۔ اب صورت یہ بنی کہ پہلے تو آپ کے ہاں اس قسم کا ایک طبقہ ہوگا جنہیں خیرات دی

---

[1] یہ بڑی ''کھردری'' سی قوم ہے۔ یہ جو ''خیر'' تھا یہ ''کھیر'' (بھیک) ہوا: اے لڑکی! فقیر (بھک منگے) کو ''کھیر'' (بھیک) دے دو۔ یہی قوم بھیک منگوں کی ہوتی ہے۔ ''خیرات'' کے معنی آٹے کی ''چٹکی'' دنیا ہوئے۔ اسے آٹے کی ''چٹکی'' دے دینا۔ تیسرے کمرے سے نانی اماں کی آواز آتی ہے: یہ ابھی پکی ہوئی تازہ روٹیوں سے نہ دینا جو رات کی بچی کھچی روٹیاں ہیں ان میں سے دینا۔ عزیزانِ من! سیدھی سی بات ہے کہ

[2] جیسی روح ویسے فرشتے۔ جیسے خیرات مانگنے والے ویسے ہی دینے والے۔ ''خیر'' دینے کا یہ ترجمہ اور یہ تصور بنا۔

جائے گی جبھی تو آپ خیرات کے کام کریں گے یعنی مستقل طور پہ آپ کے ہاں اب نظام یہ ہوا کہ ایک پورا طبقہ ایسا ہو جو صبح کو اٹھ کے خیر منگیا کرے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو یا او خیر پا دیا کرے یا خیرات کے کام کیا کرے ❶ اور خیرات کا کام کرنے والا محلے کا ''چوہدری'' ہو۔ معاف رکھیے گا میں کسی کا نام نہیں لیتا' مثلاً خیراتی ہسپتال اور خیراتی دارالعلوم اور خیراتی مکاتب۔ وہ خیرات کے کام ہیں جنہیں کرنے والا ''صاحب عزت'' سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر وہ مسجد بنا رہے ہیں تو وہ حدیث موجود ہے کہ جس نے جہاں مسجد بنادی اللہ اس کو موتیوں کا گھر جنت میں بنا کے دے گا۔ قصہ ختم ہوا۔ کیا انبیائے کرام کی خیرات یہ ہے؟ نہیں' بلکہ قرآن کریم نے کہا کہ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ (21:73) ہم نے ان کی طرف خیرات کے کام کے لیے وحی کی۔ یہ خیرات کا کام کیا تھا؟ کہا کہ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ (21:73) صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرو' ایتائے زکوٰۃ کرو۔ تے گل مک گئی۔ ❷ خیرات تو ہوگئی مگر ہمارے ہاں وہ خیرات کے کام اِقَامَ الصَّلٰوةِ ہوگئی۔ اے ہوگئی مسیتاں دی نماز۔ ❸ ایتائے زکوٰۃ ہوگئی ''جناں مال جی چاہے جمع کردے۔'' ❹ جاؤ اور سال کے بعد اس میں سے وہ بھی اگر آپ ذرا سے Good (نیک) واقع ہوئے ہیں تو پورے مال میں سے نکال دؤ ورنہ فقہ کی کتابوں میں جہاں یہ لکھا ہے کہ کتنا کتنا مال نکالنا چاہیے' اُسی کے آخر میں ایک ضمیمہ ہوتا ہے اسے کتاب الحیل کہتے ہیں کہ اس میں سے رکھنا کیسے چاہیے۔ یہ جو آپ Taxes (ٹیکس) کہتے ہیں یہ دورِ حاضر کی اصطلاح نہیں ہے۔ یہ تو

اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہے لات ومنات

مروجہ فقہ کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریق کار

آپ کے ہاں فقہ کے مطابق اس میں شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال سال تک آپ کے قبضے میں رہے تو آپ اس میں یہ کریں کہ گیارہویں مہینے میاں اپنا یہ مال بیوی کو دیدے اور بیوی میاں کو دیدے یعنی بارہ مہینے ای نہیں رہن دیندے۔ لے لوکی لیندے ہیگے او۔ ❺ نہ جرم' نہ گناہ۔ یہ ہے فعل الخیرٰت' یہ ہے اقام الصلوٰۃ' یہ ہے ایتائے زکوٰۃ۔ اور آگے ہے وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (21:73) اس کا ترجمہ ہو گیا کہ وہ ہماری پرستش کرتے تھے' ہماری پوجا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے پوجا کا ایک بت بنایا ہوا تھا کہ وہ ہماری پوجا کیا کرتے تھے۔ تو یہ ساری چیزیں انبیائے کرام کی ہوگئیں۔ اس کے بعد قرآن نے کہا کہ ان کے یہ جتنے انبیا ہوئے تھے ہم نے ان کو وحی کے ذریعے

---

❶ بھیک مانگا کرے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جو یا تو خیرات دیا کرے یا خیرات کے کام کیا کرے۔

❷ کام پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔

❸ یہ ہوگئی مسجد کی نماز

❹ جتنا مال جی چاہے جمع کرتے جاؤ۔

❺ یعنی یہ بارہ مہینے مال ایک کے پاس رہنے ہی نہیں دیتے۔ لو کرلو جو کرنا ہے اور لے لو جو لینا ہے۔

حکم دیا تھا کہ خیر خیرات بانٹا کرو، نماز پڑھا کرو، زکوٰۃ سال کے بعد دیدیا کرو، اس میں یہ گیارہویں مہینے والی بات نہ کیا کرو اور ہماری پرستش کیا کرو۔ اس کے لیے ہجرت کی کیا ضرورت تھی، اسی طرح الگ تمکن کی، ملکِ عظیم کی، اوران چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔ آج ہندوستان جیسی بدترین قوم کی بدترین غلامی کے اندر بھی مسلمان کو ان چیزوں کی اجازت ہے تو انبیائے کرام کو یہی چیزیں وحی کے ذریعے کہی جاتی تھیں۔

انبیاء کی وساطت سے نظامِ رشد وہدایت کا اصل مقصد

عزیزانِ من! یہ نظام رشدوہدایت اور کائنات کے سارے نظام کے علی الرغم، خدا کی طرف سے ایک نظام کے لیے، براہِ راست کسی کو وحی کا علم دینا اور اس کا اس طرح سے نظام قائم کرنا کیا کوئی انقلابی بات نہیں؟ تو کیا یہ سارا سلسلہ اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور انبیائے کرام علیہم السلام کا یہ سارا تذکرہ کیا، وہ اس لیے تھا کہ وہ ہماری پوجا یا پرستش کرتے تھے؟ نماز پڑھا کرتے تھے، سال کے بعد زکوٰۃ دیدیا کرتے تھے اور خیر خیرات کے کام کیا کرتے تھے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے (لنا عٰبدین) کے الفاظ نے تو سارا مسئلہ حل کر دیا۔ کاہے کے لیے یہ ہجرت تھی؟ کیوں یہ اعلان ہوا تھا، آخر یہ کیا بات تھی جس کے لیے یہ مقام چھوڑ کر آپ اس مقام کی طرف جا رہے تھے؟ وہ کیا چیز تھی جس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ان کو ملکِ عظیم دیا تھا۔ کاہے کے لیے دیا تھا؟ وہ صرف اس لیے دیا تھا کہ (لنا عٰبدین) [1] وہ ہمارے سوا کسی کے محکوم نہ رہیں۔ یہ چیز تو، عزیزانِ من! کسی مخلوط حکومت میں، محکومی کے دور میں، ایسے علاقے میں، ہو ہی نہیں سکتی، خود مسلمانوں کی اپنی مملکت کے اندر بھی اگر اس میں قرآن کی حاکمیت نہ ہو تو وہاں بھی (لنا عٰبدین) نہیں ہوتا۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! **لنا عٰبدین** کا یہ اعلان تو ہمارے ہاں بھی روز ہوتا ہے۔ میں بھی کرتا ہوں آپ بھی کرتے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں۔ کم از کم نفل چھوڑ کے چوالیس مرتبہ تو پڑھتے ہی ہیں۔ کیا اعلان کرتے ہیں؟ پہلے ہی شروع میں **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) کہتے ہیں۔ یہ (لنا عٰبدین) ہے۔ یہاں حکم تھا **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** [2] (1:4) میں نے کہا کہ وہ ساری ملت ابراہیمی علیہم السلام دہرائے چلی جارہی ہے۔ قرآنِ کریم نے انبیائے کرام کے لیے **لَنَا عٰبِدِیۡنَ** (21:73) کہا تھا کہ وہ سب ہمارے احکام وقوانین کی اطاعت کرتے تھے اور ہم کہتے ہیں کہ **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** [2] (1:4) یہ چلا جا رہا ہے **اِیَّاکَ نَعۡبُدُ** (1:4) ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں کسی اور کی نہیں۔ اور یہی چیز ہے

---

[1] وہ سب ہمارے احکام وقوانین کی اطاعت کرتے تھے۔

[2] ہم تیری ہی محکومیت اختیار کرتے ہیں۔

جسے قرآنِ کریم نے وَكَانُوا لَنَا عٰبِدِينَ [1] کہا ہے۔ اور جب کوئی اس طرح کا اقرار اعتراف اور اعلان کرتا ہے تو وہ اقامتِ صلوٰۃ ہوتی ہے۔

اقامت صلوٰۃ کا مقصد ایتائے زکوٰۃ ہے یعنی نوعِ انسانی کی حد تک سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا

عزیزانِ من! یہ بھی مقصود بالذات نہیں کہ اپنے طور پہ ذاتی طور پہ اس کی عبودیت اختیار کر لی، اقامتِ صلوٰۃ بھی کر لی۔ نہیں، وہ ایک مقصد کا ذریعہ ہے۔ مقصد کیا ہے؟ ایتائے زکوٰۃ، نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ یہ تھا ابراہیم علیہ السلام کا مطلوب و مقصود۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ہجرت کی تھی۔ اس وقت اس کا شمار عام مومنین کی صف میں تھا۔ لیکن بعد میں وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (21:74) اس کے آگے ذریتِ ابراہیمی علیہ السلام سے جو انبیائے کرام علیہم السلام آئے ہیں ان کا یونہی مختصر سا تعارف کراتا جا رہا ہے۔ قرآن نے آخر میں جا کے کچھ اور بات کہنی ہے جس تک یہ لیے جا رہا ہے۔

ہجرت کے سلسلہ میں حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر

ان واقعات کو بیان کر کے حضرتِ لوط علیہ السلام کے سلسلہ میں یہ کہا کہ حضرت لوط علیہ السلام جب وہاں تھے تو اس وقت تک تو آپ نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے تو یہ ابراہیم علیہ السلام کے اوپر ایمان لائے تھے۔ یہ چیز نبوت سے پیشتر کی ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر حضرتِ لوط علیہ السلام ان سے الگ ہو کر اس خطے میں چلے گئے تھے جسے اب Dead sea کہا جاتا ہے یعنی بحرِ مردار۔ اس کے گرد و پیش کا جو علاقہ ہے Dead sea اسی کے اندر ہے۔ یہ وہاں اس قوم کی طرف چلے گئے۔ جب یہ وہاں کا قصہ آئے گا تو میں وہاں تفصیل سے بیان کرونگا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ لوط علیہ السلام کو بھی ہم نے (حکماً وعلماً) دیا تھا۔ یہ حکمت نہیں ہے، حکمًا ہے۔ حکومت عطا کی گئی اور جو حکومت تھی اس کے ساتھ علم عطا ہوا تھا۔ العلم تو قرآن کی رو سے وحی ہے۔ صرف العلم کے اندر وحی بھی آئے گی اور دیگر ذرائع سے جو انسان اکتسابی طور پر علم حاصل کرے گا وہ بھی اس کے اندر آئے گا اور اس کے بعد یہ ہے کہ وہاں بھی جب یہ صورت پیدا ہوگئی کہ وہاں کوئی امکان نہ رہا یعنی وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (21:74) وہ سرزمین، وہ قریہ، وہ بستی، وہ علاقہ کہ جہاں کے لوگ خبائث پر عمل پیرا تھے، باز نہیں آتے تھے، وہاں سے یہ ہجرت کر کے دوسری طرف چلے جائیں۔ یہاں پھر وہی "نَجَّيْنٰهُ" کا لفظ ہے۔ انہیں تو کسی آگ میں نہیں ڈالا گیا تھا، حضرت لوط علیہ السلام کو تو کسی عذاب میں نہیں مبتلا کیا گیا تھا۔ یہاں پھر نجینہ کا وہی لفظ آیا ہے یعنی ان سے نکال کے دوسری محفوظ جگہ لے گئے۔ کیونکہ اِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِينَ (21:74) وہ قوم صحیح راستے کو چھوڑ کر بڑی خراب راہوں پر چلنے والی تھی یعنی وہ قوم بڑی ہی ناہمواریاں پیدا کرنے والی تھی، فاسق تھی۔

---

[1] وہ سب ہمارے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے تھے۔

لفظ فاسق کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! ان الفاظ کا مفہوم بہت دفعہ درس میں آچکا ہے۔ چند لفظوں میں دہرادوں۔اس سے تجدید یادداشت ہو جاتی ہے۔ ہر پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے وہ پھل اس چھلکے کے اندر نشوونما پاتا ہوا' شباب تک پہنچ جاتا ہے یعنی وہ پک جاتا ہے۔ پھر یہ وہی ہے جسے پھل کہا جاتا ہے اور جب کسی پھل کا اوپر سے وہ چھلکا پھٹ جائے یا جب وہ اُسے اندر سے پھاڑ دے تو پھر وہ شاخ پر رہنے کے باوجود گل سڑ جاتا ہے' پکتا نہیں ہے۔ ❶ قرآن نے انسانی ذات کی صلاحیت کے لیے ایک پیٹرن تجویز کیا ہے جو پھل کے چھلکے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پیٹرن وہ حدود اللہ ہیں' اللہ کی مقرر کی ہوئی وہ حدود ہیں جن کے اندر اگر وہ رہتا ہے تو اس کی صلاحیتیں نشوونما بھی پاتی ہیں' برگ و بار بھی ہوتی ہیں' پکتی بھی ہیں' ثمرِ بہشت بن جاتی ہیں۔ پھر اگر وہ ان حدود کو توڑ کے' اس چھلکے کے پیٹرن سے' باہر نکل جاتا ہے' بظاہر نظر آتا ہے کہ بڑا زورآور ہے' اُسے کیڑے کھا جاتے ہیں' سڑ جاتا ہے' گل جاتا ہے' پکتا نہیں ہے۔ عرب ایسے پھل کو جو اپنے اس چھلکے کو توڑ کے ایک طرف کو نکل جائے' فاسق کہا کرتے تھے۔ اب ہمارے ہاں جو فسق و فجور آپ سمجھتے ہیں جس کے خلاف ملا نفرت پھیلانا چاہے' جس نے اس جیسا تہمد نہ باندھا ہوا ہو' جو وہ سڑی ہوئی مسواک جو مسجد میں ایک ہی رکھی ہوئی ہوتی ہے ہر ایک آ کے اس سے مسواک کرتا ہے اس کی بجائے برش کر رہا ہو تو یہ اس کے نزدیک فسق و فجور ہے۔ فسق و فجور میں لفظ فجور فجر سے ہے۔ فجر کے بھی یہی معنی ہوتے ہیں۔ خیر یہاں فاسقین ہے۔ ❷ اس کے بعد ہے کہ **وَاَدۡخَلۡنٰهُ فِيۡ رَحۡمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ** (21:75) اور وہاں سے ہم اسے اس مقام پہ لے گئے جہاں ہماری رحمتوں کا سحابِ کرم ضوفشاں تھا۔ وہ بھی صالحین کے زمرہ میں سے تھا۔ اس کی صلاحیت ہی برومند ہوئی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت بھی احکام خداوندی کے تابع تھی

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰى مِنۡ قَبۡلُ (21:76) ان سے پہلے نوح علیہ السلام کا بھی قصہ اسی قسم کا ہے۔ وہ بھی ایک وقت تک اپنی قوم کے اندر رہے۔ وہاں تبلیغ کی۔ اس نے بھی ہمیں پکارا اور اس کے بعد **فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ** (21:76) ہم نے اس کی پکار کا جواب دیا اور اسے اور اس کے رفقاء کو اس کربِ عظیم سے نجات دلائی۔ اسے دوسرے الفاظ میں یوں کہیے۔ ٹھیک ہے یہاں سے ایسے خطے کی طرف چلے جائیے جو مساعد ہے۔ **نَادٰى** کی بات یہی ہے۔ یہ سارا کچھ مشیتِ ایزدی کے پروگرام کے مطابق یعنی وحی کے تابع ہوتا تھا۔ نبی جو کرتا تھا از خود نہیں کرتا تھا کہ جب جی چاہے اٹھ کے کھڑا ہو جائے۔ یہ ایک واقعہ قرآن میں حضرتِ یونس علیہ السلام

---

❶ عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے **فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنۡ قِشۡرِهَا** کہتے تھے۔

❷ یعنی وہ صحیح راستے کو چھوڑ کر بڑی خراب راہوں پر چل رہے تھے۔

کا تھا کہ جس کو Calculation میں ذرا سی اجتہادی غلطی لگ گئی تھی وہ اس وقت ذرا سا قبل وہاں سے نکل گئے تھے فوراً گرفت ہوگئی تھی۔ یہ اس مشیت کے پروگرام کے مطابق ہوتا تھا' یہ سب کچھ وحی کے تابع تھا۔ یہاں کہا ہے کہ **فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ** (21:76) یہاں اھل کے معنی اہل وعیال نہیں ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہوا ہے کہ حضرت لوط کا تو بیٹا بھی ان کے اہل میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے معنی ''ان کے ساتھی'' ہیں۔ پھر یہ رشتے ہی عجیب وغریب بن جاتے ہیں۔

وحی کی بنیاد پر جماعت کی استواری اور ساتھی کا تصور

عزیزانِ من! جب یہ وحی آتی ہے' اسلام آتا ہے' قرآن آتا ہے' اہل بھی اور ہو جاتے ہیں' اہلِ بیت بھی اور ہو جاتے ہیں' آل بھی اور ہو جاتی ہے۔ یہ پہلے رشتے ہی منقطع ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے جو بھی اس کے ایمان میں' اسکے ساتھ اشتراک کرتا ہے' وہ اس کے آل میں' اہل میں' دوستوں میں' رفقاء میں' شامل ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو حقیقی بیٹے کے متعلق کہہ دیا گیا تھا کہ نہیں' یہ تمہاری غلط نگہی تھی۔ تمہارے Concept (تصور) کے مطابق تم نے سمجھا تھا کہ وہ تمہارے اہل میں سے ہے۔ وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے یعنی بیٹا بھی اہل میں سے نہیں تھا' بیوی کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ نہیں' وہ تو اُن کے ساتھ تھی۔ وہ بیوی بھی اہل میں نہیں یعنی جس کے لیے ہمارے ہاں لفظ ہی اہلیہ ہے۔ باپ بھی نہیں ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کا باپ بھی اہل میں سے نہیں' بیٹا بھی نہیں۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ حضرتِ لوط علیہ السلام کی بیوی کے متعلق بھی یہ ہے

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و فرزند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

کیا بات ہے اس شخص [1] کی! یہ رشتہ وفرزند کو بتانِ وہم وگماں کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ رشتہ ''وہم وگمان'' کا رشتہ ہے۔ بچپن میں یعنی پیدا ہونے کے ساتھ ہی کوئی بچہ آپ سے یا اپنی ماں سے بچھڑ جائے اس کا کچھ پتہ نہ ہو وہ جوان ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ دن رات بھی کہیں اکٹھے رہیں تو وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں کہ یہ باپ ہے یہ بیٹا ہے۔ وہ تو پہلے دن سے جو تعلق قائم ہوا ہے ذہن کے اندر وہی رہتا ہے وہی رشتہ موجود ہوتا ہے اور باقی سب وہم وگمان۔ دوسرے الفاظ میں یہ سب بتانِ وہم وگماں ہیں۔ یہ اہل تو بت ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایمان کے رشتے کے ساتھ اس کے معنی یہ رشتے دار نہیں ہیں۔ اس کے معنی جماعت ہے' ساتھی ہیں۔ **وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ** (21:77) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں اُس کی مدد کی۔ وہ لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ وہ بہت برے لوگ تھے سو ہم نے ان سب کو سیلاب میں غرق

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

کر دیا۔ اسے دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اور ہم نے ان کو بھی اس قوم کے اوپر غالب کیا۔ وہ قوم بھی بڑی فاسق سی قوم ہے۔ سوءٍ کا لفظ تو بار بار آتا ہے آخر کار یہ ناہمواریاں پیدا کرنے والی قوم خود ہی تباہ ہوگئی۔ یہ سلسلہ دراز آگے بڑھ رہا ہے یعنی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے حضرت اسحق علیہ السلام سے یعقوب علیہ السلام اور پھر حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرتِ یوسف علیہ السلام آئے۔ وہاں تو ان کا سلسلہ یوں آگے نہیں آ رہا پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اسی ذریت کی کڑی کے اندر آتے ہیں۔ پھر وہاں سے یہ سلسلہ آگے شروع ہوا اور یہی جنہیں پھر آگے جا کے انبیائے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ انہیں اسرائیل اس لیے کہتے ہیں کہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ انبیائے بنی اسرائیل علیہ السلام میں سے پھر آگے سلسلہ یہ چلا اور اس کے بعد ذکر آتا ہے: وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ (21:78) حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا۔ وہ بڑی شان و شوکت و دولت و حشمت کے مالک انبیائے کرام علیہم السلام تھے۔ ویسے میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ ہر نبی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اس کو حکومت عطا کی' ملکِ عظیم دیا۔ ان میں سے کوئی بھی بھک منگا خیرات کے ٹکڑوں پہ پلنے والا نہیں تھا لیکن حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر تو خاص طور پہ دنیا کی تاریخ کرتی ہے۔ ویسے یہ جتنے بھی پیغمبر ہیں وہ تمام اولوالعزم ہیں۔ یہ ان کے لیے شہنشاہ کے الفاظ لاتے ہیں لیکن یہ تو شہنشاہِ بوریہ نشین تھے۔

بہرحال اب یہاں پھر اور قصہ آ گیا کہا کہ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (21:78) داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام بہت بڑی مملکت کے مالک تھے۔ ان کی عظیم حکومت تھی لیکن ان کی قوم اسے یوں تباہ و برباد کرنے کی فکر میں لگی رہتی تھی جس طرح کھلا ریوڑ چرواہے کے علم کے بغیر خود اپنے مالک کے کھیت کو چر کر تباہ کر دے۔ وہ قوم نظم و ضبط میں رہنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اور ہم دیکھ رہے تھے کہ داؤد و سلیمان علیہ السلام اس کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ یہ اس کا عام ترجمہ و معانی ہوتا ہے' پھر روایات میں نکل جایئے تو پوچھیے ہی نہیں کہ کیا کچھ آ جاتا ہے۔ یہ کچھ یوں کہا جاتا ہے کہ کسی کے کھیت میں کسی کی بکریاں چر گئیں۔ آگے اس کا مقدمہ چلا' بات ہوئی۔ انہوں (داؤد و سلیمان) نے اس کے متعلق فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کے لیے بھی وہ وہاں کی سب سے اعلیٰ اتھارٹی' مملکت کا بادشاہ داود سلیمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور مقدمہ جو ہے' اس کے لیے میں نے کہا ہے کہ اب وقت بھی نہیں ہے اور کاہے کو وقت ضائع کریں' پتہ نہیں اب مزید کتنے لمحے اور زندگی کے باقی ہیں۔ تفسیروں میں جا کے دیکھیے کہ کیا کیا قصے بنے ہوئے ہیں۔ بہرحال بات تو سمجھ میں نہ آئی کہ مقدمہ ان کے ہاں پیش ہو رہا ہے کہ ایہہ یاں بکریاں میرا کھیت چر گیاں نیں۔ [1] بادشاہ سلامت فیصلہ کر۔ انہوں نے فیصلہ کیا۔ قرآن کہتا ہے کہ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (21:78) ہم دیکھ رہے تھے کہ کس قسم کا فیصلہ دیتے ہیں۔ تاریخ سے پوچھیے کہ کیفیت کیا تھی۔

---

[1] ان کی بکریاں ہمارا کھیت چر گئی ہیں۔

قوانین کے بغیر اقتدار تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے

یہ بنی اسرائیل کی قوم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی بڑی سرکش ہوگئی تھی' بڑی بدلگام ہوگئی تھی' منتشر ہوگئی ہوئی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ پھر کسی ایسی قوم میں جن کے پاس کوئی اقتدار یا قوت تو ہو لیکن وہ قوانین کی رسیوں میں بندھی ہوئی نہ ہو تو اس کا نتیجہ زبوں حالی کے سوا کچھ نہیں ہوتا لہٰذا بنی اسرائیل میں یہ کیفیت پیدا ہو چکی ہوئی تھی۔ حضرتِ داؤد علیہ السلام نے جب زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو یہ قوم اس حالت میں تھی۔ انہوں نے بھی اس کے لیے کئی تدبیریں کی تھیں' پوری طرح سے ابھی کنٹرول نہیں پایا تھا کہ سلیمان علیہ السلام آئے۔ اور ہسٹری (تاریخ) بتاتی ہے کہ انہوں نے جو اپنے ہاں نظم و نسق کیا ہے تو اس قوم کے جو بڑے بڑے سرکش تھے' اپنی ہی قوم کے نہیں بلکہ مملکت کے اندر بسنے والے سرکش شیاطین بھی' ان تمام کو اپنے قانون کی زنجیروں کے اندر جکڑ لیا ہوا تھا۔

نفشت فیہ غنم اور حکومت کے معنی

عزیزانِ من! عربی زبان کے محاورے میں "نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمٌ" کے معنی ہوتا ہے" وہ ریوڑ جو گڈریئے کی پرواہ نہ کرتا ہوا خود بخود ہی بکھر جائے اور جس جس کے کھیت کو چاہے خود چرتا پھرے' گڈریا جو جی میں آئے کر لے یہ ریوڑ قابو ہی نہ آئے۔ اُسے کہتے ہیں "نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ" تو قرآن تو کہتا ہے کہ **اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ** (21:78) یہ خود اپنی قوم کے جو یہ سرکش افراد تھے وہ رسیاں تڑا کے' قانونِ خداوندی کے بھاگے ہوئے' کس کس طرح سے قوم کی کھیتیوں کو چر رہے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا اور سلیمان علیہ السلام کا دورِ حکومت

اس حالت میں داؤد علیہ السلام برسرِ اقتدار آئے۔ آپ نے ریوڑ کے ریوڑ دیکھے نہیں ہیں کہ وہ کس طرح سے قوم کی کھیتیوں کو چرتے ہیں۔ اور اس "نفشت فيه غنم" میں کیا بات ہے! ان عربوں کی کھیتیوں کو تو وہ ریوڑ بھی چرتا ہے جس کو گڈریا چراتا ہے۔ ایسا ریوڑ کہ جو گڈریئے سے سرکش ہو کے بھاگ نکلے اور وہ کھیتیاں چرنا شروع کرے۔ یہ ہے "نفشت فيه غنم"۔ یہ عجیب قوم تھی اور عجیب الفاظ ہیں۔ قرآن کے ایک لفظ نے ساری بات واضح کر دی کہ "غنم القوم" کو چرتا کون جا رہا تھا اور اس کے لیے ہے: **يحكمٰن**۔ حکم اور حکومت کے تو معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی راستے سے اِدھر اُدھر ہٹنے والے ریوڑ کو راستے کے اوپر چلاتے چلے جانا۔ کہا کہ ہم دیکھ رہے تھے کہ کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں۔ اس کے لیے پہلے داؤد علیہ السلام نے تدابیر اختیار کیں۔ وہ اتنی جلدی ان سرکشوں کو اپنے قوانین کی زنجیروں میں نہ کس سکا۔ **فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ** (21:79) داؤد علیہ السلام کے زمانے میں اس قوم کی حالت زیادہ نہ سنور سکی۔ لیکن سلیمان علیہ السلام کی سمجھ میں اس کی پوری پوری تدابیر آ گئیں۔ سلیمان علیہ السلام نے ایک تو اپنے ہاں باپ کی زندگی کا تجربہ دیکھا' پھر اسی ماحول کے اندر اس نے یہ پرورش پائی تو یہ فہم و ادراک میں ان سے آگے تھے۔ انہوں نے بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا اور ان شیاطین کو اپنی زنجیروں میں جکڑ

لیا۔ یہی تو تھے وہ غنم القوم جو چر جانے والے یہ منحوس شیاطین ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کو اس کا زیادہ علم تھا تو حکومت کے لیے علم کی بھی ضرورت ہے۔ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (21:79) ویسے ہم نے ان تمام انبیاء کو علم نبوت اور منصب حکومت عطا کر رکھا تھا۔ اس لیے یہ یاد رکھو کہ یہ جتنے بھی آئے تھے یہ دھاندلی کی حکومتیں کرنے والے نہیں تھے یہ مہاراج رنجیت سنگھ نہیں تھے۔ ان کے پاس حکم کے ساتھ علم بھی تھا فہم بھی تھا اور پھر وحی کی حدود بھی مقرر کیے ہوئے تھے۔ حضرتِ داؤد علیہ السلام کی سلطنت کی قوت اور وسعت کا تو یہ عالم تھا کہ وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ (21:79) ہم نے وہاں کے قبائل کے بڑے بڑے سرداروں کو اور قبیلہ طیر کے شہسواروں کو اس کے ساتھ کام میں لگا رکھا تھا۔ اس آیت میں تسبیح کا لفظ آتا ہے۔

ہمارے ہاں تسبیح کے موجودہ عمل کی ابتدا اور اسلامی تصوف کی آبیاری

عزیزانِ من! چلیے تسبیح کا مفہوم ہمارے سامنے ہے بس اس کے لیے کھٹا کھٹ ایک لفظ پھیرنا ہے۔ وہ ہم نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اب ہمارے ہاں تسبیح تو آ گئی بس اس کے بعد وہ یوں کرنا ہے یعنی اس کو پھیرنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں: تسبیح کے دانوں کو پھیرا دینا۔ [1] میں جیسے بتا چکا ہوں کہ عربوں کے معاشرے میں تسبیح نہیں ہوتی تھی۔ اس کو تو بدھوں نے ایجاد کیا تھا۔ وہاں سے عیسائی راہبوں نے لیا تھا اور جب یہ صدرِ اول کے بعد آپ کا دین مذہب میں بدلا اور پھر مذہب کا تصور آیا ہے۔ شام کی ان خانقاہوں میں کچھ راہب مسلمان ہوئے تھے تو انہوں نے وہاں اپنی خانقاہیں قائم کی تھیں حضور ﷺ کے کوئی ڈیڑھ سو سال بعد وہاں ان راہبوں کے جتنے مسالک روشیں عبادت کے طریقے ریاضتیں اور عبادتیں چلے یہ سارے پہلے سے موجود تھے۔ آپ کے ہاں پھر اتنا فرق ہوا یعنی وہ ان کا تصوف اور یہ اسلامی تصوف وہ پیٹر اور یہ عبدالرحمٰن وہ صومعہ خانقاہ۔ اور جیسا کہ میں نے اس دن درس میں بھی کہا تھا کہ ان کے ہاں پھیرے لیتے تھے یہ طواف کرتے ہیں۔ وہ درشن کرنے جاتے تھے یہ زیارت کرنے جاتے ہیں۔ وہ بھجن گاتے تھے یہ قوالی کرتے ہیں۔ یہ جو ساری چیزیں تھیں انہی میں یہ تسبیح آئی۔

سَبَّحَ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب عربی زبان کا جو سبح تھا تو وہاں تسبیح ہوئی اور تسبیح ہوئی وہ جو منکے پھیر رہے ہیں۔ اب آپ اپنے ہاں یہ دیکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عابد زاہد متقی پرہیزگار جتنی لمبی بڑی تسبیح ہو گی اتنا ہی بڑا وہ ہو گا۔ ہزار دانے کی تسبیح تو ہم نے بھی دیکھی ہے۔ ڈھیر لگا ہوا تھا جیسے ایک پھن والا سانپ بیٹھا ہو۔ یہ سو دانے کی تسبیح ہی ختم نہیں ہوتی مگر یہ ہزار دانے کی لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کی باتیں بھی

---

[1] تسبیح کے دانوں کا ایک دور پورا کرنا۔

ہو رہی ہیں' کھٹ کھٹ بولے جا رہے ہیں' یہ کچھ ہو بھی رہا ہے اور وہاں وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ آج کل آپ نے عربوں کے ہاں بھی جا کے دیکھا ہوگا کہ ان کے ہاں جیسے آپ کے ہاں چھڑی ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ وہ چل بھی رہے ہیں یہ کچھ بھی ہو رہا ہے۔ بہرحال یہ ان کے ہاں تسبیح پھیرنا ہوگیا۔ پھر ہے کہ **وَسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ** (21:79) اب یہاں جبال ہوگئے پہاڑ اور طیر ہوگئے پرندے۔ تو انہوں نے اس کی یہ تفسیر کی کہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کیا کرتے تھے' پرندے بھی تسبیح کیا کرتے تھے۔ ''تے اس طرح ای اے سارے ای تسبیحاں پھیر دے سن' تے حکومت کون کر دا سی۔ او تھے فیر اینا ں دیاں حکومتاں تے اللہ میاں چلوندا سی۔ ❶ حالانکہ **سبح للہ** کے معنی ہیں کہ اپنے فرائضِ منصبی جو خدا نے مقرر کیے ہیں' ان کی سرانجام دہی میں سرگرداں رہنا' ہر وقت مصروفِ عمل رہنا:

ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے

اپنے فرائض منصبی جو خدا نے مقرر کیے ہیں کے لیے چل رہے ہیں۔ انتہائی توانائی صرف کرنے کے ساتھ ہر وقت مصروفِ عمل رہنا اگر ہو تو پھر اس کے لیے سبح کا لفظ آتا ہے۔ اگر اس کے لیے پوری توانائی نہ ہو تو پھر عرب یہ لفظ نہیں بولتے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے نظام حکومت کے ثمرات

ان عربوں کے ہاں جبال اور جبل اُن بڑے بڑے سرداروں کے لیے محاورۃً آتا ہے جن کے جھنڈے گڑے رہتے تھے' متمکن ہوتے تھے' جنہیں کوئی اکھیڑ نہیں سکتا تھا۔ یہاں کہا کہ **سخرنا** داؤد علیہ السلام نے ان کو بھی مسخر کر دیا۔ یہ تھے وہ غنمِ قوم جن کو اس طرح سے مسخر کیا اور ان کی اب کیفیت یہ ہوگئی کہ داؤد علیہ السلام کے ساتھ جس طرح سے یہ اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں دن رات مصروفِ عمل رہتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ رہتے تھے اور یہ والطیر وغیرہ تو ان کے قبیلوں کے نام تھے۔ یہ نہایت تیز رفتار گھوڑے پالتے تھے اور یہ الطیر کا قبیلہ تھا۔ یہ بات ہسٹری (تاریخ) بتا رہی ہے کہ تیز رفتار گھوڑے پالنے کی وجہ سے ان کا یہ نام ہوگیا تھا اور یا ان کی وجہ گھوڑوں کی تیز رفتاری ہوگی۔ بہرحال یہ تھے وہ یہ بڑے بڑے سردار جن کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں' آپ جانتے ہیں' کہ فوج کی نقل و حرکت کے لیے یہ Vehicles نہیں تھے' جہاز نہیں تھے' یہ چیزیں نہیں تھیں' اس وقت تو یہ گھوڑے بہت بڑی چیز تھی۔ قیمت تو آج بھی ان کی بڑی ہے۔ اس زمانے میں ان کی اہمیت بھی سب سے بڑی تھی اور پھر اس طرح کے جو تیز رفتار گھوڑے ہوں' پرندوں کی طرح اڑنے والے گھوڑے' ان کی بڑی اہمیت تھی۔ جس قبیلے کے پاس یہ کچھ ہوتا تھا وہ چھایا ہوا ہوتا تھا۔ کہا کہ یہ بڑے بڑے جو سردار پہاڑوں کی طرح ڈٹے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے اور یہ اس قسم کے قبائل جو اتنا سامانِ جنگ لیے بیٹھے تھے' مسخر ہوگئے ہوئے تھے۔ تسخیر کے معنی پھر

---

❶ اس طرح یہ سب تسبیح پھیرتے تھے تو پھر حکومت کون کرتا تھا۔ پھر تو ان کی حکومتیں اللہ تعالیٰ ہی چلاتے ہوں گے۔

تابع فرمان ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ یُسَبِّحۡنَ آیا ہے یعنی وہ بھی خدا کے مقرر کردہ فرائضِ منصبی کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ وَكُنَّا فٰعِلِيۡنَ (21:79) اور یہ سب کچھ ہمارے پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ یہ حکومت ہی اسی لیے تھی اور پھر یہ فہم وادراک دیا ہی اس لیے گیا تھا۔ وَعَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّكُمۡ لِتُحۡصِنَكُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِكُمۡ‌ ۚ (21:80) اور ہم نے اسے (حضرت داؤد علیہ السلام کو) زرہ سازی کا علم بھی دیا تھا تا کہ تم اسے پہن کر لڑائی میں دشمن کے ہتھیاروں سے محفوظ رہ سکو۔

اب اگلی بات یہ آ گئی کہ خدا تعالیٰ نے زرہ سازی کا علم ان کو دیا تھا۔ زرہ بنانے کا کام اس زمانے میں بڑا اہم تھا۔ آج تو جنگ کے اندر زرہ چھوڑ کے آپ کے ہاں کے قلعے کی دیواریں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں لیکن اس زمانے میں جب صرف تیروں تلواروں سے ہی جنگ ہوتی تھی تو یہ بڑی چیز تھی۔ نظر آتا ہے کہ اس سے پیشتر یا تو اس انداز کی زرہ ہوتی ہی نہ ہوگی' یا پھر ہوتی ہوگی تو انہوں نے وہ خاص زرہ بنائی یعنی جو قرآن نے کہا ہے کہ ان کو علم بھی عطا کیا گیا' فہم بھی عطا کیا گیا تو پھر وہ بیٹھے تسبیحاں نہیں پھیرا کرتے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے یہ سوچتے تھے کہ کس قسم کی زرہ ہونی چاہیے جو ان کو محفوظ رکھ سکے (صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ) با الفاظ دیگر اس قسم کی زرہ بکتر سازی جو ہے اس کا بھی علم ان کو دیا گیا تھا۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا۔

ہمارے ہاں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق تلوار سازی کے سلسلہ میں بیان کردہ معجزے

چلیے صاحب! حضرتِ داؤد علیہ السلام کے پھر معجزے گنائے جاتے ہیں' ہماری تفسیروں میں یہی ہے کہ جس لوہے کو ہاتھ میں لیتے تھے وہ موم ہو جاتا تھا' ''پتہ نہیں او نادی اپنی تلوار کیویں بچ رہندی سی۔'' [1] اب یہ سارے لوہار ہی جتنا کچھ یہ بتاتے ہیں' ذرا سوچیے تو سہی' یہ بھی تو اس وقت لوہے کو کیا کچھ کرتے ہوں۔

اب کیا کچھ اس سے بن رہا ہے بس یہاں تو سوائے اس کے کہ معجزہ کرامت کا بڑا ہی آسان ہے اس میں عقل وفکر کو دخل ہی نہیں دینا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دی طرفوں ای ہو جاندا سی۔ کس طراں ہوندا سی؟ معجزہ ہوندا ہیگا سی۔ اے کس طراں ہوندا سی؟ تسی سے جتّاں کردے پئے ہیگے او۔ [2] معجزے میں یہ پوچھنا کہ کیسے ہو جاتا تھا مذاق سمجھا جاتا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ ہماری سمجھ میں بات نہیں آئی یہ بھی ان کا ایک معجزہ گنایا جاتا تھا کہ وہ لوہے کو لیتے تھے تو وہ نرم موم کی طرح ہو جاتا تھا پھر زرہ بنایا کرتے تھے اور آگے بڑھیے صاحب! ہمارے ہاں فقر والے آئے۔ کہا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ صاحب! میں مملکت کے مال سے کچھ نہیں لیا کرونگا' میں

---

[1] معلوم نہیں کہ ان کی اپنی تلوار کیسے بچی رہتی تھی۔

[2] کیونکہ یہ کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو جایا کرتا تھا۔ کس طرح سے ہوتا تھا؟ یہ معجزہ ہوتا تھا۔ یہ کس طرح ہو جایا تھا آپ تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

فقیرانہ زندگی بسر کرونگا' بھئی! روٹی کتھوں کھایا کرے گا کہ جی وہ زریں بنایا کرتے تھے [1] ان کو بیچ کے وہ روٹی کھایا کرتے تھے یعنی اپنی معاش کے لیے تو زریں بنا بنا کے بیچ کے روٹی کھاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بیچارے سارا دن بناتے ہونگے تو اس زمانے میں دو چار آنے کی وہ بکتی ہوگی اتنی بڑی مملکت کا بادشاہ جس کے ذمے خدا نے یہ کچھ لگایا ہوا ہے کہ جبال الطیر مسخر کرنے ہیں' اس نے اتنی بڑی مملکت کا انتظام کرنا ہے' خدا اس پہ شاہد ہے کہ تم کیا کر رہے ہو' وہ یہ اس کے ذمے تھا اور وہ بیٹھا اپنی روٹی کی خاطر زرہ دیاں کنڈیاں بنادا ہیگا سی [2] اور بڑے فخر سے اسے بیان کرتے ہیں اورنگزیب کے متعلق ہے کہ جی! وہ قرآن لکھ لکھ کے روٹی کمایا کرتا تھا یعنی سارا دن وہ قرآن لکھدا رہندا سی' رات ساری نماز پڑھدا رہندا سی' آ تا ہیں اوہدے بعد سلطنت دا بیڑا غرق [3] ہو یا وہ کوئی اور بتایا کرتے ہیں پتہ نہیں کونسا علاؤ الدین خلجی ہے' وہ ٹوپیاں بنایا کرتا تھا۔ بڑے فخر سے یہ کچھ کہا کرتے ہیں۔ حضرتِ داؤد علیہ السلام جی! وہ زریں بنایا کرتے تھے۔ کہا یہ کچھ تھا جو وہ کرتے تھے۔ (من باسکم) اس قومِ بنی اسرائیل سے کہہ رہے ہیں کہ اس قسم کے وہ تمہیں ہم نے حاکم دیئے ایسی مملکت دی' اتنا علم دیا' یہ کچھ تمہارے لیے وہ کچھ تیار کر کے گئے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (21:80) اس پہ بھی شکر گزار نہیں ہوتے۔ اگر وہ اپنی روٹی کے لیے زریں بنایا کرتے تھے تو ان کو شکر گزار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ (21:80) یہ کچھ کیا کرتے تھے اور پھر آگے ہے وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً (21:80)۔ اسے ہم آئندہ لیں گے۔ سورۃ الانبیا کی آیت 80 تک آ گئے۔ 81 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] بھئی! روٹی کہاں سے کھایا کریں گے؟ کہا کہ جی! وہ زرہ بنایا کرتے تھے۔

[2] زرہ کی کنڈیاں بنایا کرتا تھا۔

[3] وہ سارا سارا دن قرآنِ کریم لکھتا رہتا تھا' ساری رات نماز پڑھتا رہتا تھا اس کے بعد اسی لیے سلطنت کا بیڑہ غرق ہوا۔

دسواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 81 تا 88)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ
عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ
حٰفِظِيْنَ ﴿٨٢﴾ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ
فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى
لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ
رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ
فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا
لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1976ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 81 سے ہو رہا ہے: (21:81)۔

مذہب کی دنیا میں خدا کے مقرب بندوں کی زندگی بھر کی مصروفیات

سابقہ آیات میں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا تذکرہ جلیلہ چلا آ رہا ہے۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں خدا کے مقرب بندوں، جنہیں متقی پرہیزگار کہتے ہیں، کا زندگی کا پروگرام یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت عبادت میں گزار دیتے ہیں اور عبادت کو اگر سمٹائیے یا اس کی تفصیل بھی پوچھیے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ صائم الدہر ہوتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، روز مصلے پہ بیٹھے رہتے ہیں، نفل پڑھتے رہتے ہیں، نمازیں تو بہرحال یہی ہوتی ہیں، باقی اوقات میں وہ نوافل ادا کرتے رہتے ہیں، ورد وظیفے کرتے ہیں، تسبیح پھیرتے ہیں، اور اس سے ذرا آگے بڑھیں تو لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ خدا کے مقرب بندوں

کا اس سے زیادہ کچھ تصور ہی نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں، اسی طرح، صرف خدا کی عبادت کا، نیکی اور پرہیزگاری کا، تصور ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام مومن یا خدا کے مقرب بندوں کی یہ علامات ہیں تو حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق تو پھر یہ ہے کہ ان کے نام اسی زمرے میں سرِفہرست آتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ مقرب ہونگے وہ اسی پیمانے، اندازے اور معیار کے مطابق سب سے زیادہ خدا کے عبادت گزار ہونگے، زیادہ روزے رکھیں گے، ان لوگوں سے زیادہ نفل پڑھیں گے، زیادہ ورد وظیفہ کریں گے، زیادہ مصلے پہ بیٹھیں گے، زیادہ تسبیح پھیریں گے، اور پھر باقی وقت وعظ و نصیحت کرتے رہیں گے۔ تو یہ ہے تصور جو دیا جاتا ہے۔

انبیائے کرام مذہب کا نہیں بلکہ دین کا پروگرام لے کر آئے تھے

عزیزانِ من! انبیائے کرام دین لے کر آتے تھے اور دین تو ایک انقلاب چاہتا ہے۔ وہ ایک نیا نظام دنیا میں مسلط کرتے تھے، اس دین کا تمکن کرتے تھے۔ یہ وہ نظام تھا جو خدا کی وحی کے خطوط پر متشکل ہوتا تھا۔ وہ انسانی زندگی کے اندر ایک انقلاب لاتے تھے۔ انسانوں کو ایک دوسرے نہج پر زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھاتے تھے۔ یہ بہت بڑے آسمانی انقلاب کے داعی ہوتے تھے۔ اب اسی لیے آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم میں ایمان اور اعمالِ صالح کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا گیا ہے یعنی اس زمین کی حکومت۔ سورۃ النور کی وہ (24:55) آیت ہے جس میں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے بات شروع ہوتی ہے۔ انہیں کہا کہ ان کی ذریت میں جو انبیائے کرام علیہم السلام آئے تھے انہیں ملکِ عظیم عطا کیا گیا تھا، انہیں عظیم مملکت عطا کی گئی، انہیں **اید و ابصار** کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ ابصار بصیرتیں ہیں، دانش مندی ہے، دیدہ وری ہے، علم و حکمت ہے، اور اس کے ساتھ قوت بتایا گیا ہے کہ صاحبِ قوت تھے، وہ صاحبِ اقتدار تھے، صاحبِ ابصار تھے عزیزانِ من! وعظ اور نصیحت کے لیے کسی قوت کی ضرورت نہیں ہوتی، نفل پڑھنے کے لیے، روزے رکھنے کے لیے، تو کسی اقتدار کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مملکت کے انتظامات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا عملی کردار

ان کی خصوصیات کے حامل افراد میں سے مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو لیجیے۔ قرآن میں یہ کہا ہے کہ جب وہاں قحط پڑا تو انہوں نے جا کے خود بادشاہ سے یہ کہا کہ یہ قحط، یہ مہنگائی، یہ مصائب اس لیے آئے ہیں کہ تمہارا زمین کا انتظام صحیح نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا انتظام کیسے کرنا چاہیے۔ یہ شعبہ میرے سپرد کرو اور دیکھو کہ کس طرح سے یہ قحط سالی خوشحالیوں میں بدل جاتی ہے۔ خدا کا ایک نبی ہے اور وہ یہ چیز کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ زمین کے معاملات کا نظام کس طرح سے صحیح خطوط پر متشکل ہو تو پھر یہ حالات پیدا نہیں ہو سکتے اور جیسا کہ تورات میں ہے انہوں نے پہلی چیز یہ کی تھی کہ زمین بڑے بڑے سرداروں کی ذاتی ملکیت سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لی تھی اور پھر اسکی پیداوار کو ربوبیتِ عامہ کے لیے، اقدارِ خداوندی کے مطابق، جب تقسیم کیا گیا ہے تو سارا ملک خوشحال ہو گیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ

وعظ ہی نہیں کہنے آتے تھے' نفل پڑھنے کے لیے نہیں آتے تھے یہ تو موجود ہے کہ انہوں نے خود یہ کہا اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی وہ پوری داستان تو ہے ہی ایک انقلابی ٹکراؤ۔ وہ اتنی بڑی مملکت کے خلاف ایک انقلابی ٹکراؤ ہے' وہ ایک محکوم اور غلام قوم کے درمیان ٹکراؤ ہے جس میں اس محکوم اور غلام قوم کو وہ فرعون جیسے مستبد بادشاہ کی غلامی سے نجات دلا کے' نکال کے لے آتے ہیں۔ وہاں سے ایک الگ خطے کے اندر آ کے وہ مملکت قائم کرتے ہیں۔ ❶

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ نیز حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلمان علیہ السلام بطور ایک انقلابی حاکم

عزیزانِ من! یہ ایک ایسی عظیم مملکت ہے کہ پھر جس کے اندر حضرتِ داؤد علیہ السلام اور حضرتِ سلیمان علیہ السلام جیسے بادشاہ' کی مملکت آتی ہے۔ یہ ایسے بادشاہ ہیں کہ جو دنیا کی تاریخ کے اندر' مملکت کے اعتبار سے' بلند ترین مقام رکھتے ہیں یعنی ہم تو ان کو انبیائے کرام علیہم السلام کی حیثیت سے مانتے ہیں' ایمان لاتے ہیں لیکن دنیا کے مؤرخ انہیں عظیم ترین انقلابی انسان اور بہت بڑے حکمرانوں کی حیثیت سے ان کا تعارف کراتے اور ان کی تاریخ لکھتے ہیں۔

انبیائے کرام کی مخالفت کی اصل وجہ ان مخالفین کے خودساختہ نظام کی بقا تھی

قرآنِ کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ ہم نے انبیاء بھیجے وہیں یہ بھی کہا ہے کہ ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں **وَاَنْزَلْنَا** (57:25) اور **اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ** (57:25) اور اس کے ساتھ شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی بھیجی تو وہ اس دنیا کے بسنے والے انسانوں کے نظام میں ایک تبدیلی اور انقلاب لانے کے لیے آتے تھے کیونکہ وہ انقلاب وحی کے مطابق خطوط پر متشکل ہوتا تھا۔ صرف اس اعتبار سے وہ دوسرے داعیانِ انقلاب سے مختص اور منفرد ہوتے تھے' ورنہ یہ بڑے عظیم انقلابی انسان ہوتے تھے اور ان کی جو اتنی بڑی مخالفت ہوتی تھی وہ ہمیشہ مترفین کے طبقے سے' سرمایہ داروں کے طبقے سے' مذہبی پیشوائیت کے طبقے سے' اور خود ملوکیت کی طرف سے ہوتی تھی۔ یہ اتنی بڑی سخت مخالفت ان کی وعظ و نصیحت اور نوافل کے اوپر نہیں ہوتی تھی۔ فرعون نے اپنی آبادی کو' اپنے باشندوں کو' اپنے وزراء کو' اپنی Cabinet کو یہ کہا تھا کہ تم جانتے نہیں ہو کہ یہ دو بھائی کیا چاہتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں مملکت سے نکال کے یہاں اپنا اقتدار قائم کریں۔ سابقہ آیات میں ہمارے سامنے یہی حضرات آ رہے ہیں۔ اسی طبعی زندگی کے ساز و سامان کو ساتھ لیے ہوئے ہیں۔ حضرتِ داؤد علیہ السلام کا قصہ ہے تو ان کے متعلق یہ بتایا ہوا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے سردارانِ قوم کو اپنے تابع تسخیر بنا لیا تھا اور وہ ان کے پروگرام میں شامل ہو کے پھر اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

---

❶ اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: منظور الحق' ڈاکٹر (ایڈیٹر): مطالب القرآن فی دروس القرآن سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ۲۰۰۵ء

مذہب کی لغت' قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہی بدل دیتی ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں تو مذہب میں چونکہ یہ تصور نہیں ہے اس لیے قرآن کی ان آیتوں کو بھی پھر یہ معنی پہنائے گئے کہ پہاڑ ان کے ساتھ **یسبحن** (21:79) تسبیح کیا کرتے تھے یعنی وہ پہاڑ پہلے تو کوئی اور کام کیا کرتے تھے' جب نبی آ جاتا تھا تو پھر وہ بھی تسبیح پھیرنے لگ جاتے تھے۔ مذہب میں آ کر ان الفاظ کے معنی بدل جاتے ہیں وہ مذہب ان سب کو اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ سبح کے معنی ہیں: ''سرگرمِ عمل رہنا'' اب سرگرمِ عمل رہنے کی بجائے تسبیح پھیرنا ہو جاتا ہے' عبادت کے معنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی بجائے پرستش اور پوجا پاٹ ہو جاتا ہے۔ بس ذرا یہ معنی بدل دیجیے' دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے پھر ان حضرات کے پروگرام اسکے مطابق ڈھلتے ہیں' ان کی شخصیتیں ان پیکروں کے اندران سانچوں کے اندر ڈھلتی ہیں پھر وہ مذہبی پیشوائیت کے مقام پہ پہنچ جاتے ہیں جس میں پہاڑ بھی تسبیح کرتے تھے۔ والطیر کے معنی پرندے ہو گیا اور کہا کہ پرندے بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے یعنی اب یہ سارے ہی تسبیحاں پھیرنے لگ گئے۔ اس معاملے میں تاریخ میں بھی نہیں دیکھا جاتا کہ یہ جو چیزیں تھیں' یہ جو طیر تھے' یہ کیا تھے؟ اسی طرح ہدہد کا قصہ آئے گا تو یہی ہدہد ''پکھی ہے جنوں اسی کیندے ہیگے آں۔'' [1] یہ ہدہد ہو جائے گا۔ یہ پھر ملکہ سباء کی طرف جائے گا پھر اس کا تخت لے آئے گا۔ یہ سارا قصہ جتنا بھی آئے گا یہ معجزات ہو جائیں گے کیونکہ اس کے لیے تو آپ Reason (دلائل و براہین) کی بناء پہ تو کچھ سمجھ نہیں سکتے' علمِ بصیرت کی بناء پہ کچھ سمجھا نہیں سکتے اور جہاں بھی آپ کا Reason ختم ہوتا ہے اگر وہاں انبیائے کرام علیہم السلام ہیں تو معجزہ آ جاتا ہے اور اگر اولیائے کرام علیہم السلام ہیں تو کرامت آ جاتی ہے یا اگر عام لوگ ہیں تو چانس آ جاتا ہے کہ اتفاقیہ ایسا ہو گیا۔

دنیا میں ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور کوئی چیز بھی اتفاقیہ نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اسے یوں کہیے کہ میں اس کا سبب (Cause) معلوم نہیں کر سکا۔ یہاں کوئی بات یا کوئی چیز اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کا خود یہ ارشاد ہے کہ ہم نے جو یہاں قوانینِ فطرت بنائے ہیں ہم بھی ان کے خلاف نہیں کرتے۔ ضرورت تو اس امر کی ہوتی ہے کہ آپ دریافت کریں کہ جو کوئی Effect (علت) پیدا ہوا ہے' جو واقعہ رونما ہوا ہے' اس کا Cause یا سبب کیا ہے کیونکہ خدا نے یہ کہا ہے کہ یہاں تو بغیر سبب کے کوئی بھی Effect (علت) پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کہنا یہ چاہیے کہ ہم ابھی تحقیق نہیں کر سکے چنانچہ جب علمی تحقیق اور آگے بڑھے گی تو وہ ان کے اسباب کا پتہ لگا لے گی۔

عزیزانِ من! جسے ہم چانس کہتے ہیں' وہ بھی اس لیے چانس ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا سبب (Cause) معلوم نہیں ہوتا۔ یاد رکھیے اس

---

[1] جسے ہم پرندہ کہتے ہیں۔

کائنات میں ایک چیز ایسی ہے جو ہم Cause and Effect (سبب اور علت) سے نہیں سمجھ سکتے اور وہ ہے: پہلے پہل اس کائنات کا عدم سے وجود میں آ جانا۔ یہ چیز ہمارے کائناتی اسباب میں نہیں آتی۔ ہم اس کے مادی یا طبعی سبب یا Cause نہیں معلوم کر سکتے۔ اس کا کوئی Cause ہوتا نہیں ہے یہ جسے آپ Origin of the Universe (آغازِ کائنات) کہتے ہیں' اس کے لیے خدا نے یہ کہا ہے کہ اس طرح سے ہم اس کا Origin (آغاز) تو لے آئے کہ اس سے پہلے نہ کوئی میٹریل (مواد) (Material) تھا' نہ کوئی Cause (سبب) تھا لیکن جب ہم اسے لے آئے ہیں تو یہاں اب ہر Effect (علت) کا Cause (سبب) ہوگا اور وہ ہمارا مقرر کردہ ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جس چیز کو آپ یہاں یونہی کہہ دیتے ہیں کہ اوپر سے شروع (Originate) ہوئی ہے تو اسے معجزہ کہا کیونکہ اس کا آپ سبب نہیں بتا سکتے۔ یہ کرامات ہو گئیں کیونکہ معتقدین اس کا سبب نہیں بتا سکتے۔ اس سے نیچے' عام دنیا میں اتر یئے تو وہ اتفاق سے ہو گیا' کہا کہ صاحب! یہ چانس ہے یہ چانس سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اتفاق کی تو آپ جانتے ہیں کہ مضمون لکھایا کرتے تھے: اتفاق کی برکات۔ تو اتفاق کی تو بڑی برکات ہوتی ہیں۔ صاحب! گھروں کے اندر اتفاق ہو تو قوموں کے اندر برکت ہو لیکن اتفاق کے تو نقصانات بھی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ ہر روز اتفاق سے موٹروں کے حادثے ہو جاتے ہیں' گاڑیوں کے حادثے ہو جاتے ہیں' اتفاق سے آدمی یونہی مر جاتا ہے' تو ہمارے ہاں تو اتفاق بس اسی معنی میں ہی آتا ہے: یہ اتفاقیہ ہو گیا: کسی حادثے کا سبب نہیں' بس اتفاقیہ ہو گیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ لہٰذا یہ کہہ کے چلے گئے اور پھر جو اوپر والے ذمہ دار ہیں' انہوں نے بھی یہ کہہ دیا کہ It is just an accident (یہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے)' چل بھئی! قصہ ختم ہوا۔ وہاں سے ہم آگے نہ بڑھے۔ لہٰذا ان چیزوں کی بات سمجھ میں نہ آئی۔

غور و فکر کی محنت اتفاقات کی گتھیوں کو سلجھا دیتی ہے

عزیزانِ من! فکری طور پہ کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے تو بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اِن کے نزدیک تو یہ قصہ' یہ معجزہ ہے' جیسے حضرت صاحب نے فرمایا کہ یہ کرامت ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟ یہ چانس ہے۔ بات ایک ہی کہنے کی ہے کہ یہ اپنے ذہن کی شکست ہے: اگر یہ معجزہ ہے جس کے معنی عجز ہیں تو تمہارے اپنے ذہن کے عجز کا یہ اعتراف ہے' عزیزانِ من! ورنہ یہاں کوئی چیز بھی خدا کے قانون کے خلاف نہیں ہوتی' نہ یہ جبال تسبیحاں کرتے تھے' نہ پرندے تھے جو ان کے ساتھ تسبیحاں پھیرتے تھے۔ تاریخ سے پوچھو کہ وہ کس طرح سے ان قبائل کے نام بتاتے ہیں جیسے میں نے انہیں قبیلہ طیر کہا تھا۔ تاریخ میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ تیز رفتار گھوڑے پالتے تھے' شاید اس بناء پہ ان کے یہ نام تھے۔ یہ سب کچھ تھا۔ اسے تاریخ میں تلاش کرو۔ اور پھر میں نے پچھلی [1] دفعہ زرہ بکتر کا بتایا تھا کہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانے کا علم سکھایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کاہے کے لیے تھا؟ یہ بتاتے ہیں کہ وہ اس لیے سکھایا تھا کہ وہ اپنی روٹی' روزی اس کے

---

[1] سابقہ درس میں

ذریعے کماتے تھے۔ یاللعجب! خدا کا ایک پیغمبر اور وہ بھی اتنا عظیم اور اس کے متعلق یہ بات اس طرح سے!

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی ایجادات

عزیزانِ من! حضرتِ داؤد علیہ السلام کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ اتنی بڑی شان وشوکت کے مالک تھے۔ ان کی بہت ہی عظیم مملکت تھی اور اِس عظیم مملکت کا انتظام ان کے سپرد تھا لیکن بقول ان کے وہ زرہ بناتے رہتے تھے: سارا دن تے بھٹی جھونکدے رہندے ہیگے سن۔ ❶ دراصل قرآن ان لوگوں کو تو یہ بتاتا ہے کہ یہ بڑے بڑے بڑے موجد تھے' یہ ان کے ہاں کی ایجادات تھیں۔ حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ نہیں جانتے تھے کہ کشتی کیسے بنا کرتی ہے؟ کشتی بنانا بھی انہیں سکھایا۔ ان کے زمانے تک ابھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میدانِ جنگ میں تو تلواریں ہوتی تھیں اس قسم کی چیزوں سے حفاظت کے لیے زرہ بکتر بڑی چیز ہوتی تھی۔ انہوں نے اسے ایجاد کیا۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ جی! ان کے ہاتھ میں ایک معجزہ تھا اور لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ انہوں نے تو یہ کچھ بتایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد آج بھی ہر لوہار کی بھٹی میں لوہا موم کی طرح نرم ہی نہیں' پانی کی طرح بہنے بھی لگ جاتا ہے۔ میں نے گزارش کی ہے کہ جب تک آپ کا یہ Concept یا تصور نہیں آئے گا کہ یہ قرآن دین سکھا رہا ہے' آپ نہ آیات کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے اور نہ ہی یہ چیز ہوگی کہ صاحب یہ جو کچھ ان انبیائے کرام علیہم السلام نے کیا تھا وہ ہوگا کیا؟ بس پھر اس کے بعد بحثیں چلیں گی اور پھر اسی طرح سے آمین اونچے کہنے والے تھے یا آہستہ آواز میں کہنے والے تھے' ہاتھ سینے پہ باندھتے یا نیچے باندھتے تھے' کھلا رکھتے تھے' یا اس دَور میں' جواب نیا تماشا ہوا ہے کہ صاحب پانچ نمازیں تھیں' یا تین تھیں' دو سجدے تھے یا ایک سجدہ تھا یعنی امت کی ساری تباہیاں بربادیاں اس لیے آگئیں کہ اس امت نے ایک رکعت میں دو سجدے کرنے شروع کر دیئے' وہ اگر ایک رکعت میں ایک سجدہ کرلیں گے تو سارا کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

یہ وہی Concept (تصور) ہے۔ یہ مذہب کی سطح پر الجھنا ہے۔ ٹھیک ہے انہیں فقہ کے مسائل کہہ لیجیے لیکن ان چیزوں کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ دین تو یہ کچھ سکھانے آیا تھا کہ وَلِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِىۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَى الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا ‌ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَىۡءٍ عٰلِمِيۡنَ (21:81) اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے (سمندر کی تند اور تیز ہواؤں کو فنِ بادبانی کی رو سے' اس طرح) مسخر کر دیا تھا کہ وہ اُس کے پروگرام کے مطابق' اُس کی کشتیوں کو اُس سرزمین کی طرف لے جاتی تھیں جن میں ہم نے زندگی کی خوش حالیوں کا بہت سا سامان رکھ چھوڑا تھا اور ہم ہر بات کا علم رکھتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس طرح بتایا یہ ہے کہ ہمارے دیئے ہوئے علم کے مطابق یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ کیا ہو رہا تھا؟ سلیمان علیہ السلام کے لیے ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ کیا الفاظ ہیں: تَجۡرِىۡ بِاَمۡرِهٖۤ (21:81) ویسے تو ہوائیں اپنے رخ پہ چلتی ہیں' جو بھی اس کے لیے قاعدہ مقرر ہے' وہ اپنی سمت آپ مقرر کرتی ہیں۔ کہا کہ اگر ان کی سمت

---

❷ سارا سارا دن وہ بھٹی جھونکتے رہتے تھے۔

کسی طرح سے نہ بدلی جائے تو اس سے پہلے نظر آتا ہے کہ کشتیوں کے سلسلہ میں بادبانی کا جو علم تھا یا کم از کم اس علم نے جو کچھ Development یا ترقی کی ہے تو یہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا کشتیوں کا بیڑا بہت بڑا تھا' ان کے رسالے بہت بڑے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہمارے ہاں کے وضع کردہ افسانے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ان کے متعلق افسانے وضع کیے گئے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے شام کے وقت یعنی عصر کی نماز کے بعد گھوڑوں کو دیکھنا شروع کیا اور اس دیکھنے میں وہ اتنے مشغول ہوئے کہ مغرب کی نماز کا وقت ساکت ہو گیا۔ انہیں غصہ آیا' تلوار لی اور سارے گھوڑوں کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ ''اندازہ لاؤ غصہ کیہدے تے کڈن ڈئے ہوئے۔''[1] نماز کا وقت! معاذ اللہ یہ سارا افسانہ ہے لیکن اس افسانے میں بھی دیکھیے کہ یہ افسانہ نویس بیچارے بڑے خام سے تھے کہ یہ تو ان کی اپنی وجہ سے' غفلت سے' سہو سے' یہ کچھ ہوا۔ میں ان کی بات کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان کا وقت کیوں تنگ ہوا اور کیوں ان کو نماز ادا کرنے کا خیال نہ رہا اور پھر اس طرح نماز کا وقت تنگ ہو گیا اور اس پر ایسا غصہ آیا کہ انہوں نے اپنے سارے رسالے کے گھوڑوں کی ٹانگیں کاٹ دیں اور اس پہ کہا گیا کہ سبحان اللہ! اتنے اتنے قیمتی پالے ہوئے پیارے گھوڑے' انہیں اپنے ہاتھوں سے کاٹ کے رکھ دیا۔ آج تو اس قسم کی جنگ ہوتی نہیں جب کہ اس زمانے میں شکست وفتح کا دارومدار ایسے رسالے پہ ہوتا تھا اور اگر کوئی جرنیل یہ کچھ آج کرنے لگ جائے تو پھر پوچھیے نہیں کہ کی ہووے۔[2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہواؤں پر کنٹرول

عزیزانِ من! میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ جو کچھ آپ کے ہاں ہو رہا ہے آپ ذرا اس پر غور وخوض تو کیجیے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ ہم دین کو مذہب کی سطح پہ لے آئے ہیں۔ بہر حال نظر یہ آتا ہے کہ اس زمانے میں بادبانی ایک بڑا خاص فن تھا۔ اس زمانے میں یہ Ship (سمندری جہاز) وغیرہ تو نہیں تھے جو آج کے Ship (سمندری جہازوں) کی طرح Steam (بھاپ) کے زور پر ہر چیز کا مقابلہ کرتے۔ جب یہ نہیں تھا تو جہاز تو ہواؤں کی سمت پہ چلتے تھے۔ اگر ہوائیں اپنے رخ پہ چلتی رہیں تو پھر تو کشتی صرف ادھر جا سکتی ہے جدھر کو ہوا ہو۔ پھر تو آپ کو بہر حال ''چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو'' کے مصداق چلنا ہو گا یعنی جدھر کی ہوا چل رہی ہو' اپنی کشتی ادھر لے جاؤ' خواہ آپ نے کراچی جانا ہے' ہوا کابل کی چل رہی ہے' تم کابل کی طرف چلو۔ کیا کیا جائے' مجبوری ہے۔ جی! ہوا ہی ادھر کی چل رہی

---

[1] اندازہ لگاؤ کہ اپنا غصہ کس پہ نکال رہے ہیں۔

[2] کیا ہو جائے۔

ہے۔ معاف رکھیے گا یہ ہوا اپنی سمت چل رہی ہے' کیا بات ہے! کہا کہ بس اتنا ہی فرق تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے جو کچھ کیا ہے وہ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖٓ (21:81) ہے یعنی پھر ہوائیں اس کی Direction (سمت) کے مطابق چلتی ہیں۔ کتنا حسین لفظ ہے! پھر اس کی مقرر کردہ سمت پہ چلتی تھیں۔ اب بھی آپ یہ جو بادبانی کشتیاں ہیں ان کو دیکھیے کہ ان کشتیوں کا واقعی فن ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کشتی ران وہاں بیٹھے ہوئے کبھی اس پردے کو یوں' کبھی اس پردے کو یوں کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ یونہی تماشا نہیں کر رہے ہوتے۔ وہ اس طرح سے انہی کپڑوں کو اِدھر اور اُدھر کرتے ہیں کہ ہوا اِدھر کو جا رہی ہے کشتی اپنی سمت کو جا رہی ہے۔ اسی ہوا کے زور پہ وہ ہواؤں کی سمت کی قوت کو اس طرح سے اپنے ہاں کنٹرول میں لاتے تھے' اب بھی لاتے ہیں یہ بادبانی کشتیاں چلتی ہیں۔ تو یہ جو چیز تھی جو انہوں نے کیا یہ تھا۔ انہوں نے بادبانی کا ایسا فن ایجاد کیا تھا۔ یہ جانتے تھے کہ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖٓ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا (21:81) وہ ادھر آتے تھے تو اس زمین کی طرف جدھر وہ جانا چاہتے تھے کشتی ان کے حکم کے مطابق چلتی تھی۔ اگر امر کے معنی یہ لینے ہیں تو۔ ورنہ امر کے معنی Direction (سمت) ہی ہوتا ہے۔ بات ایک ہی ہے کہ اب وہ ان کے حکم کے مطابق چلتی تھی: وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ (21:81) اور ہمارے علم کے مطابق تھا جو کچھ ہوتا تھا۔

خدا تعالیٰ کے انسانی علم کو اپنی طرف منسوب کرنے کی حقیقت

یاد رکھیے! یہ جتنا علم انسان کو دیا گیا ہے' اس کی بناء پہ جب انسان کچھ کرتا ہے تو خدا اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے علم کے مطابق یعنی ہمارے دیئے ہوئے علم کے مطابق یہ ہوتا ہے' ورنہ خدا نے تو ایک جگہ یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے تمہیں کتوں سے شکار کرنا بھی سکھایا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذ اللہ اللہ میاں نے آ کے کتوں سے شکار کرنا بھی خود سکھایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کے اندر یہ صلاحیت رکھی کہ وہ یہ بھی ہمارے عطا کردہ علم کے مطابق کر سکتا ہے۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ[1] (2:3) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدم کو خدا نے خود' جسے ایک ایک چیز کا نام کہتے ہیں' بتا دیا تھا بلکہ وہ یہی ہے کہ آدم کے اندر یہ صلاحیت رکھ دی گئی تھی کہ وہ اشیائے کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ تو یہ بات بھی سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تھی کہ ان کا یہ بہت بڑا بادبانی کشتیوں کا بیڑا تھا۔ آپ دیکھیے کہ آپ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام یمن میں' جہاں ملکہ سباء کی مملکت تھی' تک آئے تھے۔ فلسطین اور شام کے علاقوں تک تو ان کے گھوڑے بھی جاتے تھے جو تیز رفتار تھے اور پھر اگر سمندر کا راستہ آتا تھا تو وہاں انہوں نے کشتیوں کے ذریعے ان کو بھی اپنے زیرِ تسخیر کر رکھا تھا۔

---

[1] انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی ہے کہ یہ اُن قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرم عمل ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع شیاطین کی ڈیوٹی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وَمِنَ الشَّیٰطِیۡنِ مَنۡ یَّغُوۡصُوۡنَ لَہٗ وَیَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِکَ (21:82) اور ہم نے بڑے بڑے سرکش قبائل کے لوگوں کو اس کا تابع فرمان بنا دیا تھا۔ وہ ان کے لیے سمندروں میں غوطہ زنی کرتے (اور اس میں سے موتی وغیرہ نکالتے) تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام کرتے تھے۔ عزیزانِ من! یہاں پھر وہ مذہب آ گیا کہ شیاطین بھی ان کے لیے مسخر تھے۔ شیاطین کیا کیا کرتے تھے؟ قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ ان کے لیے سمندروں میں غوطے لگایا کرتے تھے اور وہاں سمندر کی جو پیداوار ہوتی ہے مثلاً موتی' جواہرات' وغیرہ یا ممکن ہے مچھلیاں پکڑنے کا سارا کام بھی وہ ان کے لیے کیا کرتے تھے یعنی اب تو یہ سارے جتنے کام ہیں یہ تو عام انسان کرتے ہیں: ماہی گیر کرتے ہیں' غوطہ خور کرتے ہیں تو وہ ان کے زمانے میں یہ شیطان کیا کرتے تھے جس کا کام تو صرف انسانوں کو ورغلانا ہے تو کیا اس زمانے میں پھر یہ ان کی ڈیوٹی بدل دی گئی تھی اور وہ شیطان یہ کام کیا کرتے تھے۔ یہاں تو یہی کہا ہے کہ وہ ان کے لیے پانی میں غوطہ خوری کا کام کرتے تھے اور وہاں سے بہت چیزیں لاتے تھے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام وہ کیا کرتے تھے۔ دوسرے مقام سورۃ صٓ میں یہ چیز آئی ہے کہ وَالشَّیٰطِیۡنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ (38:37) یہ بڑے بڑے قوی ہیکل' سرکش قبائل کے لوگ ان کے لیے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیا کرتے تھے اور پھر سمندر میں غوطہ خوری بھی کیا کرتے تھے' وہ بڑے بڑے معمار تھے۔

لغت میں شیاطین کا مفہوم اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ان پر گرفت

عزیزانِ من! عربی زبان کے لغت کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ ان بڑے بڑے سرکش لوگوں کو شیاطین کہا جاتا ہے اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کے زمانے میں یہ جو پہاڑی لوگ تھے' پہاڑوں پہ بسنے والے قبائل تھے' وہ بڑے سرکش قبائل تھے' اور اس سے پہلے کبھی کسی مملکت یا سلطنت کے قابو نہیں آیا کرتے تھے' حضرتِ سلیمان علیہ السلام نے ان تمام کو زیرِ تسخیر کیا اور اسی لیے ان کی اس سرکشی کی بناء پر یہاں (38:38) میں یہ آیا ہے کہ وَاٰخَرِیۡنَ مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ (38:38) اور ان میں سے جو سرکشی برتتا تھا وہ اُسے زنجیروں میں باندھ دیا کرتا تھا۔ یہ وہ شیاطین تھے جو سرکشی کرتے تھے۔ ویسے بھی شیطان کے معنی ہیں: سرکشی کرنا تو وہ ان سرکشوں کو زنجیروں سے باندھ دیا کرتے تھے۔ وہ انہیں کاموں پہ لگاتے تھے۔ یہ ان کے معمار تھے' غوطہ خور تھے اور دیگر کام کرنے والے لوگ تھے۔ وہ ان سے یہ کام لیا کرتے تھے اور جو سرکشی برتتا تھا اسے زنجیروں میں باندھ دیا کرتے تھے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ ان کی کتنے دبدبے کی مملکت تھی۔ یہاں بھی شیاطین کہا ہے۔ ایک مقام پہ سورۃ سبا میں ان کو جن بھی کہا ہے: وَمِنَ الۡجِنِّ مَنۡ یَّعۡمَلُ بَیۡنَ یَدَیۡہِ بِاِذۡنِ رَبِّہٖ (34:12) اور وحشی قبائل اس کے تابع فرمان تھے' جو اس کے نشو و نما دینے والے کے قانون کے مطابق' اُس کے زیرِ ہدایت کام کرتے تھے اور اس کے بعد وہاں ہے کہ

وَمَنۡ يَّزِغۡ مِنۡهُمۡ عَنۡ اَمۡرِنَا نُذِقۡهُ مِنۡ عَذَابِ السَّعِيۡرِ (34:12) اور جو ان میں سے سرتابی برتتے تھے تو ان کو اللہ کے قانون کے مطابق سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جب یہ جن یا شیاطین مذہب کے معنوں میں آئے......تو چونکہ تمام مذاہب کا تو ہم پرستی پہ دارو مدار ہے اس لیے تو جن تو جنات ہو گئے اور شیاطین تو یہ سارا کچھ ہی ہیں۔

عزیزانِ من! ان عربوں سے پوچھیے کہ وہ یہ الفاظ کن معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ یہ جتنی آبادیاں نگاہوں سے اوجھل رہتی تھیں، دُور دُور پہاڑوں کے اندر، صحراؤں کے اندر، غاروں کے اندر، وہ ہر شے جو نگاہ سے اوجھل ہوتی تھی، اسے عربی زبان میں ''جن'' کہتے تھے۔ ''جن'' کے بنیادی معنی ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا ہوتے ہیں۔ عرب ان آبادیوں کو ''جن'' کہتے تھے۔ یہ آبادیاں تھیں: پہاڑوں کے سرکش انسان، یا دُور جنگلوں میں رہنے والے، نگاہوں سے پوشیدہ جنہیں آپ آج بھی Tribes خانہ بدوش وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ اس قسم کے Tribes (قبائل) عربوں کے ہاں بھی تھے۔ اس طرح ان کے ہاں جن اور انس دو آبادیاں تھیں۔ ''انس'' وہ آبادیاں تھیں جو شہروں میں موانست سے، Social animal (سماجی حیوان) کی حیثیت سے، رہا کرتے تھے۔ ''انس'' کے معنی ہی ''موانست'' ہوتی ہے یعنی باہمی مل جل کر رہنے والے اور ''جن'' کے معنی ہوتے ہیں، جو ان سے دور، نگاہوں سے دور، شہروں سے دور، آبادیاں، ہوں۔ یہی صحراؤں کے اندر رہنے والے شیاطین کہلاتے تھے۔ اب مذہب کی دنیا میں شیطان وہ شیطان ہوا اور وہ جن جنات ہوئے۔ اور اب تو وہ جن ان کے ہاں یہ کام نہیں کرتے ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں کرتے تھے کہ کہیں آ کے مکان بنا دیں، یا غوطہ خوری کریں، ہن او چنبڑ جاندے نیں آ کے۔ او اینہاں ای کم رہ گیا اے لیکن مذہب میں چنبڑ جان والے جن ای اوناں نوں نظر اوندے نیں۔ اے انسان جیہڑے چنبڑ جان والے نیں، اے نئیں اوناں دی نگاہواں دے سامنے اوندے۔ ایس واسطے ایہہ تے اے آپ ہوندے [1] نیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں شیاطین بھی لفظ آیا ہے اور ''جن'' کا بھی لفظ آیا ہے۔ دراصل یہ آبادیاں تھیں: پہاڑوں میں، جنگلوں میں رہنے والے، نگاہوں سے اوجھل رہنے والی آبادیاں تھیں اور اس دَور میں شہر ہوتے کتنے تھے؟ اس بیسویں صدی کی متمدن دنیا میں بھی عرب کے اندر سارے دو تین شہر ہیں، یعنی ابتدائی شہر تو ان کے ہاں اس دور میں مکہ اور یہ طائف ہوتے تھے اور انہیں بھی آج ہم شہر کہتے ہیں۔ وہ قصبے تھے۔ آج بھی وہاں ریاض ہے اور یہ جدہ تو بندرگاہ ہو گئی، ریاض دارالسلطنت ہو گیا۔ ان کے ہاں کا طائف تو اب بھی ایک گاؤں سا ہی ہے۔ وہ مکہ ہے جو ان کے ہاں کا مرکز ہے۔ باقی وہ سارے عربیہ میں آپ دیکھیے شہر ہی نظر نہیں آتا۔

---

[1] اب تو یہ جب انسانوں پر ''اپنا سایہ ڈالتے'' ہیں۔ بس ان کا اتنا سا ہی کام رہ گیا ہے۔ اب مذہب میں ''انسانوں پر اپنا سایہ ڈالنے والے'' جن ہی انہیں نظر آتے ہیں۔ یہ انسان جو ''انسانوں پر اپنا سایہ ڈالتے ہیں'' وہ ان کی نگاہوں کے سامنے نہیں آتے۔ اس لیے کہ یہ تو وہ خود ہوتے ہیں۔

آج بھی نظر نہیں آتا۔ اس زمانے میں ان علاقوں کے اندر بھی یہ شہر کہاں بستے تھے؟ جنگلوں میں آبادیاں ہوتی تھیں۔ انہوں نے ان آبادیوں کو بھی مسخر کیا: وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (21:82) اور ہم ان کی نگہبانی کرتے تھے کہ وہ سرکش نہ ہونے پائیں۔ عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ ان کی نگرانی کی ضرورت تھی اور وہ ہمارے ہی قاعدے کے مطابق، قانون کے مطابق، ان کی نگرانی کی جایا کرتی تھی۔ اب یہ ساری چیزیں وہ آ رہی ہیں جن کا تعلق مادی یا طبعی دنیا سے ہی ہے۔

عزیزانِ من! اس میں روحانیت اتنی ہے جتنا کہا کہ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ (21:81) ہم ہر بات کا علم رکھتے ہیں اور یہ کہ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ (21:82) اور ہم ان کی نگہبانی کرتے تھے کہ کہیں وہ سرکش نہ ہونے پائیں۔ یہ تو ہے روحانیت۔ اگر اس میں اتنی سی چیز آ جائے کہ یہ سب کچھ ہمارے قوانین کے تابع ہوتا تھا تو یہ سب چیز اسلامی ہو جاتی ہے، یہ سارا کچھ وہی رہتا ہے جو کچھ داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کیا کرتے تھے۔ اگر اقدار و قوانینِ خداوندی سے الگ ہٹ کے یہ کچھ کیا جائے تو وہ آپ کے ہاں سیکولرازم ہو جاتا ہے، وہ دنیاداری ہو جاتی ہے۔ اگر یہ چیزیں ہوں یعنی وہ "كُنَّا" ہو جو خدا نے کہا ہے یعنی ہمارے قانون اور علم کے مطابق۔ اگر یہ "كُنَّا" جو خدا نے کہا ہے (کہ ہمارے قانون اور علم کے مطابق) درمیان میں آ جائے تو دین ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کچھ کیا کرتے تھے۔ یہ تو اجتماعی زندگی کے واقعات تھے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا شیطان کے ہاتھوں مغلوب ہونا؟

عزیزانِ من! چھوٹے پیمانے پر بھی چیزیں آئیں جن کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ کہا ہے کہ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (21:83) اور اسی طرح، ایوب علیہ السلام (کا معاملہ بھی یاد کرو) جب اس نے اپنے نشوونما دینے والے کو پکارا تھا اور کہا تھا کہ خدایا! میں سخت تکلیف میں پڑ گیا ہوں اور (جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تیری رحمت کی ضرورت ہے)۔ یہ ظاہر ہے کہ تجھ سے بڑھ کر سامانِ ربوبیت و رحمت عطا کرنے والا اور کوئی نہیں۔ یہاں عزیزانِ من! حضرتِ ایوب علیہ السلام کا قصہ آیا۔ بات بالکل سیدھی سی ہے۔ وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ یہ جسمانی تکلیف ہے۔ دوسرے مقام پہ بتایا ہے کہ کیا ہوا تھا۔ ان مقامات کو ہم سامنے لے آئیں۔ دوسری جگہ ان کا تذکرہ ہے وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ (38:41) اور ہمارے بندے ایوب علیہ السلام کی سرگزشت کو بھی سامنے رکھو۔ انہی آیات میں یہ چیز نظر آتی ہے کہ وہ کہیں سفر کر رہے تھے، ساتھیوں سے بچھڑ گئے۔ آج بھی اگر ان صحراؤں میں کوئی شخص، ساتھیوں سے بچھڑ جاتا ہے تو وہ وہاں چلتے پڑتے ہی مر جاتا ہے۔ دھوپ، پانی تو ملتا ہی نہیں ہے۔ کوئی راستہ بتانے والا نہیں ہے۔ نشاناتِ راہ نہیں۔ سرگرداں مارے مارے پھر رہا ہے۔ "اوسسی تے مجبور ہوگئی کہ اوہدے اتے نظم لکھ دتی کہ تھلاں اچ ماری ماری پھر گئی او ہر تھل جیہڑا ہیگا اے اس میں اگر کوئی اکیلا تنہا رہ جائے"[1] اور راستہ بتانے والا نہ ہو اور وہ کارواں سے بچھڑ جائے تو اسی طرح

---

[1] سسی تو مجبور ہوگئی تو اس پر نظم لکھ ڈالی کہ وہ صحرائے تھل میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ عزیزانِ من! اگر ہر صحرائے تھل میں کوئی تنہا رہ جائے۔

سے وہ تڑپ تڑپ کے مرجاتا ہے۔ آج بھی مرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نـصـبٍ [1] (38:41) کی وجہ سے تھا یعنی تکان کی وجہ سے تھا۔ وہ ایک سفر میں بڑی جانکاہ مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ دیکھیے کیا چیز ہوئی ہے ان پہ! قرآنِ کریم نے کہا کہ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ (38:43) جب وہ پریشانی رفع ہوتی ہے تو ہوا یہ کہ وہ جن سے بچھڑ گئے تھے وہ مل گئے اور راستہ ایسا ملا کہ اور آبادیاں بھی مل گئیں۔ ان کو کیا ہوا تھا؟ اب یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ (38:41) ایسا ہوا تھا کہ انہیں تکان تھی (پیاس کی شدت سے نڈھال تھے) اس پر اسے "شیطان" نے ڈس لیا۔ اس طرح اسے مصائب و تکالیف کے ہجوم نے گھیر لیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی نوعیت

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو تکان بھی ہوگئی، پژمردہ بھی ہوگئے، افسردہ بھی ہوگئے اور انہیں بڑا ہی درد اٹھا اور بڑی تکلیف اٹھی "شیطان" نے "مس" کر دیا۔ ایک تو وہ خدا کا اتنا اولوالعزم نبی ہے اور دوسرا اسے شیطان نے آ کے "مس" کر دیا اور یہ کچھ ہونے لگا تو انہوں نے بڑے استقلال سے ان سب کا مقابلہ کیا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کا تو بہرحال اونچا مقام ہوتا ہے۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ جب ابلیس نے چیلنج دیا تھا کہ یہ کچھ تو تو بنا رہا ہے، آدم کو مجھ پہ فوقیت اور ترجیح دے رہا ہے، تو دیکھ کہ میں بنی آدم کو کیسے تگنی کا ناچ نچواتا ہوں تو خدا نے کہا یہ تھا کہ ٹھیک ہے تو یہ کرے گا لیکن ہمارے جو مخلص بندے ہونگے، ان پر تیرا کوئی قابو نہیں چل سکے گا۔ تو وہ جو خدا کے عام مخلص بندے ہیں ان پہ شیطان کا قابو نہیں چل سکتا چہ جائیکہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کو آ کے مغلوب کر لے اور ان کو بھی وہ "مس" کرے اور اس سے یہ کچھ ہونا شروع ہو جائے۔ اور پھر شیطان کے "مس" کرنے کا بھی ایک اہم نکتہ ہے۔ اس کا تو کام ایک ہی بتایا گیا ہے کہ وہ راستے سے گمراہ کرتا ہے۔ "اوڈھیڈ پیڑ تے نئیں پیدا کردہ ہیگا۔" [2] سوال یہ ہے کہ یہ ہوا کیا تھا۔ عربوں سے پوچھیے وہ بتائیں گے۔ ان کے ہاں شیطان ایک قسم کا پھنیر [3] سانپ ہوتا ہے وہ اسے شیطان [4] کہتے ہیں۔ شجرة الزقوم [5]

---

[1] اس کا مادہ "ن ص ب" ہے۔ بقول صاحب تاج العروس نَصَبَ، يَنْصَبُ کے معنی ہیں تھک جانا اور عاجز و درماندہ رہ جانا۔ اَلنَّصَبُ مشقت، تھکن، کوفت اور عَيْشٌ نَاصِبٌ ایسی زندگی جس میں مشقت ہو۔ اَلنَّصْبُ وَالنُّصْبُ وَالنُّصُبُ بیماری، مضرت، مشقت۔ ابتلا و آزمائش۔

[2] وہ پیٹ میں درد تو نہیں پیدا کرتا

[3] پھن والا۔

[4] تاج العروس اور لین نے اپنے انگریزی زبان میں لغت کے اندر لکھا ہے کہ شَيْطٰنٌ ایک بدصورت سانپ کو بھی کہتے ہیں اور رَءُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ ناگ پھنی تھوہر کو کہتے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی لکھے ہیں۔

[5] اَلـزَّقُّوْمُ ایک جنگلی پودا کا نام ہے جس میں کڑوی سی تیز بو ہوتی ہے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدہیئت ہوتے ہیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رَءُوْسُ الشَّيَاطِيْنِ (37:65) اس کے خوشے کا خول ایسا ہے جیسے سانپ کا پھن ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پودا ناگ پھنی تھوہر کا ہوگا۔

کے متعلق قرآن میں ہے کہ شیطان کا جو پھن ہے' اس کا جو سر ہے' وہ ایسا ہوگا۔ تو پھر وہاں یہ بھی ہے کہ شیطان کے یہ جو پھن ہوتے ہیں' وہ جو تصویر ہوتی ہے' یہ عرب اسے ناگ پھنی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی وہ پودا یوں ہوتا ہے جیسے پھنیر' بڑا سانپ' جس کے ڈنڈے کے اوپر وہ پھن ہوتی ہے۔ عربی زبان میں اس قسم کا جو درخت ہوتا تھا' وہ اسے شیطان کہتے تھے اور وہ اس لیے کہتے تھے کہ وہ اصل میں جو اژدھا پھن دار ہوتا ہے وہ اسے شیطان کہتے تھے۔ بات تو یہ سیدھی سی ہے۔ وہ صحرا' بیابان' جنگل میں تھے' شاید راستہ گم ہو گئے' ساتھی نہیں ہے' پانی نہیں ہے' تکان ہے' تھک گئے ہیں' اور اسی جنگل میں یا صحرا میں سانپ نے ڈس لیا ہے۔ عذاب کا تو پتہ چل گیا کہ سخت تکلیف تھی' درد سے کراہ رہے تھے' ساتھی کوئی نہیں تھا' سانپ کے کاٹے میں تو جو پھر پیاس کی شدت ہوتی ہے وہ تو پوچھو نہیں۔ یعنی یہ کچھ ہے۔ یہ ہے وہ جو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس حالت میں وہ انسان گرفتار ہو رہا ہے اُرْكُضْ بِـرِجْلِكَ ج (38:42) ہم نے اس کی راہنمائی کر دی۔ بات ساری یہ تھی کہ راستہ نہیں ملتا تھا' ہم نے راہنمائی کر دی اور کہا کہ ٹھیک ہے تمہیں بڑی تکلیف ہے' تکان بھی ہے' تھوڑی سی ہمت کرو' چار قدم چلو اور کہا کہ تم اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ج (38:42) تم مار گزیدہ پاؤں کو پانی میں رکھ کر ہلاؤ۔ اس سے حدت رفع ہو گی۔ عزیزانِ من! اُرْكُضْ بِـرِجْلِكَ کے معنی ہوتا ہے حرکت دینا۔ کہا: اپنے پاؤں کو تھوڑی سی حرکت دو' ہلاؤ۔ اپنے پاؤں کو ہلانا بھی اس کے معنی ہوتا ہے' حرکت دینا بھی اس کے معنی ہوتا ہے۔ پہلی حرکت تو یہ ہے۔ تو کیا ہوگا؟ کہا کہ هٰذَا مُغْتَسَلٌ م بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (38:42) یہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے۔ یہ تمہارے سامنے پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک چشمہ تھا۔ اس قسم کے چشمے ہیں۔ ایک چشمے میں تو نہاؤ۔ وہ سلفر کا چشمہ نظر آتا ہے۔ اس علاقے میں یہ چشمے ہوتے تھے۔ اس میں پاؤں دھو لو اور پاؤں کو وہاں ہلاؤ۔ یا ساتھ یہ ہے کہ وہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا۔ و شراب (38:42) پینے کے لیے ٹھنڈا پانی۔ یا یہی ہے کہ وہ ٹھنڈے پانی کے چشمے میں ذرا ہلاؤ' سانپ کے کاٹے میں بڑی حدت ہوتی ہے۔ اس کے علاج سے تھوڑی سی ٹھنڈ پڑے گی۔ پانی پیؤ' نہاؤ' تکان اترے گی' پیاس بجھے گی' درد میں' تکلیف میں' کمی ہوگی۔

ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر کی علمی سطح

عزیزانِ من! ہمارے ہاں حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق ایک آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (38:44) اور اپنے ہاتھ میں یہ کچھ تنکے لے' ان سے یہ مار اور گناہ نہ کر۔ اب کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام۔ اب آپ کے ہاں کی تفسیری روایت میں یوں آیا ہے کہ جی اس تکلیف کے زمانے میں وہ بیچاری مائی آئی۔ ہوا یہ کہ اس تکلیف دہ زمانے میں ان کی صرف بیوی ہی ان کے پاس رہ گئی' اس نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ گویا باقی سب ساتھ چھوڑ گئے تھے اور پھر جو اس کی تفاصیل آتی ہیں ان کا تو پوچھو ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جذام کا مرض تھا۔ آپ کے ہاں آج بھی صبر ایوبی ضرب المثل ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے سارے جسم میں کوڑھ پھوٹ گیا تھا' جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے اور اس کی جو مثالیں ہمیں پڑھائی جاتی

تھیں، ان میں کیفیت یہ بتائی جاتی تھی کہ اگر آپ کے جسم کے زخم سے ایک کیڑا نیچے گر جاتا تھا تو اُسے اٹھا کے پھر وہاں رکھ لیتے تھے کہ یہ خدا کا بھیجا ہوا کیڑا ہے، اس کو کیوں باہر جانے دیا جائے۔ آپ علیہ السلام کو اتنی شدت کا درد تھا کہ دوست اگر کچھ علاج بتاتے تھے تو آپ علیہ السلام بالکل نہیں مانتے تھے۔ ایک بیوی تھی جو دن رات ساتھ دیتی تھی۔ وہ گاؤں میں جا کے مشقت کرتی تھی، کسی کے گھر جا کے برتن مانجتی تھی، روٹی پکاتی تھی، وہاں سے کچھ لے آتی تھی، آپ بھی کھاتی تھی، انہیں بھی کھلاتی تھی۔ لوگوں نے انہیں باہر ''جنوں روڑی کیندے ہیگے نے'' ❶ پہ پھینک دیا ہوا تھا۔ آپ راکھ میں بیٹھے رہتے تھے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری، بیوی کی خدمت اور اس کے ساتھ آپ علیہ السلام کا برتاؤ

عزیزانِ من! ذرا غور تو کیجیے کہ یہ خدا کا اولوالعزم نبی ہے۔ اس کا یہ نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔ سچ کہا تھا کہ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستان کے لیے۔ کچھ بتانا مقصود ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ بیوی اتنی خدمت گزار تھی۔ ایک دن کہیں کسی معاملے میں اس سے کوئی دیر ہوگئی اصل کہوں تو یہ ہے کہ یہ سارا ہی افسانہ ہے۔ ان سے پوچھیے کہ تمہیں یہ چیزیں، یہ باتیں کہاں سے ملیں؟ ہاں تو ان کا ''افسانہ'' یہ ہے کہ کہیں کسی معاملے میں ان کی بیوی سے دیر ہوگئی۔ پھر کیا کہوں ان سے کوئی بات تو ہونی ہی ہونی ہے۔ اسی بیچاری سے سب کچھ ہونا ہی ہے۔ وہ ساری خدمت اِس کیڑوں والے بدن، جذامی خاوند کے ساتھ، جو روڑی ❷ پہ باہر بیٹھا ہوا ہے، کر رہی ہے۔ مشقت محنت کر کے روٹی کما کے لاتی ہے۔ اس کو بھی کھلاتی ہے۔ دن رات اس کے پاس رہتی ہے۔ کوئی بو کے مارے اس کے قریب نہیں جاتا۔ مگر یہ اتنی خدمت گزار ہے۔ ایک دن کہیں کسی معاملے میں اس سے دیر ہوگئی تو اس نے کہا کہ اچھا! کوئی بات نہیں، آج تو میں معذور ہوں، ذرا اچھا ہولوں، تو تمہیں سو ڈنڈے مارونگا (یا اللہ! یہ کیا؟) اور اس کے باوجود وہ نیک بخت وفا شعار بیوی اس کی خدمت کرتی رہی اور پھر جب دعا قبول ہوئی تو اس قبولیت دعا کے افسانے کا بھی ایک عجیب انداز ہے۔ یہ تو انہوں نے فلمیں بنا رکھی ہیں کہ وہ گاؤں میں گئی ہوئی تھی اور بعد میں دعا قبول ہوگئی۔ اب جو آئی ہے تو وہ آ کے دیکھے کہ یہاں میرا وہ خاوند ہوتا تھا، کوڑھ کا مارا ہوا، جسم میں کیڑے چلے ہوئے۔ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ اس کی جگہ وہاں ایک نہایت خوبصورت خوبرو نوجوان بیٹھا ہے۔ وہ اس کے پاس جانے سے ڈری سمٹی۔ اس نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میں بھول نہیں گئی تو یہاں میرا خاوند بیٹھا ہوا تھا۔ میں اُسے تلاش کر رہی ہوں۔ اس نے کہا: آ جاؤ، آ جاؤ، میں ہی تمہارا خاوند ہوں۔ عزیزانِ من! یہ صورت تھی۔ وہ آ گئی۔ کہا کہ جی! بڑی خوشی ہوئی ہے۔ خاوند نے کہا کہ میں نے تو قسم کھائی تھی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو تجھے سو ڈنڈے مارونگا۔ لو بھئی! اوکیندی ہونی اے پئی یا اللہ اینوں او ہو جیا ای کر دے۔ ❸ اب

---

❶❷ جسے گندگی کا ڈھیر کہتے ہیں۔

❸ لو بھئی! وہ کہتی ہوگی کہ میرے خدا! اُسے پھر ویسا ہی کر دے۔

اُسے بڑی مصیبت کہ یہ تو مر جائے گی۔ قسم تو کھا بیٹھے۔ اب کریں کیا۔ اللہ میاں نے کہا کہ تمہارے ہاں ایک فقہ کی کتاب ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہوا ہے کہ فقہ کے اندر لکھا ہوا ایک تو قانون ہوتا ہے اور اس کے بعد کتاب الحیل ہوتا ہے یعنی یہ لکھا ہوتا ہے کہ اس سے اب بچا کیسے جائے۔ تو معاذ اللہ' معاذ اللہ۔ میں ان کی افسانہ نگاری بتا رہا ہوں۔ انہوں نے یہ کہا ہے یعنی خدا کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سو درّے مارنے ہیں' ٹھیک ہے' تو جھاڑو کے سو تنکے لیں اور یوں کر دیں۔

مودودی صاحب کی زبانی فقہ کے بیان کردہ اصول کی تائید

عزیزانِ من! آپ ہنسے کہ اس زمانے کے افسانہ نگاروں کو اتنا پلان بھی نہیں بنانا آتا تھا کہ کوئی اور چیز وضع کریں۔ یہ جو چیز ہے یہ انہیں بقول ان کے خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے بتائی گئی ہے کہ ارے پگلے کیوں پیار میں مرتے جا رہے ہو' یوں کر لو۔ یہ انہیں خدا بتا رہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ تو یوں ہنسے ہیں کہ اس زمانے کے یہ بیچارے جاہل لوگ یہ کچھ کرتے تھے۔ سنیے' اس زمانے کے ہی نہیں' آپ کے اس دَور کے سب سے بڑے مفکر' مفسر' اور جنہیں بین الاقوامی شہرت دی جا رہی ہے جنہیں اللہ کا شاہکار بتایا جا رہا ہے: مودودی [1] صاحب۔ یہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم سورۃ النور میں ہے کہ زانی اور زانیہ کو سو دُرّے مارے جائیں' سو کوڑے مارے جائیں: یہ ان کی سزا ہے۔ وہ [1] اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر وہ زانی یا زانیہ بیمار ہو' کمزور ہو' تو اس کے بعد تو نظر آتا ہے کہ یہ سو کوڑے تو وہ کھا نہیں سکے گا تو اس کے لیے کرنا یہ چاہیے کہ سو تنکے لے کے ایک بنڈل بنا لو اور اس کو یوں مار دینا چاہیے کہ بس قانون کی شق پوری ہو جائے۔ عزیزانِ من! یہ تفسیر لکھی ہوئی ہے' آپ ہنس رہے تھے کہ صاحب! ایوب علیہ السلام کے زمانے کی یہ لوگ آج تفسیر لکھ رہے ہیں اور اس تفسیر کے Inter continental (ہوٹل) کے اندر ترجمے ہو رہے ہیں' اس کی تقریب ہو رہی ہے۔ آپ کی یہ تفسیر دنیا کے سامنے جائے گی کہ جی! قانون کا تقاضا پورا ہو گیا۔ اس کی سند حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ ہے کہ وہاں بھی تو ایک قسم کا تقاضا پورا ہو گیا تھا۔ [2]

سانپ کے ڈسے پر قرآن کی راہنمائی میں علاج

عزیزانِ من! اس آیت (38:44) میں کہا یہ گیا تھا کہ وہاں جاؤ' پانی پیؤ' نہاؤ دھوؤ' اور دیکھو یہ لوگ کہیں گے کہ سانپ ڈسے پہ یہ کچھ ٹونا ٹوٹکا کرو۔ یہ لوگ یہی کچھ بتایا کرتے ہیں اور وہ تو پھرتے تھے ہی ایسی جگہ جہاں اگر کوئی آبادی تھی تو وہ دیہاتی آبادی تھی ورنہ وہاں جنگل میں ہی بسنے والے لوگ تھے۔ یہ سارے لوگ آج بھی Tribes (قبائل) میں رہتے ہیں۔ یہ قبائل والے لوگ بھی اور ہمارے ہاں

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903-1978)

[2] اس کی مفصل تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: تفہیم القرآن (جلد چہارم) مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' 1993' صفحہ حواشی 45'44' ص ص۔ 342-340

دیہات والے بھی جو پہلی چیز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب سانپ وانپ ڈسے' یا کوئی بچھو لڑ جائے' تو دم درود پھونک ٹونا ٹوٹکا یہ سارا کچھ کرتے ہیں کہا کہ **وَلَا تَحْنَثْ** [1] (38:44) ان کی باتوں میں آ کے کوئی اس قسم کی حرکت نہ کرنا۔ تو ہم پرستی اس کا علاج نہیں بلکہ اس کا علاج یہ جڑی بوٹیاں ہیں۔ لہٰذا یہ لو' ان کی شاخیں لو' فلاں فلاں جڑی بوٹی لو' اور ان کو اپنے جسم کے ساتھ چھوؤ' مرہم بناؤ' لیپ بناؤ' ان کو پیسو' ان کو لگاؤ۔ **خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ** (38:44) مٹھی بھر گھاس لے۔ یعنی یہ نباتاتی ٹہنیاں جڑی بوٹیاں لو۔ وہ جنگل کے اندر یہی لے سکتے تھے اور وہاں یہ موجود ہیں۔ جن چیزوں کو آج آپ اتنی اتنی سپیشل دوائیاں کہتے ہیں' ان کی بنیاد بھی انہی چیزوں پہ ہوتی ہے۔ اور یجن (Origin) یہی ہوتی ہے۔ ہومیو پیتھک علاج کے اندر تو ساری مدر ٹنکچر ان چیزوں کی ہوتی ہے' خود ہمارے ہاں بھی جو دوائی ہوتی ہے وہ یونانی طب میں ہو یا ایلوپیتھی میں ہو یا انکے ہاں ہو اور یجن تو ان ساری چیزوں کے اندر ہوتی ہے اور جنگل میں' دیہات میں' ان چیزوں سے یہ علاج کیا جاتا ہے۔ ان چیزوں کے لیے کہا کہ کوئی بات ہی نہیں' یہ یہ بوٹیاں تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہیں' ان کی ٹہنیوں کو لو اور ان کو اس زخم کے اوپر لگاؤ' اور کہا کہ ٹونہ ٹوٹکا نہ کرنا' دین میں تو ہم پرستی کو کوئی دخل نہیں ہے' یہاں تو Cause & effect (علت و معلول) کا سلسلہ ہے۔ اگر مرض آتا ہے تو اس کے علاج کے لیے بھی یہاں خدا کی رحمت نے وہ چیزیں مقرر کر دی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ رحمت کے یہ معنی ہوتے ہیں: امراض کے لیے ان دی ہوئی چیزوں کے اندر ان کا علاج رکھ دینا۔ ان کے اندر یہ تاثیر کسی ڈاکٹر یا طبیب کی مقرر کردہ نہیں' یہ ان کے اندر خدا کی دی ہوئی تاثیر ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے۔ کہا کہ اس بات میں نہ آ جانا۔ یہ تو علاج نہیں ہے۔ یہ لوگ یہی آ کے کہیں گے لیکن یہ نہیں کرنا۔ اس کا علاج طریقے سے کرنا' جڑی بوٹیوں سے علاج کرنا' تعویذ دھاگے سے علاج نہ کرنا۔ کہا کہ **اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا** (38:44) اس نے اس تکلیف کو بڑی پامردی سے برداشت کیا۔ کیا بات ہے۔ اس موقع پر ہر ایک کا یہی جی چاہے گا۔ سانپ نے ڈسا ہوا ہے' شدت کا درد ہو رہا ہے۔ ایک آ کے کہتا ہے کہ او بابا! کچھ نہیں' تین دفعہ یہ پڑھ کے فو کرو' ابھی آرام ہو جائے گا۔ اِدھر سے کہا جاتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہ کرو' علاج سائنٹفک طریق کے اوپر کرنا' دیر ہو جائے گی' وقت لگ جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ درد کی شدت ہے' جانتے ہیں کہ عاجلہ انسان چاہے گا کہ کسی طریق سے تم یہ کہو کہ نہیں ہم بتوں کے آستانوں پہ چلے جاتے ہیں۔ آج یہ ساری منتیں مانی جاتی ہیں۔ وہ اسی لیے ہوتا ہے کہ تکلیف جلدی رفع ہو جائے لہٰذا ہم نے اسے یہ کہا تو اس نے اس تکلیف کو لمبے عرصے کے لیے برداشت کر لیا۔ ان چیزوں کے اوپر نہیں اترا۔ علاج اس نے ہمارے طریق سے کیا۔ **اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا** (38:44) ہم نے اس کو ثابت قدم پایا ہے۔

---

[1] (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہو کر) حق سے باطل کی طرف مائل نہ ہو۔ (لغات القرآن' جلد سوم' ص۔ 556)

عزیزانِ من! دیکھیں کہ قرآن کہاں کہاں یہ چیزیں لا رہا ہے۔ آگے کہا کہ **نِعۡمَ الۡعَبۡدُ** (38:44) آپ دیکھتے ہیں کہ عبد کا لفظ کہاں آتا ہے' عبادت کا جو عبد سے ہی ہے لفظ کہاں آ رہا ہے! حضرت ایوب علیہ السلام اتنا اچھا عبادت گزار تھا' اسے کہا کہ ان شرک و جہالت کی توہم پرستیوں کی طرف نہ آ جانا کہ جلدی سے آرام ہو جائے۔ لمبا فائدہ ہوتا ہے اس علاج کا' جو طریق کے مطابق' علم و بصیرت کے مطابق' ہوتا ہے۔ اس نے ہمارے کہنے کے مطابق اسی طریق کو اپنایا۔ لمبے وقت کے لیے تکلیف کو برداشت کر لیا۔ اس چیز کے اوپر نہیں اترا: **نِعۡمَ الۡعَبۡدُ** (38:44) وہ ہمارا کتنا اچھا عبد تھا۔ ہمارا کتنا اچھا عبادت گزار تھا۔ آگے کہا کہ **انه اواب** (38:44) ہر معاملہ میں ہمارے قانون کی طرف رجوع کرتا رہا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں تھا؟ وہ اس لیے تھا کہ اتنی شدتِ غم و تکلیف کے اندر بھی اس نے ہمارے ہی طریق کی طرف رجوع کیا' اُدھر نہیں گیا۔ اس کا نتیجہ یہ دیکھیے کہ یہاں جو اس کی دعا ہے' وہ یہ ہے کہ **وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ** (21:83) اور اے خدایا! میں سخت مصیبت میں پڑ گیا ہوں اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تیری رحمت کی ضرورت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تجھ سے بڑھ کر سامانِ ربوبیت و رحمت عطا کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اے بارِ الٰہا! تُو نے اپنی رحمت سے ان چیزوں کا علاج بھی پیدا کیا ہوگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا' یہ مجھے معلوم ہو جانا چاہیے۔ **فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا** (21:84) ہم نے اس کی بات سن لی اور اس کی تکلیف رفع کر دی۔ اس کے بچھڑے ہوئے ساتھی اس کو مل گئے بلکہ اُن جیسے اور لوگ بھی۔ یہ کچھ ہماری طرف سے مرحمت ہوا۔ ہم نے ہی اسے یہ طریق بتایا اور چشمے کی طرف راہنمائی کر دی۔

ابتدائی دور میں وحی کے نازل ہونے کی اہمیت

عزیزانِ من! اب یہاں یہ کہا جائے گا کہ انہیں کہا گیا تھا کہ جڑی بوٹیوں سے علاج کرو' اس چشمے کے اندر اپنا پاؤں ہلاؤ۔ یہ تو عام طبعی چیزیں ہیں۔ کیا ان چیزوں کے لیے بھی وحی کی راہنمائی کی ضرورت تھی؟ سب سے پہلا نبی' جس کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا ہے وہ حضرتِ نوح علیہ السلام ہیں اور وہاں طوفان کا ذکر آ رہا ہے اور انہیں بچانا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس طوفان سے' معجزے کے طور' پر خدا کا ان کو بچا لینا' مشکل ہی نہیں تھا لیکن اس طوفان سے بچنے کے لیے کہا کہ کشتی بناؤ۔ کہا کہ ہم تو جانتے نہیں ہیں کہ کشتی کیا ہے۔ لہٰذا قرآن میں یہ ہے کہ ہماری وحی کے مطابق اس نے کشتی بنائی۔ میں سمجھتا یہ ہوں' یہ میرا انداز ہے' قیاس ہے کہ یہ جتنے بڑے جنہیں ہم پہلے دور کے موجد کہتے ہیں' جن کے ہاں دوسروں کا پہلے سے چلا آنے والا تجربہ نہیں تھا کہ وہ اس پر کچھ اور ترقی کرتے' originally (ابتداءً) جنہوں نے کوئی چیزیں ایجاد کی ہیں' ان کے متعلق نظر آتا ہے کہ وہ اسی طرح سے ہی کچھ ہوگا۔ پہلی اس قسم کی جو چیز ہے وہ غالباً خدا کی وحی سے آئی ہوگی۔

حضرتِ نوح علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ ہماری وحی کے مطابق، ہماری نگرانی میں، کشتی بناؤ تو اگر اس دور میں، جہاں ابھی سانپ کے ڈسے کا علاج، اِن جڑی بوٹیوں سے یا دوائی کے کسی طریق سے معلوم نہیں تھا، اس کے لیے گویا ابھی کوئی ایجاد نہیں ہوئی تھی یا ابھی لوگ معلوم نہیں کر سکے تھے، اس کا علاج دریافت نہیں کر سکے تھے تو یہ کوئی بات نہیں ہے کہ وحی کے ذریعے سے ان کو کہا گیا ہو کہ ان جڑی بوٹیوں کے اندر تمہارے لیے علاج ہیں۔ بہرحال جو بھی صورت ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کیونکہ خدا نے اپنی طرف کہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بات جسے خدا اپنی طرف منسوب کر دے، وہ خود براہِ راست کہے بلکہ اس علم و صلاحیت اور استعداد کی رو سے جو انسان کرتا ہے، جو ہر انسان کو خدا کی عطا کردہ ہے، اسے بھی خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ بہرحال اس کے ساتھی بھی مل گئے، اور ان کی مثل اور لوگ بھی مل گئے، وہ آبادی میں بھی پہنچ گئے اور لوگ بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ یہاں کہا ہے کہ **رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا** (21:84) یہ سب کچھ ہماری طرف سے مرحمت ہوا۔

عزیزانِ من! یوں کہیے کہ اس کی اس پریشانی کو دُور کرنا، اس تکلیف کو دُور کرنا، یہ سارا کچھ ہماری رحمت کی وجہ سے ہوا، اور آگے یہ ہے کہ **وَذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ** (21:84) ہم نے یہ سارا قصہ اس لیے بیان کیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے لیے سامانِ موعظت ہے جو ہمارے قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! اب اگر عابد کے معنی عبادت گزار کیجیے تو ان کا وہی تصور آ جاتا ہے کہ وہ عبادت کرنے والے لوگ ہیں تو یہ چیز ان کے لیے یاددہانی کا ایک تذکرہ ہے کہ ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیے۔ عبادت کرنے والوں کو وہاں **نِعۡمَ الۡعَبۡدُ** (38:44) کہا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ تو ہم پرستیوں کی طرف نہ جانا بلکہ جو صحیح سائنٹفک طریق ہے اس کے مطابق اپنا یہ علاج کرنا، تو وہاں کہا تھا کہ یہ کتنا اچھا **عبد** (38:44) ہے۔

عابد یا عبادت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا انداز بیان

یہاں کہا ہے کہ یہ بات ہم نے بتائی ہے **ذِکۡرٰی لِلۡعٰبِدِیۡنَ** (21:84) ان لوگوں کے لیے سامانِ موعظت ہے جو ہمارے قانون کی اطاعت کرتے ہیں، جنہیں عابد ہونا چاہیے، ان کے لیے اس کے اندر بڑی یاددہانی ہے۔ تو ''عابد'' کے تو معنی ہی یہ ہیں جو قوانینِ خداوندی کے تابع یہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔''

اس طرح ان کے لیے اس کے اندر بڑی یاددہانی ہے کہ گو تکلیف کی شدت کتنی بھی کیوں نہ ہو لیکن جو توہم پرستی کے مشرکانہ افعال ہیں، ان کی طرف نہ جانا، صحیح طریق کی طرف جانا۔ خدا نے ہی یہ طریق تجویز کیا ہے کہ اس کی خاصیتیں بھی وہی ہیں، آدم کو علم بھی خدا کا دیا ہے۔ یہ صحیح طریقہ ہے جو ایسا کرتے ہیں وہ عابدین ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ **وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِدۡرِیۡسَ وَذَا الۡکِفۡلِ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیۡنَ** (21:85) اسمٰعیل، ادریس اور ذی الکفل اسی طرح کے انبیاء تھے۔ یہ بھی حق کی دعوت میں جم کر کھڑے رہے تھے۔ عزیزانِ

من! حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ضمن میں حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ آتا ہے کہ یہ ان کے بیٹے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کی تعمیر میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ قرآنِ کریم میں حضرت ادریس علیہ السلام ❶ اور حضرتِ ذاالکفل ❷ کا نام دو تین جگہ آیا ہے لیکن ان کی تفصیل نہیں دی۔

کچھ انبیاء کے متعلق تورات اور تاریخ کا بیان

عزیزانِ من! ان کے متعلق تورات میں کچھ چیزیں آئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ وہی ہوں۔ تورات میں حضرتِ ادریس علیہ السلام کے متعلق ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے بھی پہلے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس دَور کی تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے اور قرآنِ کریم نے ان کی تفصیل نہیں دی حضرتِ ذاالکفل علیہ السلام کے متعلق تورات میں ہے ان کے ہاں یہ Hezekel حزقی ایل نبی ہے۔ ان کے ہاں جو یہ اس دَور کے بنی اسرائیل کے انبیاء تھے؛ جن کا نام یہ نبی کے زمرے میں لیتے ہیں' ان میں بڑی بڑی اولوالعزم ہستیاں گزری ہیں۔ جس زمانے میں یہ بنی اسرائیل بابل کی اسیری میں دن گزار رہے تھے جو قریباً اسی سال (80) کے عرصے پر محیط ہے' اس زمانے میں جو انبیاء نظر آتے ہیں' ان کی شخصیتیں بہت بڑی ہیں۔ وہ قوم اس طرح سے غلامی کے پنجے میں گرفتار ہے اور وہاں یہ لوگ ہیں جو اس قوم کا حوصلہ بھی بڑھا رہے ہیں' وہاں نجات کی صورت بھی پیدا کر رہے ہیں۔ انہی میں جو نبی ہیں' کہتے ہیں کہ وہ ذاالکفل تھے۔ یہ ہوسکتا ہے اور بعض لوگوں نے تو کہا ہے کہ نہیں۔ ایسا نہیں۔ یہ کفل سے ہے جو مہاتما بدھ تھے۔ میں نے کہا ہے کہ ہمیں اس تحقیق میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ قرآن نے ان کا نام لیا ہے۔ انہیں انبیاء کے زمرہ کے اندر شریک کیا ہے۔ ہمارے مان لینے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اگر تاریخ کوئی صحیح واقعات بتائے گی تو ہم مانیں گے بشرطیکہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کی شان کے خلاف نہ ہوں۔ عزیزانِ من! اب آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کا یہ ذکر کیا ہے کہ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (21:85) یہ بھی حق کی دعوت میں جم کر کھڑے رہے تھے۔ جب تاریخی رو سے ان کے واقعات باہر آئیں گے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ انہوں نے کس کس مقام میں استقامت سے کام لیا تھا' ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی تھی۔ وہ ہمارے لیے ذکریٰ ہو جائے گا۔ ان کے تذکرہ کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهُمْ مِّنَ

---

❶ قرآنِ کریم میں تین رسولوں کا اجمالی ذکر آتا ہے جن کی تفصیل معلوم نہیں۔ اول حضرت ادریس علیہ السلام دوسرے حضرت الیاس علیہ السلام اور تیسرے حضرت ذی الکفل علیہ السلام ہیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ سورہ مریم (57-19:56) اور سورۃ الانبیاء (21:85) میں آیا ہے۔ قیاس ہے کہ ان کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے اور آپ کا نام تورات میں حنوک یا اخنوع ہے۔ اگر آپ اخنوع ہی ہیں تو پھر آپ حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں چوتھی پشت پر آتے ہیں کیونکہ تورات نے حضرت نوح کا نسب نامہ (حضرت) نوح بن لمک' بن متوسلح' بن حنوک لکھا ہے: باب پیدائش 5:21-29۔ (حوالہ: پرویزؒ: برقِ طور ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993' ص۔ 291)

❷ حضرت ذی الکفل کا تذکرہ سورۃ الانبیاء (21:85) اور سورۃ ص (38:48) میں آیا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔

الصّٰلِحِيْنَ (21:86) ہم نے انہیں اپنی رحمتوں سے نوازا۔ یہ سب صالحین کے زمرے میں شامل تھے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ ان کے ذکر ہیں، وہ صابرین تھے، ہم نے اپنی رحمت کا سحاب ان پر نچھاور کیا۔ یہ سارے ہی صالحین تھے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ

اس کے بعد ایک اولوالعزم نبی حضرتِ یونس علیہ السلام ذکر آتا ہے جن کے نام سے قرآن میں ایک سورۃ یونس بھی ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان کا ذکر بڑی تفصیل سے دو تین مقامات پر آیا ہے۔ حضرتِ یونس علیہ السلام کو ذوالنون بھی کہتے ہیں، انہیں صاحب الحوت (68:48) بھی کہا گیا ہے۔ نون اور حوت مچھلی کو کہتے ہیں۔ اس قصے میں مچھلی کا ایک ذکر آتا ہے۔ اس نسبت سے یونس تو ان کا نام ہے ذوالنون ان کا لقب بھی ہے۔ قرآن نے انہیں صاحب الحوت بھی کہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخ میں ایک مقام آتا ہے جسے ہجرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں اس کے متعلق تفصیل سے مختلف درسوں میں بتا چکا ہوں کہ جس مقام میں نبی پیدا ہوتا ہے، وہیں سے اپنے پیغام کی تبلیغ شروع کرتا ہے، اس کی پہلی مخاطب قوم وہی ہوتی ہے، سخت مخالفت ہوتی ہے۔ وہاں وہ امت کا اپنا First Crystal بنانا ہوتا ہے۔ انہی لوگوں کو وہ لیتا ہے، مصیبتیں برداشت کرتا ہے مخالفتیں برداشت کرتا ہے، انہیں میں رہتا ہے، تا آنکہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ یہ جو باقی لوگ رہ گئے ہیں ان میں اب یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس چیز کو قبول کریں یا وہ اپنی مخالفت میں اتنے شدید ہو گئے ہیں کہ وہ اب ادھر نہیں آئیں گے تو وہ کسی دوسرے مقام میں جہاں اس نظام کو قائم کرنے میں حالات سازگار ہوتے ہیں، تو اس وقت خدا کے حکم کے مطابق، وحی کی رو سے، یہ نبی اس مقام کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ اب یہ وقت یہاں مزید رہنے کا نہیں رہا: اب یہاں سے نکل جاؤ، دوسرے مقام پہ چلے جاؤ۔

ہجرت کا فیصلہ خود نبی کا اپنا ہوتا ہی نہیں

عزیزانِ من! دوسرے مقام پہ چلے جانے کا فیصلہ نبی خود نہیں کرتا اور یہ بڑی اہم بات ہے۔ نبی دلوں کے حالات تو نہیں جانتا۔ اس کا کام تو اپنے پیغام کو عام کیے چلے جانا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ کیا اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اب یہاں اس نظام کے مزید پنپنے کا امکان نہیں، یا اور لوگ اس طرح سے تبلیغ کے ذریعے سے اب ادھر نہیں آئیں گے، نبی اس کے متعلق خود فیصلہ نہیں کرتا۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ عزیزانِ من! یہ کوئی چھوٹا قدم نہیں ہے۔

نبوت کے ۲۳ سالہ زندگی کی اہمیت

عزیزانِ من! ہمارے نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری 23 برس نبوت کی زندگی ہے۔ ان صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پروگرام 23 سال پر محیط ہے اور یہ وہ نبوت ہے جسے میں کہتا ہوں کہ یہ عرصہ نبوت و رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔ وہ تو مولانا اسلم جیراجپوریؒ کے الفاظ

میں یہ ہے کہ زمانے کے گلے میں اس ہار کا ایک ایک موتی صدیوں کے برابر ہے۔ اس تئیس سال میں سے تیرہ سال مکے کی زندگی میں بسر ہو جاتے ہیں اور اس کا ماحصل یہ سارے' چند نفوس ہیں لیکن اس پہ بھی نبی خود نہیں فیصلہ کرتا کہ اب مجھے اس مقام کو چھوڑ دینا چاہیے' خدا کی طرف سے یہ فیصلہ ہوتا ہے۔ حضرتِ یونس علیہ السلام کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ بات بتائی ہے کہ **وَ ذَالنُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا** (21:87) ذوالنون نے ہمارے حکم کا انتظار نہیں کیا' بلکہ قوم کے ہاتھوں سے تنگ آ کر غصے میں خود فیصلہ کر لیا کہ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ حالانکہ اسے ابھی ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا لیکن اس نے یہ فیصلہ کسی سرکشی کے ارادے سے نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی اجتہادی غلطی تھی۔ **فَظَنَّ** (21:87) یہ اس کا ظن تھا' آپ نے یہ قیاس کیا تھا کہ **اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ** (21:87) چونکہ یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں' اس لیے خدا اس پر مؤاخذہ نہیں کرے گا اور مجھے کسی سختی میں نہیں ڈالے گا۔ عزیزانِ من! اس طرح اس نے قیاس کیا کہ یہ عمل خدا کے کسی حکم کی معصیت نہیں ہے' خدا نے یہ کہا ہو کہ یہاں رہو اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اگر یہ ہو تو اسے معصیت کہیں گے یا یہ کہ خدا نے کہا ہو کہ ہجرت کر جاؤ اور اس کے باوجود وہ وہیں رہا ہو تو اسے معصیت کہیں گے' یہ ہے جسے جرم یا گناہ کہیں گے۔ نبی یہ کبھی نہیں کرتا۔ نبی سے معصیت نہیں ہو سکتی ہاں البتہ اس قسم کی اجتہادی غلطی ہو جاتی ہے۔

حج کے سلسلے میں نبی اکرم کے خواب کی تکمیل کا واقعہ

عزیزانِ من! خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ وہ جو دل کے اندر شدتِ آرزو تھی کہ یا اللہ! یہ بیت اللہ' یہ مکہ میں تیرا گھر' جو اب بھی ہمارے اس سارے پروگرام کے نظام کا مرکز ہے' وہ مشرکین کی تولیت میں رہے تو کیا ایسا نہیں ہوگا کہ وہ ہماری تولیت میں آ جائے یعنی ہمارے نظام کے مرکز کو مشرکین کی تولیت میں رہنا واقعی ناقابل برداشت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تُو آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا اٹھا کے تک رہا تھا کہ بارِ الٰہا! یہ کیا ہے! عزیزانِ من! بات کہنے کا یہ بڑا ہی خوبصورت انداز ہے۔ قرآن میں ہے کہ سینہ مقدس کے اندر تو یہ آرزوئیں مچل رہی تھیں اور قریش نے حکم لگا رکھا تھا کہ آپ لوگ یہاں حج پہ بھی نہیں آ سکتے۔ ہم حج بھی نہیں کرنے دینگے۔ انہیں ڈر تھا کہ آپ کا نظام کہیں چھا نہ جائے۔ یہ بات تو لمبی ہے اور بڑی دلچسپ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس پروگرام کے ذریعے چھا جائیں گے۔ اگر وہ یہاں آ گئے تو حج بھی نہیں کرنے دینگے۔ یہ ان کا خوف تھا۔ تو وہ ہے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ ہم حج کر رہے ہیں' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان کر دیا۔ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے لیے اس سے زیادہ سعادت کا موقعہ اور کونسا ہو سکتا تھا! ایک تو یہ کہ وہاں جانا ویسے ہی بند تھا دوسرا یہ کہ حج کی اجازت دینا اور وہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اور پھر یہ کہ یہ پہلا حج تھا وہ جوق در جوق ساتھ ہو گئے۔ لیکن آپ کو وہاں مکے سے باہر ہی' حدیبیہ کے مقام پہ انہوں نے روک دیا۔ وہاں یہ چیز ہوئی کہ ابھی ان کے ساتھ جنگ نہیں چھیڑنی اور جنگ کے بغیر وہ مکے میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتے۔ وہ جسے صلح حدیبیہ کہتے ہیں وہاں یہ چیز تھی کہ

آپ ﷺ وہیں رک گئے۔ اب یہ بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اِس خواب کو غالباً خدا کی طرف سے اشارہ سمجھ لیا اور اس بناء پر چل پڑے۔ وہاں سے قریش نے حج نہیں کرنے دیا' اجازت نہیں دی۔ حدیبیہ میں صلح کی' بغیر حج کیے واپس لوٹ آئے۔ اسے اجتہادی غلطی کہتے ہیں۔ یہ کچھ کرنا خدا کی طرف سے حکم نہیں ہوتا' قرآن کی کوئی صریح آیت نہیں ہوتی' ایک اندازہ ہوتا ہے اور وہ تو بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (41:6) ہے۔ یہ کہ وحی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ معصیت تو نبی سے نہیں ہوتی۔ اس قسم کے فیصلے کی' جو قیاس پر مبنی ہوتا ہے' اجتہادی غلطی کہتے ہیں' یہ ہوسکتی ہے لیکن اجتہادی غلطی (جو ہے وہ غلطی) اگر کوئی انسان بھی اپنی تدبیر میں کرتا ہے تو اس کا نقصان اٹھاتا ہے' اس کا نقصان تو ہو جاتا ہے۔

نبی کی اجتہادی غلطی کا مواخذہ اور خدا کی قدرت کا مفہوم

عزیزانِ من! اب جو یہ چیز ہے اس کے لیے حضرتِ یونس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ہے کہ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِباً فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (21:87) خود اس نے فیصلہ کرلیا اور اس کا خیال یہ تھا کہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس آیت میں لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ (21:87) آیا ہے۔ لغت کے اعتبار سے تو اس کے معنی یہ ہو جاتے ہیں: کسی کے اوپر غالب آجانا' قابو پالینا۔ لیکن اس کے معنی مواخذہ کرنے کے ہوتے ہیں یعنی خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے کسی چیز کا مواخذہ ہو جانا۔ تو انہوں نے خیال یہ کیا کہ خدا کی طرف سے تو کوئی حکم نہیں آیا ہے خود ہی فیصلہ کیا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس قسم کا جو میں اپنا تدبیری فیصلہ کرتا ہوں اس پہ کوئی مواخذہ نہیں ہوگا' کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اس نَقْدِرَ عَلَيْهِ کا ''گرفت'' اچھا ترجمہ ہے کیونکہ بنیادی ترجمہ تو یہ ''قدر'' ہے۔ اگرچہ پیمانے کے معنی میں آتا ہے تو اس کے معنی ہوتا ہے کسی کے اوپر غلبہ پالینا۔ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق جس چیز کا بھی نتیجہ سرزد ہوتا ہے' وہی تو ہے جسے خدا کی قدرت کہا کرتے ہیں۔ اس نے خیال کیا' ظن کیا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے' یہ معصیتِ خداوندی نہیں ہے' اپنا ہی فیصلہ کیا ہے' یہ تدبیری فیصلہ ہے' حالات کو سامنے رکھ کے خود ایسا قیاس کیا ہے کہ اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن بات غلط تھی' تدبیر غلط تھی' قبل از وقت تھی۔ اور قرآن میں یہ ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں تھی کہ جس نے ایسے وقت میں کہ نبی ان کا ساتھ چھوڑ گیا ہو اور وہ اس کے بعد اس کے عذاب سے بچ گئی ہو یا ایمان لائی ہو' قوم یونس علیہ السلام ایسی تھی کہ نبی چلا گیا اور اس قوم نے محسوس کیا کہ نہیں ہم غلطی پر تھے' وہ صحیح بات کہتا تھا تو اسے راستے سے لوٹایا گیا۔ یہ جو ان کا اقدام تھا کہ خدا کے حکم سے پہلے ہی وہاں سے وہ ہجرت کر کے' چھوڑ کے' چلے گئے حالانکہ اس قوم کے اندر یہ امکان ہی نہیں' وہ واقعہ ہو گیا کہ وہ ایمان لے آئی تو ہجرت کا تو یہ موقعہ نہیں تھا۔

حضرت یونس کے متعلق ایک مشہور افسانے کی حقیقت

عزیزانِ من! اب حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق ایک مشہور افسانہ آرہا ہے۔ اس کا تعلق ایک واقعہ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ گئے'

راستے میں دریا پڑتا تھا یا ندی پڑتی تھی، اسے انہوں نے کشتی کے ذریعے سے پار کرنا تھا اور پھر وہی بات ہے کہ اگر میں افسانے دہرانے شروع کر دوں تو وقت نہیں بچے گا، بات بڑی لمبی ہو جائے گی۔ وہاں میں ان سورتوں میں آؤں گا تو پھر میں وہ آیتیں تفصیل سے بیان کرونگا۔ آج وقت نہیں ہے یا شاید میں اگلے درس میں رکھ لوں۔ یہاں بات تو اتنی سی ہے کہ وہ کشتی کے اندر بیٹھے۔ وہ کشتی آج کی لاری والوں کی طرح ہی تھی انہوں نے کشتی میں زیادہ سواریاں بٹھالیں۔ جی ہاں، وہ ڈوبنے لگی یہ بھی دریا میں گرے وہاں کوئی مگرمچھ یا کوئی بڑی وہیل مچھلی یا کوئی شارک وغیرہ تھی، اس نے انہیں دبوچ لیا۔ قرآن میں بھی وہاں سَبَّحَ کا لفظ آتا ہے کہ اگر یہ مُسَبِّحِيْنَ نہ ہوتا تو وہ مچھلی کے پیٹ میں چلا جاتا اور قیامت تک وہیں رہتا۔ اب یہاں انہوں نے کہا کہ اگر وہ وہاں تسبیح نہ پھیرتا تو بس گیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی زبان میں سبح ''تیراک'' کو کہتے ہیں کہ اگر وہ بہت بڑا ماہر تیراک نہ ہوتا تو گیا تھا۔ مچھلی نے منہ میں نگلا نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا قرآن صرف یہی کہتا ہے کہ چھڑا لیا اور وہ تیراک تھا اور اس طرح وہ وہاں آ گیا مگر انہوں نے کہا کہ نہیں، اس نے تسبیح پڑھنی شروع کی تو اسی لیے یہ کہا کہ جب وہ وہاں تکلیف میں پھنس گیا، **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ** (21:87) چل بھئی! اب یہ آیہ کریمہ ہو گئی اور پھر اس کے ورد ہونے لگے۔ جی، اب تو چونکہ یہ ساری مملکت ہی اسلامی ہو گئی ہے اس لیے ہر جگہ یہی ورد ہے۔

ہماری مساجد میں دی جانے والی تعلیم

عزیزانِ من! پہلے تو یہ ورد مسجدوں میں ہی ہوتے تھے، اب تو امتحانوں کے دنوں میں بھی ہیں۔ امتحانوں سے چند دن پہلے، یہ بچیاں بتاتی ہیں، کہ بجائے اس کے کہ وہ کچھ Preparation (تیاری) کرائیں وہ وہاں چادریں بچھا کے ''کھجوراں دیاں گٹکاں رکھ کے'' ان بچیوں سے سوا لاکھ آیہ کریمہ کا ورد کراتی ہیں۔ ایہہ چار دن جیہڑے پڑھن دے اینا ں دے ہیں نے، او وی ایہدے اچ لگ جان۔ [1] اور یہ وہ آیہ کریمہ: **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ** (21:87)۔ یہاں کہا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ پڑھی تو اس پر خدا نے کہا کہ **فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ** [2] (21:88) تو اس طرح وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا گیا۔ بہر حال میں یہ بات تفصیل سے بعد میں کرونگا مگر یہ کہتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ کے ورد سے تو وہ اس مصیبت سے اس طرح سے چھٹکارا پا گیا۔ عزیزانِ من! وہ بہت بڑا تیراک تھا۔ آج میں دس منٹ زیادہ لونگا۔ مجھے آج بڑی اہم بات کرنی ہے اور وہ بات یوں نہیں کہی جا سکتی اس لیے

---

[1] وہ وہاں چادریں بچھا کر، ان پر کھجوروں کی گٹھلیاں رکھ کر، ان بچیوں سے سوا لاکھ آیہ کریمہ کا ورد کراتی ہیں۔ یہ جو ان کے چار دن پڑھنے کے تھے، وہ بھی اسی میں لگ جائیں۔

[2] سو ہم نے اس کی پکار کو سن لیا اور اسے غم سے نجات دی۔

میں اسے یہاں چھوڑ رہا نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (21:88) اس کو ہم نے اس تکلیف سے نجات دی' بچا لیا۔ کہا کہ وَكَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ (21:88) اور اس طرح سے یہ جو مومن ہے وہ ان تکلیفوں سے یوں بچا کرتے ہیں۔ اس وقت سیدھی بات یہ ہے کہ پریشان ہو کر حواس نہیں کھو بیٹھنا چاہیے۔ دریا میں گر گیا' وہ کشتی میں ڈوبنے لگا' مچھلی نے منہ میں دبوچ لیا۔ اوسان خطا ہوتے اگر پریشان ہوتے تو گیا تھا۔ حواس کو بچائے رکھا ہے۔ تیراک ہے' چھٹکارا بھی حاصل کر لیا اور پھر تیر (Swimming) کر باہر بھی آ گیا۔ کچھ زخم لگے تھے' باہر آ کے علاج ہوا ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ كَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ (21:88) [1] یہ ہے طریق اس قسم کے حوادث سے بچنے کا۔ اب انہوں نے کہا کہ وہ جو کہا ہے کہ كَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ (21:88) اوناں وی تسبیح پڑھی سی' تے اللہ میاں کیندا اے تسی وی او تسبیح پڑھیا کرو' تے تسبیح اے ہونی چھیدی اے [2] لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (21:88) [3] یہ سوا لاکھ مرتبہ ہونی چاہیے اور اگر ہم اپنا بتائیں کہ کتنی پھیری سی تسبیح تے کروڑاں بن جاندی ہیگی اے۔ [4]

عزیزانِ من! سورۃ الانبیا کی آیت 88 تک آ گئے' 89 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

1. اسی طرح ہم ان لوگوں کو غم و حزن سے نجات دیتے ہیں جو ہمارے قوانین کی صداقت و حکمیت پر یقین رکھتے ہیں۔
2. انہوں (حضرت یونس) نے بھی تسبیح پڑھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم بھی وہ تسبیح پڑھا کرو اس لیے تسبیح یہ ہونی چاہیے۔
3. بارِ الٰہا! تیرے سوا اور کسی کو اس کا اقتدار و اختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے جو اس فیصلے میں عجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو یہ میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔ (اس کے لیے مزید یہ آیات دیکھیے: 37:139; 68:48)
4. اگر ہم اپنا بتائیں کہ کتنی دفعہ یہ تسبیح پھیری تھی تو اس کی تعداد کروڑوں تک جا پہنچتی ہے۔

گیارھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 89 تا 96)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا
لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَأَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ
وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَالَّتِىْٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا
فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾ إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّأَنَا
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ كُلٌّ إِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ
الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَإِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ
أَهْلَكْنٰهَآ أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ
يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1976ء کی 31 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 89 سے ہو رہا ہے: (21:89)۔

نبوت کسی ذریت کے سہارے عطا نہیں ہوئی

سابقہ اتوار Convention (کنونشن) کی وجہ سے اس مسلسل درس کا ناغہ ہو گیا تھا۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سابقہ آیات میں مختلف حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ سامنے آئے۔ قرآن کے انداز کے مطابق بات حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوئی۔ حضراتِ نوح علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، ادریس علیہ السلام، ذوالکفل علیہ السلام اور ذوالنون کے تفصیلی تذکرے یہاں نہیں آئے۔ ان میں سے دو چار [1] تو ایسے ہیں کہ جن کا تفصیلی تذکرہ قرآن میں مذکور ہی نہیں اور باقی حضرات کی زندگی کے، ان کے

انقلابی پروگرام کے' بہت سے واقعات مختلف مقامات پر قرآنِ کریم میں آئے ہیں۔ اب اس کے بعد اس سلسلے کی سرِ دست' یہاں ان آیات میں' آخری کڑی' حضرتِ زکریا علیہ السلام کی ہے۔ یہاں ان کے ذکر سے بات شروع ہوئی ہے کہ **وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ** (21:89) اور اسی طرح زکریا علیہ السلام کا بھی معاملہ یاد کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! تو مجھے اس دنیا میں تنہا نہ چھوڑ' اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ تو ہی سب کا بہترین وارث ہے۔ اس قسم کے وارث کی ضرورت بھی ظاہر ہے کیونکہ یہ سلسلہ بالعموم ان کی ذریت یا نسل میں آ رہا تھا۔ نبوت تو اس لیے کسی کو نہیں مل جاتی کہ وہ نبی کا بیٹا ہے لیکن حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں یہ خاص بابرکت چیز ہمیں ملتی ہے کہ ان کی اولاد میں مسلسل نبوت چلی آئی ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے حضرتِ اسحاق علیہ السلام اور حضرتِ اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بعد کی شاخ میں تو آخر میں آ کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ حضرتِ اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں حضرتِ یعقوب علیہ السلام آئے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہی ہیں۔ جن کو اسرائیل کہا جاتا ہے اور پھر جنہیں انبیائے بنی اسرائیل کہتے ہیں وہ اسی ذریت میں ہیں اور انہی کی نسل میں سے آگے چلے۔ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں حضرت یوسف علیہ السلام تو براہِ راست ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر چہ باپ کے بعد یہ بیٹا بھی نبی تھا لیکن یہ اس لیے نبی نہیں تھا کہ وہ نبی کا بیٹا تھا۔ نبوت میں تو اس قسم کا کوئی اختصاص ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ تو مشیتِ خداوندی جس شخصیت کو بھی اس کے اہل سمجھتی تھی اسے اس کے لیے مختص کر لیا جاتا تھا۔

انقلابِ نبوت ایک علیحدہ نوعیت کا انقلاب ہوتا ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ حضرات علیہم السلام بہت بڑے بڑے انقلاب لے کر دنیا میں آئے تھے۔ ایک بات پہلے سے ہی سمجھ لینی چاہیے اور اسے ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ جب ہم مذہب کی نسبت سے گفتگو کرتے ہیں تو ان حضرات کی تعلیم' ان کا پروگرام جسے میں اب انقلاب بھی کہتا ہوں' وہ کچھ ذہن میں مذہبی سا ہی آتا ہے کہ یہ کچھ مذہبی رہنما تھے۔ اور پھر ہمارے ہاں مذہبی رہنما بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ایک گرونانک ہو گیا' بھگت کبیر ہو گیا' سورداس ہو گئے یا آپ کے ہاں کے اولیائے کرام کو مذہبی راہنما کہا جاتا یا امورِ شریعت میں علمائے کرام آ گئے جیسے امام ابن تیمیہ (1263-1328)' امام احمد بن حنبل (780-855) ہے۔ یہ اس قسم کی شخصیتیں' مذہب کے نقطہ نگاہ سے' ہمارے سامنے آتی ہیں کہ یہ ریفارمر تھے' یہ راہنما تھے۔ انہوں نے لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھایا لیکن جب ہم دین کی نسبت سے گفتگو کریں گے تو یاد رکھیے کہ دین اس دنیا میں انسان کی اجتماعی اور تمدنی زندگی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے وہ قوموں کی داستان بیان کرتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے سلسلے میں بھی بات تو کسی نبی کی آئے گی لیکن آگے آپ دیکھیں گے کہ وہ ایک قوم ہے' جس کی طرف وہ نبی مبعوث ہوتا ہے اور وہ اس قوم کے اندر ایک انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ

جب صحیح انقلاب پیدا ہوتا ہے تو اس میں اس قوم کے جو افراد ہیں ان کے اندر بھی صالحیت آ جاتی ہے' ان کی سیرت کا تزکیہ ہو جاتا ہے' ان کے اخلاق سدھر جاتے ہیں' ان کی ذات کی نشو ونما ہو جاتی ہے۔ افراد میں یہ چیز ہوتی ہے لیکن ان کے سامنے جو مقصود بالذات نقشہ ہوتا ہے وہ ایک نظام کی تبدیلی ہوتی ہے کہ انسانیت نظام ہی کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے اور پروان بھی چڑھتی ہے۔ نظام ہی کے ہاتھوں یہ حضرات ایک تمدنی زندگی کا ڈھانچہ بدلتے تھے۔ جب بھی ان کے متعلق گفتگو ہو تو ذہن میں یہ جو مذہبی قسم کے راہنما ہیں' وہ نہیں آنے چاہئیں' نہ ہی یہ خالص سیاسی قسم کے سیکولرازم جو ہمارے ہاں کے لیڈر یا بڑے بڑے راہنما ہیں وہ آنے چاہئیں کیونکہ ان کے نزدیک صرف مکینکل طور پر جو کوئی نظم ونسق ہے ان کے ذمے اس کو صحیح کر دینا ہوتا ہے اور وہ صرف اتنا ہی کرتے ہیں جبکہ دین ایک عجیب وغریب نظام ہے کہ جس میں انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام درست ہوتا ہے اور اس نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افراد کی ذات کی صحیح نشو ونما ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ انقلاب جو یہ انبیائے کرام علیہم السلام لایا کرتے تھے۔ یہ ایک بڑی مخصوص سی چیز ہے۔

دنیا بھر میں مروجہ مذہبی اور سیاسی سوچ کا ماحصل

آج ہمارے سامنے کہیں بھی وہ طریق یا نقشہ نہیں ہے اس لیے ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ ہماری سمجھ میں صرف یہی بات آتی ہے کہ یا تو وہ جو میں Inverted comas میں کہوں گا آپ کے ہاں روحانیت کے راہنما ملیں گے یعنی یہ جو پیرانِ طریقت کہلاتے ہیں جو ایک ذہنی سی چیز یا ایک اعتقادی سی چیز ہے اور یا مذہبی راہنما ملیں گے جن کا مقصود ومطلوب ان کے اپنے الفاظ میں ''اعتقادات کی درستی'' ہوگا یا وہ مذہبی مناسک اور رسوم اور عبادات وغیرہ کے' طریقے ٹھیک ٹھاک کریں گے یا زیادہ سے زیادہ جو Personal laws (شخصی قوانین) ہیں: نکاح طلاق عدت وغیرہ کے' یہ مسائل بیان کریں گے' انہیں انسانی ہیئت اجتماعیہ یا نظام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور دوسری طرف آپ کو یہ سیاسی لیڈر ملیں گے' خواہ وہ ہٹلر (1889-1945) ہو یا مسولینی (1883-1945) ہو' یا اسی ٹائپ کا وہ لینن (1870-1924) ہو' یا ماؤزے تنگ (1893-1976) ہو' یا دوسرے ممالک کے اندر بھی جو بڑے بڑے ان کے ہاں کے لیڈر ہوتے ہیں' ان کا مقصد صرف اپنے ہاں کی تمدنی یا سیاسی زندگی کے نظام میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ جو انسانیت کی ایک اندر کی تبدیلی ہے' جس سے انسانی ذات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے' اس کی نشو ونما ہوتی ہے' وہ ان دونوں میں سے کسی کے سامنے نہیں ہوتا۔ ویسے انہوں نے روحانیت کے لیے تزکیہ نفس کی اصطلاح تو لے لی ہے لیکن وہ خالصتاً ایک ذہنی چیز ہے۔ اپنے ذہن میں سمجھ لیا جاتا ہے کہ روحانی ترقی ہو رہی ہے' اس کا انسانی ذات سے تعلق نہیں ہوتا۔ جسے آپ روحانیت کہتے ہیں یہ کچھ ایک مبہم سی اصطلاح ہے۔ روحانیت کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا۔

آج کی انسانی دنیا میں دین خداوندی یا اسلامی نظام کے خدوخال کا نفاذ کیونکر ممکن ہے؟

عزیزانِ من! انبیائے کرام علیہم السلام جس قسم کا انقلاب لاتے تھے، وہ ایک بڑا ہی مخصوص انقلاب تھا جس کی مثال نہیں مل رہی۔ یہ نہیں ہے کہ انبیائے کرام کے بعد یعنی ختمِ نبوت کے بعد اب اس قسم کا انقلاب لایا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ تو انبیائے کرام علیہم السلام لاتے تھے۔ بات یہ نہیں ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ وہ جو انقلاب لاتے تھے، انہی کے اتباع میں، انہی کے نقشِ قدم پر، اور وحی کے اتباع میں، وہ انقلاب ہر زمانے میں لایا جا سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد آپ کے پاس قرآن تو محفوظ ہے اور قرآن ہی کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ انقلاب لائے تھے۔ لہٰذا قرآن ہی کی رو سے اب بھی وہ انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اس انقلاب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ انسانی زندگی کے تمدنی معاشرتی سیاسی معاشی اسے کچھ بھی کہہ لیجئے، ان کی ہیئت اجتماعیہ میں ایک تبدیلی پیدا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو افرادِ انسانیہ ہیں ان کی ذات کی صحیح نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے اور دین و دنیا یا دنیا اور عقبیٰ دونوں کی فلاح و بہبود اس انقلاب کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ انقلاب جو آسمانی ہدایت کی روشنی میں لایا جاتا ہے، اس کی ابتداء انبیائے کرام علیہم السلام کرتے تھے اور ان کے بعد اگر وہ روشنی، اگر وہ ہدایت محفوظ شکل میں موجود ہے، تو وہ انقلاب ہر دَور میں لایا جا سکتا ہے، ہر آن میں لایا جا سکتا ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے گا۔ جب انبیائے کرام علیہم السلام کا آپ کے سامنے ذکر آئے تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ وہ محض وعظ و نصیحت کرنے والے نہیں تھے یا محض وہ یہ نہیں بتانے کے لیے آئے تھے کہ سیاست میں الیکشن یا جمہوریت ہوگی یا ڈکٹیٹر شپ ہوگی۔ یہ چیزیں بھی نہیں تھیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتے تھے کہ اس میں افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی تھی۔ بہرحال حضرتِ زکریا علیہ السلام تو اس سلسلے کی سرِدست، یہاں ان آیات میں، آخری کڑی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے زیرِسایہ حضرت مریم علیہا السلام کی تعلیم وتربیت اوراس کے اثرات

عزیزانِ من! حضرتِ زکریا علیہ السلام کی زندگی کا ایک واقعہ قرآن میں مذکور ہے۔ ایک تو سمجھ لیجیے کہ انہوں نے حضرتِ مریم علیہا السلام کی کفالت کی تھی، تربیت کی تھی، قرآنِ کریم حضرتِ مریم علیہا السلام کا ذکر انبیاء کے زمرے میں شامل تو نہیں کرتا کیونکہ وہ تو نبی نہیں تھی لیکن ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ قرآنِ کریم حضرت زکریا علیہ السلام کے زمرے میں ان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ بھی بہت بڑا انقلاب تھا جو وہ لائی تھیں۔ میں آپ کو ان کے ذکر میں تفصیل سے سورۃ مریم میں بتا چکا ہوں۔ [1] وہاں ہیکل اور خانقاہیت کی خودساختہ شریعت تھی یا خودساختہ طریقت تھی جس نے انسانیت کو تباہ کر دیا تھا۔ حضرتِ مریم علیہا السلام کی زندگی کے ابتدائی دَور کی تعلیم وتربیت اس خانقاہ میں ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ بطور

---

[1] مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: منظور الحق، پروفیسر ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف وسورۃ مریم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 2004، ص ص۔ 211 تا 528

ایک راہبہ اس خانقاہ میں وہ زندگی بسر کرتی ہیں اور یہودیوں کی پوری نظامِ شریعت کے خلاف تنہا اٹھ کر وہ ایک جہادِ عظیم کا اعلان کرتی ہیں اور اس میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اس قسم کے جہاد تھے جو یہ حضرات علیہم السلام آ کر کرتے تھے۔ حضرتِ زکریا علیہ السلام کا ایک ذکر تو حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کی زندگی میں آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ انہی کی دی ہوئی تقویت تھی' انہی کا سہارا تھا' انہی کی تعلیم و تربیت تھی' جو حضرتِ مریم علیہا السلام اتنے بڑے عظیم انقلاب کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں بڑھاپے میں بیٹے کا پیدا ہونا

عزیزانِ من! حضرتِ زکریا علیہ السلام کے دل میں بڑھاپے کے زمانے میں یہ آرزو مچلی کہ ان کے ہاں بھی کوئی انکا بیٹا ہونا چاہیے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ اس لیے نہیں تھا کہ ان کی کوئی بہت بڑی جائیداد تھی' کوئی جاگیر تھی اور ان کو یہ غم کھائے جارہا تھا کہ اس کا کوئی وارث ہو' جیسا کہ ہمارے ہاں کے زمینداروں' جاگیرداروں اور دولتمندوں کو غم کھاتا ہے کہ میرے بعد یہ میری دولت' میری جاگیر اور میری زمینداری کدھر جائے گی۔ یہ ''میرے شریک لے جان گے سارے جنے لٹ پٹ کے''۔ [1] اس لیے وہ قبروں پہ اور آستانوں پہ مارا مارا پھرتا ہے کہ میرے ہاں اولاد ہونی چاہیے۔ یہ سلسلہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں نہیں تھا۔ ان کے ہاں تو کوئی جائیداد اور جسے آپ جاگیر کہتے ہیں' ہوتی نہیں۔ یہ کیا چیز تھی جس کے لیے وراثت تھی؟ بات یہ ہے کہ آلِ یعقوب علیہ السلام کے گھرانے میں یہ آسمانی تعلیم چلی آتی تھی اور حضرتِ زکریا علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ معاشرے میں اتنی ابتری پھیل گئی ہے کہ ان کے جو بھی قریبی تھے ان میں سے کوئی بھی اس کا اہل نہیں تھا کہ وہ اس آلِ یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کی تعلیم کو عام کرے اور انقلاب لائے۔ ان کے ہاں کے یہ صحفِ سابقہ اور یہ سابقہ کتبِ سماوی بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں تھیں۔ انہیں نظر آتا تھا کہ میرے بعد کوئی ایسا ہے نہیں جو انہیں سنبھال سکے۔ اس لیے ان کے دل میں یہ آرزو مچلی کہ ان کے ہاں بھی ان کا کوئی بیٹا ہونا چاہیے۔ سورۃ مریم میں کہا گیا ہے کہ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (19:6) تو اپنی جناب سے مجھے کوئی ایسا وارث عطا کر دے جو آلِ یعقوب کی برکات و نعما کا اہل بن سکے تاکہ میں انہیں اس کے سپرد کر دوں' تاکہ وہ میری تعلیم کا وارث ہو اور وہ جو آلِ یعقوب علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء میں شروع سے چلی آ رہی تھی وہ اس کا وارث ہو۔ وہ تنہا میری تعلیم نہیں ہے بلکہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے انبیائے بنی اسرائیل تک کا یہ پورا سلسلہ جو چلا آ رہا ہے وہ اس کا وارث ہو۔

میں نے عرض کیا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کے ہاں جتنا کچھ ان برکات کا' نعمائے خداوندی اور تعلیم کا' یہ سارا ذخیرہ جو چلا آ رہا تھا' اس کی وراثت کے لیے ان کے ذہن میں تھا کہ ایک صالح سا فرزند عطا ہو جائے تاکہ میں یہ اس کے سپرد کروں۔ قرآن نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر بھی کیا ہے کہ وہ ان کا بیٹا تھا اور واقعی اس کی صلاحیت رکھتا تھا کہ وہ ان کی ان تمام برکات کا وارث ہو جائے اور قرآنِ کریم نے

---

[1] یہ سارے میری برادری والے لوٹ کر لے جائیں گے۔

خود بھی اُسے نبیوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔تو یہ تھی وہ دعا جو حضرتِ زکریا علیہ السلام نے یہ کہہ کر مانگی تھی کہ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ (21:89) تو مجھے اس دنیا میں بغیر وارث کے تنہا نہ چھوڑ اگرچہ حقیقت تو یہی ہے کہ تو ہی ہم سب کا بہترین وارث ہے۔ اس آیت میں انت خیر الوٰرثین میں یہ بات بتا دی کہ واقعی وہ جائیداد کا مسئلہ نہیں تھا۔کہا یہ کہ حقیقی مالک' حقیقی وارث' تو تو ہی ہے۔ ان چیزوں کا تو ہی محافظ ہے لیکن انسانی زندگی میں تو تیرا قانون یہ ہے کہ یہ حفاظت بھی انسانوں کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے۔اس لیے اگر میرے ہاں ایسا انتظام نہ ہوا تو مجھے ڈر یہ ہے' خدشہ یہ ہے' کہ یہ ساری چیزیں برباد ہو جائیں گی' تلف ہو جائیں گی' ویران ہو جائیں گی۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ایسا صالح فرزند ہو جس کے سپرد میں ان تمام چیزوں کو کردوں۔ یہ تھی وہ آرزو جو حضرتِ زکریا علیہ السلام کے دل میں مچلی اور اللہ نے کہا کہ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ز وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی (21:90) ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے یحیٰی جیسا بیٹا عطا کر دیا۔اس آیت میں پہلے تو یہ ہے کہ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ (21:90) اس کے لیے عموماً کہا جاتا ہے کہ ہم نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور وَوَهَبْنَا لَهٗ یَحْیٰی (21:91) اسے یحیٰی فرزند عطا کر دیا تو اب ذہن پھر اس طرف گیا کہ یہ بات ایک معجزے کے طور پر تھی۔دعا انہوں نے مانگی۔اللہ تعالیٰ نے ان کو فرزند دیدیا۔ ہمارے ہاں یہ قصہ چلا آتا ہے کہ ہر چیز جو انکی طرف منسوب ہو'اس میں کوئی نہ کوئی معجزانہ پہلو تلاش کر لیا جاتا ہے کہ ایسی بات ہوئی تھی لیکن قرآن تو بات کو ایسا واضح کر دیتا ہے کہ اس میں ان چیزوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہاں سورۃ مریم میں کہا تھا کہ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا (19:5) میری بیوی بانجھ ہے۔ یہ وجہ بتائی تھی کہ جس لیے میرے ہاں ابھی اولاد نہیں ہوئی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔اس کے ساتھ ہی کہہ دیا' واضح کر دیا' کہ ذہن کہیں اس طرف نہ چلا جائے کہ ''انہوں نے دعا مانگی' ہم نے قبول کر لیا' اور اس کے بعد بیٹا ہو گیا۔'' بیوی کے متعلق کہا یہ گیا ہے کہ وہ بیوی بانجھ ہے یعنی اس میں ایک طبعی نقص ہے' اس کے اندر اولاد نہ پیدا کرنے کی ایک بیماری سمجھ لیجیے' ایک طبعی نقص سمجھ لیجیے' یہ ایک سقم سمجھ لیجیے' سقیم بھی اسے ہی کہتے ہیں۔ یہ تھی وہ چیز جو کہی گئی تھی۔قرآن نے کیا کہا؟ کہا کہ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (21:90) اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی یعنی ایسا علاج ہوا کہ اس کی بیوی کا وہ نقص رفع ہو گیا اور اس طریق سے اس کے گھر بیٹا پیدا ہو گیا۔ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (21:90) نے تو ساری بات واضح کر دی۔اور پھر قرآن کی بلاغت ملاحظہ فرمائیے کہ ایک لفظ ''لَهٗ'' کہہ کے بات کتنی واضح کر جاتا ہے کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام میں کوئی ایسی کمی یا نقص نہیں تھا۔ بیوی میں طبعی کمی تھی۔اس کا جو مناسب علاج ہوا تو وہ اَصْلَحْنَا لَهٗ (21:90) اپنے خاوند کے لیے اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جو کچھ بھی اس کا علاج کیا وہ اس قابل ہو گئی۔ یہ (له) خود بتا رہا ہے اور پھر یہاں سے ہی وہ چیز واضح ہو گئی جو آگے حضرتِ مریم علیہا السلام کے قصے میں آنی ہے جو قرآن نے بتایا تھا' یہاں بھی یہ بتایا ہے کہ دونوں میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے۔ تو اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ''لہٗ'' سے یہی مراد ہے کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام میں تو صلاحیت موجود تھی' بیوی میں یہ نقص تھا۔اس لیے یہ کہا کہ اَصْلَحْنَا (21:90) اس نقص کو دُور کر دیا: ''له'' اس کے لیے کہ جس میں

یہ نقص نہیں تھا۔اس کے لیے اس بیوی کا جو نقص تھا وہ دُور کر دیا' بیٹا پیدا ہو گیا۔

خدا کا دین' دینِ فطرت ہے' اس میں کوئی بات خلافِ فطرت نہیں

عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے کہ یہ جتنی چیزیں جنہیں ہم خارقِ عادات یا فوق الفطرت چیزیں کہہ کر اپنے ذہنوں میں لا رہے ہیں' ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے۔ لَہٗ بتا رہا ہے کہ حضرتِ زکریا علیہ السلام میں یہ صلاحیت تھی اور اَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ (21:90) بتا رہا ہے کہ بیوی کے اندر یہ ایک نقص تھا۔ وہ جو بانجھ عورتیں ہوتی ہیں ان کے علاج بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ اصلحنا لہ زوجہ کیسے واضح الفاظ ہیں! یہاں یہ بتایا ہے کہ اولاد پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مرد میں بھی یہ صلاحیت ہو اور عورت میں بھی یہ صلاحیت موجود ہو' پھر ان کے اختلاط سے ہی اولاد پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں آپ کو یاد ہے کہ یہ جو عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کا بیٹا ہے' اس کی تردید یہ کہہ کر قرآن نے کی تھی کہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے' ان سے کہو کہ میرے تو بیوی ہی نہیں ہے تو بیٹا کیسے ہو جائے گا۔

خدا تعالیٰ بھی اپنے قانون کے خلاف کچھ نہیں کرتا

عزیزانِ من! خدا وہ ہے جو اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے اور وہ لایا ہے۔ اسکی مطلق قدرت ایسی عظیم ہے کہ اتنا بڑا کارنامہ تو بغیر کسی قسم کے Physical Cause (طبعی سبب) کے' طبعی مسالے کے' طبعی اسباب کے کائنات کو تو وجود میں لے آیا لیکن کائنات کو وجود میں لانے کے بعد جو قوانین اس نے بنا دیئے ہیں وہ اپنے لیے بھی ان قوانین کے اندر اس کے خلاف نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے ہاں کیسے بیٹا ہو جائے گا میرے تو بیوی ہی نہیں ہے۔ کہا کہ جی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اتنی بڑی کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ اس کے ہاں بیٹا بھی ہو۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں لایا اس کے بعد اولاد پیدا کرنے کے لیے میں نے قانون بنا دیا ہے کہ مرد اور عورت جن میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہو گی ان کے اختلاط سے اولاد پیدا ہو گی' تو میرے متعلق اگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ میں اس کا باپ ہوں تو اکیلے باپ سے تو لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی خدا کہہ رہا ہے کہ اس کے لیے تو بیوی کی بھی ضرورت ہے۔ تو کہیے بیوی کہاں ہے۔ اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ مریم علیہا السلام کے قصے میں اسی کو الٹا دیکھیے کہ یہاں عورت موجود ہے' ان کے عقیدے کے مطابق ساتھ مرد نہیں ہے۔ خدا کے قصے میں کہا ہے کہ یہ کہتے ہیں خدا کا بیٹا یعنی ان کے عقیدے کے مطابق مرد موجود ہے۔ کہا کہ عورت موجود نہیں ہے یہ کیسے ہو۔ اسی کو الٹا دیکھیے عورت موجود ہے اگر مرد موجود نہیں ہے تو کیسے ہو جائے گا۔

انبیاء کا کام اس قسم کے معجزات دکھانا نہیں تھا

عزیزانِ من! انبیائے کرام علیہم السلام اس قسم کے معجزات دکھانے کے لیے نہیں آتے تھے۔ وہ کہے چلے جا رہے ہیں کہ بَشَـــــرٌ

مثلکم بشرٌ مثلکم [1] شروع سے آخر تک کہے چلے جا رہے ہیں کہ او بابا میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں' وحی ہے جو ایک Exception ہے' ایک استثنیٰ ہے۔ وہ میری طرف آتی ہے' جب میں وہ تمہارے تک پہنچا دیتا ہوں تو ہم برابر ہو جاتے ہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں پہلی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اولاد ہوئی ہے جو سلسلہ آگے چلا ہے۔ اس کے بعد اولاد نہیں ہے۔ آپ کے ہاں معجزانہ طور پر کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں بھی' یہ جو ان کے ہاں کا عقیدہ تھا کہ انہوں نے دعا مانگی اور وہ بیٹا پیدا ہو گیا' اس کی تردید کی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (21:90) اور ہم نے' اس کے لیے' اس کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔

انبیائے کرام کے نزدیک احساسِ ذمہ داری کی کیفیت

عزیزانِ من! اب ان تمام انبیاء کے تذکرہ کے بعد کہا کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (21:90) یہ تمام انبیاء نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں نہایت تیزی سے آگے بڑھتے تھے اور زندگی کے ہر گوشے میں' خواہ وہ امید افزا ہو یا یاس انگیز' ہم سے پوچھتے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے (وہ ہر معاملہ میں ہمارے حکم کا انتظار کرتے تھے) اور اُسی کے سامنے جھکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوانین خداوندی کے خلاف قدم اٹھانے میں کس قدر خطرات پوشیدہ ہیں۔ وہ ان کی خلاف ورزی سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے۔ اس آیت میں ان کی خصوصیات بتائی ہیں کہ یہ جو ہم نے ان انبیائے کرام علیہم السلام کا اتنا ذکر کیا ہے ان کی خصوصیات کیا تھیں؟ خصوصیات یہ تھیں کہ وہ ہمارے قوانین کی خلاف ورزی سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے تھے۔ یہ خٰشعین تھے۔ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی معصیت کروں تو میں بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ یہ جو اس کا احساس ہے یہ ہوتا ہے جسے خشوع کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اس احساس سے لرزاں و ترساں رہنا انبیائے کرام علیہم السلام کی خصوصیت بتایا گیا ہے۔ انبیاء میں سے بھی' نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک جگہ نہیں ہے غالباً دو جگہ اعلان کرایا کہ اگر میں بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو اس کے خمیازہ سے' اس کی سزا سے' اس کی عقوبت سے' میں بھی نہیں بچ سکتا۔ آپ اندازہ لگایئے ان لوگوں کی پہلی خصوصیت یہ بتائی ہے۔

زندگی بھر انبیائے کرام کی مصروفیات کا جذبہ صادقہ

عزیزانِ من! اس آیت میں پہلے تو یہ ہے کہ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (21:90) زندگی کا کوئی گوشہ ہو' کوئی منفعت بخش پہلو

---

[1] میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔

سامنے آ رہا ہو کہ ایسا کرنے سے اتنا فائدہ ہو جائے گا یا یہ ہو کہ اس سے ڈر آتا ہے کہ ایسا نہ کیا تو اتنا بڑا نقصان ہو جائے گا' زندگی میں دو ہی پہلو ہوتے ہیں: جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت یا فائدہ حاصل کرنا یا کسی خطرے یا نقصان سے محفوظ رہنا یہ دو ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ عام انسان ان دونوں گوشوں میں کوئی تدبیر خود اختیار کرتا ہے کہ مجھے ایسا کرنا چاہیے' فائدہ حاصل کرنے کے لیے یہ یہ کرنا چاہیے' جائز و ناجائز ہر قسم کا طریق اختیار کرتا ہے۔ انسان اپنی مدافعت کے لیے' نقصان سے بچنے کے لیے' بھی اسی طرح سے سب کچھ کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے' فریب دیتا ہے' دونوں گوشے ہوتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ **یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا** (21:90) زندگی کا کوئی گوشہ بھی ہو' دفعِ مضرت کا ہو یا جلبِ منفعت کا ہو' وہ اس کے لیے اپنے طور پہ فیصلہ نہیں کرتے تھے بلکہ **یَدْعُوْنَنَا** (21:90) ہم سے پوچھتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یعنی ہماری وحی کے مطابق تدبیر اختیار کرتے تھے۔ کتنا ہی منفعت بخش پہلو کیوں نہ ہو' اگر وحی خداوندی اس کی اجازت نہیں دیتی تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ کتنا ہی خطرہ کیوں نہ لاحق ہو' وحی خداوندی ناجائز طریق کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتی' وہ کبھی اس منفعت کے پہلو کو استعمال نہیں کرتے۔ یہ ہے معنی **یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا** کے اور ان سب میں کرتے کیا تھے؟ کہا کہ **يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ** (21:90) یہ تمام انبیاء نوعِ انسان کی بھلائی کے کاموں میں' نہایت تیزی سے آگے بڑھتے تھے۔ **يُسٰرِعُوْنَ** وہ ہے جسے بھاگ دوڑ کرنا کہتے ہیں۔ وہ جلدی سے' تیزی سے' ان کاموں کو کیا کرتے تھے یعنی نوعِ انسانی کی منفعت کے کام' فلاح اور بہبود کے کام' انسانیت سازی کے پروگرام نہایت تیزی سے آگے بڑھ کر کرتے تھے۔

قانونِ خداوندی انسانی اختیارات میں وسعت پیدا کر دیتا ہے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے پہلے بھی یہ بتایا تھا کہ یہ خیر کا لفظ یا خیرات کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تو بڑی عظیم چیز ہے۔ خیر کا' یا خیرات کا وہی مادہ ہے جس سے اختیار کا لفظ نکلا ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق انسان جتنا کچھ بھی حاصل کرتا ہے' اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں' محکومیت کم ہوتی ہے' محتاجی کم ہوتی چلی جاتی ہے' حتیٰ کہ محتاجی اور محکومی رہتی ہی نہیں ہے۔ اختیارِ کامل تو انسان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ اس کو محتاجی بھی نہ ہو کسی قسم کی محکومی بھی نہ ہو۔ یہ حضرات جو نظام قائم کرتے تھے اس میں افراد کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ یہی چیز پھر ہمارے ہاں کے بعد کے مستعار تصوف کے اندر وہ دم اور پھونکیں اور تعویذ ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنے پروگرام سے ایسا نظام قائم کرتے تھے کہ جس میں افرادِ انسانیہ کے اختیارات کی وسعتیں بڑھ جاتی تھیں اور پھر سوچ لیجیے کہ اختیار کی وسعت کہاں پڑتی ہے؟ جہاں انسان کسی دوسرے انسان کا طفیل نہ ہو' انسان دستِ نگر نہ ہو' دوسرے کا محتاج نہ ہو' دوسرے کا محکوم نہ ہو۔ یہ جو نظام قائم کرتے تھے اس کی خصوصیت یہ ہوتی تھی:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

حاکم ومحکوم کے بلمقابل امیر المومنین کی اصطلاح کا مفہوم

عزیزانِ من! اس نظام میں نہ کوئی ایک فرد دوسرے فرد کا اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے محتاج ہے نہ اس میں کوئی حاکم اور محکوم ہے۔ اس نظام میں حاکم اور محکوم ہونے کا تصور ہی نہیں۔ اس میں تمام افراد قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ جنہیں آپ حاکم کہتے ہیں وہ حاکم بھی خدا کے قانون کے محکوم ہوتے ہیں۔ جسے محکوم کہتے ہیں وہ تو اصطلاح ہی نہیں ہے۔ نظامِ خداوندی میں اسلامی نظام میں یہ اصطلاحیں ہی نہیں ہیں۔ حاکم اور محکوم کی اصطلاح بھی نہیں ہے جو انہوں نے اپنے لیے استعمال کی تھی۔ صدرِ اول میں امیر المؤمنین کی اصطلاح تھی۔ شاید میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اسے پھر دہرا دوں کہ الفاظ کس طرح اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ مرورِ زمانہ سے ''امیر'' کا لفظ تو ہمارے ہاں ''غریب'' کے برعکس آ گیا' بالمقابل آ گیا جیسے امیر اور غریب۔ سوال یہ ہے کہ اسے امیر کیوں کہا؟ امیر ہمارے ہاں حاکم کے معنی میں آ گیا تو یہ جو غریب کے مقابلے میں امیر ہے' اسے دولت کے بل بوتے پہ غریبوں کے اوپر حکومت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال ہمارے ہاں یہ لفظ دولتمند کے معنی میں آ گیا۔ سیاست میں' یہ لفظ ہمارے ہاں' حکمران کے معنی میں آ گیا۔ اور عربی زبان اور اسلامی نظام کی اصطلاح میں ان دونوں میں یہ معنی نہیں ہیں۔ میں نے بتایا تھا کہ صحراؤں میں سڑکیں تو ہوتی نہیں۔ نشاناتِ راہ نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے صحراؤں میں سفر کرنا تھا۔ ان کے کارواں بھی چلتے تھے۔ یہ جو 'امیرِ کارواں'' تھا' اس کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ پائلٹ کی طرح کارواں سے آگے جاتا تھا اور وہ راستے کو دیکھ بھال کر کے' متعین کر کے' وہ چھوٹے چھوٹے پتھر کے جسے گیٹیاں کہتے ہیں' چھوٹے چھوٹے پتھر' وہ یہاں یہاں رکھتا چلا جاتا تھا۔ آگے آگے وہ چلا جاتا تھا۔ نشانِ راہ قائم کرتا یا راستہ متعین کرتا اپنے کارواں کے لیے آگے چلا جاتا تھا۔ یہ امیر کہلاتا تھا۔ امر کے معنی ہی' ہدایت کرنا' راہنمائی کرنا' راستے کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہوتا تھا امیر المؤمنین۔ وہ ان کے لیے صحیح راستے کا تعین کرتا تھا اور تعین کرتا تھا خدا کی بتائی ہوئی ہدایت کے مطابق۔ بس یہ تھا اس کا مرتبہ۔ یہ حاکم نہیں تھا۔

انسانیت کی دنیا میں حاکم کا لفظ شرک ہے' اور انسان کی تذلیل بھی

کسی انسان کے لیے حاکم کا لفظ یا اصطلاح شرک ہے۔ کسی انسان کے لیے محکوم کا لفظ اس کی انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ اصطلاحات ہی اسلامی نظام کے اندر نہیں آ سکتیں۔ اس لیے وہ کرتے یہ تھے کہ جتنی ایسی طاغوتی قوتیں یعنی غیر خدائی قوتیں ہوتی تھیں جنہوں نے انسانوں کے صحیح اختیارات کو سلب کیا ہوتا تھا' وہ ان کو راستے سے ہٹاتے تھے اور انسانوں کو ان کے صحیح اختیارات دیتے تھے۔ یہ جو قرآن نے کہا ہوا ہے کہ خدا کے احکام یا اس کی پابندیاں جو عائد کی گئی ہیں اس کا مقصد کیا ہے؟ کہا کہ **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا** (2:286) یہ جو پابندیاں خدا کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں' یہ اس لیے ہیں کہ انسانی ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ یہ تو نہر کی ٹھوکر (Fall) ہوتی ہے جس سے آ کے پانی ٹکراتا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ اس کی روانی کو روک دے بلکہ وہ اس کی روانی میں تیزی پیدا

کرتی ہے۔ یہ نظامِ خداوندی جو یہ حضرات قائم کرتے تھے اس میں افرادِ انسانیہ کو محکومیت اور محتاجی کی جو ذلتیں ہوتی تھیں ان سے بچا کے ان کو صحیح اختیارات کا مالک بنا دیتے تھے۔ یہ ہے جسے خیرات کہا جاتا ہے۔ یہ ہے جسے عملِ خیر کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابل میں ''شر'' ہے۔ انسانیت کی ان وسعتوں اور اختیارات کو جلا دینے والی چیز تو اِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ (21:90) اب ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ہو گیا کہ وہ نیکیوں میں بڑی بھاگ دوڑ کرتے تھے' جلدی کرتے تھے۔ اب نیکی اور بدی کے دو لفظ ہمارے ہاں آ گئے۔

نیکی کے تصور میں استحصال کا پہلو

نیکی کا تصور بھی آپ دیکھیں گے کہ وہی ہے جو مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ مذہب کہیں بھی ہو' یہی تصور ہے کہ مثلاً ہندوؤں کے ہاں صبح سویرے اٹھ کر آٹا ڈالتے ہیں۔ ''چڑیوں کو دانہ''۔ آپ نے تو ہندوؤں کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ سارا دن انسانوں کا خون چوستے رہتے تھے مگر چڑیوں کو چگنے کے لیے دانہ ڈالتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس سے نجات ہو گی۔ مذہب میں نیکی نام ہی اس کا ہے۔ یہاں بھی کوئی جس قدر یہ کام کرنے والے ہیں کتنی بڑی دولت کے مالک بنتے ہیں۔ کہاں سے وہ دولت آتی ہے؟ غریبوں اور مفلسوں کا خون چوس کے' ان کا استحصال کر کے' وہ دولت اکٹھی کرتے ہیں پھر اس میں سے تھوڑا سا نکال کر' سمجھتے ہیں کہ وہ مال پاک صاف ہو گیا۔

ہمارے ہاں نیکی اور عبادت کا مروجہ تصور

عزیزانِ من! آپ کے ہاں اس قسم کی نیکی کمانے والا کہاں سے دیگ پکا کے لاتا ہے؟ ایک دیگ نہیں' لنگر لگا دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں مسافر خانے بنا دیتا ہے' بڑا نام ہوتا ہے' بڑی شہرت ہوتی ہے۔ کہاں سے آیا؟ ہمارے ہاں نیکی کا یہ تصور اس قسم کا رہ گیا ہوا ہے یعنی یہ تصور نہیں ہے کہ کسی محنت کش کی محنت کا استحصال نہ کرنا نیکی ہے۔ اس استحصالی کاروبار سے سبیل لگا دینا نیکی ہے۔ یہ چڑیوں کو دانہ ڈالنے والی بات کے مصداق ہے۔ اس آٹا ڈالنے میں اور اس طرح غریبوں کا خون چوسنے میں کیا فرق ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

مذہب دین کی تمام اصطلاحات و تصورات کو بدل کر رکھ دیتا ہے

جہاں آپ نے نیکی کہا تو کچھ اس قسم کی چیزیں ذہن میں آئیں اور جہاں آپ نے عبادت کہا' نفل پڑھنے اور تسبیح پھیرنے کا وہ تصور ذہن میں آ گیا۔ عزیزانِ من! یہ تبدیلی جو دین سے مذہب کی طرف آتی ہے تصورات کو ہی بدل دیتی ہے' اصطلاحات کے معنی بدل دیتی ہے۔ خیرات جیسا عظیم لفظ ہے اس کے معنی اختیارات کی وسعتیں تھیں۔ اب اس کے معنی بھیک ہو گیا ہے: وہ خیرات بانٹتا ہے' وہ خیرات لیتے ہیں۔ یہ تصور وہ ہے جو خیرات کو دینے والے اور لینے والے ان دونوں کی انسانیت کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔ یہ چیز دینے والے کے ذہن میں تکبر پیدا کرتی ہے' لینے والا تذلیل محسوس کرتا ہے۔ وہ شیطنت ہے' یہ ابلیسیت ہے۔ یوں خیرات ہے اور ہمارے ہاں سب سے بڑی نیکی تو خیرات ہے۔ خیرات کے کاموں میں بڑا حصہ لیتے تھے' وہ اتنی خیرات بانٹا کرتے تھے۔ کاہے کے لیے یہ کچھ کرتے تھے؟

کہ ان میں کوئی اختیارات ہی اپنے پیدا ہو جائیں۔ خیرات دے کر ان کو ناکارہ بھی اور بھک منگا ہی بنا دیتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ اصطلاحیں کیسے بدلتی ہیں' ان اصطلاحوں کی رو سے ترجمے جو آپ لے لیں گے ان سے کیا قرآن سمجھ میں آئے گا؟ البتہ ہمارے ہاں اس سے نیکی کا یہ تصور ہوا' قرآن نے ان کی یہ خصوصیات بتائی ہیں کہ **كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** (21:90-91) وہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ اور ان کے ساتھ اس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے (یہودیوں کی خودساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰ علیہ السلام جیسا بیٹا عطا کیا۔ جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمہ ڈال کر اُسے صاحبِ اختیار و ارادہ انسان بنا دیا تھا' اسے بھی ایسا ہی بنا دیا (32:9; 19:16; 3:44) وہ دونوں اقوامِ عالم کے لیے اس بات کی نشانی تھے کہ احکامِ خداوندی اور انسانوں کی خودساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ یہودیوں کی خودساختہ شریعت نے انہیں' معاذ اللہ' مردود و ملعون قرار دیا اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھہرایا۔

مذہب کے خلاف حضرت مریم علیہا السلام کی بردباری اور جرأت کا کارنامہ

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ قرآنِ کریم حضرتِ مریم علیہا السلام کی زندگی کو بھی اسی انقلاب آفریں ہستیوں کے زمرے میں شریک کرتا ہے حالانکہ وہ نبیہ نہیں تھیں۔ نبیہ تو کوئی بھی عورت نہیں تھی۔ انہوں نے بہت بڑا عظیم انقلابی کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ آج بھی' عزیزانِ من! مذہب پرست طبقہ کے فتوے گولی تو نہیں مارتے لیکن جس طرح سے یہ بھڑوں کا چھتہ چھڑتا ہے ان کے اس پروپیگنڈہ کے ڈر سے کتنی ہی ایسی گفتنی باتیں ہیں جو ناگفتنی رہ جاتی ہیں' جن کو آدمی زبان پہ نہیں لا سکتا' اس کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔ ایک تنہا لڑکی ٹیمپل کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔ اس شریعت اور طریقت کی پابند' وہی تعلیم اس کی ہوئی ہے کہ وہ شادی نہیں کر سکتی' اپنا سارا گھرانہ' بڑا ہی مذہبی ہے۔ یہی اسی مذہب اور اسی شریعت کا پابند' بنی اسرائیل کا پورا علاقہ ہے۔ یہ سارا علاقہ ہے اس کے اندر یہ تنہا لڑکی' اس ہیکل کے اندر کھڑی ہو کر ان مذہبی پیشواؤں کو اور طریقت کے احبار و رہبان کو چیلنج دیتی ہے کہ یہ تمہاری شریعت خودساختہ ہے' خدا کی شریعت نہیں ہے اور میں اس کے خلاف احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ وہ زبان ہی سے نہیں کہتی۔ وہ کہتی ہے کہ میں تمہیں کر کے بھی دکھاؤں گی۔ صاحب! بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہم نے مریم علیہا السلام کو ایک مقصدِ عظیم کے لیے چن لیا اور ہمیں وہ مقصدِ عظیم کیا بتایا جاتا ہے کہ بن باپ کے بیٹا پیدا ہو گیا' تو یہ مریم کا کیا کارنامہ تھا۔ عزیزانِ من! اس میں سوچنے کی چیزیں ہیں کہ کتنے بلند مقام کے اوپر قرآن انہیں بتاتا ہے اور ان کا وہ کارنامہ کیا ہے کہ جس بنا پہ وہ یہ بتا رہا ہے۔ اس میں مریم کا کیا کارنامہ ہے؟ اگر اس کو بغیر کسی انسانی اختلاط کے بقول ان کے یا ان کے عقیدے کے مطابق ایک حمل قرار پا جاتا ہے تو میری بیٹیاں مجھے معاف رکھیں' کہ اس

کارنامے میں اس عورت کا کیا کردار ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو قرآن کہتا ہے کہ مریم کو ہم نے چن لیا۔ یہ لفظ تو قرآنِ کریم میں انبیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک مقصدِ جلیلہ کے لیے اس کو ہم نے چن لیا۔ وہ عظیم مقصد یعنی ذرا سا اپنا شائبہ نہیں تھا۔ معاف رکھیے گا طبعی طور پر بچہ پیدا کرنے کے لیے پھر بھی تو عورت کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ یہ جو Conception تھا اس کا جو یہ Concept کہ خدا کی طرف اس کو حمل ہوگیا اور وہ بچہ پیدا ہوگیا تو کیا کارنامہ ہے جس کے لیے خدا کہتا ہے کہ ہم نے اسے ایک کام کے لیے چن لیا تھا۔

قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوگا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کو سمجھنا ہو تو اس طرح سے ان مقامات پہ کھڑے ہو کے یہ سوچنا چاہیے کہ بالآخر وہ کیا بات تھی جس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو اتنا ممتاز درجہ دیا تھا۔ بہر حال پیدائشِ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس سے پیشتر سورۃ آلِ عمران اور سورۃ مریم کے ضمن میں، میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، میری کتابوں میں یہ باتیں درج ہیں، اس لیے تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد آگے اصل چیز آئی۔ اب حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کے یہاں حضرتِ یحییٰ علیہ السلام تک کا ذکر قرآن لے آیا ہے اور پھر حضرتِ مریم علیہا السلام کا بھی تذکرہ ضمناً اس میں آ گیا۔

قرآنِ حکیم پوری نوعِ انسانی کو ایک امت کا تصور پیش کرتا ہے

قرآن کہتا ہے یہ انبیائے کرام علیہم السلام، دنیا کی ہر قوم میں ہم نے بھیجے، ہر ملک میں ہم نے بھیجے، ہر زبان میں ہم نے بھیجے، تو یہ ان کے ملک مختلف، ان کے زمانے مختلف، نسلیں مختلف۔ ہماری اصطلاح میں ان کی قومیتیں مختلف ہیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (21:92) اے رسول! یہ تمام انبیاء کا گروہ شروع سے آخر تک، ایک جماعت تھی۔ ان کی تعلیم بھی ایک ہی تھی اور مقصد بھی ایک۔ یہ تمام کے تمام ایک قوم کو Belong کرتے تھے۔ کہتے ہیں جی! اسلام میں قومیت کا مدار کیا ہے؟ آدھی آیت بتا رہی ہے کہ قومیت کا مدار کیا ہے۔ آدھی نہیں پوری بتائے گی۔ پھر سن لیجیے نسلیں مختلف، وطن مختلف، جغرافیائی حدود مختلف، زبانیں مختلف، نسلیں بھی مختلف، اور ان سب کے باوجود یہ سب کے سب اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (21:92) امتِ واحدہ تھے، یہ سارے ایک قوم کو Belong کرتے تھے۔ کونسی چیز تھی جس کی بناء پر ان تمام اختلافات کے باوجود وہ ایک قوم کے افراد تھے؟ آج تو ان اختلافات میں سے کوئی ایک اختلاف بھی ہو تو وہ ایک قوم کا فرد نہیں ہوسکتا۔ مگر وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ ان تمام اختلافات کے باوجود یہ سارے امتِ واحدہ تھے، ایک قوم کے فرد تھے۔

قرآنِ حکیم ایک قانون کی اتباع ہی کو قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

عزیزانِ من! اگلے دو لفظوں میں بتا دیا ہے کہ قومیت کی بنیاد کیا ہوتی ہے۔ اختلافات کی چیزیں تو بنیاد نہیں ہوتیں۔ ان میں ایک چیز قدرِ مشترک تھی اور وہ تھی: وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (21:92) وہ ایک خدا کے بتائے ہوئے قانون کی اتباع کرتے تھے۔ قرآن نے معیار یہ بتا دیا کہ ایک قانون کا اتباع کرنے سے ایک قوم متشکل ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ان تمام اختلافاتِ زمانی اور مکانی کے باوجود یہ ایک قوم کے افراد اس لیے تھے کہ یہ صرف قانونِ خداوندی کا اتباع کرتے تھے۔ قرآن نے یہ کتنا عظیم معیار بتایا ہے قومیت کی تشکیل کا قانون کی وحدت۔ یہاں ہر قوم یا ہر مملکت جو اپنی الگ الگ ہستی رکھتی ہے' تو ٹھیک ہے' وہ نقشے کے اوپر لکیریں ہوتی ہیں۔ ان لکیروں کی چار دیواری کے اندر جو افراد بستے ہیں ان کے مابین ایک قوم بننے کے لیے کیا معیار ہوتا ہے' وہ کونسی Force (قوت) ہوتی ہے جو ان کو یکجا رکھنے یا ایک قوم بنانے کے لیے ہوتی ہے؟ یہ چیز ایک قانون کا اتباع ہے' اور اگر انہی حدود کے اندر بسنے والا کوئی گروپ اپنے لیے کوئی دوسرا قانون وضع کر لے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس قوم کا فرد نہیں رہتا بلکہ بغاوت کا جرم اس پہ عائد ہو جاتا ہے' پھانسی پہ لٹکا دیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اسلامی قوم بننے کے لیے اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ❶ (21:92) ایک خدا کے قانون کا اتباع ضروری ہے۔ یہی چودہ سو سال پہلے کے انسانوں نے کیا اور اگر آج ہم بھی وہی کچھ کریں تو پھر ہم سب اسی طرح ایک قوم کے افراد ہو کر امتِ واحدہ بن سکتے ہیں۔ آج بھی اگر دنیا کے کسی خطے کے اندر ایک قوم کے افراد ایک قانون کا اتباع کرتے ہیں تو وہ سب ایک قوم کے افراد ہیں اور اگر اس کے برعکس اور ایک ہی قوم میں' ایک ہی جغرافیائی حدود میں' ایک Country یا ملک کے اندر' اگر وہ خدا کا قانون نہیں ہے جس کا اتباع کیا جاتا ہے تو یہ اس قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ تو سوچیے تو سہی' عزیزانِ من! دُور نہ جائیے۔ یہ جو آپ کے ہاں ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ رکھتا ہے اور اپنے اپنے قانون رکھتا ہے' خواہ وہ Personal Laws (شخصی قوانین) ہوں' یہاں تو ہر فرقے کے یہ الگ الگ قانون ہیں تو کہا کہ کیا یہ ایک قوم بن سکتی ہے؟ یہ امتِ واحدہ کس طرح سے ہو جائے گی؟ وہاں تو ایک قانون ہے جس کا اتباع کیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے ہی اس طرح وہ امتِ واحدہ بنتے ہیں۔

مملکت پاکستان کے خلاف ایک گہری سازش

میں نے اس دفعہ اپنے کنونشن کے اندر کہا تھا کہ یہاں یہ ایک سازش ہے کہ اسے اسلامی مملکت اور اس قوم کو ایک امتِ واحدہ نہیں بننے دینا' وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں' اس ملک کے اندر' کہیں ایک قانون نہ بن جائے اور نہ ہی نافذ ہو سکے۔ ہر فرقے کے الگ الگ

---

❶ میں تمہارا نشو ونما دینے والا رب ہوں' سو تم صرف میری اطاعت کرو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو (23:52)۔

Personal laws (شخصی قوانین) رکھنے کے بعد آپ اس قوم کو ایک قوم اس ملک کو ایک ملک اس مملکت کو ایک مملکت کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد جو Public Laws (ریاستی قوانین) ہیں وہ تو خداوندی Laws (قوانین) ہیں جو آج تک بن ہی نہیں سکے۔ ایسی بنیاد رکھ دی گئی ہے کہ یہ بن ہی نہیں سکتے۔ خود ان کو اعتراف ہے کہ نہیں بن سکتے ہئیت حاکمہ کو نہیں ہے یہ جو اقامتِ دین کے داعی ہیں ان کا اعتراف ہے کہ Public Laws (ریاستی قوانین) کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بن سکتا' جو یہاں کے تمام مسلمانوں کے نزدیک اسلامی کہلا سکے۔ نہیں بن سکتا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! وہ سازش کہ اگر یہ سیکولر رہے گی تو آپ کی مملکت قائم رہے گی۔ اسلامی کی طرف آ ؤ گے تو بقول ان کے معیار کے ایک قانون بن ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک ملک کے اندر ایک قانون رائج نہیں ہے تو وہ مملکت نہ مملکت بن سکتی ہے' نہ اسکے رہنے والے ایک قوم بن سکتے ہیں۔ یہ کچھ چھوٹی سازش نہیں ہے۔ سیکولر رکھیے اس کو۔ بس ٹھیک ہے ہر فرقے کے Personal Laws (شخصی قوانین) اپنے اپنے اور Public Laws (ریاستی قوانین) حکومت کے جیسے بھی وہ بنائے۔ تو انڈیا میں بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو بھی تو Personal Laws (شخصی قوانین) کی اجازت ہے وہاں Public Laws (ریاستی قوانین) سیکولر ہیں تو یہاں اور وہاں میں فرق کیا ہے؟ آگے پھر ہمارا یہ نوجوان پوچھتا ہے کہ پھر یہ اس قدر جان جوکھوں میں ڈال کے علیحدہ مملکت بنانا' علیحدہ قوم بنانا' لاکھوں کی قربانی دینا' کیا تھا؟ آج روز یہاں یہ ڈنکا بجتا ہے کہ بھارت نے قوت پیدا کر لی' وہ حملہ کر دے گا۔ انڈیا نے یہ کچھ کر لیا تو علاحدہ ہونے' قربانیاں دے کے اس عذاب کی ضرورت کیا ہے جبکہ یہاں بھی نظام وہی ہے اور وہاں بھی نظام وہی ہے تو خوانخواہ کے لیے یہ کچھ کیوں کیا اور اسی لیے پھر جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس پاکستان کی وجہ جواز بھی پھر اس قسم کی تلاش کرتے ہیں کہ ہندوؤں نے تنگ کیا تھا' سرمایہ دار طبقہ دیکھتا تھا کہ وہاں ہندو کارخانے لگانے کی اجازت نہیں دے گا' دولت ہندو لوٹ کے لے جائے گا' سرمایہ ان کے پاس چلا جائے گا' اس لیے یہ الگ مملکت بنی۔ یہ ایک Law (قانون) کیا ہے؟ یاد رکھیے اسلامی مملکت میں وہ Law (قانون) وحی خداوندی پر مبنی ہوتا ہے اس سے ایک امت بنتی ہے' اس سے ایک اسلامی مملکت بنتی ہے اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اِنَّ هٰـذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ [1] (21:92)

قرآنِ حکیم کا پیغام نوعِ انسانی کے نام

قرآن بڑی عظیم چیز کہہ گیا ہے اور آپ نے اب دیکھ لیا کہ قرآن کوئی مذہبی وعظ نہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام جو آتے رہے تھے' وہ یہ

---

[1] (اے رسول!) یہ تم انبیاء کا گروہ شروع سے آخر تک' ایک جماعت تھی۔ (ان کی تعلیم بھی ایک ہی تھی اور مقصد بھی ایک۔ ان کے خدا نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمہاری تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ) میں تمہارا نشوونما دینے والا ہوں۔ سو تم صرف میری اطاعت اختیار کرو۔ اس میں کسی اور کو شریک نہ کرو۔ (21:52)

بتانے کے لیے آتے تھے کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانیت ایک قوم ایک امت‘ کیسے بن سکتی ہے۔ وہ سیاست کا بنیادی اصول دینے کے لیے آئے تھے کہ امتِ واحدہ بنانے کے لیے واحد قانون کا ہونا ضروری ہے۔ یہ آج کی اصطلاح میں Political Science (سیاسی سائنس) نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ یہی کہنے کے لیے آتے تھے۔ اور آگے انہوں نے پھر بتا دیا کہ جب یہ بات نہ رہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ سب انبیاء ایک ہی جماعت کے افراد تھے اور ان کی تعلیم بھی ایک ہی تھی‘ تو ان کے متبعین کو بھی امتِ واحدہ بن کر رہنا چاہیے تھا لیکن **وَتَقَطَّعُوٓا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ** (21:93) انہوں نے باہمی اختلافات سے اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیا جبکہ انبیائے کرام علیہم السلام یہ کرنے کے لیے آتے تھے: ایک قانون‘ اس کے ماننے والے افراد ایک قوم۔ اور ان کے بعد یہ لوگ ایک قانون کی بجائے اپنی اپنی مختلف فقہیں ایجاد کر لیتے تھے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ یہ ایک قوم بھی نہیں رہتے تھے‘ ایک قانون بھی نہیں رہتا تھا۔ ان کے ہاں ہر قوم یہ کچھ کرتی تھی‘ کہلاتے تو وہ وہی تھے‘ یہودی بھی یہودی کہلاتے تھے‘ عیسائی عیسائی کہلاتے تھے‘ مسلمان مسلمان کہلاتے ہیں لیکن اپنے اندر پھر یہ فرقے پیدا کر لیتے تھے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ یہاں لفظ بینھم آیا ہے۔ سوچیے‘ کہ پھر ہمارے ساتھ آپس میں کیا کچھ نہیں ہوا!

آج کرہ ارض پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کی حالت زار اور اُن کی بے حسی

آج ہم سیاسی اعتبار سے ستر کروڑ مسلمان‘ پتہ نہیں ستر یا ستر سے بھی زیادہ‘ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی مختلف مملکتیں ہیں۔ ہر مملکت کا مسلمان ایک الگ قوم ہے۔ اس کا الگ قانون ہے۔ ایک ہی مملکت کے اندر بسنے والے مسلمانوں کے ہر فرقے کی‘ الگ الگ‘ اپنی اپنی شریعت‘ اپنا اپنا فقہی قانون ہے مگر اس مملکت کا اسلامی قانون نہیں بنا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ایسا کوئی قانون نہیں بن سکتا جو تمام فرقوں کے لیے متفق علیہ ہو۔ انہوں نے معیار وہ دیدیا ہے جس کی رو سے یہ خود کہتے ہیں کہ ایسا قانون نہیں بن سکتا۔ عزیزانِ من! پہلے دین کی اہمیت ذہنوں سے اوجھل کر دی۔ یہ کوئی ایسا معاملہ ہی نہیں ہے جس کو Seriously (سنجیدگی سے) کوئی سوچے۔ آپ سوچیے تو سہی کہ آپ کے یہ ساٹھ کروڑ مسلمانوں نے کبھی بیٹھ کے Seriously (سنجیدگی سے) سوچا بھی ہے کہ یہ معاملہ کیا ہے‘ یہ اسلامی مملکت کیوں نہیں بن رہی‘ اس کی کیا وجوہات ہیں‘ کہاں کہاں خرابیاں ہیں؟ آپ کے ہاں ہزاروں مسائل کے لیے روز کنونشنیں (Conventions) بھی ہوتی ہیں‘ کانفرنسیں (Conferences) ہوتی ہیں‘ جماعتیں بنتی ہیں‘ پارٹیاں بنتی ہیں‘ الیکشن ہوتے ہیں۔ کیا کبھی اس Issue (مسئلہ) پر بھی بیٹھ کے کسی نے سوچا ہے کہ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ قوم کو Indifference (بے حس) بنا دیا جاتا ہے۔

بات یاد آ گئی یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ دفتر کی بات تھی۔ احمدی حضرات میں مناظرانہ پہلو ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ اپنے پمفلٹ لیے لیے پھرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ڈیپارٹمنٹ کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس زمانے میں وہ اینگلو انڈین ہی کہلاتے تھے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ وہ گورا تھا۔ اس قسم کا اسی کے دفتر کا ایک کلرک تھا۔ وہ کچھ پمفلٹ لیے ہوئے اس کے پاس گیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کا ہے کے

متعلق ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب کے متعلق ہیں۔ وہ کہنے لگا:

Go to the Padri; he is paid for this, I am not

یعنی انہیں پادری کے پاس لے جاؤ' انہیں اس کی تنخواہ ملتی ہے' مجھے اس کی تنخواہ نہیں ملتی۔ عزیزانِ من! قوم جب یہاں پہنچ جاتی ہے کہ ''یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا میرے ساتھ تعلق نہیں' اس کا تعلق مولوی صاحب سے ہے' ان سے جا کے بات کرو' اسے ان کی تنخواہ ملتی ہے' مجھے اس کی تنخواہ نہیں ملتی'' قوم اس کے بارے میں Indifferent (بے حس) ہو جاتی ہے۔ مذاہب میں تو یہ ہوسکتا تھا کہ مذہب کا Department ہے' الگ شعبہ ہے لیکن مسلمان کے ہاں تو یہ بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس قوم کو اس مقام پہ پہنچا دیا گیا ہے کہ انہوں نے بھی سمجھ لیا ہے کہ یہ مذہب سے متعلق معاملہ ہے' تم ان کے پاس جاؤ' یہ ان کا معاملہ ہے' میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمان Indifferent (بے حس ولاتعلق) ہو چکا ہے۔ اس کے ذہن سے دین کا تصور غائب ہو گیا ہے۔ اگر اس قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میری زندگی کی ایک ایک سانس دین کے تابع آنی چاہیے تو پھر یہ Indifference (لاتعلقی و بے حسی) نہ ہوتی۔ قیامت آ گئی ہے' عزیزانِ من! بینگن اگر دو روپے کی بجائے ڈھائی روپے سیر ہوتی ہے تو دہائی مچ جاتی ہے' دین سرے سے' بنیاد سے' اکھیڑا جا رہا ہے کسی کو احساس ہی نہیں کہ اس سے بھی کوئی فرق پڑتا ہے۔ امتِ واحدہ بننے کے لیے فَاعْبُدُوْنِ (21:92) کہا ہے کہ تم صرف میرے قوانین کی اطاعت اختیار کرو۔ عزیزانِ من! یہ عظیم آیت ہے۔ اس کے بعد اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ (21:93) یہ باہمی اختلافات سے اس وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے تھے' ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے حالانکہ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (21:93) ان سب کو بالآخر ہمارے ہی قانون کی طرف آنا ہے۔ اس کے سوا انسان کے لیے فلاح وسعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ عزیزانِ من! اس طرح یہ بات واضح کر دی کہ جو جی میں آئے کر دیکھو' جس قدر غیر قرآنی' غیر خدائی نظام' انسان بنانا چاہتا ہے' بنا کے دیکھ لے' تھک تھکا کے' تنگ آ کر' بالآخر انہیں اس اصول پہ ہمارے ہاں آنا پڑے گا: كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ (21:93)۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اچھا' مرنا تو ہے ہی۔ ایک دن ہمارے ہاں بھی تجھے آنا ہے۔ ہاں جی یعنی یہاں تو کوئی خدا کا اقتدار معاذ اللہ نہیں ہے وہ وہاں آخرت میں بیٹھا ہوا ہے جیسے وہ لڑکے جو اسکول میں جھگڑا کرتے ہیں یا وہ جو کمزور کو پیٹتا ہے تو پٹنے والا کہتا ہے: ''اچھی گل اے۔ ساڈے محلے وچ وی آئیں گا ناتوں۔ فیر تینوں دساں گا۔ ساڈے محلے جدوں آئیں گا''۔ [1] وہ کہتے یہ ہیں کہ یہاں تو جو جی میں آئے تم کر لو' کوئی بات نہیں۔ مرنے کے بعد تو ہمارے ہاں آنا ہے فیر کھچاں گے تہانوں۔ [2] عزیزانِ من! نقشہ کیا بن گیا ہے! قرآن بتا رہا ہے کہ آخرالامر انسانیت کا مستقبل کیا ہے۔ وہ کہتا

---

[1] اچھی بات ہے۔ ہمارے محلے میں تو تم آؤ گے تو پھر میں تجھے بتاؤں گا...... جب ہمارے محلے میں آؤ گے!!

[2] پھر تمہاری کھچائی کریں گے۔

ہے آزما کے دیکھ لے جو کچھ انہوں نے کرنا ہے' اس طرح سے الگ الگ معیاروں کے مطابق' الگ الگ قومیتیں بنالیں' الگ الگ وطنیتیں بنالیں' الگ الگ قوانین بنالیں اور پھر دیکھیں کہ اس کا کیا تماشہ ہو رہا ہے۔عزیزانِ من! یہی کچھ آج ہو رہا ہے:

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

انسانیت کو آخر کار اسی صراطِ مستقیم پر آنا پڑے گا

اس نے یہ کچھ کر دیا ہے۔کہا: ٹھیک ہے' جوشِ جنوں میں پاگلوں کی طرح تو یہ کچھ کرے گی جب انسانیت کا ذرا بھی دماغ ٹھنڈا ہوا تو پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ وحدتِ قانون کی بنیاد کے اوپر اجتماعیت کی تشکیل ہونی چاہیے۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن انسانیت اس مقام پر آئے گی۔ اِلَيْنَـا رٰجِعُوْنَ (21:93) ہمارے قائم کردہ' ہمارے دیئے ہوئے' معیار کی طرف رجوع کرے گی۔ انسانیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور سوال یہ ہے کہ اس کا معیار کیا ہو گا؟ کہا کہ اس کا ایک ہی معیار ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (21:94) جو کوئی بھی ضابطہ خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھے اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو' جس سے اس کی ذات کی نشوونما بھی ہو جائے اور انسانی معاشرے کے بگڑے ہوئے کام بھی سنور جائیں تو اس کی کوششیں ناکام نہیں رہیں گے۔عزیزانِ من! یہ ایک ہی معیار ہو گا۔اس میں پہلی چیز تو ہے: وَهُوَ مُؤْمِنٌ (21:94) وہ مومن ہو گا۔اب یہاں بھی یہ ہو گیا کہ جو عملِ صالح کرے گا اور وہ مومن ہو گا' نیک کام کرے گا' وہ ایمان لائے گا وہ مومن ہو گا' تو اس کی کوششیں ناکام نہیں رہیں گی' نتیجہ برآمد کر کے رہیں گی لیکن ہمارے ہاں پھر وہ فقہی مسئلہ پیدا کیا گیا کہ کفار کے جو نیک اعمال ہیں ان کا کیا ہو گا؟ اب کفار اور مومن دو الگ قومیں بن گئیں۔ہم' جو عبدالرحمٰن نام رکھاتے ہیں' یہ الگ ہو گئی اور وہ جو رام داس ہے وہ الگ ہو گیا۔

انسانی زندگی کے لیے جذبہ محرکہ اور عقل وشعور کا معیار

عزیزانِ من! بالکل سیدھی سی بات ہے' آپ کسی کام کے لیے قدم نہیں اٹھا سکتے' جب تک آپ کو اس کا یقین یا اطمینان نہ ہو کہ اس کام کے کرنے میں آپ کا کچھ فائدہ ہے۔اس کے بغیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آپ اس کام کے لیے اٹھیں۔اس کام کے کرنے کے لیے یا تو اس کام کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق ہے یا اس کام میں آپ کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''دفعِ مضرت یا جلبِ منفعت'' کام کرنے کے یہ دو ہی جذبے اور بنیادیں ہیں۔کوئی وجہ کشش اس کے اندر ہو گی تو اس کے لیے آپ قدم اٹھائیں گے یا نہ کرنے سے نقصان ہو گا تو آپ بطور تحفظ و دفاع اپنا قدم اٹھائیں گے۔روز سینکڑوں ہزاروں کام' کاروبار' دنیا میں پھیلے ہوتے ہیں۔آپ ہر ایک کی طرف تو نہیں بھاگ کے جاتے۔ان میں سے کوئی ایک ہوتا ہے جس کے لیے آپ قدم اٹھاتے ہیں۔وہ ایک کیا ہوتا ہے؟ وہ ہوتا ہے جس میں آپ کی

دلچسپی، جاذبیت، منفعت یا دفع مضرت کا کوئی پہلو ہوتا ہے، جس کے ساتھ you are in any way interested in it [1]۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو آپ اس کام کے لیے اٹھتے ہی نہیں۔ تو یہ پہلی چیز ہے یعنی دل کے اندر یہ ہو کہ میں اس کے لیے Interested ہوں۔ اسے اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔

یہاں کہا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہو گی کہ یہ جو نظامِ خداوندی دیا گیا ہے کہ قانون اس کے بتائے ہوئے خطوط پر متشکل ہونا چاہیے کیا یہ ایک ایسی چیز ہے جو تمہارے جی کو لگتی ہے؟ پہلے تو یہ فیصلہ کرو، جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ہاں صاحب! یہ اس قابل ہے کہ اس کے لیے جدوجہد کی جائے، اسے مومن کہتے ہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ یہ نہیں، ایسا نہیں ہے، میں جس طرح جی چاہے کروں، اسے کافر کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ کفر اور ایمان کی فقہی بحثیں نہیں ہیں۔ یہ دین اسلام کے بنیادی مبادیات ہیں۔ پھر آ جائیے اسی روزمرہ کی زبان کی طرف کہ جس مسئلے کے ساتھ آپ کو دلچسپی نہیں، اس کی افادیت کے آپ قائل نہیں، آپ اسے محسوس نہیں کرتے، اس پہ آپ کو یقین نہیں ہے کہ یہ واقعی فائدہ مند چیز ہے، اس کے لیے آپ قدم نہیں اٹھاتے۔ اس یقین کو ایمان کہتے ہیں۔ کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قوم اس چیز کا یقین کرلے کہ واقعی انسانیت کی فلاح، نجات اور خود ہماری اپنی منفعت اس نظام کے اندر ہے جس میں ایک قانون ہو، جو وحی خداوندی پر متشکل سب پہ یکساں طور پہ لاگو ہو۔ اس طرح سے وہ ایک قوم ہے، جو اس طرح تصور کی محکمیت پر یقین رکھے گی۔ اب اس کے بعد جب وہ قدم اٹھائے گی تو مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ (21:94) وہ ایسے کام کرے جو ان کی صلاحیتوں کو بھی بیدار کر جائے، اور انسانیت کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوار جائے۔ اسے عملِ صالح کہتے ہیں یہ وہ کام ہیں جو بگڑے ہوئے کاموں کو سنواریں، جو تخریب کی جگہ تعمیر پیدا کریں، جو ناہمواریاں دُور کر کے ہمواریاں پیدا کریں، جو بگڑے ہوئے معاملات کو سنواریں، جو گیسوئے کائنات میں مشاطگی [2] کریں اور انسان کی اپنی ذات کی بگڑی ہوئی صلاحیتوں کو سنواریں وہ قرآنِ حکیم کے نزدیک اعمال صالح ہوتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (21:94) ان کی کوششیں بے سود نہیں جائیں گی، تعمیری نتیجہ برآمد کریں گی یعنی جو اس نظام کے صحیح خوشگوار نتائج ہیں وہ ان لوگوں کی محنتیں برآمد کریں گی۔

عزیزانِ من! یاد رکھیے یہ نظام، نظری طور پہ خود ہی اپنے نتائج نہیں پیدا کرتا۔ ان نتائج کے پیدا کرنے کے لیے قرآن کہتا ہے لِسَعْيِهٖ (21:94) اس کے لیے جو قوم کوشش کرے گی، اس کی کوشش کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔

---

[1] کسی نہ کسی طرح سے آپ اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

[2] کنگھی کرنا۔ معاملات کو سنوارنا

قرآنِ حکیم کا بیان کردہ قانونِ مکافاتِ عمل

نظری طور پہ تو قرآن میں یہ موجود ہی ہے۔ اسے اتنا دہرایا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی کلمہ' کوئی نظام' کوئی نظریہ اس طرح تواتر کے ساتھ دہرایا ہی نہیں جاتا جتنا ہم اسے دہراتے ہیں۔ تو پھر اس کے باوجود وہ نتائج کیوں نہیں نکلتے؟ نتائج تو یہی نکلنے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس کی افادیت پر تو یقین ہے لیکن اگر صلاحیت بخش کام جو اس نے بتائے ہیں' اس کے مطابق ان کو کیا جائے یعنی اسی نظام کے استحکام' بقا' فروغ' آگے بڑھانے کے لیے' تو ان کی جو یہ کوششیں ہونگی' وہ صحیح نتائج پیدا کریں گی۔ اور کہا کہ ایسا کبھی بھی ذہن میں نہ ہو کہ پتہ نہیں کوئی کوشش تو وہاں لکھی جائے اور یہ جو مزدور اپنی دہاڑیاں کارخانے میں لکھایا کرتے ہیں' مہینے کے بعد ان سے کہا جائے کہ نہیں اوئے' تمہارے پچیس دن بنتے ہیں اور وہ کہتا ہے صاحب! نہیں' وہ دو دیہاڑیاں تے لکھی ہی نہیں' وہ میری ماری گئیں۔ اب جھگڑا پڑا۔ اندازہ لگائیے کہ کیا کہتا ہے قرآن کا قانونِ مکافاتِ عمل' کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ کہیں ان کا ذکر نہ ہو۔ وہ تو ایک قانون ہے وہاں تو انسان کا ہر سانس ایک عمل ہے جو نتیجہ پیدا کرتا ہے لہٰذا لیکن ہماری اصطلاح میں کہا ہے کہ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (21:94) ہم تو یہ کسی اور سے لکھواتے نہیں کہ منشی ونشی غلطی کر جائے بلکہ ان کے کام ہم خود لکھتے ہیں ورنہ تم وہاں کہدو:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

''او کیندا' پئی ساڈا لکھن والا نہ سہی' گواہ ای ہیگا سی۔ اپنے فرشتے بھیج کے ساڈے لکھوا کے سانوں سزا دے دیندا ہیگا اے [1]۔ مگر قرآن کا یہ انداز ہے کہ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (21:94) ہمارا قانونِ مکافات ہر ایک کی سعی و عمل کو محفوظ رکھتا ہے' اس میں کوئی گھپلا نہیں ہوگا ہم خود لکھتے ہیں۔ یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔

آخر کار ان تمام انبیاء کرام کا ذکرِ خیر کیوں؟

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے نظام دیا۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کا حضرتِ نوح علیہ السلام سے حضرتِ یحییٰ علیہ السلام تک ذکر شروع کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے کیا؟ یہ کوئی قصے کہانیاں تھیں جو بیان کی گئی ہیں؟ کیا یہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے جس میں ان کا ذکر کیا گیا ہے؟ بات یہ نہیں ہے اس نے تو تاریخی شہادات کی تائید سے ایک نتیجے پہ پہنچانا ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس کا ذکر قرآن میں مذکور ہے' تفصیل سے اس کو دیکھو۔ قرآن نے اس کا نچوڑ دو لفظوں میں بیان کر دیا کہ یہ حضرات کاہے کے لیے آئے تھے اور

---

[1] وہ کہتا ہے کہ ہمارا لکھنے والا نہ سہی کوئی گواہ تو ہو۔ مگر یہاں تو اپنے ہی فرشتے بھیجے ہمارے اعمال کا اندراج کیا اور دے دی سزا۔

یہ کیا کرتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ یہ بکھری ہوئی انسانیت کو ایک امت بنانے کے لیے آتے تھے کہ ساری رقابتیں، عداوتیں، خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ختم ہوں۔ آج آپ کے ہاں یہ جو روز جنگ چھڑتی ہے، وہ مختلف قومیتوں کے اعتبار سے چھڑتی ہے، یہ جو روز آپ کی قوم کے اندر جھگڑے اٹھتے ہیں، یہ مختلف پارٹیوں اور مختلف فرقوں کی وجہ سے اٹھتے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ یہ ہے وہ چیز جس کی وجہ سے انسانیت ایک دوسرے کے ساتھ بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہے۔ یہ انبیائے کرام اس لیے آتے تھے کہ ان کے ان اختلافات کو دُور کر کے ان کو امتِ واحدہ بنا دیں۔ اس کا طریقہ یہ تھا، اس کی بنیاد یہ تھی کہ انہوں نے ایک قانون دیا، انسانوں کو ایک امت کہا: یہ تو ایک قوم ہے، ایک نوع ہے۔ اب وہ قومیں جو اس نظام کو چھوڑ دیتی ہیں تو پھر کیا ہوتا ہے؟ قرآن غلط نظام کے انجام کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے یا دو مراحل میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ پہلے تو چھوٹی چھوٹی سی تخریبی چیزیں ان کے ہاں آتی ہیں جسے عذاب کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جب عذاب کا لفظ آتا ہے تو ذہن میں وہ قیامت والی بات آ جاتی ہے جب کہ تخریبی نتائج یعنی کسی قوم کو برباد اور تباہ کرنے والی جتنی چیزیں ہوتی ہیں یا ان کے جرائم کے جو نتائج نکلتے ہیں جسے ہم سزا کہتے ہیں قرآنِ حکیم عام اصطلاح میں اسے عذاب کہتا ہے۔

دنیا کی کوئی قوم فوری طور پر تباہ نہیں ہوتی

قرآنِ کریم میں ہے کہ ابتداً یہ نہیں ہوتا تھا کہ جونہی کسی قوم نے ذرا بھی کوئی غلط قدم اٹھایا اور ہم نے اس کو فنا کر دیا۔ یہ نہیں ہوتا مگر یہ لوگ اپنے غلط نظام زندگی پر نازاں ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا مستحکم اور پائیدار ہے اور اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ ان سے کہہ دو کہ غلط نظام کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا کیونکہ **وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا** (17:58) کوئی قوم ایسی نہیں کہ وہ غلط نظام کی حامل ہو اور وہ اسی دنیا میں تباہ یا سخت عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ ہمارے قانونِ مکافات کے ضابطہ میں درج ہے اور وہ قانون اٹل ہے۔ ہمارے قانونِ مشیت کے اندر یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ہیں: قومیں غلط قدم اٹھاتی ہیں تو پہلے شروع میں چھوٹے چھوٹے نقصانات ہوتے ہیں، ان کی چھوٹی چھوٹی تخریبیں ہوتی ہیں۔ اس کو بھی قرآن نے عذاب کہا یعنی ان کو متنبہ کیا جاتا ہے، انہیں وارننگ دی جاتی ہے، صحیح راستے کی طرف بلایا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس غلط روی میں Persist (ضد) کرتی چلی جاتی ہیں، ضد کرتی ہیں اور اسی میں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں تو کہا کہ پھر وہ وقت آ جاتا ہے جسے قرآن نے ہلاکتِ امم کہا ہے

ہلاک ہونے والی قوموں کی زبوں حال کیفیت

عزیزانِ من! ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ پوری کی پوری قوم ہی کہیں غرق کر دی جاتی ہے اور ان کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ تاریخ میں ایسی قومیں بھی ہیں کہ جن کے ہاں قرآن کے الفاظ میں ''ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئی ہیں''، ان کے افراد بھی الگ نظر نہیں آتے،

دوسری قوموں میں جذب ہو جاتے ہیں لیکن ہلاکت کی بدترین شکل تو یہ ہے کہ وہ قوم' قوم کے نام سے تو موجود ہو لیکن وہ ان کے حصے میں انسانیت کا جتنا بھی امتیاز ہے اس کی بجائے تخریبِ انسانیت ان کے حصے آ گئی ہو۔عزیزانِ من! یہ ہلاکتِ قومی کی بدترین عذاب کی شکل ہے کہ وہ قوم زندہ رہے۔ یہودیوں کی مثال قرآن نے دی ہے کہ تم دیکھو ہزاروں سال سے یہ اپنا جداگانہ تشخص قائم کیے ہوئے چلے آ رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی نسل کے بعد دوسروں کے ساتھ شادیاں تک بھی روا نہیں رکھیں' مذہب بھی قومی بنا لیا ہوا ہے۔آج ان کا قومی تشخص تو قائم ہے لیکن حالت یہ ہے کہ **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ** (2:61) ان پر ذلت وخواری کا عذابِ خداوندی مستولی ہو گیا۔دنیا میں جہاں کہیں بھی یہ قوم جائے خانہ خراب ہے۔تاریخ ان کے ایک دور میں انہیں Wandering Jews کے نام سے یاد کرتی ہے۔ذلت اور خواری ان کے پیچھے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی ہے۔یہ بھی ایک ہلاکتِ قومی ہے کہ قوم کا نام باقی رہے' تشخص تو وہ باقی رکھے لیکن ذلت اور پستی کے غاروں کے اندر ڈوب جائے' جیسا کہ آج ہمارا حال ہے۔ہم تشخص تو قائم رکھے ہوئے ہیں لیکن ہزار برس سے جو ہم پہ بیت رہی ہے وہ سراپا ہلاکت ہے لیکن اس ہلاکت کے سلسلہ میں بھی یہاں ایک بڑی عظیم چیز آ رہی ہے۔ وقت تھوڑا رہ گیا بات ذرا لمبی ہے۔دو چار منٹ شاید زیادہ لگ جائیں۔قرآن کہتا ہے کہ **حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ** (21:95) جن اقوام کی صلاحیتیں نشوونما پانے سے رک جاتی ہیں وہ تباہ ہو کر زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ جاتی ہیں اور پھر لوٹ کر مرفہ الحالی کی طرف نہیں آ سکتیں (17:58)۔یوں ایک اسٹیج تو ایسی بھی آ جاتی ہے کہ قوم اس طرح سے مٹتی ہے' تباہ ہوتی ہے کہ پھر اس میں نشاۃ ثانیہ یا حیاتِ نو دوبارہ زندہ ہونا' دوبارہ فروغ پانا' دوبارہ ترقی یافتہ ہو جانا' اس کا امکان ہی اس کے اندر نہیں رہتا۔اس طرح سے وہ قوم ختم ہوتی ہے۔یہاں اس سے آگے ایک چیز اور بھی کہی ہے۔

دورِ ہلاکت میں حیاتِ نو کے آثار

عزیزانِ من! میں نے قرآن حکیم پہ جو کچھ غور کیا ہے تو اس دَور کی ایک عظیم چیز سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض قومیں ایسی ہیں جو اپنا تشخص رکھے ہوئے ہوتی ہیں۔وہ باہر کے دباؤ سے کچلی ہوئی بھی ہوتی ہیں' وہ اٹھ نہیں سکتیں لیکن ایک طریقہ ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دور میں یہ بات سمجھ میں آئی ہے جو قرآن یہاں کہہ گیا ہے۔بعض اوقات ہوتا یہ ہے: **حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ** (21:96) یاجوج وماجوج کے یہ الفاظ قرآن میں دو جگہ آئے ہیں۔ایک تو سورۃ کہف میں آئے ہیں یعنی (18:94) میں وہ تو وہاں ہے جہاں ذوالقرنین کا قصہ آتا ہے۔وہ ایران کا مشہور بادشاہ ہے جسے سائرس کہا جاتا ہے۔ وہ جب پاکیشیا کی طرف گیا ہے تو وہاں ایک بیچاری کمزور سی قوم تھی' کوئی Tribe تھا۔اس نے کہا تھا کہ یہاں سے اور اس کے آگے سطح مرتفع پامیر وغیرہ شروع ہو جاتی ہے۔وہ جہاں پرانی تاریخ میں یہ منگول Tribes چنگیزوں اور ہلاکوؤں وہ جو گڑ گڑ کرتے آندھی کی

طرح آتے تھے برق رفتاری سے آتے تھے تباہ و برباد کر کے لوٹ کھسوٹ کے پھر واپس چلے جاتے تھے۔ ان کا شیوہ ہی یہ تھا۔ اپنے گرد و نواح کی اقوام میں وہ یورپ تک آ جاتے تھے۔ یہ قومیں ان کے ہاتھوں بڑی نالاں تھیں بیچاری بڑی تنگ آئی ہوئی تھی تو قرآن میں یہ ہے کہ انہوں نے اس سائرس [1] سے کہا کہ یہ قومیں بڑا تنگ کرتی ہیں پہاڑوں میں یہ درہ دانیال [2] ہے اس درے کے راستے گھس آتی ہیں اور ہمیں چین سے نہیں رہنے دیتیں لوٹ کھسوٹ کے سب کچھ لے جاتی ہیں۔ اس کا انتظام کر دو۔ تو اس نے اس درے کو بند کر دیا تھا۔ ایک تو وہاں یہ لفظ یاجوج و ماجوج [3] آتا ہے۔ تاریخ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہی وحشی قبائل تھے جو وسط ایشیاء سے سنٹرل ایشیاء سے اس طرح سے آیا کرتے تھے۔ یہ یاجوج و ماجوج [3] کی طرح ہے: بھڑکتی ہوئی آگ یا آندھی کی طرح تیزی سے لپٹ کے آ جانا اور جلا کے بھسم کر کے رکھ دینا یا لوٹ کھسوٹ کر کے الگ ہو جانا۔ ان لفظوں کے بنیادی معنی یہی ہیں تو وہاں تو کہا جاتا تھا کہ وہ قبائل تھے۔ لیکن دوسرے مقام پہ آیا ہے کہ یہ دنیا کی ہر وہ قوم ہے جو اپنے اپنے ہاں سے اٹھ کے اور دوسرے دُور دراز مقامات میں جا کے جہاں غریب کمزور ناتواں قومیں ہوں وہاں جا کے جسے آپ Colonization کہتے ہیں وہ وہاں جا کے اپنی کالونیاں بنا لیتے تھے۔ یہ وہی چیز تھی۔ وہ قبائل تو لوٹ کھسوٹ کے بعد چلے جاتے تھے وہ دَورِ وحشت کا غیر مہذب زمانہ کا تھا۔ وہ لوٹنے کو آتے تھے۔ چنگیزیت اور ہلاکوخانیت میں بدنام ہو جاتے تھے اور لوٹ کے چلے جاتے تھے۔ کچھ بھیڑ بکریاں کچھ کسی کے ہاں کے گھوڑے کچھ جانور اتنا ہی لے جاتے ہونگے مگر یہ جو ہمارے مہذب دَور کی لوٹ تھی جسے یہ Colonization کہتے ہیں وہ تو پوچھو نہیں کہ اس لوٹ کے کیا معنی تھے۔ ہندوستان کے اندر بھی ان کا جو زمانہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے حالانکہ جس کمپنی نے حکومت شروع کی تھی اس وقت پھر بھی یہاں کے رہنے والے اتنے زیادہ دبے ہوئے نہیں تھے۔ افریقہ میں آپ دیکھیے یعنی بیلجیئم اور ہالینڈ جیسی قومیں اپنے ہاں اپنے ہی ملک میں جنہیں کوئی پوچھتا نہیں ہے انہیں ہالینڈ کے گوالے دودھ بیچ کر گزارا کرنے والے کہتے تھے اور آپ کے ہاں یہ سارا علاقہ جتنا انڈونیشیا وغیرہ کا ہے وہاں بیلجیئم جیسی قومیں کس طرح سے آئیں کس طرح انہوں نے لوٹا کھسوٹا کی ان قوموں کو تباہ کیا۔ یہ ہے جو قرآن میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں

---

1. اس کی مفصل تفصیل کے لیے دیکھیے: منظور الحق، پروفیسر، ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف، سورہ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص ص۔ 155 - 141۔
2. اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: منظور الحق، پروفیسر، ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف وسورۃ مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص۔ 147 نیز فٹ نوٹ نمبر 1۔
3. نہایت شعلہ مزاج، تندخو، برق رفتار آندھی کی طرف امڈ آنے والے، جنگجو، سرکش۔ یاجوج و ماجوج کی مفصل تفصیل کے لیے دیکھیے: منظور الحق، پروفیسر، ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ الکہف وسورۃ مریم ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص ص۔ 146,147، 155 تا 157 نیز فٹ نوٹ نمبر اص 157۔

کہ ہمارے دَور کے یاجوج وماجوج ازحد خطرناک ہیں۔ یہ یاجوج وماجوج کا وہی مظہر ہے۔ اس کا مطلب ہے: اپنے ہاں سے اٹھ کر، دوسروں کے ہاں آندھی کی طرح چلے جانا، وہاں جا کے ان کا یہ تمام سامانِ زیست تباہ کر دینا، لوٹ کھسوٹ سے اسے لے جانا، ان کا استحصال کر دینا۔ یہ تھا ان کا وطیرہ۔

استحصال واستبداد کے خلاف خونِ اسرائیل کا جوش میں آنا

قرآن کہتا ہے کہ جو قومیں کبھی ایک دفعہ دب جائیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کا یہ استحصال اور استبداد اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اس کے خلاف ان اقوام کا ایک ردِعمل ابھرتا ہے اور اس ردِعمل کے طور پہ ان اقوام میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ عظیم چیز ہے مگر اس میں پہلے تو یہ ہوتا ہے جو اقبالؒ نے کہا کہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہ کچھ استحصال کرنے والی اقوام کرتی ہیں لیکن اقبالؒ (1877-1938) یوں بھی کہتا ہے کہ پھر یہ ہوتا ہے:

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ ساحری

ان قوموں کے اندر، ان کے استبداد کے ردِعمل کے طور پہ، ان کے خون میں جوش آتا ہے تو وہاں کوئی موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتا ہے، وہ طلسمِ سامری کو توڑ دیتا ہے۔ مسلمان ممالک میں بھی ایسا ہوا ہے۔ جہاں یورپ کی یہ قومیں گئی ہیں، وہاں جا کے انہوں نے اس طرح سے استحصال کیا ہے تو وہاں ان کے استحصال سے ایک ردِعمل پیدا ہوا۔ اس کی ایک مثال ترک ہمارے سامنے ہیں۔ جنگِ بلقان اور یونان کے بعد ان کی حالتِ استحصال انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یہ وہاں کانفرنس میں بیٹھے ہوئے ترکی کے حصے بخرے کر رہے تھے جب یہ مسئلہ شدت تک پہنچا ہے تو آپ دیکھیے گا کہ وہاں کے ایک نوجوان، جو ترکی کے تھے، کے اندر ایک ردِعمل پیدا ہوا۔ اس طرح وہاں ایک اتنا بڑا انسان پیدا ہوا۔ اس نے اس قوم کو حیاتِ تازہ بخش دی۔ اقبالؒ (1877-1938) نے انہی کے متعلق یہ کہا تھا کہ

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مغرب ومشرق ان کی تشبیہیں ہوتی ہیں۔

آخر کار حکمرانوں کی یہ ساحری قانونِ مکافات کے سامنے سرنگوں ہوگی

قرآن نے یہ ایک پروسیس یا طریق کار بتایا ہے کہ وہ پسماندہ قومیں جو ابھی ختم ہی نہ ہوگئی ہوں اور ان کے اوپر راکھ کا ڈھیر ہو لیکن اس کے نیچے شرارِ زندگی، کسی طرح سے دبا ہوا ہی سہی، موجود ہو تو ان کے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ اس قسم کی قومیں ان کے ہاں جاتی ہیں، جا کر استبداد اور استیلاء میں شدت اختیار کرتی ہیں۔ شروع شروع میں تو وہ اور زیادہ دب جاتی ہیں یعنی حکمراں کی ساحری ان کو سلا دیتی ہے لیکن ایک ایسا وقت آ سکتا ہے کہ ردِّعمل کے طور پہ ان کے خون میں جوش پیدا ہوا اور وہاں کوئی ان کے اندر ایک انسان پیدا ہو جائے جو ان کے طلسم کو توڑ دے۔ اس طریق سے انہیں نشاۃِ ثانیہ حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر قوموں کے اندر یہ صورت نہیں ہے، اس کے اندر رگوں میں خون ہی باقی نہ رہے، تو پھر اس کے دوبارہ اٹھنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ تو یہ قوم اس طرح سے مٹ جاتی ہے۔

آخر کا یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی

حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ (21:96)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی یہ آیت مشکل آیات میں سے ہے۔ مشکل کے معنی یہ ہیں کہ یہ آیات زیادہ غور و فکر چاہتی ہیں۔ مشکل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ اس کے متعلق بہت کچھ کہا گیا، یاجوج و ماجوج قومیں [1] متعین کی گئیں۔ کہا کہ ان کے پھاٹک کھل جائیں گے اور ہمارے ہاں تو ہر شے کو قربِ قیامت کے متعلق رکھ دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہاں کوئی تبدیلی ہی نہیں آ رہی، وہ قربِ قیامت کی ہی ہوتی ہے جہاں یہ تبدیلی آئے گی مگر قیامت بھی اپنے اصلی مفہوم میں نہیں، قرآن کے مفہوم میں نہیں، بلکہ اپنے ہی خود ساختہ مفہوم میں لی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) وہ (انقلابِ عظیم واقع ہوگا) جس میں عالم گیر انسانیت خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ (39:69; 45:36-37; 84:6-8; 89:16-22) اس دنیا کے اندر نوعِ انسانی ربوبیت خداوندی کے نظام کے قیام کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہاں **یقوم الناس** کہا ہے تو یہ وہی لفظ ہے جہاں سے قیامت آئی ہے، عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ ان کچلی ہوئی قوموں کے نشاۃِ ثانیہ حاصل کرنے کا یہ ایک طریق ہو سکتا ہے لیکن اس کے بعد انسانیت اور ان کے لیے یہ چیز وجہ فروغ اور وجہ نشو و نما اسی صورت میں ہو سکے گی کہ یہ اپنے نظام کو قرآن کی حدود کے مطابق، وحی کے

---

[1] یاجوج و ماجوج کے مروجہ مفہوم کے لیے دیکھیے: منظور الحق، پروفیسر، ڈاکٹر (مدیر): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ الکہف و سورۃ مریم، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2004، ص۔ 155

مطابق، متشکل کریں۔ آگے یہ بات آتی ہے اور یہاں سے اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ کو کہا گیا کہ یہ جو تمہارے مخالف ہیں، ان کے متعلق قرآن پرانی قوموں کی داستانیں بیان کرتا ہے اور پھر حضور ﷺ سے یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اسی طرح سے کر رہے ہیں، اس کے بعد ان کا انجام تمہارے ہاتھوں سے یہی کچھ ہونے والا ہے۔ ان کو اس کی وارننگ دیدو۔ یہ چیز ہم اگلی آیت میں لیں گے۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ الانبیاء کی آیت 96 تک آ گئے۔ اس کے بعد والی آیات اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ الانبیاء (آیات 97 تا 102)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي
غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٩٧﴾ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ۖ
أَنتُمْ لَهَا وَارِدُونَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هَٰؤُلَاءِ آلِهَةً مَّا وَرَدُوهَا ۖ وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيهَا
زَفِيرٌ وَهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُم مِّنَّا الْحُسْنَىٰ ۙ أُولَٰئِكَ عَنْهَا
مُبْعَدُونَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنفُسُهُمْ خَالِدُونَ ﴿١٠٢﴾

عزیزانِ من! آج نومبر 1976ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 97 سے ہو رہا ہے (21:97)۔

قرآنی معاشرے کی پہلی اور اہم خصوصیت

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے درس میں، میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ قوموں کے خود ساختہ قائم کردہ غلط نظام کی جگہ احکامِ خداوندی کے مطابق صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ایک انقلاب لاتے تھے۔ اس کے لیے وہ پہلے ان قوموں کو آگاہ کرتے تھے کہ تمہارے اس غلط نظام کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے اور اس سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ تم نظامِ خداوندی کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کرو۔ اس معاشرے کا پہلا نتیجہ یا خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ساتھ کے ساتھ ہوتی جاتی ہے۔ طبعی زندگی کی جو نشوونما اور پرورش ہے یہ تو یوں کہیے کہ مفت میں ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ مقدم چیز ہے۔ اس کے بغیر، زندگی کی اس سطح پر، جس پر ہم جی رہے ہیں، یعنی طبعی سطح Physical ground پر، افراد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے اس جسم کی نشوونما نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انسانی ذات کی نشوونما ہو نہیں سکتی۔ یہ تو بالکل اس کی ابتدائی چیز ہوتی ہے، اصل مقصد انسان کی ذات کی خصوصیات کی نشوونما ہوتا ہے، اور وہ نشوونما ایک اجتماعی زندگی

نظام کے اندر ہوسکتی ہے' انفرادی طور پر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا انبیائے کرام کی آمد کا مقصد اور ان کی رسالت کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ ہمارے تصور کے مطابق ایک ایک فرد کا تزکیہ نفس کرتے تھے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہاں ایک معاشرتی نظام' قائم کریں۔ اس نظام میں تمدنی' سیاسی' معاشی' سب چیزیں آ جاتی ہیں۔ وہ انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک صحیح نظام قائم کرتے تھے جس میں تمام ضروریاتِ زندگی از خود میسر آتی تھیں اور انسانوں کی صلاحیتوں کی نشو ونما ہو جاتی تھی۔ یہ غلط نظام کی جگہ اس نظام کو قائم کرتے تھے۔ وہ انہیں کہتے تھے کہ اس غلط نظام کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ یاد رکھیے! کبھی تو یہ ہوتا تھا کہ وہ جو جماعت تیار کرتے تھے اس کے ہاتھوں وہ نیا نظام متشکل ہو جاتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اسی مقام پہ ہو جائے جہاں ان کی ابتداً دعوت کا آغاز ہوتا تھا یا وہ وہاں سے کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر کے چلے جائیں جہاں اس نظام کے قیام کے لیے فضا زیادہ سازگار ہو۔ یہ تھا مقصود۔ اب قرآنِ کریم نے سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی گزشتہ امم جن کی طرف وہ آئے تھے' کے جتنے واقعات بیان کیے ہیں وہ اسی مقصد کے لیے بیان کیے ہیں۔ اسکے بعد جب ہماری نگاہوں سے دین کا تصور ہی اوجھل ہو گیا تو ہم نے عذاب کے معنی بھی کچھ اور متشکل کر لیے' نجات کا مقصود بھی کچھ اور سمجھ لیا' اور ان قوموں کے اوپر جو ہلاکت اور تباہی آئی تھی اس کے متعلق بھی یہ سمجھ لیا کہ وہ کچھ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعا کا نتیجہ تھا' کچھ انہوں نے معجزات دکھانے تھے' اس کی وجہ سے کہیں وہ کہہ دیا کہ جھکڑ چلا تھا اور کہیں یہ کہہ دیا کہ طوفان آ گیا تھا۔ قرآنِ کریم نے یہ چیزیں بتائی ہیں لیکن ہم نے یہ نہیں سمجھا کہ وہ اس کی غرض وغایت کیا بتایا ہے' مقصود کیا بتایا ہے؟ بہر حال وہ کچھ ان کے ہاتھوں سے ہو جاتا تھا' ان کے سامنے یہ چیز آتی تھی۔ یہ کچھ قرآن میں موجود ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب یہی سلسلہ آگے بڑھ کر حضور نبی اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک تک آتا ہے تو ہمارے سامنے وہ عہد آتا ہے جس میں یہ انقلاب اس قدر بھرپور مکمل شکل میں سامنے آیا ہے کہ ہم ہی نہیں غیر مسلم مورخین بھی یہ بتاتے ہیں کہ تاریخ میں اس قسم کے انقلاب کی مثال نہیں ملتی۔

عذاب اور ہلاکت کے معنی اقتدار کا چھن جانا اور کسی نظام کا باطل ہو جانا ہے

عزیزانِ من! یہی وہ مقصود و مطلوب انقلاب تھا جس میں غلط نظاموں کو مٹا کر اُن کی جگہ صحیح نظام کا قیام کرنا تھا۔ یہ تھا انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد اور یہ جسے ہم ہلاکتِ امم کہتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں سے مخالفین ہلاک ہو گئے تو اس میں ہلاک کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کے ہاں کا اقتدار چھن گیا' انکا جو نظامِ باطل تھا وہ مٹ گیا۔ اس کے لیے اگر حضور ﷺ کی غزوات اور معرکے جمع کیے جائیں تو تاریخ کی رو سے قریباً بیاسی کے قریب تصادمات ہیں جو حضور ﷺ کے ان لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کی اپنی زندگی کے اندر ہوئے اور اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں جو ہوا وہ تو چھوڑ دیجیے۔ حضور ﷺ کی اپنی زندگی کے اندر اور وہ بھی قریباً سات سالہ جو مدنی ابتدائی زندگی ہے اس میں اتنا کچھ ہوا تھا۔ یہ مخالفین اس نظام کی مزاحمت کے لیے جنگ کے میدانوں میں اتر آئے تھے۔ وہاں ان کو

شکست پہ شکست ہوتی چلی گئی۔ یہ ہے وہ جسے عذاب کہا گیا ہے۔ عذاب نہیں ہے' یہ تو ان کے باطل نظام کے تباہ کن نتائج ہیں جو جنگ میں شکست کی بناء پہ سامنے آئے ہیں۔ اپنے ہاں جو غلط نظام کا نتیجہ ابتری' بدتر تباہی ہوتا ہے یہ اس شکل میں بھی سامنے آئے ہیں اور جنگ کی شکلیں اسی کا مظہر ہیں۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہاں یہ تباہی وابتری اس قدر آئی ہے کہ اس سے وہ تاریخ بھری پڑی ہے لیکن ہم نے وہ تصور ہی ذہن سے ہٹا دیا۔ جہاں جہاں قرآنِ کریم میں حضور ﷺ کے زمانے کے ان واقعات کا ذکر ہے وہاں ہم نے تصور ہی یہ قائم کیا ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ان کے دشمنوں کو اس قدر ہلاکت ہوگی' عذاب آئے گا' سزا ملے گی' وہ ہم نے سمجھا کہ یہ قیامت کے متعلق بات ہے' یہاں کی بات نہیں ہے۔

نیکی اور بدی کے نتائج کو قیامت پر اٹھا رکھنے کے تصور کی سازش

سابقہ امم اور انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق تو ہم نے دیکھا کہ وہ یہاں اسی دنیا میں ہوتا تھا لیکن حضور ﷺ کے عہدِ مبارک میں ان کے ساتھ اسی قسم کا جو کچھ ہوا' اس کے متعلق ہم نے سمجھا کہ یہ قیامت کے دن کے واقعات کا ذکر ہے یہاں کا نہیں ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ اس کے بعد جب یہ دین مذہب میں بدلا ہے تو مذہب میں یہ جو غلط اعمال جہاں کیے جاتے ہیں ان کی جزا اور سزا دی ہی قیامت میں جا کے جاتی ہے' یہاں اس زندگی میں اس کا تعلق کچھ نہیں بتایا جاتا۔ اس زندگی کا کاروبار کچھ دنیاوی معاملات کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔ انسان کے غلط اعمال' جن کو گناہ کہا جاتا ہے' اور اچھے اعمال جن کو نیک عملی یا نیکیاں کہا جاتا ہے' اس کا حساب کتاب قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ گناہوں کی سزا اور نیکیوں کی جزا قیامت میں جا کر ملتی ہے' اس زندگی میں نہیں ملتی۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی کہ انہیں یہ تصور کیوں قائم کرنا پڑا کہ جن چیزوں کا نام انہوں نے یہاں نیکیاں رکھ لیا تھا' اعمالِ صالح رکھ لیا تھا' یہ اعتقادات' چند رسومات' چند شعائر' چند مناسک' اس قسم کے دین میں ہیں جن کی بڑی اہم حیثیت تھی۔ ان کو انہوں نے مقصودِ بالذات قرار دیدیا: اتنی نمازیں پڑھ لی جائیں' روزے رکھ لیے جائیں' حج کر کے آ جائے' آدمی اتنی زکوٰۃ دیدے۔ یہ ان کے نزدیک نیک عمل ہو گیا اور نیک اعمال کا نتیجہ یہاں تو کوئی سامنے نہیں آتا' ان کے برعکس یہ جتنے بھی غلط اعمال والے لوگ تھے ان کی اصطلاح کے اندر فاسق' فاجر اور یہ گناہگار ہیں' ان کو بھی یہاں سزا ملتی دکھائی نہیں دیتی۔ جزا اور سزا کا یہ عمل قرآن کے ایک ایک صفحہ کے اوپر تھا تو اس کے ہوتے ہوئے یہ کیا کرتے؟ اس سے انکار بھی نہیں ہوسکتا تھا تو انہوں نے اس کی شکل یہ پیدا کی کہ یہ سب برحق ہے لیکن یہ سب قیامت میں جا کر ہوگا۔ اسی لیے انہوں نے اس کو دارالجزا کہا کہ یہ کچھ وہاں جا کے ہوگا' اس زندگی میں ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں اور جب بھی مذہب آتا ہے اس کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جنہیں نیک کام یا ''پن کے کام'' کہا جاتا ہے ان کا کوئی نتیجہ بھی یہاں سامنے نہیں آتا اور جنہیں آپ یہ عام برائیاں کہتے ہیں' ان کے متعلق ٹھیک ہے کہ آپ یوں کہیے کہ آپ انہیں گالیاں دیدیجیے' لعنتی قرار دیدیجیے ان کو یہاں سزا ملتی

نظر ہی نہیں آتی بلکہ وہ تو الٹا تصور ہوتا ہے کہ صاحب! یہ تو روز پیٹتے چلے جاتے ہیں۔ اس دشواری کے پیشِ نظر انہوں نے حل یہ سوچ لیا کہ اس کو تو قیامت پہ اٹھا رکھو......

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

اور وہاں جا کے دیکھ لیا جائے گا یہاں تو اسکا کوئی ثبوت مل نہیں سکتا تھا۔

قرآن جنت اور جہنم کی ابتدا اس زندگی سے کرتا ہے

عزیزانِ من! قرآن تو انسان کی اس دنیا کی زندگی سے پہلی گفتگو کرتا ہے۔ آدم سے کہا ہی یہ گیا تھا کہ اب تم نے اس دنیا کے اندر بسنا ہے۔ اس کے لیے ہماری طرف سے راہنمائی آئے گی۔ جو اس راہنمائی کا اتباع کریں گے ان کے لیے کہا کہ **لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ** (2:38) وہ ہر قسم کے خوف وحزن سے مامون ہونگے' وہ لوگ جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ تباہ اور برباد ہونگے۔ یہ اس دنیا کا ذکر ہو رہا ہے اور یہ الگ بات ہے کہ زندگی مسلسل چلتی ہے' یہیں سے پھر یہ کارواں آگے بڑھتا ہے۔ جسے ہم آخرت کہتے ہیں' وہاں پہنچتا ہے اور انسان یہی جزا اور سزا اپنے ساتھ لیے ہوئے آگے جا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلسل پروگرام ہے' ایک Continuous پروجیکٹ ہے لیکن یہاں وہ ایک نظام کے تابع ہوتا ہے۔ اب اگر نظام غلط ہے تو اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی' اس کے ساتھ تو یہ کسی قسم کا تعلق ہی نہیں رکھتے کہ وہ دنیا داروں کا معاملہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے یہ کر لیں' چار دن کی بات ہے اس کے بعد تو پھر وہاں چلنا ہی ہے۔ خدا کا اقتدار' اس کا حیطہ اقتدار' اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہاں تو یہ سارا جتنا بھی عمل ہے' شیطان کا ہو رہا ہے' ہونے دیتے ہیں۔ وہ بھی الگ بیٹھا ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے کسی دن ساڈی گلی اچ وی آئیں گا ای نا توں' پھر دیکھاں گے۔ [1] معاذ اللہ' یعنی اس دنیا میں خدا کا کوئی اقتدار نہیں' اس کا کوئی قانون نہیں چل رہا' کچھ نہیں' بے بس ہو کے وہ بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہے کہ اچھا' ان کو یہاں آنے دیجیے عزیزانِ من! خدا کا اقتدار ساری کائنات پہ ہے' آج کی زندگی پہ بھی ہے' آج بھی اس کے قانون چل رہے ہیں' ہمارا ہی تصور غلط ہو گیا ہے۔ یہاں کی زندگی کے اندر' غلط نظام کے باعث' ہمارا ہی تصور غلط ہو گیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یہاں کی زندگی کے اندر بھی وہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

دورِ اولیٰ کے بعد نظروں سے دین کا نظام اوجھل ہو جانے کا نتیجہ

عزیزانِ من! چونکہ دورِ اولیٰ کے بعد دین کا وہ نظام قائم ہی نہیں ہوا لہٰذا ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کے نتائج ہوتے کیا ہیں' سوائے اس کے کہ ہم تاریخ کے واقعات کو دہرا دیتے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیتے ہیں کہ صاحب ٹھیک ہے جی' کہ وہ تو ایک رسول ﷺ

---

[1] ہمارے ہاں بھی تو کسی دن آؤ گے' وہاں دیکھ لیں گے۔

تھے‘ ان کے ساتھ صحابہ کبار رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے‘ انہوں نے یہ نتائج پیدا کر کے بتا دیئے‘ اب ان کی شان کا کوئی مومن کہاں پیدا ہوتا ہے‘ تو وہ قصہ تو ان کے ساتھ ہی ختم ہوا‘ باقی آگے جو چلے تو یہ دنیا داروں کا نظام ہے۔ جو دنیا داروں کے فاسق و فاجر ہیں‘ چار دن کے لیے عیش کر لیں اللہ کے ہاں جا کے ان کو سزا ملے گی۔ اب یہاں جو کچھ بھی متقی پرہیزگار اللہ کے نیک بندے ہیں یہ سارا کچھ کرتے ہیں اور مرتے چلے جاتے ہیں‘ پستے چلے جاتے ہیں‘ تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ’’چار دن کی بات ہے میاں! یہ دنیا جیل خانہ ہے۔ اس کے اندر مومن قیدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سے جب قیامت میں نکلے گا جنت اسی کے لیے ہوگی‘‘۔ معاملہ ختم کر دیا۔

دینِ خداوندی کا دوسرا نام نظامِ حیات ہے

عزیزانِ من! یہاں اس دنیا سے دین کی بنیاد ہی اکھاڑ کے رکھ دی۔ دین تو یہاں کے نظام کا نام ہے۔ پچھلی آیات میں یہ چیز آتی رہی۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ آپ کے سامنے آئے۔ اِن واقعات کے بعد قرآن نے یہ بتایا کہ یہ جو کمزور قومیں ہیں‘ پست قومیں ہیں‘ ان پہ تباہی اور بربادی آتی ہے‘ پھر اگر اِن میں نئی زندگی کا‘ نشاۃ ثانیہ کا کوئی امکان ہو سکتا ہے تو اس سلسلہ میں قرآن نے ایک چیز بتائی تھی کہ اس کا ایک طریق وہ بھی ہو سکتا ہے جو میں نے پچھلے درس میں آپ کے سامنے پیش کیا تھا جسے قرآن نے ’’یاجوج و ماجوج‘‘ کہہ کے پکارا ہے۔

اب یہ کچھ یہ کہنے کے بعد قرآن اصل چیز پہ آتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے مخالفین کو مخاطب کر کے وہ کہتا ہے کہ ہم نے یہ ساری داستانیں بیان کی ہیں تو ہم تمہیں کوئی تاریخ نہیں پڑھا رہے کہ تم نے ایم اے کا امتحان دینا تھا بلکہ ہم بتا یہ رہے تھے کہ یہاں یہ ایک اٹل قانون چلا آ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ باطل کا نظام جب بھی حق کے نظام کے ساتھ ٹکرائے گا‘ اسے شکست ہوگی‘ وہ خاسر و نامراد ہوگا‘ اور اس کی جگہ دوسرا نظام جو حق کا نظام ہے‘ قائم ہوگا‘ اس میں انسانیت پروان چڑھے گی۔ لہٰذا یہ وہی ٹکراؤ ہے جس کا یہ ذکر ہے۔ وہ یہیں ٹکراؤ ہے اور اسی سے آج کے درس کا آغاز ہوتا ہے کہ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (21:97) وہ انقلاب جو ٹھوس تعمیری نتائج کا حامل ہوگا‘ قریب آ رہا ہے۔ وہ لوگ جو ہمارے قانون کی صداقت سے انکار کرتے ہیں‘ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ افسوس! ہم اس آنے والے انقلاب سے بے خبر رہے اور اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس طرح ان پہ یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم جو کچھ ان سے کہہ رہے ہیں وہ کوئی خالی خولی دھمکی نہیں ہے‘ وہ وعد الحق ہے‘ حقیقت پر مبنی ایک وعدہ ہے۔

الحق کے بنیادی معنی

یاد رکھیے! بنیادی طور پر‘ عربی زبان کی رو سے‘ الحق اس واقعہ کو کہتے ہیں جو ذہنی نہ ہو بلکہ حقیقت میں سامنے آ جائے۔ یہ وہی ہے

جسے ہم اب بھی اردو میں لفظ حقیقت سے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے' افسانہ نہیں ہے۔ تو یہ جو الحق ہے اس کے معنی ہیں کہ ''وہ چیز جو یہاں اس دنیا میں ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے۔'' یہاں اس آیت (21:97) میں کہا کہ وہ وعدہ جو ہم کرتے آ رہے ہیں' وہ تنبیہہ اور وارننگ جو ہم دیتے آ رہے ہیں کہ اس کا نتیجہ ایسا ہوگا وہ قریب آ رہا ہے۔ لہٰذا یہ تو نظر آتا ہے کہ یہ زمانہ حضور ﷺ کے مدنی دور کی زندگی کی آیات کے متعلق ہے' خواہ اس کا آغاز بدر (سترہ رمضان ۲ھ مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) سے ہو' خواہ وہ آخر میں جا کے تبوک (رجب ۹ھ مطابق نومبر ۶۳۵ء) تک پہنچے' لیکن یہ بتایا کہ وہ قریب آ رہا ہے اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ جب میدانِ جنگ میں ٹکراؤ ہوگا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

عزیزانِ من! ذرا اس دور کی صحیح تاریخ کو سامنے لائیے تو ان آیات کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ قریش اپنی قوت کے نشے میں بد مست تھے یہ تو ٹھیک ہے کہ ایران اور روم کا تو مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ جو مٹھی بھر جماعت اتنا بڑا دعویٰ لے کر اٹھی تھی اس کا تو وہ مذاق اڑاتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ استہزا کرتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس چیز کا مذاق اڑاتے تھے؟ اس کا کہ:

ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

اندازہ لگائیے یہ جماعت کیا ہے؟ غریبوں کی' بھوکوں کی' ننگوں کی' تعداد کے اعتبار سے بھی محض انگلیوں پہ گنے جانے والے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ نہ گھر' نہ بار' نہ گھر' نہ گھاٹ۔ جا کے دوسروں کے ہاں پناہ لی ہے۔ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ قریش کا سارا اقتدار ختم ہو جائے گا' ان کی عزت و تکریم باقی نہیں رہے گی۔ اور اس کے بعد آگے بڑھ کے کہہ رہے ہیں کہ قیصر و کسریٰ تک کی تہذیبیں بھی باقی نہیں رہیں گی۔ اللہ اکبر! وہ اسکا مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہا جا رہا تھا کہ جس بات کا تم مذاق اڑاتے ہو' اب دیکھو وہ تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ تو کہا کہ ابھی جب وہ تمہارے سامنے آئے گا' ٹکراؤ ہوگا' تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہاں! ہم سے اس کے متعلق کہا تو جاتا تھا لیکن ہم اس کو حقیقت نہیں سمجھ رہے تھے۔ ہم اس سے غفلت برت رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یونہی خالی خولی ایک دھمکی ہے جو دی جا رہی ہے' مذاق ہے جو اڑایا جا رہا ہے۔ اس وقت کہیں گے کہ بَلۡ کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ (21:97) افسوس ہم پر! ہم اس آنے والے انقلاب سے بے خبر رہے اور اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس طرح یوں ہم اپنے اسی روش کے' ظلم اور استبداد کے نظام' کی روش میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم نے اس کی وارننگ پر دھیان نہیں دیا اور وہ بات جو وہ کہہ رہے تھے آج سچ بن کر ہمارے سامنے آ گئی۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ بات جو بدر (13 مارچ 624ء) اور حنین (شوال 8ھ) کے میدانوں کے اندر سچ بن کر سامنے آئی تھی اور پھر خیبر (7ھ) کے اندر اور ان تمام غزوات میں سچ بن کے سامنے آئی تھی۔ مدائن کے اندر سچ بن کر آئی تھی' فلسطین میں سچ بن کر سامنے

آ ئی تھی چنانچہ وہ یہ بات کہیں گے کہ ہاں! ہم نے غفلت برتی تھی اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ **اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ** (21:98) تم اور تمہارے وہ اربابِ اقتدار؛ جن کی تم، قوانین خداوندی کو چھوڑ کر، اطاعت کیا کرتے تھے، سب کے سب تباہ کر دینے والے آتشیں عذاب کے ایندھن ہو۔ اس کے شعلے کہیں باہر سے نہیں آتے، خود تمہارے اپنے اعمال ہی شعلے بن جاتے ہیں۔ تم خود ہی اس آگ کو جلاتے ہو اور خود ہی اس میں جل کر راکھ ہو جاتے ہو۔

پتھر کے بتوں کو جہنم کی سزا چہ معنی؟

عزیزانِ من! اب یہاں بھی ہمارے ہاں کے تراجم سامنے آتے ہیں؛ چونکہ ہمارے ہاں قرآن کے یہ سارے تراجم مذہب کے تصور سے کیے گئے ہیں تو وہاں ہر بات مذہب کی آ گئی اور وہ یہ ہے کہ تم اور تمہارے یہ معبود یعنی وہ بت، یہ سب جہنم کے اندر جائیں گے۔ اب جہنم بھی وہاں کا یعنی مرنے کے بعد کا جہنم ہے۔ معبود کے معنی ہو گئے ''بتوں کی پرستش کرنا''۔ چنانچہ تم کو اور تمہارے ان بتوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اب اس پہ ان کے ہاں یہ مشکل پیدا ہوئی کہ صاحب! پتھر کا وہ بت جس کو یہ وہاں جنگل سے اٹھا کے لے آئے اور انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشا، تراش کے مندر میں رکھ دیا، کعبہ میں بٹھا دیا، خود اس کے سامنے جھکنے لگ گئے، یہ بیچارا نہ خود بت بنا، نہ خود اس نے کہا کہ میری پرستش کرو، نہ اس نے ان کے جھکنے کو ہی دیکھا۔ اب اس کو بھی اٹھا کے جہنم میں پھینکا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہیں کیوں جہنم میں پھینکا جا رہا ہے؟ مروجہ تراجم سے یہ مشکلات سامنے آتی ہیں۔

عزیزانِ من! اب اس کے بعد علم الکلام آیا یعنی وہ گورکھ دھندہ جسے منطق کہا جاتا ہے: لفظ ہی لفظ، پیچید گیاں ہی پیچید گیاں۔ حقائق کو الفاظ کے لطائف کی رو سے سلجھانے کی کوشش کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاں کی تفسیریں تو ذرا پڑھنے کی چیز ہے۔ اعتراض بہت بڑا ہے یعنی وہ ان کو بتانے کے لیے کہ دیکھیے یہ کس قدر بے بس ہیں، اس لیے ان کو وہ جہنم کے عذاب کے اندر پھینکا جائے گا۔ کیا کوئی اور طریقہ نہیں ان کو بچانے کا؟ جہنم میں تو عذاب ہو گا انہیں کاہے کے لیے جہنم میں پھینکا جائے گا؟ اس لیے کہ یہ **تعبدون** تھا یعنی عبادت تھا اور پھر اس کا ترجمہ ہوا کہ جن بتوں کی تم پرستش کرتے تھے ان کو جہنم میں پھینکا۔ اور اگر دین کے نقطہ نگاہ سے، قرآن کے نقطہ نگاہ سے، مفہوم سمجھتے، عربی زبان کے بنیادی اعتبار سے سمجھتے، تو بات صاف تھی کہ تم اور تمہارے یہ اربابِ اقتدار، جنہیں تم سمجھتے تھے کہ بڑی بڑی قوتوں کے مالک ہیں، دیکھو آج کس عذاب میں مبتلا ہیں۔ کتنی بات صاف ہو جاتی ہے۔ انہوں نے **تعبدون** کا ترجمہ پرستش کیا اور عبادت کے لفظ سے معبود بنے جس کا ترجمہ بت کیا اور کہا کہ یہ اور وہ بت دونوں جہنم میں۔

مذہب کی دنیا قرآن حکیم کی تعلیم کو پیش ہی نہیں کر سکتی

عزیزانِ من! یہاں آ کے بڑی مشکل پیش آئی۔ اب ہاتھوں کی دی ہوئی گانٹھیں دانتوں سے کھول رہے ہیں کہ یہ بُت کیوں جہنم کے اندر پھینکے چلے جا رہے ہیں اور یہاں قرآنِ کریم نے **حَصَبُ جَهَنَّمَ** کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جہنم [1] کا لفظ کئی ایک مقام پہ آیا ہے۔ جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کا ایندھن تم ہو؟ چنانچہ یہ ایک عظیم حقیقت قرآن میں بیان کر دی گئی ہے۔

عزیزانِ من! مذہب کی دنیا میں تو یہ جتنی بھی مبینہ آسمانی کتابیں ہیں' ان کی رو سے اس کا تصور بھی نہیں آ سکتا کیونکہ مذہب کی دنیا میں کوئی بات سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔ اسی طرح جہنم کی بات بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ یہ تو قرآن کی رو سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ میں' جب قرآن کا مفہوم سامنے آتا ہے' تو مفہوم جہنم نکھر اور ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں نظر آ جاتا ہے کہ یہ نسخہ کیمیا' یقیناً' **لا ریب** ہے یہاں تک کسی انسان کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

قرآن حکیم کے نزدیک عذاب جہنم کی نوعیت اور علامہ اقبال کا طرزِ بیان

انسان کا تصور جہنم تو وہی ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا اگڑھا ہے۔ اس کے اندر پہلے سے آگ' قرنہا قرن سے' ہزاروں لاکھوں سالوں سے' جلائی جا رہی ہے۔ اسے تندور کی طرح تپایا جا رہا ہے اور پھر اس آگ کے اندر پھینکا جائے گا۔ صاحب! جہنم کا یہی تصور ہے۔ ہر مذہب میں جہنم کا اسی قسم کا تصور ہے۔ قرآن ایک لفظ سے یہ سارا تصور بدل دیتا ہے۔ تصور یہ ہے کہ جہنم ایک شے خارج میں موجود ہے' اس میں آگ جلائی جا رہی ہے' تو وہ ایندھن پہلے سے وہاں پھینکا گیا ہے' ڈالا گیا ہے۔ لکڑیاں اس میں ڈالی گئی ہیں۔ ایندھن اس میں ڈالا گیا ہے۔ پہلے اس کو ان سے جلایا گیا ہے' پہلے تندور کو تپایا گیا ہے۔ تو اس کے لیے پہلے ایندھن چاہیے۔ قرآن ایک لفظ میں بات کر جاتا ہے کہ وہ کوئی ایسا تندور نہیں ہے جس میں باہر سے لا کے لکڑیاں ڈالی جائیں گی اور ان کی آگ جلے گی اور وہ اس میں تپش پیدا کرے گی۔ وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس میں ڈالا جائے گا' انسانوں کو اس میں ڈالا جائے گا۔ بات یہ نہیں ہے۔ دراصل جہنم وہ ہے کہ جس میں انسانوں کے اپنے اندر بھڑکنے والی آگ ہی وہ اس کا ایندھن بنتی ہے' ایندھن کہیں باہر سے نہیں آتا۔ عزیزانِ من! ایک لفظ نے یہ سارا تصور بدل دیا۔ کہا کہ یہ کہیں باہر سے نہیں آتا اس کی تشریح خود کر دی **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ O الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ** (104:106-7) یہ خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یعنی یہ وہ آگ ہے کہ جس کے شعلے تمہارے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں' اس طرح یہ خود اس کا ایندھن ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے جب میں نے علامہ اقبالؒ کی ''بانگِ درا'' میں ان

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے' منظور الحق' پروفیسر ڈاکٹر (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن' سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص 275 اور فٹ نوٹ 1' ص 275۔

کی ایک بڑی خوبصورت نظم کا بتایا تھا جس میں یہی بات ہے۔ وہ اس کی وضاحت اپنے انداز میں کر گئے ہیں کہ میں وہاں افلاک کی سیر کرنے کے لیے گیا۔ جنت کو دیکھا۔ میزان کو دیکھا۔ یہ کچھ ایک فرشتہ گائیڈ دکھاتا پھرتا تھا۔ اس کے بعد چلتے چلتے میں نے کہا کہ بھئی! وہ ایک جھلک' میں ذرا دُور سے ہی' جہنم کی بھی دیکھ لوں۔ اس نے کہا: بسم اللہ چلیے۔ لہٰذا وہ آپ کو اس مقام پر لے گئے۔ ٹھیک ہے بہت بڑا تھا جیسا تصور میں ہے لیکن میں نے دیکھا کہ وہ تو یخ بستہ ہے' اتنا ٹھنڈا! میں نے کہا کہ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ اس میں آگ بھڑک رہی ہے' شعلے لپک رہے ہیں' لیکن یہ تو بہت ٹھنڈا ہے۔ اس نے کہا کہ اس جہنم کے اپنے اندر کوئی اپنی آگ نہیں ہے۔ ان کی اس نظم کا وہ آخری شعر ہے:

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

ہر ایک اپنے اپنے کمر پہ اٹھائے ہوئے لکڑیوں کا گٹھا لاتا ہے۔ یعنی ایک مثال کے طور پہ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی اپنی لکڑیاں لاتے ہیں تو اس سے گرم ہوتا ہے' اس کے اندر تو کوئی گرمی نہیں ہے۔ یعنی بات یہ ہے۔

قرآن نے ایک لفظ میں جہنم کا تصور ہی بدل دیا کہ یہ انسان خود اس کا ایندھن ہے۔ اس کا ایندھن کہیں خارج سے نہیں کہ اس میں یہ ڈالا جائے گا' یہ خود ہی اس کے ایندھن ہوتے ہیں۔ اب اس جہنم کو دیکھیے جس میں ہم آپ سارے ماخوذ ہیں۔ عزیزانِ من! یہ کہیں باہر سے لکڑیاں لا لا کے یہاں نہیں جلائی گئی تھیں کہ جس کے اندر ہم جل رہے ہیں' دن رات ساری قوم جل رہی ہے اور آج تو ساری دنیا جل رہی ہے لیکن آپ کو آگ کہیں نظر نہیں آتی اور کیفیت ہر قلب کی یہ ہے کہ ہر دل آگ کے شعلوں کے اندر لپٹا ہوا ہے۔ یہ ہے وہ جہنم۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن' عزیزانِ من! یوں سمجھنے کی بات ہے۔ انسان خود اس جہنم کا ایندھن ہے' یہ اپنا جہنم آپ تپاتا ہے' یہ خارج سے نہیں تپتا۔ یہ اس کے اپنے ہی نیتیں' ارادے' دل کے جھکاؤ' نگاہ کی خیانتیں ہیں' پھر ان کے مطابق اس کے اعمال کردار' پھر اجتماعی طور پر اس کا نظام' یہ سارے کا سارا ایک جہنم بنتا ہے اور یہ چیزیں اس کا ایندھن بنتی ہیں اور اس میں اس کے وہ شعلے ان کے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ کہا یہ ہے کہ وہ جہنم اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (21:98) یہ ہے جس کے اندر تم داخل ہو رہے ہو۔ اب یہی یہاں کہا تھا: مَا تَعْبُدُوْنَ (21:98) جن کی تم عبودیت اختیار کیے ہوئے تھے' جن کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھے لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا (21:99) اگر یہ تمہارے معبود (اربابِ اقتدار) کسی قوت کے مالک ہوتے' تو اس تباہی کے عذاب میں کیوں مبتلا ہوتے؟ عزیزانِ من! اسے عام فہم زبان میں یوں سمجھو کہ کیا بات ہے تم انہیں بڑا صاحبِ اقتدار' بڑی قوتوں کے مالک سمجھ رہے تھے' اور ذہن میں یہ تھا کہ خود تو ایک طرف یہ تمہیں بھی ہر آنے والے خطرے سے' ہر آنے والی بلا سے' محفوظ رکھیں گے آج مگر اس وقت تمہیں شکست کی سزا ملی ہے' تم جہنم میں گرفتار ہو۔ کہا کہ اگر یہ واقعی اختیار و اقتدار کے مالک ہوتے تو آج تمہاری طرح جہنم میں کیوں جل رہے ہوتے۔

عزیزانِ من! آج دنیا کے اندر جنہیں ہم اربابِ اقتدار کہتے ہیں' وہ بھی کچھ کم جہنم کے اندر نہیں ہیں۔ جہنم کا تو کوئی بھی گوشہ جنت نہیں ہوسکتا۔ وہ تو کلیتاً جہنم ہوتا ہے۔ تو جہنم کے اندر کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو اس عذاب سے محفوظ ہو یا اس عذاب میں مبتلا نہ ہو۔ عزیزانِ من! کیا عجیب دلیل ہے کہ جنہیں تم اربابِ اقتدار سمجھ رہے تھے' اگر واقعی انہیں کوئی اقتدار حاصل ہوتا تو یہ خود کیوں اس جہنم کے اندر ہوتے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ **وَ كُلٌّ فِيهَا خٰلِدُوْنَ** (21:99) یہ سب کے سب' تمام جنہیں یہ صاحبِ اقتدار سمجھتے تھے' یہ عوام اور وہ جو صاحبِ اقتدار بنے بیٹھے تھے' یہ سب جہنم کے اندر گرفتار ہوں گے۔ **لَهُمْ فِيهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ** (21:100) اس تباہی و بربادی' اور افراتفری کے اندر اتنا شور اٹھے گا اور اتنی دہائی مچے گی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی۔

عزیزانِ من! دیکھتے ہیں کہ اس دَور کا کیسا نقشہ کھینچا گیا ہے! تو آپ سمجھ لیجیے کہ ان مخالفین کو جس جس قسم کے تصادمات سے واسطہ پڑا تھا' اس جنگ کے اندر ان کی کیفیتیں کیا ہوئی تھیں اور اس کے بعد بھی' جب کبھی بھی' باطل کا نظام' جہاں بھی قائم ہوگا' اس کے نتائج جب بھی محسوس شکل میں سامنے آئیں گے' تو یہی کیفیت ہوگی' یہی نفسانفسی کا عالم ہوگا' کسی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے گی بلکہ یوں کہو کہ یہ چیخ وپکار اس قدر شدید ہوگی کہ کوئی کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی۔ وہاں یہ کیفیت ہوجائے گی۔ اس کے برعکس **اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ** (21:101-2) جو لوگ اپنے اعمال کی بدولت' حسن کارانہ اندازِ زیست کے مستحق قرار پاچکے ہوں گے' وہ اس عذاب سے دُور رکھے جائیں گے۔ اتنے دُور کہ وہ اس کی آہٹ تک بھی نہیں سن پائیں گے (19:71)۔ ان کی تمام دلی آرزوئیں پوری ہوں گی اور وہ اس کیفیت میں سرشار رہیں گے۔ عزیزانِ من! یہاں جو غلطی کرتے ہیں وہ میں ذرا آگے چل کر بیان کرونگا۔ پہلے یہ کہوں کہ یہ لوگ تو اس جہنم کے عذاب کے اندر مبتلا ہونگے اور آج جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے' ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ اپنے حسنِ عمل کی بناء' پر صحیح نظام کی بناء پر' جو یہ قائم کریں گے' ان کے مقابلے میں جہنم کے ان تمام شعلوں سے دُور رکھے جائیں گے' اتنے دُور کہ اس کی بھنک تک بھی ان کے کان میں نہیں آئے گی۔ وہ صحیح' خالصتاً صحیح' نظام کی زندگی بسر کررہے ہونگے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ کہا کہ **وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ** (21:102) ان کے دل کی آرزوئیں پوری ہونگی۔ جیسا کہتے ہیں کہ جو چاہیں گے وہ ہوگا' جو مانگیں گے وہ ملے گا۔

غلط نظامِ زندگی کا ایک اور اہم پہلو

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کس قسم کا نظام ہے۔ آپ غلط نظام کے اندر دیکھیے' وہاں بھی ہر آرزو پوری نہیں ہوتی۔ یہ اتنی ہی بات نہیں ہے کہ ہم لوگ تو مفلس ہیں' بے زر ہیں' غریب ہیں اس لیے ہزاروں آرزوئیں ایسی ہیں جو اس لیے دب کے کچل کے رہ جاتی ہیں کہ ان کے خریدنے کی ہمارے پاس قیمت نہیں ہوتی لیکن جن کے پاس خریدنے کی قیمت ہے' ان سے بھی پوچھیے کہ کیا تمہاری ہر آرزو پوری ہو

رہی ہے؟ جہنم کے عذاب میں تو اس کے پورا ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس یہ ہے وہ صحیح زندگی جس میں ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر آرزو میں یہ بات نہ ذہن میں رکھ لیجیے کہ صاحب! حرامزدگیوں کی ہر آرزوئیں بھی پوری ہونگی۔ یہاں یہ بات ان کے متعلق ہے جنہیں اہلِ جنت کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح نظامِ زندگی کی وجہ سے اس زندگی کے مستحق ہونگے۔ حرامزدگیوں کی اس قسم کی آرزوئیں تو ان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہوسکتیں۔ ان کی تو کیفیت یہ بتائی ہے کہ **وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ** (76:30) تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشاء ہے۔ تم اپنے اختیار وارادہ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرلو۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم اور ان کا ازالہ

عزیزانِ من! ہمارے ہاں پھر اس آیت کا غلط ترجمہ ہوا ہے۔ اس نے پھر لٹیا ہی ڈبو دی۔ ان آیات پر میں آؤنگا تو بتاؤنگا کہ جہاں کہا گیا ہے کہ جو کچھ تم چاہو' اپنے اختیار وارادے سے کرو' اسی کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ اور اگلی آیت کے اندر یہ کہا کہ نہیں' تم چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے کہ جو خدا چاہے۔ چل بھئی! معاملہ ہی ختم ہوا۔ یعنی تم جو چاہو اس کے مطابق کرو اور کہا کہ صاحب! تم چاہ ہی نہیں سکتے بجز اس کے کہ جو خدا چاہے۔ تو اس کا چاہنا کیسا' اس کا اختیار وارادہ کیسا؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ پہلے کہا کہ قتل کردو' تو قتل کردیا اور پھر اس قتل کے جرم میں ماخوذِ سزا کرلیا۔ عزیزانِ من! اس کے تو معنی ہی یہ تھے کہ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے کہ ہونا چاہیے۔ سیدھی سی بات ہے تم جو چاہو گے اس کے مطابق ہوجائے گا لیکن تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم چاہو ہی وہ جو خدا کہتا ہے کہ مومن کا شعار یہ ہے کہ وہ یہ چاہے اور یہ مانگے۔ تم وہ مانگو۔ یہ جو آیت ہے کہ **اِنَّ الَّـذِيْـنَ سَبَـقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى** (21:101) اس میں بھی یہی کچھ کہا گیا ہے مگر اس کا ترجمہ یہ کردیا جاتا ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق ہم نے پہلے سے طے کررکھا ہے کہ وہ تو جنت میں جائیں گے' وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ چل بھئی! یہ بھی پہلے سے طے ہے حالانکہ وہ جو سبقت ہے وہ پہل (Initiative) کی بات ہے۔ وہ تو بڑا عظیم فلسفہ ہے۔ عمل اور اس کا نتیجہ یعنی ہر عمل پہلے سرزد ہوتا اور اس کا نتیجہ بعد میں برآمد ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ نتیجہ پہلے برآمد ہوجائے اور عمل بعد میں سرزد ہو۔ یہی مسابقت اور یہی سبقت ہوتی ہے جو کچھ تم نے پہلے کیا تھا' آج اس کا نتیجہ یہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ اس دن کہے گا کہ **يٰلَيْتَـنِـىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ** (89:24) اے کاش! میں پہلے سے اپنی زندگی کے لیے کچھ بھیج چکا ہوتا جو مجھے آج حقیقی زندگی عطا کر دیتا۔ **مـا قـدمـت' مـا قدم' ما سبقت** یہ الفاظ قرآن کے ہیں اور یہ بتانے کے لیے ہیں کہ یہ سب کچھ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور عمل ہمیشہ پہلے سرزد ہوتا ہے۔ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ** (59:18) اے جماعت مومنین! تم ہر حالت میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو کہ تم نے مستقبل کی خوشگواریوں کے لیے کیا کیا ہے۔ ہر شخص جو آج اپنے کل کے لیے کررہا ہے' اسے ہمیشہ اس پہ نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ جو آج آنے والے کل کے لیے کررہا

ہے یہ ہے جسے آپ قَدَّمَتْ یا سَبَقَتْ کہتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے سے جو لکھ دیا گیا ہے وہ طے ہو چکا ہوا ہے۔

انسان کے لیے ابلیس کا سب سے خطرناک جبریت کا یا تقدیر کا تصور ہے

معاف رکھیے گا یہ بات بہت بڑی اور لمبی ہے۔ اسے یہ تقدیر کا مسئلہ بنا کے بیٹھے ہیں۔ اس کے لیے تو پتہ نہیں' کتنے درس چاہئیں اور میں ساتھ کے ساتھ کہتا بھی رہتا ہوں۔ اب یہ بات یہاں بھی آ گئی ہے تو میں یہ عرض کر دوں کہ ابلیس نے' انسان کی خودفریبی کے لیے' جو سب سے زیادہ گہرا خطرناک حربہ ایجاد کیا' وہ تقدیر کا مسئلہ ہے۔ اسے اصطلاح میں جبریت کہا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے Determinism کہا جاتا ہے۔ میں بتاؤں گا کہ آج کے دَور کے اندر اگرچہ یہ اپنے آپ کو تو بہت زیادہ آگے سمجھ رہے ہیں' وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ قدامت پرستی کے زمانے کی جہالت تھی' جو یہ تقدیر کے مسائل تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں

وہی عقیدہ آج بھی ہے۔ انہوں نے صرف اصطلاح بدل لی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ابلیس کا سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ انسان تو زندگی میں مجبورِ محض ہے۔ اس کے لیے اس کی ہر کیفیت یعنی جو کچھ اس کے ساتھ ہونا ہے' جو کچھ اس نے کرنا ہے' یہ سارے کا سارا پہلے سے لکھا جا چکا ہے' پہلے سے طے شدہ ہے۔ یہاں تو یہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے پہ مجبور ہے' اسے بدل ہی نہیں سکتا۔ اس ایک عقیدے نے آپ دیکھیے کہ پہلی چیز تو یہ کی کہ فرار کی کتنی راہیں کھول دیں۔ اب اس عقیدے کی رو سے اس پر تو کوئی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہوتی۔ انسان تو مجبور ہے۔ یعنی قصہ ختم' انسان اعمال کی دنیا سے اپنی تقدیر کو بدل ہی نہیں سکتا۔

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

آپ اس عقیدے کو ذرا واضح الفاظ میں کھول کر دیکھیے کہ اس کے معنی کیا ہوئے؟ کہ نہیں صاحب! یہ انسان تو بدل ہی نہیں سکتا' اس کے لیے تو ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے' اس کے آگے انسان مجبورِ محض ہے اور پھر آگے یہ ہے کہ صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے: پھر یہ جنت' یہ جہنم' یہ سب کچھ تو صاحب! آپ دیکھیے اس کا غضب ہے کہ وہ اسے جہنم کے اندر لے جاتا ہے۔ اس کی خوشنودی ہے' موج ہے کہ اس کی جنت میں داخل کرتا ہے۔ انسان تو کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ انسان کے اپنے کرنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ اس دنیا میں مجبورِ محض ہے۔ دنیا کے ہر مذہب کے اندر یہ عقیدہ ہے۔ ہندوؤں میں ورن آتے ہیں' انہوں نے کم از کم اتنا کہا کہ انسان کے اپنے کسی پچھلے جنم کے جو اس کے اعمال ہوتے ہیں' ان کے مطابق اس کا جنم ہوتا ہے۔ اِسے چھوڑ دیجیے کہ وہ حیوانات کی شکل میں ہوتا ہے' جو ہابلی کتا بن کے آتا ہے' انسانوں کی شکل میں وہ شودر بنتا ہے' وہ ویش بنتا ہے' وہ کھشتری بنتا ہے' وہ برہمن بنتا ہے۔ نہ ان کے اس زندگی کے کسی عمل کا یہ نتیجہ ہے' نہ ہی کوئی اس ورن کو بدل سکتا ہے۔ وہ مجبورِ محض ہے۔ دوسرا سب سے بڑا مذہب عیسائیت کا ہے۔

اس میں یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ کے گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لے کے پیدا ہوتا ہے اور یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہے کہ اعمال کے ذریعے سے ان کو دھو سکے۔ یہ مجبورِ محض خالص جبریت ہے۔

مذاہبِ عالم کو قرآن حکیم کا کھلا چیلنج

عزیزانِ من! ساری دنیا کے مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کو اٹھا کے دیکھیے۔ یہی جبریت ہر جگہ ہے۔ میں اس کے اندر تفصیل میں یہاں نہیں جاتا' یہ بات زیادہ وقت لے لے گی' یہ ہر مذہب میں ہے۔ یہ جو میں نے کہا ہے کہ

Islam: A Challenge To Religions [1]

یہ میں نے ایسے ہی نام نہیں رکھ دیا۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے' یہ چیلنج ہے یہ جتنے بھی مذہب کے نام سے باطل یا اس قسم کے عقائد رائج تھے' یہ ان کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ یہ قرآن ہے جس نے آ کے کہا کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) جونسی روش جی چاہے اختیار کر لو' جو کچھ تمہارے جی میں آئے کر لو۔ ہماری مشیئتِ قانون سازی کے لیے ہے اور اس کے بعد تم جو چاہتے ہو کرو' کوئی اس میں دخل نہیں دے سکتا۔ تم قطعاً کسی معاملے کے اندر مجبور نہیں ہو' نہ پچھلے جنم کے مجبور ہو' نہ پیدائش میں کوئی آلائش لے کے آتے ہو' نہ یہاں کائنات کے اندر کوئی قوت ایسی ہے جس کے تابع تم مجبور ہو' کائنات کی ہر قوت ہم نے تمہارے تابع کر دی ہے۔ **سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مِّنۡهُ** (45:13)' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس نے سب کو تمہارے لیے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اور **اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ** (41:40) جو کچھ تمہارے جی میں آئے کر لو' جونسی رَوش جی چاہے اختیار کر لو۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ **شئتم شئتم** کا لفظ خدا نے اپنے لیے بھی استعمال کیا ہوا ہے اور **ما یشآء** کا لفظ بھی۔ وہاں **شئتم** (41:40) ہے۔ ہم اپنے عالمِ امر کے اندر صاحبِ مشیت ہیں۔ ہم وہاں تمہارے لیے قوانین بناتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو یا ان کی خلاف ورزی کرو۔ **ما شئتم** جو کچھ تمہارے جی میں آئے کر لو۔ یہاں عالمِ مشیت نہیں' یہاں خدا کی مشیت نہیں' انسان کی مشیت چلتی ہے۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! اب آپ نے سوچ لیا کہ یہ کتنا بڑا چیلنج ہے۔ یعنی سارے مذاہبِ عالم کی بنیادی قدر تھی۔ تمہارا یہ بنیادی اصول قرآن نے آ کر ایک چیلنج سے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ تمہارا عمل محسوس تو ایک طرف رہا' تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات اور تمہاری نگاہوں کی خیانتیں جو کہ تمہارے اختیار و ارادہ کی چیزیں ہیں وہ بھی نتیجہ پیدا کریں

---

[1] یہ پرویزؒ کی انگریزی زبان میں ایک مشہور کتاب کا نام ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1968 میں ادارہ طلوعِ اسلام لاہور سے شائع ہوا تھا۔ یہ 292 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے 18 ابواب ہیں۔

گی۔قرآن نے جبریت کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔کتنا عظیم احسان تھا انسانیت کے اوپر۔ ہر شخص صاحبِ اختیار ہے' اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔اور ذمہ داری کے معنی یہ ہیں کہ وہ Accountable (جوابدہ) ہے۔اِس Accountability (جوابدہی) کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج بھگتے۔اِن سے اسے کوئی بچا ہی نہیں سکتا۔اپنے عمل کے نتیجے سے بچا کون سکتا ہے؟ اور یہی ہے وہ جسے قرآنِ حکیم نے جہنم کہا ہے۔

مجبور کی نیکی اور بدی کوئی اہمیت نہیں رکھتی

عزیزانِ من! قرآن نے آ کے' اس کے لیے' یہ کہا تھا کہ قانون تو تم خود نہیں بنا سکتے' وہ تو ہم نے بنا دیئے ہیں۔اب ان پر عمل کرنا تمہارے اختیار و ارادے میں ہے۔اس میں کوئی Interfere (مداخلت) نہیں کرے گا۔خدا کہتا ہے کہ ہم بھی اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔اگر مداخلت کر دی جائے تو اس میں جبریت نکل آتی ہے اور جبریت نکل آئے تو جزا اور سزا اور قانونِ مکافاتِ عمل سب ختم ہو جاتا ہے۔وہ تو کسی بھی عدالت میں' جہاں بھی' آپ یہ ثابت کر دیں کہ صاحب! یہ جو میں نے کیا ہے ''میں مجبور تھا'' میں نے خود اپنے ارادے سے نہیں کیا' آپ کو سزا نہیں ملتی' وہاں جرم ہی ثابت نہیں ہوتا۔اسی لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ نہ مجبور کی نیکی نیکی ہے' نہ اس کا گناہ گناہ ہے۔اس کا سوال ہی نہیں ہے۔نیکی بھی نیکی نہیں ہے۔وہ بھی اگر اپنے اختیار و ارادہ سے کی جائے گی تو ہو گی۔قرآن نے یہ چیلنج دیا۔ جس وقت قرآن کی جگہ مذہب نے لے لی' آپ کا وہی جبریت کا عقیدہ پہلے سے بھی زیادہ متشدد طریقے سے آ گیا۔بات لمبی چلی جائے گی ورنہ میں بتاتا کہ کتنی بڑی سازش تھی جو دین کے خلاف کی گئی اور اس ایک عقیدے کو جز بنا دیا۔

دین کے پانچ بنیادی اجزا میں جبریت کے عقیدے کا اضافہ

عزیزانِ من! دین میں بنیادی چیز یہ ہے کہ اجزائے ایمان کیا ہیں؟ یعنی کونسی باتیں ہیں جن پہ ایمان لانے سے ایک غیر مسلم یا کافر یا کوئی انسان مسلمان ہو جاتا ہے' دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے' اسے ایمان والا کہا جاتا ہے۔قرآن نے ان کی تصریح کر دی کہ یہ پانچ اجزاء ہیں: بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (4:136) ایمان' خدا' ملائکہ' کتابیں' انبیاء اور آخرت پر۔قرآن میں صرف یہ پانچ ہی اجزائے ایمان ہیں۔اور انہی پانچ اجزائے ایمان کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ انہی کے انکار سے انسان کافر ہوتا ہے اور سارے قرآن میں یہی پانچ ہیں لیکن آپ کو پتہ ہے کہ پھر آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ معلوم نہیں کہ کبھی آپ کو کوئی ایسا اتفاق ہوا ہے یا نہیں یعنی ''حادثہ'' گزرا ہے یا نہیں جس میں آپ کو یہ کچھ پڑھنا پڑا ہو۔پہلے ایک ''حادثہ'' آیا کرتا تھا جسے نکاح کہتے ہیں۔اس میں یہ پڑھایا کرتے تھے۔اب تو غالباً اس سے بھی چھٹی ہو گئی ہوئی ہے صرف دستخط ہی کرا لیتے ہیں لیکن بہرحال یہ آپ کے ہاں کا ایمان ہے۔ پتہ ہے کہ وہ اب کس چیز کے اقرار کا نام ہے؟ وہ ہے اٰمَنْتُ باللہ و ملٰئکتہ و کتبہ و رسلہ ۔یہ چار ہو گئے اور اس کے بعد

ہے **والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ و بعث بعد الموت** ۔تو آخرت یعنی آخر لفظ سے پہلے یہ ایک ٹکڑا ہے۔اور اس طرح' عزیزانِ من! آپ کے ایمان کے پانچ کی جگہ چھ جزو بنا دیئے گئے۔ یہ چھٹا جز کیا ہے؟ عقیدہ تقدیر جبریت کہ خیر و شر سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے' ہماری طرف سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ایمان کے اجزاء میں شامل کر دیا ہے۔اس کے اقرار سے ایک کافر مسلمان ہوتا ہے' اس کے انکار سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔قرآن میں بالتصریح' ہر جگہ' پانچ اجزائے ایمان ہیں مگر آپ کے ہاں یہ چھ ہیں اور یہ چھٹا عقیدہ جبریت ہے۔اسے کہتے ہیں سازش۔ وہ یہ کہ اگر آپ یہ نہیں دہراتے تو آپ مسلمان نہیں ہوتے۔انہوں نے مسلمان ہونے کے لیے یہ شرط لازم قرار دیدی۔

کمیونزم میں ایمان کے پانچ اجزاء کا انکار لیکن جبر اور تقدیر کا اقرار

عزیزانِ من! کہتے ہیں کہ تباہیاں کیسے آتی ہیں؟ ہمارا دَور جو ایسا آ گیا ہے۔ میں ذرا درخواست کرونگا کہ بڑی توجہ سے سنیے گا۔ ہمارا دَور بڑا Liberalism کا دَور آیا ہے۔قدامت پرستی کے خلاف ان نوجوانوں کے نعرے سنیے گا۔ یہ دیکھیے کہ یہ کس طرح تقدیر کا مسئلہ لے کر آ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ بہت اچھا جی! لمبی چوڑی باتوں کو جانے دیجیے۔اس دَور کے اندر آپ کے ہاں دو فلسفے چلے۔ پہلا فلسفہ کمیونزم کا چلا جس میں خدا کا بھی انکار ہے' وحی کا بھی انکار ہے' رسالت کا بھی انکار ہے' اور آخرت کا بھی انکار ہے۔اور کہا آپ کو پتہ ہے کہ اقرار کس بات کا ہے؟ اقرار جبریت کا ہے اور تقدیر کا ہے۔ مجھے اپنے نوجوانوں کی جہالت پہ حیرت آیا کرتی ہے۔ میں یہاں بھی یا کسی بھی مجمع میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ اس جبریت کے قائل ہیں۔ وہ جب یہ بات سنتے ہیں کہ صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ یہ کیا چیز آئی ہے؟ یہ عقیدہ نیا آیا ہے۔اس کے اندر خدا رسول کتابیں اور آخرت کا تو انکار ہے لیکن اقرار کس بات کا ہے؟ تقدیر کا تو وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیا ہو گیا اس ملا جی کو؟ تشریف رکھیے۔عزیزانِ من! تو ذرا سوچیے تو سہی کہ یہ Determinism (جبریت) کیا ہے؟ ''مجبور'' اسی کا ترجمہ تو ہے۔کمیونزم کا سارا فلسفہ مارکس سے لے کر آخر تک' سارا Determinism (جبریت) پر ہے۔ یہ ان کی ٹرم ہے Determinism۔(جبریت) یہ Determinism (جبریت) کہے چلے جائیں گے۔صاحب! تقدیر کہہ دیجیے۔ ہیں ہیں؟ یہ تو ملا ازم ہے جناب! Determinism (جبریت) کیا ہے؟ کمیونزم کا فلسفہ Determinism (جبریت) کا ہے کہ انسانی دنیا کے اندر کوئی ایک قوت ہے' جسے یہ تاریخی وجوب یا Historical Necessity کہتے ہیں۔ Necessity (وجوب' ضرورت) فلسفے کی اصطلاح ہے۔ یہ انگریزی کے عام لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔اصطلاحی الفاظ اور ہوتے ہیں۔

کمیونزم کے فلسفے کی تمام تر حقیقت اور آج کے نوجوانوں کی سوچ

عزیزانِ من! میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں کے بیچارے ان ذرائع ابلاغ عامہ (کمیونیکیشن) کو بھی یہ پتہ نہیں کہ

Necessity (ضرورت) کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ Necessity (ضرورت) کو فلسفے میں کہتے ہیں کہ انسان جو جی میں آئے کرلے ''وہ'' ہو کے رہے گا۔ اسے فلسفے کی اصطلاح میں Necessity (ضرورت) کہتے ہیں یعنی یہ Historical Necessity (تاریخی وجوب) ہے۔ بالفاظ دیگر انسان جو جی میں آئے کرلے ''وہ'' ہو کے رہے گا۔ لہٰذا جبریت تو یہاں سے شروع ہوگئی۔ پھر کیا ہوگا؟ کہ جی وہ Necessity (ضرورت) جو ہے' کوئی پتہ ہی نہیں کہ وہ ہے کیا کہ اس کی رو سے وہ اتنی بڑی قوت ہے کہ انسان جو جی میں آئے کرلے ساری دنیا کے انسان مل کے کرلیں' اس کے خلاف نہیں کرسکتے۔ وہ (Necessity (ضرورت) ایک نظام قائم کرتی ہے اور وہ Necessity (ضرورت) کچھ عرصے کے بعد پھر اس نظام کو الٹ دیتی ہے اور اس طرح وہ Necessity (ضرورت) اس کے برعکس ایک دوسرا نظام قائم کر لیتی ہے۔ اس دَور میں جس قسم کا نظام وہ قائم کرتی ہے اس نظام میں اس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے آپ کے بدلنے کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ یعنی Necessity (ضرورت) جو نظام وہ لاتی ہے اس کا قائم کرنا' اس کا مٹا دینا یا اس میں تغیر و تبدل کرنا' انسان کے بس کی بات ہوتی ہی نہیں۔ چنانچہ اس نظام کے تابع جس قسم کے وہ انسان بناتی ہے' اس میں کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ اس میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بدل لے یا اس کے خلاف انسان بن جائے۔ یہ ہے جی کمیونزم کا فلسفہ۔ یہ ہے ہمارے ہاں کے نوجوانوں کے لبرل ازم کی آزادی۔ یہ ہے کہ جو کوئی تقدیر کا لفظ کہہ دے تو مذاق اڑائیں گے۔ ٹھیک ہے کہ خدا' رسول' وحی' رسالت' آخرت سے انکار ہی پر تو فخر محسوس کریں گے لیکن جبریت کی بنیاد پر جو فلسفہ ہے یہ اس کے ہی متبع رہ گئے یعنی انسان نہ تو Determinism (جبر و قدر) بدل سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس نظام کو بدل کر خود کوئی دوسرا نظام لاسکتا ہے چنانچہ اس نظام میں جس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں ان کے ہاں کی Means of Production یعنی جو ذرائع پیداوار ہوتے ہیں تو اُن کے ذریعے انسان اس نظام کے تابع اس میں' اپنے آپ کو بدل ہی نہیں سکتا۔ جی! غور فرما رہے ہیں آپ کہ وہ [1] یونہی نہیں چیختا مر گیا تھا کہ

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

مذہب سے انکار کے باوجود اسی کی بنیاد پر محکم ایمان

عزیزانِ من! یہ وہی تقدیر کا مسئلہ ہے یعنی وہی جبریت تھی۔ مذہب کو تیاگ رہے ہیں' اس کے خلاف لٹھ لے کے پھر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود جو مذہب کی بنیاد تھی اسی پر ان کا ایمان ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ Determinism (جبریت) تھوڑے ہی عرصے میں' یہ تھوڑا سا دَور تو لمبا نہیں ہوا' یہ کمیونزم خود ہی گھس پٹ کے' اس زمانے کے اندر' فرسودہ سا ہو گیا تھا۔ ہم نے سمجھا کہ خیر ہمارے ہاں کے

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

نوجوانوں کی کچھ جان چھوٹ جائے گی۔ بہرحال آپ کو پتہ ہے کہ انہوں نے یہ کیوں اختیار کیا تھا؟ وہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ جب اپنے کسی فعل اور اپنے کسی کام کی ذمہ داری انسان کے اوپر عائد نہ ہوتی ہو تو پھر ہر قسم کی بداخلاقی جائز قرار پا جاتی ہے یعنی میں اس کا ذمہ دار ہی نہیں ہوں۔ ارے میاں! یہ اس قسم کی حرامزدگی کیوں کرتے' تو اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ انسان تو اس نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے افعال کا تو ذمہ دار ہوتا ہی نہیں۔ عزیزان من! بداخلاقی کے جوازات کی یہ ساری کی ساری راہیں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔

جبریت کا یہ مسئلہ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے

جبریت کے اس مسئلے پر میں اگر تاریخ میں جاؤں تو میں یہ عرض کروں کہ آپ کے ہاں یہ جو جبریت کا مسئلہ آیا تھا وہ بھی اس قسم کی' مجھے معاف رکھیے گا' میں پھر یہ لفظ حرامزدگی کا استعمال کر رہا ہوں' اس کے علاوہ کوئی لفظ ہی سمجھ میں نہیں آتا' کہ کیا کیا جائے' ہاں یہ اسی قسم کی حرامزدگیوں کا پیدا کردہ تھا۔ ملوکیت نے جب استبداد اختیار کیا تو آپ کے ہاں ہر قسم کی دھاندلی' بے انصافی' ظلم' استبداد نے جنم لیا تو ان سے کہا گیا کہ تم یہ کیا کچھ کر رہے ہو' تمہیں کچھ خیال نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ ''اس'' کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا' ہم کون ہیں یہ کرنے والے! یہ تو اس کے مطابق ہو رہا ہے' جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہم تو درمیان میں شطرنج کی بازی کے صرف مہرے ہیں' اسٹیج کے ایکٹر ہیں' سب کچھ وہ کراتا ہے:

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است

گناہ ہماری اپنی طرف سے نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں خدا کے باب میں یہ چاہیے کہ گستاخی کی بجائے ذرا احترام سے کام لو' کہہ دو کہ ہاں صاحب! چلو' ہماری ہی غلطی سہی۔ لہٰذا یہ ذرا سی بات کہہ دیا کرو۔ یہ مسئلہ آپ کی تاریخ میں ملوکیت نے پیدا کیا تھا اور مذہبی پیشوائیت نے سند عطا کر دی' اسے جزو ایمان بنا دیا۔ کہا کہ ہاں حضور! جو جی میں آئے آپ کیجیے' کھلی چھٹی ہے' آپ اس کے ذمہ دار ہی نہیں ہیں۔ **والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ** جزو ایمان۔ اور یہی آج کے نوجوانوں میں جو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی قسم کے ضابطہ اخلاق کی پابندی ہی نہیں رہی۔ فری لائسنس مل رہے ہیں' پتہ خواہ انہیں بھی نہ ہو' فلسفہ جبریت کا جو کمیونزم نے پیدا کیا۔ اس کے لیے لینن (1870-1924) کے الفاظ میں اس نے کہہ دیا کہ اس کی رو سے ہم کسی مستقل قدر کے قائل نہیں ہیں' ہم کسی ضابطہ اخلاق کے قائل نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی میں اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ چلیے نہ ضابطہ اخلاق' نہ کوئی Value (قدر)' جو کچھ جی میں آئے یہ کرے اور اس کے لیے کوئی Accountability (جوابدہی) نہیں' کوئی ذمہ داری نہیں' کوئی بازپرس نہیں' کوئی نتیجہ نہیں' اس

لیے کہ یہ مجبورِ محض ہے، اور دنیا کہ ساری دنیا میں یہ کیا قیامت آ گئی ہے کہ ساری دنیا میں بد اخلاقی ہے' فحاشی ہے' اور یہ فسق و فجور عام ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے؟ آخر یہ کیوں ہے؟ جبریت کا عقیدہ جو آیا ہے۔

سائیکالوجی کے تحت آج کے نوجوانوں کی سوچ کا رخ

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ کمیونزم کی رو سے یہ لعنت ہے لیکن ہمارے نوجوانوں کو خدا دے۔ سائیکالوجی ایک نئی چیز آئی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس میں تحقیق شروع ہوئی لیکن ان نوجوانوں کو تو کوئی ہتھکنڈہ ہاتھ آنا چاہیے۔ انہوں نے کیا کیا؟ انہوں نے تحقیق کی ابتدا اس چیز سے کی کہ انسان کے اندر ایک تو Conscious Mind (نفسِ شعوریہ) ہے اور دوسرا Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) ہے۔ چنانچہ اس میں ان کی ابتدائی تحقیق ہے جس پہ یہ ابھی پہنچے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ جو Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) ہے حقیقت میں وہ 9/10 حصہ ہے اور انسان کے لیے فیصلے کرتا ہے۔ اس کے ہی یہ فیصلے ہوتے ہیں اور وہ غیر شعوری ہوتے ہیں یعنی Consciously (شعوری طور پر) نہیں۔ وہ فیصلے انسان Unconsciously (غیر شعوری طور پر) کرتا ہے اور اس پہ Conscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کا کنٹرول نہیں ہوتا۔ انہوں نے ابتداء میں یہ بات ایک نظریئے کے طور پہ کی تھی۔ انہوں نے یہ ایک چیز دی اور اس سے وہ آگے چلے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ وہ خود پھر کیسے آگے پہنچے اور انہوں نے اس کی کیا تدبیر بتائی۔ ہمارے ہاں کے یہ' پنجابی اچ ایناں نوں لے پج کیندے نیں [1] اسے لے اُڑے۔ کہا کہ لو! موج ہوگئی بھئی! یہ سارا کچھ جو تم حرامزدگیاں کرتے ہو' وہ تو ہمارے Conscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کا کیا ہوا ہی نہیں ہے' یہ تو Unconscious Mind کا ہے جس پہ انسان کو اختیار ہی نہیں۔ لہٰذا یہ وہیں جبریت پہ جا پہنچا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ادھر کمیونزم سے یہ نوجوان بھاگے تو اس میں آ گئے۔ اب ساری بات صرف یہ ہے کہ اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے جو Escapism (فرار) یعنی فرار کی راہ ہے' اسے تلاش کرنا چاہیے' کمیونزم کے فلسفے سے نہیں کہ وہاں پھر یہ ہوتا تھا کہ تم خدا کے منکر ہو' وحی کے منکر ہو' پھر بھی مسلمان کہلاتے ہو' تو اس سے کچھ تھوڑی سی ندامت ہوتی تھی۔ اب جو یہ نئی سائیکولوجی آئی' اس میں خدا رسول وغیرہ سب کچھ مانتے چلے جاؤ اور اس کے بعد یہ مانو کہ صاحب! یہ سب کچھ غیر شعوریہ نفس (Unconscious Mind) کا کیا دھرا ہے اور ہمارے شعور کا اس پہ کوئی اختیار ہی نہیں ہے تو ہمیں اب کس طرح ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔

---

[1] انہیں پنجابی زبان میں 'لے اڑنے والے' کہتے ہیں۔

کیا انسان اپنے نفسِ غیر شعوری کا غلام ہے

اب اس چیز کو ثابت کرنے کے لیے گھنٹوں بحثیں ہو رہی ہیں لیکن اگر ان کو دیکھیے تو چند ابتدائی اصطلاحات ہیں اور کیفیت ان کی یہ ہے کہ چونکہ یہ ابھی عام نہیں ہوئیں یا یہ کہ دوسروں کو یہ اصطلاحات ابھی سمجھ نہیں آئیں' پانچ سات اصطلاحات استعمال کر کے ان پہ رعب گانٹھ لیتے ہیں اور مقصد سارا یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم اپنے اعمال اور فیصلوں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ تو کوئی Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) اندر ہی اندر کرتا پھرتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہ وہی جبریت کا تصور ہے جس نے مذہب کی دنیا میں آپ کے ہاں یہ عقیدہ اختیار کیا' جس سے تقدیر کی یہ بحثیں شروع ہوئیں کہ **ولقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ** ۔ لہٰذا تباہی آئی۔ ہمارے ہاں انسان اپنے عمل کا ذمہ دار ہی نہ رہا۔ اس دَور میں انہوں نے مذہب سے دامن چھڑایا اور سیکولرازم کی طرف آئے' جس میں وحی اور خدا کو بھی تو چھوڑ دیا مگر Determinism (جبر وقدر) پھر ساتھ لے کر آئے جو کمیونزم میں تھی۔ کمیونزم فیل ہوگئی' Determinism (جبریت) پھر ان کے آگے پیچھے بڑھ رہی ہے۔ یہ Determinism (جبریت) کو پھر ساتھ لا رہے ہیں۔ اب ان کے ہاں یہ Unconscious (غیر شعوریہ) سائیکولوجی کا دَور آ گیا اور جیسا میں نے کہا ہے کہ لے دے کر چند اصطلاحیں ہیں یہ تو یاد کر لیں اور آج ان میں Escapism (فرار) کے لیے بڑی گنجائش مل گئی ہے اور یہ کہ ہاں صاحب! آپ تو ٹھیک کہتے ہیں مگر یہ اس بات سے آگے نہ بڑھے جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے فرائیڈ (1939-1856) نے کہی تھی۔

اقدارِ خداوندی کے تابع انسان کی Will Power (قوتِ ارادی) ایٹمی قوت کا درجہ رکھتی ہے

عزیزانِ من! اس ساٹھ سال کے عرصے میں سائیکولوجی جہاں تک پہنچی ہے۔ ان کو اس کی گرد کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ وہ خود اس نتیجے کے اوپر پہنچی ہے کہ انسان کی Will Power (قوتِ ارادی) ایک ایسی چیز ہے کہ وہ اس کے Unconscious Mind (نفس غیر شعوریہ) کو بھی کنٹرول کر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس Will Power (قوتِ ارادی) کو صحیح اقدار کے تابع رکھ لیا جائے۔ میں ان کی یہ Latest (جدید ترین) بات کہہ رہا ہوں جو انہوں نے پچھلے پانچ سات سال میں کی ہے۔ یہ ان کی تحقیق ہے۔ آج کا School of Thought (مکتب فکر) فرائیڈ (1939-1856) کو چھوڑ چکا ہے' اس سے آگے چلا گیا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ خدا کرے کہ سائیکولوجی کی یہ تحقیق اور آگے بڑھے' اور خدا کرے کہ مجھے بھی اتنی زندگی نصیب ہو۔ قرآن کے کئی مقامات اس سے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن نے ابلیس کے مقابلے میں یہ دعویٰ کیا تھا: ابلیس نے کہا تھا کہ تو 'دیکھ' میں تیرے بندوں کو کس طرح تگنی کے ناچ نچواتا ہوں اور خدا نے اس کے مقابلے میں کہا تھا کہ تو جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے' میرے بندے' جو میرے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے والے ہونگے' ان پر تمہارے اس نفسِ غیر شعوریہ کا کوئی کنٹرول نہیں ہوگا۔

عزیزانِ من! آج کا خود یہ School of Thought (مکتبِ فکر) سائیکولوجی کا ہے۔ وہ ان کی ان اصطلاحوں کو ان کی ان بحثوں کو چھوڑ بیٹھا ہوا ہے جس کو آج لے کر ہمارے ہاں کے نوجوان اپنے لیے ہر قسم کی بداخلاقی کے جواز کی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ آج وہ خود اس تصور کو چھوڑ رہے ہیں۔ خود انہوں کی تحقیق یہ ہے کہ اس غیر شعوری قوت کے باوجود انسان کے اندر ایک ایسی قوت بھی موجود ہے جو اس کے نفسِ غیر شعوریہ کے اندر کی چیزوں کو بھی اپنے پیمانوں کے اندر ڈھال سکتی ہے بشرطیکہ ان کو یہ Values (اقدار) اور اقدار کہیں سے مل جائیں اور وہ اقدار غیر متبدل ہونی چاہئیں۔ آج سائیکولوجی یہ کہہ رہی ہے لیکن ہمارے نوجوان کی بلا جانے اور اس کو یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اس کے بعد تو پھر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ ایسا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے 1976ء کی اسی کنونشن کے اندر اپنے پہلے خطاب ''آدمِ نو کی تخلیق'' میں یہی نقطہ لیا تھا۔

نفسِ غیر شعوریہ انسانی نفسیات پر کیونکر قابو پایا جا سکتا ہے؟

عزیزانِ من! جنت میں داخل ہونے والوں کی پہلی چیز یہ ہے کہ ان کے اندر جو غل [1] ہوتا ہے اس کو نکال دیا جاتا ہے۔ یہ غل (7:43; 15:47) چھپا ہوا ایک راز ہے' ایک کانٹا ہے' ایک پھانس ہے' جو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اسی کو یہ نفسِ غیر شعوریہ (Unconscious Mind) کے اندر چھپا ہوا بھید کہتے ہے۔ جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ نکل جاتا ہے تو بات تو صاف ہوگئی۔ وہ کوئی ایسی چیز ہے نہیں کہ جس پہ انسان کو کنٹرول نہ ہو۔ وہ نکل سکتا ہے خواہ وہ کسی بھی وجہ سے پیدا ہوا ہو' خواہ وہ انسان کے اپنے کنٹرول میں ہو یا نہ ہو۔ انہوں نے کہیں کہہ دیا ہے کہ صاحب انسانی بچہ ابتدائی تین سال میں جو کچھ بننا ہوتا ہے' بن چکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جی! جو بننا ہوتا ہے' بن چکتا ہے۔ ہمیں آپ کہتے ہیں کہ تم اس قسم کے غنڈے اور بدمعاش کیوں ہو' وہ تو تین سال میں ہی بن گئے تھے پھر سائیکولوجی کہتی ہے جو تین سال میں بن گئے آئندہ زندگی میں تو اس سے تم پھر بچ ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے تو ہم اس دَور کے غنڈے بنے ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے پیدائشی غنڈے کی! میں نے یہاں پیدائش کا لفظ بھی یونہی نہیں کہا۔ ان کے ہاں Inheriaty (وراثت) کی بھی چیز ہے۔ یہ کچھ بھی ان کے ہاں کا نظریہ تھا۔ یہ ساری تھیوری Explore ہو چکی ہوئی ہیں لیکن Explore تو ان کے ہاں ہوں جن کو ذمہ داری کا احساس ہو۔ جو اس کے راستے میں ان چیزوں کو بطور دلائل بلائے وہ کیوں کہیں گے کہ Explore ہو چکی ہوئی ہیں۔ یہ تھیوری کہ جی وہ تو Inheritary آتا ہے یعنی اس سے پہلے یہ تھا کہ سوسائٹی کا پیدا کردہ ہوتا ہے' سوسائٹی کی

---

[1] یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ (15:47) اس کے افراد کے دلوں میں (ایک دوسرے کی طرف سے جس قدر) گرہیں ہوں گی سب صاف ہو جائیں گی......بغض' کینہ' عداوت' سازش' مکروفریب کی کوئی بات نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ کوئی راز ایسا نہیں ہوگا جسے وہ ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھیں (7:43)۔

ابتداء پیدائش کے بعد ہوتی ہے۔ ان سے کہا کہ میاں! تمہارے گھر بار والے تو اچھے شریف آدمی تھے' اخلاق والے تھے' سب کچھ ہے' کہنے لگے جی! نہیں' وہ آپ کو پتہ نہیں ہے۔ وہ جو دس ہزار سال پہلے ان کے ہاں ایک بدمعاش ہوا تھا' اس کی یہ بدمعاشی وراثتاً چلی آ رہی ہے۔ وہ ہم میں آئی ہے بھئی! اس نسل کے اندر تو اچھے اچھے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ کہا کہ جی! انہوں نے کہا ہے کہ ایک صورتِ حال جمپ کر جاتی ہے۔ یہ جو بدمعاشی ہے جمپ کر جاتی ہے۔ اس طرح درمیان میں دو تین کڑیاں چھوڑ دیتی ہے۔ وہ اچھے بھی ہو جاتے ہیں' پھر یہ جمپ کر کے آ جاتی ہے تو اتفاق سے جب ہم پیدا ہونے والے تھے تو وہ جمپ کر کے آ پہنچی ہوئی تھی۔

ہمارے ہاں سائیکولوجی کے متعلق دی جانے والی تعلیم کے اثرات

یہ ہمارے ہاں کا آج کا نوجوان یہ بحثیں کر رہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے میں نے ''لے بج[1]'' کہا ہے۔ یہ جو Half Baked Knowledge (خام علم) ہوتا ہے' یہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے اور یہ نہیں ہے کہ یہ کچھ جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں' ان کو اپنے اس غنڈے پن اور بدمعاشیوں کے لیے جواز کی منطقی دلیلیں مل جاتی ہیں۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے کہ یہ سب کچھ کرو اور آپ کے ہاں نہ ندامت' نہ کوئی معذرت' نہ پشیمانی' نہ کوئی قطراتِ انفعال' نہ آنکھوں میں کوئی حیا' نہ کوئی جھکاؤ۔ کچھ نہیں' دھڑلے سے کھڑے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ تو ہمارے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اور دس ہزار سال پہلے کا' جو ہمارا خاندان تھا' جو ہماری نسل تھی' اس میں سے کوئی گزرا ہے۔ یہ اس سوسائٹی کا اثر ہے۔ اب اینتھروپولوجی (Anthropalogy) (علم بشریات) ایک علم آ گیا۔ چلیے' Inheritance (وراثت) کا ایک اثر آ گیا' سوسائٹی کا ابتدائی اثر آ گیا۔ جی! تین سال تک جو بچہ بننا تھا' بن چکا۔ جی! اس کے بعد اس میں تبدیلی کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ بھئی! یہ دیکھیے بڑے نیک ہیں' وہ یہ کچھ نہیں کرتے۔ کہنے لگے کہ یہ کون سے ان کے اپنے اختیار کی بات ہے' ان کے وقت میں وہ بدمعاشی جمپ کرتی تھی' وہ ٹپ کے ذرا گاں چلی گئی ہونی اے۔[2] آپ نے سوچا' عزیزانِ من! کہ یہی جو چیزیں ہیں جنہیں انسانی علم کے لیے انسانیت سازی کے لیے' یہ کچھ بننا تھا' جب اس قسم کے ارادے والے ان نوجوانوں کے ہاتھ میں آیا ہے تو پھر وہ کیا کرتے ہیں: خودکشیاں کرتے ہیں' جس کا آج کل[3] عام چرچا ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ سائیکولوجی ابھی ابھی آئی ہے۔ ابتداً ہی یہاں کی کلاسز میں داخل ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں کی ابتدائی کلاس میں پڑھایا ہی کیا جاتا ہے۔ جسے یہ ایم اے سائیکولوجی کہتے ہیں وہ مبادیات سے آگے کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسے پڑھانے والے' پھر اس قسم کے وہی استاد ہیں جو اس کلاس میں چار سال بعد میں آئے

---

1. لے اڑنے والا۔
2. وہ پھلانگ کر کہیں دوسرے گاؤں چلی گئی ہوگی۔
3. یاد رہے یہ 1976 کی کہی ہوئی بات ہے۔

ہیں، اور وہ چار سال پہلے آ گئے تھے۔ وہی Inheritance (وراثت) کی بات جمپ کرتی ہوئی اس کے اندر بھی داخل ہوئی تھی۔ اس سائیکولوجی کو وہ پروفیسر پڑھاتے ہیں۔ میں ان پروفیسروں سے بھی بات کر چکا ہوں۔ میری تو، عزیزانِ من! یہ خاص لائن یا فن نہیں، میں تو یہ سارا جتنا کچھ بھی یہ ہے قرآن کو سمجھنے کے لیے، ان علوم سے استفادہ کرتا ہوں۔ بہرحال اس کے لیے بھی as a lay man جتنا کچھ بھی مجھے معلوم ہوتا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ ان کے پروفیسروں کو بھی اتنا معلوم نہیں ہوتا۔ میرے ہاں پھر بھی اس کی Latest (جدید ترین) چیزیں آ جاتی ہیں۔ وہ فرائڈ (1856-1939) کے معاملے کے اندر تھیوری پر چلے ہوئے ہیں، ان کے ہاں وہی دی جاتی ہے، وہی ان کو پڑھا رہے ہیں۔ یہی کچھ یہ پڑھ کر ادھر نکلے تو کچھ تو مذہب پرست ہیں اور کچھ کشتۂ کمیونسٹ ہیں۔ آپ کے ہاں وہی تقدیر کے مسئلے میں **والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ** ہے۔ چل بھئی! وہاں قصہ ختم۔ وہاں سے یہ دامن چھڑا کے بھاگے تھے، کمیونزم میں الحاد اور بے دینی آئی تھی وہاں یہ ہر قسم کی جتنی بھی اخلاقی اقدار ہیں۔ ان سے چھٹی ہوئی رسیاں تڑائی ہوئی، پھر رہے ہیں۔ انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ Historical necessity (تاریخی وجوب) ہے جو کچھ بنا دیتی ہے صاحب! ٹھیک ہے۔ برٹرینڈ رسل (1872-1970) نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ایسا بڑا دلچسپ تھا یہ Historical necessity (تاریخی وجوب) یہ جو لینن (1870-1924) تھا جرمنی میں تھا، تو وہاں بغاوت کے یا کسی سازش کے مقدمے میں جرمنی میں گرفتار ہو گیا۔ اس پر وہاں مقدمہ چل رہا تھا کہ وہاں اس جج نے، اس کو پھانسی کی سزا دینے کے بجائے رشیا کے کسی قانون Law کے تابع، ذرا اس پر رحم کھایا اور اس بنا پر اس کو عمر قید کی سزا سنا کر، اسے سائبیریا بھیج دیا۔ اس کے بعد وہاں اس نے یہ سازش جاری رکھی اور یہ کچھ کر دیا۔ برٹرینڈ رسل (1872-1970) میں کہتا ہے کہ Historical necessity (تاریخی وجوب) کے سب سے بڑے جو مدعی ہیں، جو کہہ رہے ہیں کہ یہ سارا کچھ پہلے سے کیا کرایا ہوا ہوتا ہے، تو اس صبح کو جب جج نے اس کا فیصلہ سنایا ہے، اگر اس دن اس کا مزاج چڑ چڑا ہوتا، تو وہ یقیناً اس کو پھانسی کی سزا دیدیتا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ پھر یہ ساری کمیونزم کہاں چلی جاتی۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عمدگی سے تنقید کرتے ہیں۔ انسانوں کے معاملات انسانوں کے ہاتھوں سے یہاں طے پاتے ہیں۔ بات بڑی صاف ہے کہ اس دن اس کا مزاج ذرا معتدل تھا، تو اس نے پھانسی کی سزا نہیں دی، اس کو سائبیریا بھیج دیا۔ اگر اس دن اس کا مزاج ذرا بگڑا ہوا، چڑ چڑا ہوتا، تو وہ آتے ہی، چھوٹتے ہی، اس کو موت کی سزا دیتا تو ہم پوچھتے یہ ہیں کہ پھر ان کی کمیونزم، اور Historical Necessity (تاریخی وجوب) کہاں جاتی جس کو یہ لیے لیے پھرتے رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک ابلیس و آدم کے تعارف کا انداز

عزیزانِ من! ابلیس کے تو معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو، اپنی غلطی کا، خود ذمہ دار قرار نہ دے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں جو بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ قرآن نے یہیں سے تو آدم کا اور ابلیس کا تعارف کرایا تھا کہ آدم سے غلطی ہوئی تو اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنفُسَنَا

(7:23) اے ہمارے نشو ونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (جو تیری بات نہ مانی۔) یہ Determinism (جبریت) کے خلاف پہلی آواز ہے۔ انسان کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ نہیں کہ اس نے خدا کے حکم کی تعمیل کس طرح کی بلکہ اس کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے کہ اس نے خدا کے حکم کے خلاف ایک عمل اپنی مرضی سے کس طرح سے کیا۔ بظاہر یہ بات ایسی نظر آتی ہے کہ صاحب! یہ کیا۔ لہٰذا میں اس کی وجہ میں کہتا ہوں کہ یہ اتنا عظیم تعارف ہے کہ اس سے قرآن نے مذہب کے اس عقیدے کو' جبریت کے اس عقیدے کو' جڑ سے کاٹا تھا۔ اس نے آدم کا تعارف یہ کہہ کے کرایا کہ آدم وہ مخلوق تھی کہ ہم نے اسے کہا کہ اس کے قریب نہیں جانا' اس نے کہا کہ جاؤنگا اور وہ گیا۔ دراصل یہ تخلیقِ نو ہے جو اس نے کی یعنی اپنے اختیار کا مالک کہا۔ غلطی سہی' اپنے اختیار سے کی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔

گفت یزداں کہ چنیں ہست و چنیں خواہد ماند
گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں خواہد بود

خدا نے یہ کہا کہ یہ ایسے ہے' ایسا ہی رہے گا۔

آدم نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے' اس طرح سے ہے' ایسے نہیں' ویسا ہوگا۔ یعنی یہ آدم کا تعارف ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ تعارف اس طرح کیوں کرایا؟ قرآن نے جبریت کا جو یہ عقیدہ تھا اس کی جڑ کاٹنے کے لیے یہ تعارف کرایا کہ یہ جو ہماری تخلیقِ نو تھی اس میں جبریت نہیں تھی' اس میں معصیت سے اپنے اختیار سے' کچھ کرنا ہے۔ یہ ہے جس کا تعارف یوں کرایا۔ اور اس کے مقابلے میں جیسا میں نے کہا ہے کہ ابلیس اتنی بڑی قوتوں کا مالک بنا پھرتا ہے' جب اس سے کہا کہ تو نے انکار کیوں کیا' تو اس نے کہا کہ جی! میں کون ہوں انکار کرنے والا' تیرے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا' تیرا انکار تیری ہی مشیت کے تابع' مجھ سے سرزد ہو گیا ہے۔ میں تو اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ کہا کہ تو ساری عمر کے لیے راندہ درگاہ ہو گیا' تیری اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ہے قصہ ابلیس و آدم۔ وہ یہاں چلے آئے۔ ابلیس نے اپنے اسی عقیدہ ابلیسیت کو نہایت مقدس نقاب اوڑھا کر' مذہب کے رنگ میں' یہاں پیش کر دیا اور ابلیس تو جتنا مذہب کے نقاب میں کھیل کھیلتا ہے' یہ فسق و فجور کے نقاب میں تو اس کا عشرِ عشیر بھی اس کے حصہ میں نہیں آتا۔ یہ جو بداخلاقیاں ہیں' ان کے متعلق تو آج کے اتنے بڑے بداخلاق معاشرے میں پھر بھی برائیوں کو برائیاں ہی قرار دیا جاتا ہے لیکن مذہب کے نقاب میں جب یہ چیزیں آتی ہیں' کبھی ان کی طرف نگاہ نہیں اٹھتی۔ اس میں اس اپنی ابلیسیت کے بنیادی عقیدے کو' مذہب کا لباس اوڑھایا اور جیسا میں نے کہا ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں جبریت جزوِ ایمان بن گئی حتیٰ کہ مسلمان کے ایمان میں داخل ہوگئی۔ اجزائے ایمان میں چھٹا جز بن کے داخل ہوگئی اور آج جبکہ جیسا میں نے کہا ہے خدا سے انکار' وحی سے انکار' رسالت سے انکار' آخرت سے انکار۔ مگر جو ابلیسیت ہے وہ عقیدہ Determinism (جبریت) ہے پہلے کمیونزم میں آئی۔ اب ان کے ہاں کی وہ ابتدائی کمیونزم میں بھی در آئی۔ میں کہیں یہ بات کرونگا کہ خود مارکس

(1818-1883) کے آخری دور کے اندر اعتراف کے طور پر یہ چیزیں موجود ہیں۔ انسان اپنے آپ کو خود بنا سکتا ہے یعنی مارکس (1818-1883) بھی اس نتیجے پہ پہنچ کے یہ کہنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا اور وہ تو چلیے اس کا دَور ختم ہو گیا ہے نہ سہی یہ جو آج سائیکولوجی چلی آ رہی ہے میں نے عرض کیا ہے ابھی ان کے ہاں فرائڈ (1856-1939) ینگ (1875-1961) وغیرہ کے یہ سکول چلے آ رہے ہیں انہی کے اندر سے یہ نئے School of Thought پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے ان کے اُن کلیوں کو مسترد کر کے رکھ دیا ہے اور وہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں جس نتیجے پہ خدا نے آدم کو پہنچایا تھا ابلیس کو نہیں۔ لیکن یہ چیز تو ان کو خوش نہیں آتی۔ ہمارے نوجوانوں کو پابندیاں کیوں خوش آئیں گی۔ اس کے لیے تو ان کے ہاں بداخلاقیوں کے جتنے لائسنز ہیں وہ ان کو مل جاتے ہیں۔ بہرحال ان کو پھر ان سے رکنا پڑے گا۔ رکنے کی بات کیوں ہوئی؟ وہ یہ سارے اسی سائیکولوجی کو اب **والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ** کو جزوِ ایمان بنائے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن تو بہت آگے کی چیز ہے اور آگے کی نہیں مسلمان کے لیے تو سب سے مقدم چیز تھی۔ اس کو دیکھ لیا ہوتا تو یہ کمیونزم کی جبریت اور یہ سائیکولوجی کی جبریت ساری ختم ہو جاتی۔ قرآن حکیم تو ایسے دلائل دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اتنا نہ سہی کم از کم اس برانچ آف نالج کا علم تو آگے حاصل کر لیا ہوتا۔ جہاں تک وہ خود تحقیق پر پہنچے ہیں وہاں پہنچیں کے بھی تو وہ اس کا کیوں اعتراف کریں گے؟ بحثیں اس پہ ہوتی رہتی ہیں کھڑے ہیں صاحب! بحثیں چلی جا رہی ہیں۔ چار اصطلاحیں لیے ہوئے ہیں اور انسان کا دماغ تو ابلیسی واقع ہوا ہے دلیل پہ دلیل تو دیتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد ابلیس نے بھی تو پہلی دلیل ہی دی تھی۔ دلیل کا کیا ہے؟ یہ ہے۔ مگر اب ہمارا جو دَور ہے اس میں بات یہاں سے چلی تھی کہ یہ جو اس آیت کا ترجمہ ہو گیا: **اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ o لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا ج وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ** (21:101-2) جن کے لیے پہلے سے ہم نے یہ لکھ دیا تھا وہ جنت میں جائیں گے ان کو جہنم کی بھنک تک کان میں نہیں پڑے گی۔ وہی چیز ہوئی۔ سبقت کا ترجمہ یہ ہوا تو جبریت آ گیا تھا۔ اس عقیدہ یا اس عقیدے کی بناء پہ یہ ترجمے ہوئے یہ تفسیریں ہوئیں۔ قرآنِ حکیم میں یہ جتنی آیات ہیں کہ **جزاً ما کانوا تعملون جزاً ما کانوا تعملون** کہ یہ وہ جنت ہے جو تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے میں ملی ہے۔ بلکہ **ما کانوا تعملون یا یعملون** تمہارے عملوں کے اندر یہ جنت خود پوشیدہ تھی تمہارے اعمال ہی جنت تھے۔ برادرانِ عزیز! اگر قرآن کا ترجمہ کروں تو اس کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے کہا ہے کہ آپ کا سارا مذہب عہدِ ملوکیت کا بنا ہوا ہے۔ یہ تفسیریں ہو رہی ہیں وہ ترجمے ہو رہے ہیں اور پھر اس کے لیے روایات کی تو کمی نہیں ہے۔ آپ کی ساری روایات مجوسیوں کے عہد کی بنی ہوئی ہیں۔ روایاتِ تقدیر کے متعلق اس میں دیکھیے آپ کے ہاں کتنا مواد مل جاتا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ کیفیت ہے۔ قرآن کے تراجم اور تفاسیر اس طرح سے ہوئیں۔ تقدیر کا بہانہ بنا کے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ تو ہو کے ہی رہنا ہے مسلمان عمل سے غافل ہوا۔ بہرحال صاحب چلیے قصہ

ختم ہوا۔ ہمارے ہاں کی جو اگلی نسل تھی اس سے انہوں نے رسی تڑائی، مذہب سے ادھر آئے، اور ادھر آنے کے بعد وہ کمیونزم کے Determinism (جبریت) میں آئے اور اس کے بعد اب سائیکولوجی کے Unconscious Mind (نفسِ غیر شعوریہ) کے فریب کے اندر خود فریبی میں مبتلا ہوئے۔ صاحب! وہی جبریت، وہی ابلیسیت، وہی قصہ آدم و ابلیس۔ مومن بننا تو بڑی چیز ہے، عزیزانِ من! ان عقائد نے تو انسان کو آدمی بھی نہیں بننے دیا ہے، حیوان کی سطح پہ رکھا ہے۔ حیوان مجبور ہوتا ہے انسان صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ آپ کے یہ اس قسم کے نیم پختہ علوم کے طالبعلم حیوان کی سطح کے اوپر لے جاتے ہیں۔ بات بیچ میں سے آ گئی تھی، میں سمجھتا ہوں کہ کام کی بات ہی تھی جو میں نے عرض کی۔ پھر وہی رہ رہ کے ذہن میں آتا ہے کہ اے کاش! کہیں ایسا ہوتا کہ یہ نوجوان کہیں میرے پاس رہتے، میرے پاس آتے تو اور کچھ نہیں تو ان کے ہاں کی ان چیزوں کو تو میں کہیں صحیح کر دیتا، درست کر دیتا۔ [1] اگر یہ سائیکولوجی پہ آئے تھے تو میں ان کو ایسی سائیکولوجی پڑھا دیتا کہ وہاں آگے لے جاتا کہ آؤ، برخوردارو! ذرا آگے چلیں، انہی کے ساتھ ساتھ آگے چلیں، لیکن بہرحال میرے لیے گنجائش کا موقعہ نہ رہا تو جہاں یہ چیز آتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس چیز کو بیان کر دوں۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ اب اتنے میں ہم نے آیات تو دو ایک ہی لی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بات آپ تک پہنچ گئی۔ اس طرح 102 آیت تک ہم آئے ہیں، 103 آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ محترم پرویزؒ صاحب کی زندگی میں فکرِ قرآنی کی روشنی میں، تعلیم و تدریس کی دنیا میں، ایک انقلاب برپا کرنے کی خاطر، ایک کالج کا قیام ان کی اہم ترین خواہش تھی۔ لیکن افسوس کہ مرحوم کی یہ حسین و جمیل خواہش، آپ کی 17-16 سالہ انتھک تگ و تاز کے باوجود، مفاد پرستیوں کی نذر ہو کر رہ گئی اور اس مفکرِ قرآن کا یہ بے مثل و بے نظیر خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ دیکھیں، اب ملتِ اسلامیہ کی اس زبوں حالی اور ذہنی پس ماندگی کو جلا بخشنے کی خاطر، دین و دانش کا یہ چراغ، روشن کرنے کی سعادت کس کے حصے آتی ہے؟

تیرھواں باب: سورۃالانبیاء (آیات 103 تا اختتام)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ۝١٠٣ یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ
وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ۝١٠٤ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ
یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۝١٠٥ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۝١٠٦ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً
لِّلْعٰلَمِیْنَ۝١٠٧ قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝١٠٨ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ۝١٠٩ اِنَّهٗ یَعْلَمُ
الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَیَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ۝١١٠ وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰی
حِیْنٍ۝١١١ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۝١١٢

عزیزانِ من! آج نومبر 1976ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الانبیاء کی آیت 103 سے ہو رہا ہے گو کہ یہ آیت اس سے پہلے درس میں بھی آئی تھی یعنی (21:103)

قرآنِ حکیم کے نزدیک انسانی زندگی کی جنت اور جہنم کے موجودہ تصور کی حقیقت

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں حق اور باطل کی اس کشمکش کا ذکر مسلسل چلا آ رہا تھا جو مختلف ادوار میں 'مختلف اقوام میں' شروع سے ہی مشہود طور پہ آتا رہا۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ خدائی انقلاب کی دعوت لے کر آتے تھے' مفاد پرست انسان انکی مخالفت کرتے تھے اور انجامِ کار حق کامیاب ہوتا تھا۔ ان مخالفین کا جو انجام ہوتا تھا قرآنِ کریم نے اسے ان کے جہنم سے تعبیر کیا اور خدا کے احکام اور قوانین کے مطابق جو خوشگوار معاشرہ قائم ہو جاتا تھا' اس کی خوشگواریوں کی وجہ سے' اسے جنت سے تعبیر کیا۔ یہ اس دنیا کا جہنم اور جنت تھا۔ اس کے بعد زندگی مسلسل چلتی ہے' اگلی زندگی کے جنت اور جہنم پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن یہاں اقوام کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی

بعد زندگی مسلسل چلتی ہے' اگلی زندگی کے جنت اور جہنم پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن یہاں اقوام کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے لاتا ہے۔ غلط نظام کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ صحیح نظام قائم ہو تو اس میں انسانیت کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا سابقہ درس کی آخری آیت میں یہی تھا کہ جن لوگوں نے ایسے کام کیے تھے جن کا نتیجہ خوشگواریاں تھیں وہ ایسی جنت کی زندگی میں رہیں گے کہ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (21:102) وہاں اس معاشرہ میں وہ اتنے دور رہیں گے کہ وہ جہنم کی آہٹ تک بھی نہیں سنیں گے (19:17)۔

ہمارے ہاں دوسروں سے مانگا ہوا ایک غلط تصور چلا آ رہا ہے کہ جہنم قید خانے کی طرح ہے' مجرم کچھ وقت سزا بھگتنے کی خاطر وہاں چلے جائیں گے اور وہ اپنی قید کی مدت کاٹنے کے بعد وہاں سے پھر رہا ہو کے جنت میں چلے جائیں گے۔ انسانی زندگی کے متعلق جنت اور جہنم کے یہ موجودہ تصورات مانگے ہوئے' مستعار تصورات تھے' جو دوسروں سے لیے گئے۔ یہ مذہب کے تصورات تھے۔ قرآن تو بڑے سائنٹفک انداز سے بات کرتا ہے۔ وہ تو زندگی کی ارتقائی منازل سے گفتگو کرتا ہے۔ زندگی کی اس منزل میں جو افراد اپنے اندر اتنی سیرت اور کردار اور خودی کی پختگی پیدا کرلیں گے کہ وہ اگلی منزل میں جانے کے قابل ہوں گے' قرآن کے نزدیک وہ تو اہلِ جنت کہلائیں گے اور جن کی نشو وارتقاء رک جائے' جامد ہو جائے' وہ ایک مقام پہ کھڑے ہو جائیں تو اس رک جانے کا نام جہنم کی زندگی ہے۔ زندگی اسی طرح سے چلی آ رہی ہے Evolutionery Stages (ارتقائی منازل) طے کرتی ہوئی۔ جس نوع میں بھی زندہ رہنے کی قوت' آگے بڑھنے کی استعداد' تھی وہ ارتقائی منزل میں آگے آ گئی' جس میں یہ قوت نہیں تھی' وہ ختم ہو گئی۔ جس میں آگے بڑھنے کی استعداد نہیں تھی' وہ وہیں رک کے کھڑی ہو گئی۔ ہر نوع اپنے اپنے مقام پہ رک کر بھی کھڑی ہوئی ہے اور پھر وہ بھی ہے جو آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کرّہ ارض پر زندگی کی نشو وارتقاء کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے جسے انسانیت کی منزل کہتے ہیں۔ اب اس کے بعد' یہاں اس نے رک کر فنا نہیں ہو جانا۔ اِس زندگی نے آگے چلنا ہے اور اس زندگی کی جو آگے جانے کی بات ہے وہ اس کرّہ ارض پہ نہیں ہے۔ یہ اس کے بعد' کہہ دیجیے کہ کہیں اور مقام پہ ہے۔ اس کا ہمیں علم نہیں ہو سکتا۔ بہرحال زندگی نے ابھی مزید ارتقائی منازل طے کرنا ہیں۔ ہمیں قرآن یہی بتاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات نہیں ہے کہ وہ کچھ وقت کے لیے جہنم میں رہ کے' سزا بھگتنے کے بعد' جنت میں چلے جائیں گے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو نوع رک جاتی ہے پھر اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ وہی جہنم کی زندگی ہے۔ کہا کہ اگر اسی معاشرے میں' جو اس دنیا کے اندر خطوطِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے' اس کی اگر جنت کی زندگی بھی لی جائے یا عاقبت کی جنت کی زندگی بھی' تو جنت جنت ہے اور جہنم جہنم ہے۔ نہ جہنم کا کوئی گوشہ جنتی ہو سکتا ہے اور نہ جنت میں کوئی گوشہ جہنم کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہا کہ وہ جنت کے اندر' جہنم کی تو آہٹ بھی نہیں سنیں گے' آہٹ سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا' وہاں کسی قسم کی دھاندلی کا' ناانصافی کا' پریشانی کا' اضطرابِ قلب کا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بڑی چیز ہے۔ وہاں کہا ہے کہ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ (21:102) وہ وہاں رہیں گے'

ان کے دل کی جتنی پاکیزہ آرزوئیں ہونگی وہ سب پوری ہوجائیں گی۔ وہاں جنت کی زندگی کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہاں انسانی آرزوئیں پوری ہوجائیں گی اور میں نے کہا تھا کہ یہ اہلِ جنت کی آرزوئیں بھی خدا کے اصولوں کے' خدا کے قوانین کے' مطابق پیدا ہوتی ہیں۔ان کے اندر ابلیسی آرزوئیں نہیں ابھرتیں کہ وہ بھی پوری ہوتی چلی جائیں گی۔آرزوئیں ہی ایسی ہونگی جو خدا کے قوانین کے مطابق ہونگی اوران کے راستے میں کوئی آڑ یا اوٹ نہیں آئے گی' وہ پوری ہوتی چلی جائیں گی حتیٰ کہ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ط هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (21:103) اس انقلاب کی شدید ترین ہولنا کی بھی انہیں ہراساں نہیں کرسکے گی۔کائنات کی تمام تعمیری قوتیں ان کی رفیق کار رہوں گی اوران سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ آ کر رہے گا۔(27:89)

عزیزانِ من! یہاں **فزع اکبر** کہا ہے۔یعنی ان کے دل میں خوف وہراس یا حزن پیدا نہیں کرے گا۔یہ ہے فزع اکبر جسے آپ بہت بڑا یعنی عظیم حادثہ کہہ سکتے ہیں۔ زندگی میں مختلف حوادث آتے ہیں جس سے انسان پر حزن طاری ہوتا ہے' ملال طاری ہوتا ہے' خوف بھی آتا ہے لیکن جنت کی زندگی میں قرآن نے یہ کہا ہوا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) اس زندگی میں خوف اور حزن نہیں ہوگا اور یہاں اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (21:103) ہے یعنی انقلاب کی شدید ترین ہولنا کی بھی ہراساں نہیں کرسکے گی۔ یہ حادثہ ان کے اندر حزن نہیں پیدا کرے گا۔اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ یہاں تک کہ آپ کسی قسم کا کوئی بھی حادثہ لے لیجیے اور یہاں اکبر کہا ہے: سب سے بڑا حادثہ۔اور ہم سمجھتے ہیں کہ سب سے بڑا حادثہ تو موت کا ہوسکتا ہے۔موت کا حادثہ بھی ان میں حزن نہیں پیدا کرے گا۔جس کی ذات میں اتنی نشوونما ہوجائے وہ موت کو موت سمجھتا ہی نہیں کیونکہ جب اسے یقین ہو کہ میری زندگی نے اسی طرح آگے بڑھنا ہے اور اگلی منزل اس منزل سے زیادہ حسین خوشنما اور خوشگوار ہے تو وہ تو اس کا استقبال کرے گا۔مومن کے لیے موت کا حادثہ باعث مسرت ہوگا۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

میں تمہیں بتاؤں کہ مردِ مومن کی نشانی کیا ہوتی ہے؟

چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

موت آتی ہے تو وہ مسکراتا ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔لائق اور ہونہار طالبعلم کے لیے' جو سالانہ امتحان ہوتا ہے' وہ خوشگواریوں کا مستقبل بتا رہا ہوتا ہے' وہ اس سے گھبراتا نہیں ہے' رزلٹ کا دن' جو اس کے سامنے آتا ہے' تو اس دن تو پوچھو نہیں کہ اس کی خوشیوں کا کیا عالم ہوتا ہے۔وہ تو انتظار کررہا ہوتا ہے کہ کسی طرح جلدی سے رزلٹ آ ؤٹ ہو اور یہ معلوم ہو کہ میں نے First Stand (پہلی پوزیشن لی ہے) کیا ہے۔ناچتا' بھاگتا' دوڑتا' گھر کی طرف لوٹتا ہے تو یہ جو مومن کے لیے موت ہے وہ تو واقعی وجہِ تبسم ہے کہ اگلی زندگی اس زندگی

سے کہیں زیادہ بلند، خوشگوار اور شادمانیوں کا گہوارہ جھولانے کے لیے آتی ہے تو اس میں اَلْفَزَعُ الْاَکْبَرُ اس میں حزن کیوں پیدا کرے گی۔ یہی چیز ہے کہ وہ موت سے بھی نہیں مرتا۔ اقبالؒ (1938-1877) ہی کے دو مصرع، دو شعر تو بڑے بلند ہیں کہ

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گُہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

تو موت سے نہ مرنا ہے، جو کہا گیا ہے کہ ''الفزع الاکبر بھی ان میں حزن اور ملال پیدا نہیں کرتا''۔ ملائکہ ان کے استقبال کے لیے آتے ہیں، ان کی امداد کے لیے آتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ یہ ہے وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا، یہ ہے وہ دَور، وہ یوم، تو دَور کو بھی کہیں گے، یہ ہے وہ دَورِ زندگی جس کے متعلق تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اور دوسری طرف کہا کہ یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ (21:104) اس دَور میں، ان بڑے بڑے لوگوں کو جو آج اس طرح بلندیوں پر متمکن ہیں، یوں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا جس طرح بہی کھاتے کو (حساب کتاب ہو چکنے کے بعد) لپیٹ کر رکھ دیا جاتا ہے (کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس وقت اخلاق واقدار اور انسان کی معاشی زندگی ایک ہی مرکز کے تابع ہو جائیں گے (39:67) اور اس طرح مساواتِ آدم کی پھر وہی کیفیت ہو جائے گی جو تخلیقِ انسانی کے دَورِ اوّل میں تھی۔ معاشرہ پھر اسی دَور کی طرف لوٹ آئے گا جس میں نوعِ انسان امتِ واحدہ تھی اور رزق کی عام فراوانی تھی (2:213:10:19) یہ ہمارا وعدہ (طے شدہ پروگرام) ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔ [1] عزیزانِ من! یہ عظیم آیات ہیں۔

ان آیات کا مروجہ مفہوم

عام ترجموں میں آپ یہ دیکھیں گے اور اسی قسم کی اور آیات میں بھی مثلاً اسی آیت کا ترجمہ کیا جائے گا کہ ''جس دن ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے، جیسا کہ رجسٹروں کو لپیٹ دیا جاتا ہے، اور پھر جس طرح ہم نے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اس کائنات کو، اسی طرح سے پھر دوبارہ یہ کچھ کریں گے۔ ہمارا یہ وعدہ ہے بلکہ ہم پر یہ کرنا واجب ہے اور ہم یہ کر کے رہیں گے۔''

---

[1] اگر ان آیات کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی سے سمجھا جائے، تو پھر ان میں طبعی کائنات کے زیروزبر ہو جانے کی طرف اشارہ ہوگا، جس کے بعد تخلیق کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس صورت میں یہ آیت ایک عظیم حقیت کو سامنے لاتی ہے کہ اس کے بعد تخلیق کائنات کا از سرِ نو آغاز ہوگا جس طرح پہلے ہوا تھا۔ (مفہوم القرآن، ص ص 48-747 فٹ نوٹ نمبر 1)

ان آیتوں کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ یہ خارجی کائنات ہے' یہ طبعی کائنات Physical Universe ختم ہوگی' یہ کرے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے' آسمان پھٹ جائے گا' زمین شق ہوجائے گی۔ قرآنِ کریم میں' جس طرح مختلف آیات کا ترجمہ دیا جاتا ہے' یہ ٹھیک ہے' ہر شے جو مخلوق ہے' اس کا ایک End (اختتام) تو آخر ہوگا' ابدیت تو صرف ذاتِ خداوندی کے لیے ہے۔ **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** (28:88) کائنات کی ہر شے' ہر آن تغیر پذیر ہے (55:26) تغیر (Change) سے ماوراءصرف خدا کی ذات ہے۔ تو یہ ابدیت تو اس کائنات کو نہیں ہے۔ اسے تو ایک دن' کسی نہ کسی طرح' کسی نہ کسی دَور میں' اس ہیئت میں نہیں رہنا۔ آپ یوں کہیے کہ اسے تو ختم ہوجانا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم کی ان آیات کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیات اس Universe (کائنات)' اس مادی کائنات کے انجام کے متعلق ہیں تو یہ بھی ٹھیک ہوسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے ان آیات پہ غور کیا ہے اور یہ جو آخری دو پارے ہیں وہاں تو سارا ذکر ہی یہی چلا آرہا ہے۔ آپ نے میرے ''مفہوم القرآن''[1] میں اس آیت کو اور اسی قسم کی جو دوسری آیات آتی ہیں' دیکھا ہوگا کہ ایک تو الفاظ کے حقیقی معنی ہوتے ہیں اور دوسرے مجازی۔ مثلاً سماء کے معنی بلندی' اس میں اجرامِ فلکی' یعنی یہ تمام کرے آجاتے ہیں اور سماء کے معنی میں انسان کی رفعتیں' بلندیاں اور سرفرازیاں بھی آجاتی ہیں۔ اسی طرح جبال کے لفظی معنی پہاڑ ہیں لیکن قرآنِ کریم نے جو یہ بڑے بڑے طرہ باز تھے ان کو بھی جبال کہا ہے کہ وہ پہاڑوں کی طرح مستحکم کھڑے ہیں۔ جب یہ کہا ہے کہ پہاڑ' روئی کے گالے کی طرح' اڑتے نظر آئیں گے تو حقیقی معنوں میں یہ ہوگا کہ پتھر کے' مٹی کے یہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح بن جائیں گے۔ یہ بات ہوئی اور اگر زبان کے مجازی معنی لیے جائیں جو کہ عربوں کے ہاں یہ بڑی عام چیز تھی کیونکہ زبان بڑی وسیع تھی تو اس کے معنی یہ ہونگے' کہ یہ جو آج اس طرح سے انسانوں کی تمدنی معاشرتی معاشی زندگی میں' پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے کھڑے ہیں' یہ بڑے بڑے سردارانِ قوم ہیں' تم دیکھو گے کہ کس طرح ان کے پرخچے اڑ جاتے ہیں' پہاڑ اپنے مقامات سے ہل جائیں گے۔ یہ ہے وہ چیز اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ کرہ ارض یوں ہوگا' اجرامِ فلکی پھٹ جائیں گے' ریزہ ریزہ ہوجائیں گے۔

ان آیات کا ایک دوسرا مفہوم: قرآن حکیم کے الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت اور حقیقت

عزیزانِ من! ایک واقعہ کے لحاظ سے تو یہ ہوسکتا ہے لیکن ہماری زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کرے' یہ کائنات' یہ اجرامِ فلکی' یہ ارض نہیں رہیں گے' پھٹ جائیں گے' تو اس زمانے میں جو کچھ اس پر ہوگا' وہ انسان بھی جو ہونگے' وہ بھی تباہ ہوجائیں گے۔ ہمیں اس سے کیا واسطہ؟ ہمیں آج اس واقعہ کے لحاظ سے کیا سبق ملا؟ ہمارا ایمان ہے کہ اگر قرآن یہ کہتا ہے تو بالکل صحیح ہے لیکن ہمیں اس سے کوئی سبق نہیں ملتا' عبرت نہیں ملتی' ہمارے لیے اس میں کوئی تعلیم نہیں ہے۔

---

[1] پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور۔

عزیزانِ من! یہ تعلیم تو اسی صورت میں ہے کہ یہ جو آیات ہیں' ان کے مجازی معنی لیے جائیں جیسا کہ عرب لیتے بھی تھے' پھر آپ اس Context (سیاق وسباق) میں رکھ کے دیکھیے جس میں یہ آیات آ رہی ہیں تو وہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے جس مقصد کے لیے یہ آیات آ رہی ہیں کہ قوموں میں باہمی کشمکش کیا تھی' یہ داعیانِ انقلاب کیا چیز پیش کرتے تھے' ان کی مخالفت کس طرح سے ہوتی تھی' غلط نظام اور صحیح نظام کا ٹکراؤ کیسا ہوتا تھا۔ اور اس ٹکراؤ کے آخر میں اگر یہ کہا جائے کہ تم دیکھو گے کہ پہاڑ اُڑ جائیں گے' ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں' حق کی اس جماعت کا باطل کے نظام کی تائید کرنے والوں سے اتنا بڑا ٹکراؤ ہو رہا تھا' تو اس مزاحمت اور اس تصادم کا یہ انجام ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ یعنی آج تو تمہیں یہ اس قدر پہاڑوں کی طرح جمے (Established) ہوئے نظر آ رہے ہیں' ان کے طرے آسمانوں کی طرف فضاؤں کی بلندیوں میں اڑ رہے ہیں' تم دیکھو گے کہ اس تصادم اور مخالفت میں کس طرح ان کے پرخچے اڑتے ہیں۔ یہ روئی کے گالوں کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ان کی یہ حیثیت ہو جائے گی اور پھر وہ چیزیں ہیں جو اس تصادم اور کشمکش کے ابتدائی دَور میں اِن سے کہیں جا رہی ہے۔ انہیں وارننگ دی جا رہی ہے۔ تو میں اپنی بصیرت کے مطابق ان آیات کا یہی مفہوم لیا کرتا ہوں اور میں نے قرآن سے یہی مفہوم لیا ہے کیونکہ جس تسلسل میں یہ چیز چلی آ رہی ہے' جسے Context (سیاق وسباق) کہتے ہیں' اس میں آپ دیکھیں گے تو یہی معنی fit in ہوتے ہیں۔ اس میں قوموں کی کشمکش کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ یہ سورج ماند پڑ جائے گا اور چاند کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور اس کے بعد پھر یہ کہا کہ دیکھا کہ قوموں کا انجام کیسے ہوا' تو آپ دیکھتے ہیں کہ درمیان میں یہ ٹکڑا کچھ اَن جوڑ سا نظر آتا ہے' بے جوڑ نظر آتا ہے جبکہ قرآن میں تو بڑا ربطِ باہمی ہے۔ اس میں تو بے ربط ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اگر یہ چیز سامنے ہو تو پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ بالکل مربوط کلام ہے۔ لہٰذا اس کشمکش کے اندر تم دیکھو گے کہ مخالفت کرنے والے کس طرح جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور صحیح نظام کو قائم کرنے والے کس قدر زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ انجام کار تم دیکھو گے کہ یہ اتنے بڑے بڑے پہاڑوں جیسے یہ سردار' جو سمجھتے ہیں کہ ہمیں کون ہلا سکتا ہے' اپنے مقام سے ہلنا تو رہا ایک طرف' یہ آسمان کی بلندیوں پر اڑنے والے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اب آئی وہ آیت جس میں کہا کہ جس طرح کسی کا حساب کتاب کرنے کے بعد' اس کا بہی کھاتہ لپیٹ کے رکھ دیا جاتا ہے۔ یوں ان کا خاتمہ ہو جانا ہے' یہ سارا حساب کتاب ہو جانا ہے' ان کا بھی بہی کھاتہ ٹھپ کر کے رکھ دینا ہے۔ اور یہ جو آج آسمان کی بلندیوں پر اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں' اس کے بعد تم دیکھو گے' کہ انہیں کس طرح ردی کے کاغذوں کی طرح لپیٹ کے ایک طرف پھینک دیا جائے گا اور اس کے بعد یہ عظیم آیت پیش کی جاتی ہے کہ اس طرح مساواتِ آدم کی پھر وہی کیفیت ہو جائے گی كَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (21:104) جو تخلیق انسانی کے دَورِ اول میں تھی۔ معاشرہ پھر اُسی حالت کی طرف لوٹ آئے گا جس میں نوعِ انسانی امت واحدہ تھی اور رزق کی عام فراوانی تھی (2:213; 10:19) اس آیت میں لفظی معنوں کے اعتبار سے یہی کہا جاتا ہے کہ پھر یہ سارا کرۂ ارض' یہ اجرام' یہ Outer Universe (خارجی کائنات)' یہ

Physical Universe (طبعی کائنات) تباہ ہوجائے گی' برباد ہوجائے گی' خاتمہ ہوجائے گا اور اس کے بعد پھر اگلی آیت میں مروجہ تراجم کی بنا پر' یہ کہ جیسے ہم نے اس کائنات کو پہلی دفعہ پیدا کر دیا تھا' اسے پھر دوبارہ پیدا کرتے جائیں گے۔

وجودِ کائنات کے متعلق ایک عظیم قرآنی آیت کا مفہوم

برادران عزیز! اگر دیکھا جائے تو یقینی طور پر خدا کی قدرت سے یہ کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ وہ پھر دوبارہ یہی سلسلہ کائنات پیدا کرے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ایسے ہی پھر پیدا کرنا ہے تو اسی کو کیوں نہ Continue (جاری) رکھا جائے اگر اس میں کسی اصلاح کی گنجائش ہے تو اصلاح کر دی جائے لیکن اس سارے سلسلے کو تہس نہس کر کے' ختم کر کے' فنا کر کے' ریزہ ریزہ کر کے' نیست کر کے اصلاح کرنا چہ معنی دارد؟ کہا کہ اس کے بعد جیسا پہلے ہم نے شروع کیا تھا اسے پھر شروع کر دیں گے اور جب پھر یہ ایسے ہو جائے گا تو پھر فنا کر دیں گے اور اس کے بعد ہم اسے پھر شروع کر دیں گے: می نہ سزد خدائے را۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے تو کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ بالحق پیدا کردہ شے کے متعلق تو یہ نہیں ہے کہ پھر اس میں تھوڑا سا تجربہ کرنے کے بعد' معاذ اللہ' یہ دیکھا جائے کہ او ہو اس میں تو غلطی رہ گئی' اس لیے پھر وہ کیا جائے جیسے سلیٹ پہ بچہ یوں کر دیتا ہے یعنی اس نے غلط سوال کو مٹایا اور پھر حساب شروع کر دیا۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ کائنات بالحق پیدا ہوئی ہے۔ اس کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے انجام میں اس کی ابدیت تو نہیں ہے لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ یہ دیکھ کے کہ یہ تو کچھ اس میں معاذ اللہ غلطی سی رہ گئی تھی' اس کو مٹاؤ پھر نئے سرے سے حساب شروع کرو۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو وہ چیز ہے جسے اقبالؒ (1877-1938) نے اپنے عجیب انداز میں کہا تھا کہ:

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

یہ کہنے کا ایک انداز ہے اور خوبصورت انداز ہے کہ اگر ہمارے ہی جیسے اور پیدا کرنے ہیں تو اس پیدا کرنے سے کیا حاصل ہے۔ غلط سوال نکالنا ہے تو بیس مرتبہ غلط نکالنے سے کیا فائدہ ہے! تو یہ بات نہیں ہے۔ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (21:104) دراصل' یہاں قرآن نے' انسانوں کے باطل نظاموں کے متعلق بڑی عجیب چیز کہی ہے۔ انسان مختلف تجارب کے بعد' اپنے غلط اور خود ساختہ نظام کو تجربے کے بعد' جب اسے آزماتا چلا جائے' آزماتا چلا جائے' تو تم آخر کار دیکھو گے کہ ہر آزمانے کے بعد' وہ جب بھی کبھی کسی ایک نتیجے پہ پہنچے گا تو اس کا اگلا قدم اس صحیح نظام کی طرف اٹھے گا جو قرآن نے اسے دیا ہے۔ ایک یہ طریقہ تو ہے کہ داعیانِ انقلاب کی ایک جماعت اٹھے اور اپنے قوتِ بازو سے' مخالفت کی قوتوں کو شکست دے کر' صحیح نظام کو قائم کر دے۔ وہ بہت جلدی ہو جاتا ہے' چند دنوں میں ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ ہے جسے کہتے ہیں کہ زمانے کے تقاضوں پہ چھوڑ دیا جاتا ہے' اور جسے میں کائناتی قوتیں کہا کرتا ہوں۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنے خودساختہ نظاموں کے خود تجربے کرتا ہے' ہر نظام آخر میں جا کرنا کام ثابت ہوتا ہے' پھر اس کے بعد وہ کھڑا ہو کر سوچتا ہے' پھر ایک نیا نظام شروع کرتا ہے۔ یہ تاریخ بتا رہی ہے کہ ہر باطل یا غلط نظام کے بعد جو نیا نظام شروع کرتا ہے' اس میں جو اصلاح کرتا ہے' اس اصلاح کا رخ اسی سمت کی طرف ہوتا ہے' جدھر قرآن لے جانا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں چودہ سو سال کی پوری تاریخ' عزیزانِ من! یہ بتا رہی ہے۔ میں نے ان چیزوں کو اپنے ہاں تفصیل سے لکھا ہے۔ آپ میرا ایک پمفلٹ ہی دیکھیے۔ اس کا عنوان ہے: ''کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟''[1] وہاں میں نے یہ چیزیں دی ہیں کہ انسان کا ہر قدم اُدھر جا رہا ہے۔ یورپ کے جو بعض فلاسفر تھے' وہ بھی اپنی کاوش کے بعد' تحقیق کے بعد' یہ کہنے پہ مجبور تھے کہ شروع میں انسانی زندگی ایک فطرتی (Natural) کیفیت کے مطابق تھی اور اس کے بعد اس نے اپنے ہاں جو تہذیبی نظام قائم کیے' یہ غیر فطری ہیں۔ یہ ان کے الفاظ تھے۔ لہٰذا آخر الامر انسانوں نے ہار تھک کر' اپنے ناکام تجارب کے بعد' پھر Return (مراجعت) کرنا ہے اور اپنے اسی صراطِ مستقیم پر آنا ہے جو وحی نے انسان کے لیے متعین کر رکھا ہے۔ یہ فلاسفر ہیں' ان کا ایک School of Thought (مکتب فکر) ہے کہ انسان نے بالآخر اس زندگی کی طرف ہی لوٹنا ہے' خواہ یہ جتنے چاہے تجربات کرتا چلا جائے' چنانچہ جہاں کہیں بھی صحیح نظام قائم ہوتا ہے' وہ وحی کا ہی ایک نظام ہوتا ہے جہاں سے قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کی تمدنی زندگی کی ابتداء کی تھی۔

سب سے بڑی جنت کے حصول کا راز

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے اس آیت میں دو خصوصیات بتائیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) پوری نوعِ انسان ایک گروہ' ایک گروپ' ایک کنبہ' ایک قوم' ایک امت ہے۔ اس میں کوئی تفرقہ نہیں۔ وہ جغرافیائی حدود یا نسلی حدود یا خون' رنگ اور زبان کے اختلافات حتیٰ کہ مذہب کے اختلاف کی بناء پر بھی مختلف فرقے یا پارٹیاں یا قومیں یا قومیتیں نہیں بنی تھیں۔ یہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) تھی یعنی نوعِ انسان پوری نوعِ انسانی ایک امت' ایک ملت' ایک امت چنانچہ بغیر اختلاف اور تفرقہ کے ایک قوم۔ لہٰذا' برادرانِ عزیز! انسان کے لیے اس سے بڑی جنت اور کیا ہوگی۔ پہلی چیز تو یہ ہے اور غالباً دوسری یہ کہ **مَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا** (10:19) الناس ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ اس کے بعد انفرادی مفاد پرستیوں نے ان میں اختلافات پیدا کیے۔ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اور یہی ان کی درندگی کی زندگی ہے جس سے قرآن نے انسانیت کو نکال کے لے آنا ہے۔ کہاں لے آنا ہے؟ **کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213) اسے پھر امت واحدہ بنا دینا ہے۔ وہی پہلے دَور کی چیز' جس دَور کو جنتِ آدم کہا گیا ہے۔ اس میں دوسری چیز کیا کہی تھی؟ یہ دوسری چیز تو کئی بار دہرائی گئی ہے' اور اسے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ یہ وہی ہے

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ Is Islam Failure? کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جو آدم سے کہا گیا تھا کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی o وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی (20:118-119) یاد رکھو! اس زندگی میں تمہیں اپنی طبعی زندگی کی ضروریات کے لیے کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے' کوئی تم میں سے نہ روٹی کا محتاج ہوگا' نہ پانی کا' نہ سردی گرمی کا' نہ موسم کے لباس کا۔ تمہیں اس قسم کے تفکرات ہی نہیں ہونگے۔ یاد رکھو کہ اس زندگی میں تمہیں ان چیزوں کے متعلق کوئی پریشانی یا فکر نہیں ہے۔ اطمینان سے یہ سب چیزیں از خود فَتَشْقٰی (20:117) جگر پاش مشقتوں کے بغیر تمہیں حاصل ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ ہے وہ پہلا دَور جو آدم کی جنت کا دَور ہے۔ ابتدائی دَور انسانیت کا دَور ہے۔ امتِ واحدہ کا دَور ہے اور طبعی ضروریاتِ زندگی کا بغیر پریشانیوں کے پورا ہوتے چلے جانے کا دَور ہے۔ یہی وہ ابتدائی دَور ہے' جس کا نقشہ قرآن نے بتایا تھا پھر اس کے بعد تو پوچھو نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا: فَوَسْوَسَ اِلَیْہِ الشَّیْطٰنُ (20:120) انفرادی مفاد پرستیوں نے اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ پھر تو یہ سارے کا سارا نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کو ان چیزوں کے لیے پھر اس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑیں کہ انسانیت کا بلند مقصد ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد کے دَور میں جو کچھ ہوا اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ کشمکش حق و باطل اس طرح جاری رہے گی' غلط نظام مٹتے جائیں گے' صحیح نظام آگے بڑھتا چلا جائے گا تا آنکہ یہ بڑے بڑے طبقاتی طور پر جو اپنے آپ کو آسمان کی بلندیوں پر سمجھنے والے ہیں' بہی کھاتے کی طرح لپیٹ کے رکھ دیئے جائیں گے اور اس کے بعد آخر کار اِس حضرت انسان کی کیفیت اسی طرح مساواتِ آدم کی سی ہو جائے گی جو کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ (21:104) تخلیق انسانی کے دورِ اوّل میں تھی۔ یہ حضرت انسان اور اس کا انسانی معاشرہ وہیں چلا جائے گا' جہاں سے اس نے اپنی ابتداء کی تھی۔

عزیزانِ من! اگر قرآن کے ان حقائق کو اور اس انداز کو سامنے رکھا جائے تو انسان جھوم جاتا ہے۔ انسانی کاوشوں نے کیا کیا؟ میں جب یورپ کے فلاسفروں کا وہ دَور پڑھتا ہوں تو ان میں سے ایک ایک اس چیز کے اوپر آتا ہے کہ آخر کار انسان پھر سے اس نیچرل زندگی کی تلاش میں ہے' جہاں سے اس نے اپنی تمدنی زندگی کی ابتداء کی تھی۔ ان کے سامنے تو قرآن کی یہ آیت نہیں تھی۔ یہ ہوتی تو پتہ نہیں وہ جھوم کے کیا کرتے: کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ (21:104) اللہ اکبر! تو یہ چیز نہیں ہے کہ Universe (کائنات) کو تباہ کر دیا جائے گا اور اس کے بعد پھر' دوبارہ' شروع کی طرح سے یا اسی طرح سے پیدا کر دیا جائے گا۔ یہ تصور ہی دراصل غلط ہے۔

آج کا انسان اپنی ابتدائی تمدنی زندگی کی تلاش میں ہی سرگرداں ہے

عزیزانِ من! انسان کی تمدنی زندگی کا جو آغاز تھا اُس میں وہ جنت میں رہتا تھا۔ اس میں نہ کوئی باہمی اختلاف تھا' اور نہ زندگی کی ضروریات کے لیے جگر پاش مشقتوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جنت کے متعلق تو میں آگے آؤنگا تو بتاؤں گا البتہ ایک جگہ ہے کہ وہاں جو

پانی کی ضرورت ہوگی تو کنویں کھود کھود کے پانی نہیں لینا پڑے گا' زمین سے چشمے ابلتے ہوئے ملیں گے۔ یہ تشبیہات بڑی عجیب چیزیں ہیں **کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ** (21:104) اور یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اس کے مجازی معنی ہیں، اس کی تائید ہمیں نبی اکرمؐ کے ایک ارشادِ گرامی سے ملتی ہے جو انہوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارزاں فرمایا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر بیان کردہ خطبے کی گہرائی

عزیزانِ من! یہ عظیم چیز ہے حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے کہا تھا کہ اس دَور میں یہ ساری کشمکش ختم ہوئی' باطل کے نظام ختم ہوئے' یہ جبال اور یہ پہاڑوں کی طرح آسمان کی بلندیوں پہ اڑنے والے لپیٹ کے رکھ دیئے گئے' ریزہ ریزہ ہوگئے' اپنے مقام سے سرک گئے اور یہ نظامِ حق قائم ہوا۔ اس دنیا میں جنت کی زندگی میسر آئی۔ تو یہ جو اس کا آخری لمحہ یا دَور تھا وہ نبی اکرم ﷺ کے حجۃ الوداع میں تھا۔ آخری حج' جو حضور ﷺ نے فرمایا' اس اجتماعِ عظیم میں حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا ہے' جو نوعِ انسانی کے لیے منشور کا حکم رکھتا ہے۔ عزیزانِ من! اس خطبے کا آخری فقرہ بڑی عظیم چیز ہے۔ حضور ﷺ نے یہ کہا تھا کہ اے انسانو! سن لو' زمانہ گردش کرتے کرتے آج پھر وہیں آ پہنچا ہے جہاں سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ **یوم خلق السمٰوٰت و الارض** کہا ہے۔ زمانہ اس ہیئت کے اوپر آ گیا ہے یعنی زمانہ گردشیں کرتا کرتا آج پھر اس مقام پہ آ گیا ہے جہاں یہ اس دن تھا جب تخلیقِ ارض و سما ہوئی تھی۔ کس مقام پہ کہا گیا ہے۔ وہ جسے The Lost Paradise (فردوسِ گم گشتہ) کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کا دَور فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کا دَور ہے۔ اور اس میں یہ سارے اعلانات کرنے کے بعد دیکھیے اس کے آخری مقطع کا بند۔ صاحب! یہ صحیح حدیث تو ہیرے کی چمک کی طرح پکار کے کہہ دیتی ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہوگا۔ یہ اس خطبے کے آخری الفاظ ہیں کہ اے نوعِ انسان! آج زمانہ گردشیں کرتا کرتا پھر وہیں آ گیا ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ یہی ہے وہ جو قرآن نے اس آیت میں کہا ہے کہ **کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ** (21:104) وہیں لائیں گے ہم جہاں سے یہ ابتداء ہوئی تھی۔ **وَعْدًا عَلَیْنَا** (21:104) یہ ہمارا وعدہ (طے شدہ پروگرام) ہے۔ عزیزانِ من! ایسا کرنا ہم پر واجب ہے اندازہ لگایئے قرآن نے کن الفاظ میں یہ بات کہی تھی۔

قرآنِ حکیم انسان کو اس کے روشن مستقبل سے مایوس ہونے ہی نہیں دیتا

اگلی ہی آیت میں کہ **اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ** (21:104) ہم یہ کر کے رہیں گے۔ یہ بڑے خوبصورت الفاظ ہیں اس لیے کہ قرآن پر جن کا ایمان ہے وہ انسانیت کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ انسانیت مختلف ادوار سے گزر رہی ہے۔ اس کا انجام یا اس کا مستقبل مایوس کن نہیں ہے۔ بڑا ہی خوشگوار ہے۔ اسے قرآنِ کریم نے **وَعْدًا عَلَیْنَا ط اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیْنَ** (21:104) کہا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ان آیات کا صحیح مفہوم اس وقت صاف طور پہ سمجھ آتا ہے جب آپ اِس Context (سیاق

وسباق) میں رکھتے ہیں۔ وہاں یہ پچھلی آیات سے یہ کچھ چلا آ رہا ہے: یہ کشمکش' یہ تصادمات' یہ غلط اور صحیح میں خط امتیاز۔ اور درمیان میں یہ آیتیں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (21:105) ہم نے اس حقیقت کو' ہر کتابِ وحی میں' متعلقہ امور کو سامنے لانے کے بعد بطور ایک اساسی قانون کے لکھ دیا تھا کہ ارض (نظام مملکت وحکومت اور وسائل پیداوار وغیرہ) کے حقیقی وارث وہی لوگ ہوں گے جن میں ان امور کی صلاحیت ہوگی' اور جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کریں گے۔ اس طرح' عزیزانِ من! یہاں یہ کہا ہے کہ ہم نے تو ہر آسمانی صحیفے میں ابتدائی آئین کے خطوط' ضوابط' احکام دے دیئے تھے۔ یہ دینے کے بعد ایک عظیم اصول دیا تھا۔ ویسے الزبور اس صحیفے کو بھی کہتے ہیں جو حضرتِ داؤد علیہ السلام پہ نازل ہوا تھا۔ عام معنی میں "زبر" ہر کتاب کو بھی کہتے ہیں۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے ہر آسمانی کتاب میں ابتدائی نصیحت کی چیزیں لکھنے کے بعد یہ عظیم اصول دیا تھا کہ ارض کی مملکت' استخلاف فی الارض' یہاں کی مملکت' حکومت' اقتدار' خدا کے ان بندوں کو ملے گا جو صالحون ہیں۔ یہاں لفظ صٰلحون ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم نے یہ اصول دیدیا' وراثت ارضی کا ابدی اصول کہ یہ اقتدار' استخلاف فی الارض خدا کے صالح بندوں کو ملے گا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں صالحین کا حقیقی مفہوم

عزیزانِ من! اب آپ پہلے تو یہ دیکھیے کہ پچھلی آیات سے' جو سب کچھ چلا آ رہا ہے' اس میں یہ آیت آئی ہے۔ آگے تو نظر آ رہا ہے کہ یہ جو انسانی تمدن کا انجام بتایا جا رہا ہے یہ اس دَور میں ہوگا جب مملکت اور اقتدار صالحین کے ہاتھ میں آئے گا۔ اب یہ ابدی قانون بتا دیا کہ وراثتِ ارض کا ابدی قانون یہ ہے کہ وہ صالحین کو ملتی ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کی رو سے صالحین کیا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے بڑا عظیم اصول بتایا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ (21:105) ارض (نظامِ مملکت وحکومت اور وسائل پیداوار وغیرہ) کے حقیقی وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے۔ یہ ایک ابدی' محکم اصول ہے' غیر متبدل اصول ہے' کہ وراثتِ ارض مشروط ہے۔ اب میں وراثتِ ارض کے مفہوم کی طرف آتا ہوں۔ وراثتِ ارض صلاحیتوں پر مشروط ہے۔ جس قوم میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے اسے یہ نعمت مل سکتی ہے۔ اور پھر ملنے کے بعد بھی جو قوم صلاحیت کھو دیتی ہے تو پھر یہ عطا بھی اس سے چھن جاتی ہے۔ لہٰذا اسے حاصل کرنے کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ قرآن یہ لفظ الصّٰلحون یا صلاحیت کن کے لیے' کس مفہوم میں لایا ہے۔ اس کا مادہ "ص ل ح" ہے۔

اسے آپ عربوں کی زبان میں دیکھیے۔ پہلی چیز تو خود انسانوں کی طبعی اور مادی قوتیں ہیں۔ قرآن تندرست اور توانا بچے کو بھی صالح کہتا ہے' کسی کی بیماری کے بعد اس کا علاج کرنے کے بعد جو تندرست ہو جاتا ہے' وہ اسے بھی اصلحنا کہتا ہے۔ صلح کے معنی ہوتے ہیں:

تمام قوتوں کے اعتدال کو لیے ہوئے قائم ہونا اور پھر ہر اعتبار سے اس کا تندرست وتوانا ہونا ہے یعنی یہ صلاحیتیں اور قوتیں بھرپور اور صحیح Proportion (تناسب) کو لیے ہوئے ہوں۔ اس کے پہلے معنی تو یہ ہوتے ہیں۔ باالفاظ دیگر وراثتِ ارض کے ابدی قانون میں پہلی شرط یہ ہے کہ اس قوم کے پاس مادی صلاحیتیں اور مادی قوتیں ہونی چاہئیں۔ اور یہ فطرت کا قانون چلا آ رہا ہے کہ زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت ہوتی ہے۔ جیسا میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ آگے وہ بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جہاں یہ قوت ختم ہوتی ہے' وہیں وہ قوم رک جاتی ہے اور رکنے کے بعد تباہ ہو جاتی ہے' فنا ہو جاتی ہے' آگے نہیں بڑھ سکتی' اپنے مقام پہ بھی نہیں کھڑی رہ سکتی۔ اگر قوت نہیں ہوتی تو

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے پاس وہ قوت ہونی چاہیے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

مذہب کا فریب اور روحانیت کی تلبیس' یہ کوشش کرتی ہے کہ قوم میں قوت نہ آنے پائے۔ اس میں ضعف وانکساری ہو۔ مسلمانوں کو قرآن سے برگشتہ کرنے کے لیے جو سازشیں ہوئی ہیں اُن کا تو پوچھو نہیں۔ ان کی تو ایک تاریخ ہے اور سب سے بڑی سازش یہ ہے کہ خدا کے مقرب بندوں کی نشانی اور خصوصیت ضعف وانکساری ہے۔ ناتوانی' بے کسی' بے بسی' مجبوری' ضعف' غریبی' یہ ساری جتنی بھی دنیا کی لعنتیں ہیں' اکٹھی کی جائیں تو اس کا مقام تقرب بارگاہِ خداوندی ہوتا ہے۔ جی! نہ او کجھ کھاندا پیندا اے' نہ ایس قوم نوں کوئی لبدا اے کھان پین نوں' نہ او کجھ کپڑے وپڑے پاندا اے' نہ ایناں نوں لبدا ہیگا اے۔ او وی لا مکان تے اے وی لا مکان'[1] جناب! نہ گھر' نہ گھاٹ۔ مقربین بارگاہِ خداوندی کا نقشہ یہ دیا جاتا ہے۔ ہزار سال سے آپ کے خلاف یہ سازش ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جتنے بھی بڑے بڑے اولیائے کرام خدا تک پہنچے ہوئے ہیں آپ ان کی زندگیاں دیکھ لیجیے۔ پھٹے ہوئے کپڑے' کھانے کو کچھ نہیں' پژمردہ روح' رو رہے ہیں' چیخ رہے ہیں' جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں' کبھی جھونپڑی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ اللہ والوں کی نشانیاں ہیں اندازہ لگائیے جبکہ خدا کے بندوں کے لیے پہلی شرط وراثتِ ارض کی صلاحیت تھی' تاکہ یہ ضعف وناتوانی کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

---

[1] جی نہ وہ کچھ کھاتا پیتا ہے' نہ اس قوم کو کچھ کھانے پینے کو ملتا ہے' نہ وہ کوئی لباس پہنتا ہے نہ انہیں ملتا ہے۔ وہ بھی لامکان اور یہ بھی لامکان۔

مملکتِ اسلامیہ کو قائم اور دائم رکھنے کی تاکید

قرآنِ کریم نے تو مملکت حاصل ہونے کے بعد بھی یہ چیز جماعتِ مومنین سے کہی تھی کہ مملکت تو تمہیں حاصل ہوگئی ہے مگر یاد رکھو اسے قائم رکھنا ہے۔ اس کے قائم رکھنے کے لیے کہا کہ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ** (8:60) اب مطمئن ہو کے نہ بیٹھ جاؤ کہ مملکت مل گئی، سلطنت ہاتھ میں آ گئی، حکومت آ گئی، اقتدار آ گیا، دشمن پامال ہو گئے۔ بالکل نہیں۔ اپنی سرحدوں کے اوپر رسالے اور گھوڑے اور قوتوں کے نشانات ہر وقت تیار باندھ رکھو یعنی مملکت حاصل ہونے کے بعد اسکی حفاظت کے متعلق قرآن کی طرف سے یہ چیز آ رہی ہے کہ سرحدوں کی حفاظت پوری پوری کرو، جتنا بھی سامانِ مدافعت ہے، تیار رکھو۔ وہاں تمہارے دشمن، خدا کے دشمن ہیں۔ کیا بات ہے! اگر یہ مملکت طبعی طور پہ ہے تو اس کے مخالفین تمہارے دشمن اگر وہ نظامِ خداوندی کو مٹانا چاہتے ہیں تو خدا کے دشمن۔ ان دونوں دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہر وقت اپنی سرحدوں کو مضبوط رکھو۔ اِن سے بھی جنہیں تم جانتے ہو اور بہت سے ایسے ہیں جنہیں تم جانتے بھی نہیں ہو، ان سے بھی۔ ہر وقت پوری استطاعت کے مطابق **بالقوۃِ**۔ ان سے زیادہ مقرب کون ہو سکتا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہم یہ جو سب سے اولیں درجے کے **السّٰبقون الاولون**، مقربینِ خداوندی ہیں، انہیں مملکت حاصل ہو جانے کے بعد بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اب کہیں لاپرواہ ہو کے نہ بیٹھ جانا کہ صاحب! اب تو سب کچھ مل گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے یہ بات بطور اصول بتا دی کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (57:25) ہم نے مختلف اقوام کی طرف، اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لایا۔

عزیزانِ من! کیا بات ہے، کیا تدریس ہے! انبیاء کو بھیجا۔ پہلی چیز تو یہ کہ ان کو دلائل دیئے۔ بات کی یہاں سے ابتداء ہوتی ہے۔ انہیں دلائل دیئے کہ دوسروں سے علم وبصیرت کی بناء پہ بات کرو، دلائل و براہین کی بناء پہ بات کرو، پہلے ذہنی طور پہ ان کو قائل کرو، اپنے اس نظام کی صلاحیت کے متعلق، اصلحیت کے متعلق، دلائل سے ان کو قائل کرو۔ انہیں بینٰت دے کر بھیجتا ہے۔

اجتماعی نظام ہمیشہ قانون پر عمل پیرائی کا، رہینِ منت ہوتا ہے

عزیزانِ من! اگلا Step (مرحلہ) یہ ہے کہ **اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (57:25) انہیں ضابطہ قوانین دیا کہ جب یہ لوگ اس پر قائم ہو جائیں، اس پر یقین لے آئیں کہ واقعی یہ حق کی بات ہے، پھر ان کو قانون کی ضرورت پڑے گی تو قانون کی ضرورت کی بنا پر یہ قوم ایک امت بنے گی، اجتماعی نظام قائم ہوگا۔ صرف دلائل سے اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضابطہ قانون کی ضرورت ہے۔ یہ ضابطہ قانون کاہے کے لیے دیا جاتا ہے؟ کیا وہ اسی لیے دیا جاتا ہے کہ تلاوت کرو، ثواب حاصل کرو، کھجوروں کی گٹھلیوں پہ گن گن کے

آیہ کریمہ کا ورد کیا کرو؟ کاہے کے لیے یہ کتاب دی جاتی ہے؟ کہا کہ **وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25) تاکہ تم دنیا میں میزانِ عدل قائم کر سکو۔

عزیزانِ من! ایک ایک آیت کے الفاظ میں دیکھیے کہ کیا تدریج آ رہی ہے۔ ابتداء دلائل و براہین کے ذریعے کرو جو اس سے قائل ہوتے چلے جاتے ہیں ان کو ضابطہ قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضابطہ قانون محض کتاب میں رہنے کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا میزان ہے کہ جس میں ہر کسی کے عمل کا ہر ہر ذرہ تلے حتیٰ کہ کوئی ذرہ بھی ضائع نہ ہو اور اس طرح کوئی غلط کام نتیجے سے بچ نہ سکے۔ لہٰذا ایسا میزان قائم کرو کہ **لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25) تاکہ نوعِ انسانی عدل کے ساتھ' انصاف کی رو سے' اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے کیونکہ اگر عدل اور انصاف کے قانون کی حکومت نہ رہے تو کوئی اپنے پاؤں پہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت انسانیت کس طرح لڑکھڑا رہی ہے۔ لہٰذا یہ کہا کہ یہ اتنا کچھ دینے سے ہی کام نہیں چل سکتا۔ کچھ اور دینے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ** (57:25) اور اس کے بعد ہم نے شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی۔ یہ بھی وہی ''انزلنا'' کا لفظ ہے کہ خدا کی طرف سے فولاد دیا تھا' یہ تم نے نہیں بنایا تھا۔ یہ بھی ساتھ دیا' انبیاء کو بھیجا' وحی دی' کتابیں دیں' اور اس کے ساتھ ہی ہم نے شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی۔ یہ بھی ضروری ہے: چار کتاباں عرشوں آئیاں' تے پنجواں آیا ڈنڈا۔''[1] **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ** (57:25) اور ہم نے شمشیر خارہ شگاف (فولاد) نازل کی۔

قرآن حکیم اور شمشیر کا باہمی رابطہ

عزیزانِ من! قرآنِ کریم اور شمشیر کا باہمی رابطہ ہے۔ اس رابطے کے ریفرنس لکھتے جائیے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آیت (57:25) کس تدریج سے آ رہی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کہا کہ **اَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ** (57:25) ہم نے شمشیر خارہ شگاف (فولاد) نازل کی۔ اب تلوار تو جس کے پاس بھی ہوگی وہ تو اپنا کام کرے گی۔ ظالم کے ہاتھ میں بھی ہوگی تو وہ اسی طرح سے قتل کر دے گی' خواہ وہ مظلوم ہی سامنے ہو لیکن اگر وہ ظالم کے ظلم کے مٹانے کے لیے' انصاف پسند کے ہاتھ میں ہوگی' تو وہ ظالم کو کاٹ کر رکھ دیگی۔ تلوار تو صرف ایک قوت ہے۔ دیکھیے کہ کس انداز سے بات کی ہے! کہا کہ **فِيهِ بَاْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) الناس یعنی عام انسانیت کے لیے' اس تلوار میں' شمشیر میں' بڑی سختی ہوتی ہے' اس کے اندر بڑی صلابت ہوتی ہے اور اس میں بڑی منفعت کی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن نے یہاں کافر اور مومن میں فرق نہیں کیا: یہ الناس کے لیے ہے اور یہ جو کہا ہے کہ یہ شمشیر زنی کے لیے بھی ہے تو اس میں صلاحیت کی ضرورت ہے یعنی پہلے تو شمشیر حاصل کرنے کے لیے صلاحیت کی ضرورت ہے' پھر تیغ زنی کے لیے بھی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

---

[1] (اسے استعارۃً یوں سمجھیے کہ) خدا کے ہاں سے چار کتابیں ملیں اور پانچواں ڈنڈا ملا (قوتِ نافذہ کے لیے)۔

عزیزانِ من! میں ابھی صلاحیت اور صالحیت پہ آ رہا ہوں۔ آپ دیکھیے گا کہ ان دونوں میں فرق کیسے ہوتا چلا جا رہا ہے۔ صلاحیت تو سارے انسانوں کے لیے کھلی ہوئی ہے جو بھی اس کے بعد تلوار چلانا سیکھ لے۔ ٹھیک ہے ظلم کے لیے بھی وہ کر سکتا ہے' منفعت کے لیے بھی وہ کر سکتا ہے۔ یہ تو الناس کی بات ہے کیونکہ الناس کے لیے شمشیر نازل کی تو سنیئے' عزیزانِ من! کہ یہ اس لیے نازل کی کہ **لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ** (57:25) یہ دیکھا جائے کہ وہ کون ہے جو خدا کے اس نظام کو قائم کرنے کے لیے مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز مرئی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے ہوتے۔ یہ خدا کی مدد کرنے والے کون ہیں؟ اب آئی' عزیزانِ من! صالحیت کی بات۔ صلاحیت کی بات تو اتنی تھی کہ شمشیر حاصل کی جائے' چلانے کا فن آئے' لیکن صالحیت اس میں آ گئی کہ جو اپنی اس صلاحیت کو خدا کی مدد کرنے کے لیے استعمال کرے اور خدا کی مدد کے ساتھ ''رسلہ'' (57:25) بھی کہا ہے یعنی خدا کے اس نظام کے قیام کے لیے' جو رسولوں کے ہاتھوں اس زمانے میں متشکل ہوتا تھا یا اس وقت تک جب وہ ابھی متشکل نہیں ہوا' اُن بالغیب نتائج کے سلسلہ میں کہ تم کہیں اس خیال سے یہ نہ کہہ دو کہ صاحب! خدا بھی ہماری مدد کا محتاج ہو گیا۔ کہا: نہیں **اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ** (57:25) وہ تو بڑی قوتوں والا ہے' بڑے غلبے والا ہے۔ اس دنیا میں رسولوں کے ہاتھوں سے جو نظامِ خداوندی قائم ہونا ہے' اس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تو کہا یہ ہے کہ ہم نے کتاب کے ساتھ شمشیر نازل کر دی۔

عزیزانِ من! زندگی کا کیا پتہ' خدا توفیق دے تو قرآن کو اس طرح سے سمجھا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کچھ بھی مشکل نہیں' اس کے سمجھنے میں کوئی پیچیدگی نہیں' کوئی منطقی موشگافیاں نہیں' اس میں کوئی فلسفیانہ نکات آفرینیاں نہیں ہیں بلکہ بات تو صاف صاف ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ قرآن حکیم پر کھڑے ہو کے سوچنا پڑتا ہے۔ سو اب آ گئی شمشیر کی ایک بات۔ ہمارے سامنے تو ہلاکو بھی شمشیر اٹھاتا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ بھی شمشیر اٹھاتا ہے۔ شمشیر اٹھانے کی صلاحیت دونوں کے اندر ہے۔ وہ صرف ذاتی منفعت' ذاتی انتقام کے لیے' اپنی قوت کے لیے' یہ شمشیر اٹھاتا ہے اور دوسرا خدا کا نظام جو رسول نے قائم کیا تھا' اس کے قائم کرنے میں' اس کے استبقا میں' اس کو باقی رکھنے میں' اُسے مستحکم کرنے میں' شمشیر اٹھاتا ہے۔ لہٰذا یہاں شمشیر کی ضرورت پڑے گی: یعنی دلائل کے ساتھ' کتاب کے ضابطہ قانون کے ساتھ' میزان قائم رکھنے کے لیے' شمشیر کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آپ کے ساتھ کتاب اور کتاب کے ساتھ شمشیر ہے۔

عزیزانِ من! صالح ہونے کی یہ ضروری شرط ہو گئی اور یہی وہ چیز ہے:

مؤمناں را تیغ با قرآن بس است

شمشیر اور قرآن! کیا بات ہے اس شخص [1] کی!! کہاں سے یہ بات لاتا ہے:

ایں دو قوت حافظِ یک دیگرند

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

دوقوت: قرآن بھی ایک قوت ہے، شمشیر بھی ایک قوت ہے۔ یہ دوقوتیں ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں۔ شمشیر تو قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ کہیں یہ وعظ و نصیحت ہی بن کے نہ رہ جائے، یہ مملکت کا ضابطہ قانون ہو، شمشیر اس کی حفاظت کرتی ہے۔ قرآن شمشیر کی حفاظت کرتا ہے کہ کہیں ہلاکو اور چنگیز کی شمشیر نہ بن جائے، عمر رضی اللہ عنہ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شمشیر بن کے رہے۔ یہ اسکی حفاظت کرتا ہے۔ قربان جائیں اس شخص ❶ پہ!

ایں دوقوت حافظِ یک دیگرند

اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے

کائناتِ زندگی را محورند

زندگی کی ساری کائنات ان کے گرد گھومتی ہے۔ عزیزانِ من! ایں دوقوت حافظِ یک دیگرند۔ ایک مصرع پہ کتابوں کی کتابیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ سارا دین اس کے اندر آجاتا ہے۔ قرآن کی آیت سامنے ہوتی ہے، اسی آیت کا یہ مفہوم ہے۔ اسی کا ہے اور کتنے خوبصورت انداز میں ہے: ایں دوقوت حافظِ یک دیگرند۔ عزیزانِ من! اس قسم کی آپ کو کہیں مثال بھی نہیں ملے گی۔ اس انداز سے بات کا کہنا، قرآن اور شمشیر حافظِ یک دیگرند۔ قرآن ہٹ جائے تو شمشیر ہلاکو ہو جاتی ہے اور رہ جاتی ہے چنگیزی۔ شمشیر ہٹ جائے تو قرآن صرف مُردوں کو بخشنے کے لیے، بغیر سوچے سمجھے تلاوت کرنے کے لیے رہ جاتا ہے:

کہ از یٰس او آساں بمیری

جان نہ نکل دی ہووے تے یٰس سنا دیو تا کہ چھیتی مرے۔ ❷ وہ کہتا تھا خدا نے کہا تھا کہ ہم نے قرآن دیا تا کہ یہ تمہیں حیات عطا فرمائے اِسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ (8:24) تم ہمیشہ ''اللہ اور رسول'' (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے تا کہ تمہیں زندگی عطا کرے مگر یہاں ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ وہ جو زندگی کے آخری دم باقی ہیں یٰسین سناؤ تا کہ جلدی سے وہ ختم کرے۔ وہاں قرآن کے ساتھ شمشیر نہ رہے تو پھر اسی قرآن سے قوموں پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! شمشیر کے ساتھ اگر قرآن نہ رہے تو ''رہ جاتی ہے چنگیزی''، اور دونوں ہوں تو ''حافظ یک دیگرند''، اور جب یہ ایک دوسرے کے محافظ بنتے ہیں تو پھر یہ ''کائناتِ زندگی را محورند'' ہے۔ دوسری جگہ اور وہ بھی بڑا خوبصورت شعر ہے:

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

❷ اگر جان نہ نکل رہی ہو تو اسے سورۃ یٰس سنا دو تا کہ وہ جلد ہی خدا کو پیارا ہو جائے۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اور سنیے عزیزانِ من:

اس بیت کا یہ مصرع اول ہے۔

شمشیر کو مصرع کہنا اس شاعر اقبالؒ (1877-1938) کو ہی زیب دیتا ہے۔ دراصل شمشیر ہوتا ہی ایک مصرع ہے' دو ہو جاتے ہیں تو بیت بن جاتا ہے۔ وہ تو ہوتا ہی مصرع ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ اس بیت کا یہ مصرع اول ہے۔ یہ ابھی پورا شعر نہیں بنا۔ یہ مصرع اول ہے اور ہے بھی ضروری۔ مصرع اول نہ ہو تو شعر بن ہی نہیں سکتا' نامکمل رہتا ہے:

اس بیت کا یہ مصرع اول ہے کہ جس میں
توحید کے پوشیدہ چلے آتے ہیں اسرار

یہ مصرع اول ہے لیکن ناگزیر مصرع اول ہے۔ بیت یا شعر دوسرے مصرع سے بنے گا۔ وہ دوسرا مصرع آگے اس نے کہا ہے۔ اُسے وہ قرآن کہتا ہے۔ دوسرا مصرعِ ثانی قرآن۔ یہ مصرع اول ہے' مگر ہے ناگزیر۔ تو یہ دو مصرعے ہیں: یہ فولاد کی شمشیرِ جگر دار اور دوسرا مصرع جو اس کا ثانی ہے' وہ قرآن۔ یہ دو مصرعے ہوں تو پھر یہ بیت یا شعر بنتا ہے۔ یہ چیز ہے جو قرآن نے بتائی ہے۔

عزیزانِ من! اب ہمارے سامنے یہ بات آ گئی کہ **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ** (21:105) یہ ابدی قانون ہم نے ساتھ لکھ کے دیدیا کہ "ہمارے بندوں کو زمین کی وراثت' استخلاف فی الارض' یہاں کی مملکت' حاصل ہوگی"' جن میں یہ "بات" ہوگی۔ اب میں نے کہا ہے کہ اب میں اس کا کیا ترجمہ کروں۔ اگر میں اس کا ترجمہ صرف صلاحیت کرتا ہوں تو یہاں صلاحیت کے معنی شمشیر حاصل کرنے کی قوت ہوگئی' یعنی شمشیر کو حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کی صلاحیت ہوگی تو اس شکل میں تو کافر اور مؤمن میں فرق ہی نہیں رہا جبکہ یہاں تو لفظ "عبادی" ہے اور خدا کا عبد تو ایسا نہیں ہوتا۔ خدا کے عبد تو صالحین ہونگے' صلاحیت والے صرف الناس ہونگے اور قرآن نے اُن کے متعلق عبدالطاغوت کہا ہے یعنی وہ شیطان کے "عبد" ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں تلوار تو ہوتی ہے لیکن ساتھ قرآن اِس کا محافظ نہیں ہوتا چنانچہ یہ عبدالطاغوت ہیں جبکہ ان دوسروں کو قرآن نے "عبادی" کہا ہے: ہمارے بندے کہا ہے۔ ان کے لیے صالح کا یہ لفظ صرف صلاحیت نہیں بلکہ ان کے اندر صالحیت ہوتی ہے اور صالحیت کے معنی ہیں کہ وہ شمشیر کو قرآن کی حفاظت میں رکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ کہا کہ ہم نے یہ وراثت ارض کا ابدی قانون لکھ دیا کہ مملکت اور اقتدار اور حکومت تو حاصل ہوگی جس کے لیے صلاحیت شرط ہے اور جس کا جی چاہے لے لے' خواہ وہ ہلاکو ہو' چنگیز ہو' ہٹلر ہو' کسے باشد لیکن اس کے ساتھ اگر صالحیت بھی ہے تو وہ ہمارے بندے ہونگے۔ انہیں بھی یہ اسی شرط کے ماتحت ملے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ جو صالحیت ہے تو یہ صلاحیت کے ساتھ انہیں کیسے ملتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ جو صالحیت والے ہیں ان کیلیے تو ذرا شرط مختلف ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (24:55) ہم نے ان لوگوں سے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، ان سے یہ کہہ رکھا ہے کہ انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (39:74)۔ عزیزانِ من! یہ وہی صالحات ہے جن کا خدا نے وعدہ کیا ہوا ہے اور کہا تھا کہ **"وعدًا علینا حق"** ہے: ہمارا وعدہ ضرور پورا ہوتا ہے، ہم نے وعدہ کیا ہوا ہے، تم میں سے جو بھی ایمان لائے اور عملِ صالح کرے۔ اب یہاں "صالح" لفظ آ گیا اور وہاں وہی صالح سے صالحون ہے جو کہا گیا ہے۔ ایمان اور اعمالِ صالح سارے قرآن میں آپ کو اکٹھے ملیں گے۔ ہم نے صالح کا ترجمہ نیک کیا اور نیکی کے معنی ہم نے پھر وہی لیے جس میں قوت مفقود ہو جائے۔ اس طرح اس میں نیکی کا ترجمہ یہ ہو گیا۔

سارے قرآن میں اعمال کے ساتھ صالحات کا لفظ ہے اور وہاں کہا ہے کہ وراثتِ ارض کا یہ قانون ہے کہ یہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحات کے بدلے میں ملتی ہے۔ ہم نے اس بات کا وعدہ کیا ہوا ہے کہ جو لوگوں میں سے ایمان لائے ان حقیقتوں کی صداقت پہ یقین رکھیں اور اس کے اعمال صلاحیت پیدا کریں۔ اسی لیے میں نے اپنے "مفہوم القرآن" میں ان کا ترجمہ صلاحیت بخش کیا ہوا ہے اور وہ جامع ہے یعنی صلاحیت بخش اعمال جن میں یہ چیز پیدا ہو اور اس کے عوض خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) ہم انہیں اس زمین پر حکومت عطا کریں گے۔ عزیزانِ من! ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ یہ حکومت ہے، استخلاف فی الارض ہے اور یہ ایک لازمی نتیجہ ہے جس کے بارے قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اس امر کا وعدہ کر رکھا ہے، اس کا پورا کرنا ہم پہ لازم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم خلافت عطا کریں گے۔ ایک تو یہ خلافت ہوتی ہے اور دوسری بات آپ کو معلوم ہے کہ "ہر پیر دا اک خلیفہ ہوندا اے۔ اوہنوں خلافت ملدی ہیگی اے۔ کئی کئی ہوندے نیں۔ ایسے ای آیت دا ترجمہ اے۔ یعنی اے ایناں دے تسبیح دے دانے گنن نال خلافت ملدی اے۔ او کیندے نیں: "او خلافت دتی تہانوں۔" تے اے اک اپنے والا جھونپڑا اوی نئیں ملیا ہویا ہیگا اور کیندے نے "جی! اے خلافتِ روحانیت ہے۔"[1] لہٰذا اصل میں خلافت تو یہ ہے۔ ان کی روحانیت کا عالم الگ ہے۔ اس کے لیے قطعاً نہ زمین کی ضرورت، نہ مملکت کی، نہ مقان کی، نہ زمان کی، کچھ نہیں۔ یہ ایک معلق روحانیت ہے جو ملتی ہے۔ "ہن ایناں نوں کون کہے، پئی ساڈے تے نائی نوں وی خلیفہ کیندے نیں۔ تے گل ٹھیک ہے اووی سر منڈے نیں، اے وی سر منڈ دے ہیگے۔"[2]

---

[1] ہر پیر کا ایک خلیفہ ہوتا ہے۔ اسے خلافت ملتی ہے۔ یہ کئی ایک ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے (اس) آیت کا ترجمہ ہے۔ یعنی ان کے تسبیح کے دانے گننے سے یہ خلافت انہیں مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ہم نے تمہیں خلافت عطا کی۔" انہیں خود تو اپنی ایک جھونپڑی بھی نصیب نہیں ہے، اور کہتے یہ ہیں کہ "جی! یہ خلافت روحانیت ہے۔"

[2] اب انہیں کون بتائے کہ ہمارے ہاں حجام کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔ بات صحیح ہے کہ وہ بھی سر مونڈھے ہوتے ہیں اور یہ بھی سر مونڈھتے ہیں۔

عزیزانِ من! قرآن ایمان اور اعمالِ صالح کا فطری اور لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض بتاتا ہے' مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ روحانیت ہے جی۔ اچھا جی! یہ قرآن ہے' کہیں نہیں جانے دیتا۔ کہتا ہے کہ **کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (24:55) اسی طرح سے استخلاف فی الارض جیسا تم سے پہلی قوموں کو حاصل ہوا تھا۔ ان قوموں کو تو یہ خلافت روحانیت کی حاصل نہیں رہی۔ قرآن تو بتا رہا ہے کہ وہ استخلاف فی الارض کیا تھا جو حاصل ہوا۔ جسے قرآن وراثتِ ارض کہتا ہے یہ کا ہے کے لیے دیا جائے گا۔ اب یہاں آ گئی وہ صلاحیت سے آگے صالحیت۔ کہا کہ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ** (24:55) تاکہ وہ دین' نظامِ زندگی' جو ہم نے ان کے لیے پسند کیا ہے' اسے قائم کیا جا سکے' متمکن کیا جا سکے' Establish کیا جا سکے۔ نظر آ گیا کہ **استخلاف فی الارض** کے بغیر دین قائم ہی نہیں ہو سکتا' دین Establish ہی نہیں ہو سکتا اور استخلاف میں تین چیزیں آ گئیں: ایمان' اعمالِ صالح اور صالحیت۔ اعمالِ صالح کہلا نہیں سکتے اگر ان کا نتیجہ استخلاف فی الارض نہیں ہے اور استخلافِ فی الارض جو ہے یہ لازمی شرط ہے دین کے تمکن کے لیے۔ دین قائم ہی نہیں ہو سکتا اگر اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ اسی کے لیے تو یہ پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ آج تک تیس [1] برس سے یہ بحثیں چلی آ رہی ہیں کہ پاکستان مانگا کیوں تھا۔ انہیں کون بتائے کہ کیوں مانگا تھا۔ سوئے ہوئے کو تو جگا بھی دے جاگتوں کو کون جگائے۔ کس کو پتہ نہیں ہے کہ کیوں مانگا تھا۔ دس برس تک' 1930ء سے' اقبالؒ (1877-1938) چلاتا ہوا مر گیا کہ کیوں مانگا تھا۔ انہی آیات کے تابع وہ کہتا تھا کہ دین کا تمکن نہیں ہو سکتا جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ وہ مذہب رہتا ہے' دین نہیں ہو سکتا۔ یہ تھی آیت اس کے سامنے دس برس تک۔ وہ قائداعظمؒ (1876-1948) جس کے ہاتھ میں وہ شمع دے کے چلا گیا' کونے کونے' کھدرے کھدرے' گونجتا چلا گیا کہ او بابا اس دین کا تمکن نہیں ہو سکتا' اسلام قائم نہیں ہو سکتا' جب تک اپنی آزاد مملکت نہ ملے۔ یہ دین کے تمکن کے لیے' اس آزاد مملکت کی ضرورت ہے **وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا** (24:55) اور یہاں کی زندگی میں تمہیں ہر وقت کے خوف کی جگہ امن اور اطمینان نصیب ہو جائے گا۔ لہٰذا پہلی چیز تو دین کے تمکن کے لیے یہ ہوگی۔

یہ دین کا تمکن کیا ہے؟ **يَعْبُدُوْنَنِيْ** (24:55) تاکہ تم صرف ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کر سکو اور **لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا** (24:55) اور ان میں انسانوں کا کوئی خود ساختہ قانون شامل نہ ہو۔ یہ تھا جی' وہ استخلافِ فی الارض ملنے کا طریقہ: ایمان اور اعمالِ صالح۔ اِس استخلاف فی الارض کا منتہیٰ' مقصود' مطلوب' تمکن دین۔ تمکنِ دین کے معنی صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کرنا ہے' اس شرط کے ساتھ کہ اس کے اندر کسی اور کے قوانین شامل نہ ہوں۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد پھر کہا کہ **وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ** (24:55) جو پھر کفر کی روش اختیار کر لے' اِس سے عملاً انکار کر دے تو **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** (24:55) یہ لوگ اس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو

---

[1] یہ نومبر 1976ء کی 14 تاریخ کو کہا گیا تھا۔

انہیں صحیح منزل کی طرف لے جارہی ہے اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے۔ اس لیے کہا کہ ٹھیک ہو جاؤ' ایسا نہ ہو کہ پھر فسق کی زندگی بسر کرتے پھرو۔ یہ جہنم ہے' یہ تمہارے لیے جحیم ہے۔

عزیزانِ من! اب پھر سورۃ الانبیاء کی اس آیت پہ آ جایئے جس میں کہا تھا کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (21:105) ہم نے اس حقیقت کو' ہر کتاب وحی میں' متعلقہ امور کو سامنے لانے کے بعد بطور ایک اساسی قانون لکھ دیا تھا کہ ارض (نظام مملکت وحکومت اور وسائل پیداوار وغیرہ) کے حقیقی وارث وہی لوگ ہوں گے جن میں ان امور کی صلاحیت ہوگی اور جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کریں گے۔ البتہ' عزیزانِ من! ایک چیز قرآن کے مطالعہ سے' ہمیں پتہ چلتی ہے کہ ایک اسٹیج یہ ہوتی ہے کہ کوئی قوم کسی مستبد قوم کے پنجہ استبداد اور محکومیت میں گرفتار ہو جاتی ہے' جیسے بنی اسرائیل کی قوم فرعون کے پنجے میں گرفتار و محکوم ہوگئی' محکومی کی حالت میں (اس میں شبہ نہیں) کہ ان کے اندر فکری طور پر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے وہاں یہ جذبہ بیدار کیا کہ محکومی کی زندگی انسانیت کی زندگی نہیں ہے لیکن فرعونیت کا فولادی قوت اور استبداد اتنا غالب تھا کہ ان کے اندر رہتے ہوئے وہ قوم اپنی آزادی اور اپنی مملکت حاصل نہیں کر سکتی تھی لہٰذا وہاں کے متعلق قرآن نے یہ کہا کہ وہاں یہ خیال بیدار کیا جائے کہ یہ زندگی انسانیت کی زندگی نہیں ہے۔ لہٰذا اس حالت میں تو خدا کا دین تمہارے حصہ میں آ ہی نہیں سکتا اس کے لیے تو آزاد مملکت کی ضرورت ہے چنانچہ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ احساس بیدار کیا جسے قرآن نے کہا ہے کہ ان سے کہو کہ کوئی بات نہیں' اپنے اپنے گھروں کو ہی قبلہ بنالو' ابھی تو بڑی بات یہی ہے کہ تم اپنے اندر انفرادی طور پر یہ چیزیں پیدا کرو کیونکہ ابھی وہ وقت نہیں آیا' تمہارے پاس بھی قوت نہیں آئی کہ اس حکومت سے ٹکر لے لو تو اس وقت کیا کیا جائے گا؟ کہا کہ اس سرزمین کو چھوڑ کر کسی دوسری سرزمین کی طرف منتقل ہو جاؤ' جہاں اپنی حکومت قائم کرنے کی فضا زیادہ سازگار ہو۔ یہ جو امکان ہے وہاں سے نکل کر دوسری جگہ چلے جانا یہ حکومتیں تو اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ یعنی اگر یہ محکوم قوم نکل کر چلی جائے تو یہ حاکم قوم حکومت کس پہ کرے گی' پھر انہیں حکومت کرنے کے لیے ایک محکوم قوم کا رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان کے لیے یہ جو فرعون نے اتنی زیادہ مخالفت کی تھی' اگر دیکھا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے مانگتے کیا تھے سوائے اس کے کہ میں تم سے صرف یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دو اور اس نے اس چیز کی بھرپور مخالفت کی۔ تو ظاہر ہے کہ پھر وہ اُسے جانے کیسے دے' وہ حکومت کس پہ کریں۔ لہٰذا یہ جو چیز ہے کہ اس کے لیے یہ امکانی قوتیں پیدا کرنا' امکانی سامان ذرائع پیدا کر دینا کہ قوم وہاں سے نکل آئے' قرآن نے اتنے حصے کو ''احسانِ خداوندی'' کہہ کر پکارا ہے۔ واقعی اس قوم میں ابھی اتنی قوت نہیں ہوتی کہ ٹکرا لے لیکن اس کے پنجہ استبداد سے رستگاری بھی بڑی چیز ہے۔ اس لیے اس نے کہا ہے کہ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ o وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ (28:5-6) چنانچہ اس کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کیے جا رہا تھا' اسے ہمارے نعمتوں

سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطہ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔

قرآن نے ہجرت کے عمل کو خدا کا احسان کہا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ ہماری مشیت کے پروگرام میں پھر یہ بات آئی کہ اس قوم پر ایک احسان کرو اور وہ احسان یہ کہ یہ اس مملکت کے خطے کو چھوڑ کے ایک ایسے خطہ زمین کی طرف ہجرت کر کے آ جائیں جہاں انہیں اپنی مملکت قائم کرنے کے امکانات زیادہ روشن ہوں تا کہ ہم انہیں ارض کا وارث قرار دیں اور نُمَكِّنَ لَهُمْ (28:6) وہاں انہیں تمکن عطا کر دیں۔ تو یہ جو وہاں سے ہجرت کر کے ادھر آ جانے کی بات تھی اسے خدا نے اپنا احسان کہا ہے۔ یہ چیز ان کے قوتِ بازو سے نہیں ہوئی' یہ سامان اسباب ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق میں کسی دوسرے وقت بتاؤنگا کہ مستبد قوتوں کے اپنے نظام کے اندر خرابیاں اتنی ہوتی ہیں کہ وہ سنبھال نہیں سکتے۔ خیر! اسے قرآن نے خدا کا احسان کہا ہے۔ اب وہ یہاں اس سرزمین میں تو آ گئے۔ یہ صرف حصہ لا ہے ابھی۔ یعنی ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بات صرف ابھی ہوئی ہے۔ کہا ہے یہ اس لیے ضروری تھا تا کہ یہ اپنی مملکت قائم کر سکیں۔ وہ مملکت قائم کر کے نہیں دیدی گئی' صرف اس کو قائم کرنے کے امکانات جو تھے وہ تھی جو چیز ان کو بطورِ احسان دی اور یہاں آنے کے بعد پھر وہی شرط لاگو ہے۔ سورۃ اعراف کی آیت 137 میں یہ ساری کشمکش دہرانے کے بعد کہا کہ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (7:137)' وہی قوم ہے جس کو اس قدر کمزور بنا دیا گیا تھا' وہاں ہم نے اس قوم کو اس ملک کے مشرق اور مغرب کے حصوں کی وراثت ارض دیدی وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (7:137) اور اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں خدا کا وہ وعدہ پورا ہوا' وہ قانون اپنے نتائج لے کر سامنے آ گیا جو خدا نے ان سے وعدہ کیا تھا' وراثتِ ارض ان کو مل گئی۔ یہاں پہلے تو کہا تھا: ''دمن''، ہم نے ان پر احسان کیا اور یہ امکانی قوت ان کو عطا کر دی۔

عزیزانِ من! یہ چیز بڑی غور طلب ہے۔ اتنا حصہ تو صرف بطورِ احسان ہو جاتا ہے اور آگے یہ کہا کہ یہاں ہم نے ان کو مملکت Establish (قائم) کرا دی۔ انہوں نے اپنی مملکت Establish (قائم) کر لی لیکن اس جگہ اُسے بطورِ احسان نہیں کہا۔ کہا کہ بِمَا صَبَرُوْا (7:137) وہ اس لیے کہ یہاں انہوں نے تمام مشکلات کا مقابلہ بڑی استقامت سے کیا' پھر تمکن حاصل ہوا' خالی سرزمین کے مل جانے سے تمکن نہیں حاصل ہو جاتا۔

مملکتِ پاکستان کی تاریخ بعینہ بنی اسرائیل کی تاریخ ہے

عزیزانِ من! ہماری تاریخ بعینہٖ ہی بنی اسرائیل کی تاریخ ہے۔ یہ ہندوؤں کے پنجہ استبداد سے رستگاری تھی۔ اس دَور کی تاریخ' ذرا مسلم لیگ یا قائداعظمؒ (1876-1948) یا اقبالؒ (1877-1938) کے دَور سے پہلے دیکھیے۔ مسلمان ان کے جال میں پھنسا ہوا تڑپ رہا تھا'

پھڑک رہا تھا، لیکن اس سے نجات اور رستگاری کا کوئی راستہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے جال کے پھندے اتنے سخت کر رکھے تھے کہ یہ ان سے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ چیز تھی کہ انہیں پہلے اقبالؒ جیسا دیدہ ور، اور پھر قائداعظمؒ جیسا مدبر اور دیانتدار ایک لیڈر مل گیا اور اس کے حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ انگریز کو ضرورت پیش آئی کہ وہ چھوڑ کے یہاں سے چلا جائے۔ یہ جو وہاں سے الگ ہونے کا ہمیں امکان ملا، یہ ہمارے اوپر احسانِ خداوندی تھا۔ کاہے کے لیے تھا؟ تاکہ تم یہاں ہمارے قانون کے مطابق حکومت قائم کرسکو۔ اتنا حصہ ''لا'' ہے۔ یہاں ہم نے اس کے قانون کے مطابق حکومت قائم نہیں کی۔ اب اگر اس کو آپ باقی بھی رکھیں گے تو صلاحیت ہوگی، منشائے خداوندی کے مطابق تو مملکت اس وقت بنے گی جب آپ کے ہاں صالحیت پیدا ہوگی اور جب تم خدا کے نظام کو قائم کرنے کے لیے اس کی مدد کرو گے اور یہ بِمَا صَبَرُوْا ہے۔ اس کے لیے یہاں آکے بڑی مشقتیں، بڑے تکلیف دہ تصادمات ہونگے، انکا مقابلہ استقامت سے کرنا پڑے گا جب یہ صورت حاصل ہوگی۔ اور کہا کہ یہ جو ہم نے وراثتِ ارض کا ابدی قانون دیا ہے وہ یہ ہے کہ عبادیت صالحون کو ملتی ہے۔

بلاغ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (21:106) ہر وہ قوم جو ہمارے قوانین کی اطاعت کرنا چاہتی ہے، اس کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، اس کے لیے اس آئینِ جہاں داری کے اندر بلاغ ہے۔ ایک لفظ ''بلغ'' کے معنی تو پہنچنا یا پہنچانا ہوتا ہے۔ بلاغ کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ آج ہم تو اسے انکے لیے استعمال کر رہے ہیں وہ جو ذرائع ابلاغ ہیں یعنی ریڈیو، ٹیلیویژن، اور یہ ساری جتنی ابلیس اور اس کے جنود کی آوازیں ہیں، پہنچانے کے معنی میں، قرآن کا بلاغ کیا ہے۔ قومِ عابدین کیا ہے وہ قوم جو ہمارے قوانین کی اطاعت کرنا چاہتی ہے، اس کے لیے اس اصول کے اندر منزل تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ بلاغ کے معنی ہیں ''منزل تک پہنچنا'' وہ قوم جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اس کے لیے منزل تک پہنچنے کی نشانی۔ اس آئین کے متعلق ہے کہ وراثت صالحون کو ملا کرتی ہے۔ یاد رکھو! وراثتِ ارض اس کے بغیر نہیں مل سکتی، وراثتِ ارض ملی ہوئی چھن جاتی ہے اگر وہ صلاحیت باقی نہ رہے۔ کہا کہ یہ ہے وہ مقصد۔ یعنی وراثت ارض کے لیے صلاحیت اور قوانین خداوندی کی اطاعت شرط ہے۔ ان کے بغیر، ہنگامی طور پر غلبہ تو حاصل ہوسکتا ہے، وراثت نہیں مل سکتی۔

رحمت للعٰلمین کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب سنیے وہ آیت جو ہم روز پڑھتے ہیں۔ وہ ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (21:107) اے رسول! تم اقوام عالم سے کہہ دو کہ ان کی صحیح نشوونما، جس سے انسانی صلاحیتیں بیدار ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں، اسی ضابطہ کی اطاعت سے ہوسکتی ہے۔ جو قوم اس حقیقت سے انکار کرے گی، اس مرحمت ایزدی سے محروم رہ جائے گی (9:61)۔ یوں تمہاری بعثت تمام اقوام

عالم کے لیے حقیقی رحمت کا موجب بن جائے گی۔ یہ ہے وہ مقصد۔ یعنی ہم نے تمہیں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ تم اقوامِ عالم کے لیے رحمت کا موجب بن جاؤ۔ یہ ہے وہ اصول جو پہلے دیا ہے۔ رحمت کے معنی اب آپ کو پتہ ہے کہ یہ وہ طریق عمل ہے جس سے انسان کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پا جائیں جیسے جنین رحمِ مادر میں نشوونما پاتا ہے۔ رحمت کے یہ معنی ہیں: اقوامِ عالم کی انسانیت کی صلاحیتوں کی نشوونما' بالیدگی اور برومندی حاصل کرنا تاکہ انسانیت اپنی صلاحیتوں کو بیدار کر سکے۔ اے رسول ﷺ! ہم نے تمہیں اس قرآن کو دے کر بھیجا۔ اب صرف قرآن ہے۔ اس کا ذریعہ باشمشیر ہے۔ اور شمشیر حاصل کی جائے گی قوت سے۔ لیکن یہ دیدی جائے گی قرآن کی حفاظت میں اور پھر اس سے اس دنیا میں جو نظام قائم ہوگا اس سے اقوامِ عالم کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی۔ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے نبی اکرم ﷺ کو رحمت للعلمین کہا ہے۔ ہم تو اس لفظ کو ہی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں اور رحمت للعلمین بڑی ہی اہم چیز ہے۔ رحمت یہ حضور ﷺ کا لقبِ مبارک ہے اور ہم ہر جگہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بجا ہے مگر ہم نے کبھی اس کے معنی پہ غور نہیں کیا کہ رحمت بنتی کس طرح سے ہے' کس کے لیے رحمت ہے؟ یہاں تو عالمین کا لفظ ہے۔ نظر آتا ہے کہ یہ ہر ایک کے لیے ہے کسے باشد لیکن نہیں' قرآن نے دوسری جگہ حضور ﷺ کے متعلق کہا ہے کہ آپ ﷺ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ (9:61) ان کے لیے رحمت ہیں جو اس صداقت پر ایمان لائیں۔ تو اب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کو ''رحمت'' ان کے لیے کہا ہے جو اس صداقت پر ایمان لائیں۔ اور ''رحمت للعلمین'' (21:107) میں ان کے لیے کہا ہے جو ان میں سے ایمان لائیں۔ تو بات ٹھیک ہے کہ یہ دین نہ قومی ہے' نہ نسلی ہے' نہ جغرافیائی ہے' یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے کھلا ہوا ہے۔ پوری نوعِ انسانی میں سے جو بھی ان صداقتوں پر رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لے آئے گا اس کے لیے رسالتِ محمدیہ ﷺ رحمت بن جائے گی۔ آسمان سے جو بارش برستی ہے اسے بھی ہم رحمتِ خداوندی کہتے ہیں' یہ بارش خدا کی رحمت ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ رحمت کس کے لیے بنتی ہے؟ یہ اس کسان کے لیے رحمت ہے جس نے اپنی زمین کو اس ''رحمت'' کے جذب کرنے کے لیے' اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے' تیار کر رکھا ہوتا ہے۔ بنجر زمینوں پہ بھی بارش برستی ہے حتیٰ کہ سعدی کے الفاظ میں کہ رُوڑی تے وی تے مینہ ورداہیگا اے۔ اوہدی بوزیادہ ہوجاندی ہیگی اے۔ [1] آسمان سے جو بارش برستی ہے وہ یہ فیصلہ نہیں کرتی کہ مجھے اُس زمین پر برسنا ہے جسے اس نے تیار کر رکھا ہے اور بیج بھی ڈال رکھا ہے وہاں کھیتیاں برومند ہونگی۔ وہ تو ہر قسم کی زمین پر برسے گی وہ رحمتِ ایزدی برسے گی۔

عزیزانِ من! اب اس رحمت کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ پھر اس رحمتِ خداوندی سے فائدہ کون اٹھاتا ہے؟ اس کے قانون کے مطابق یہ رحمت اس کسان کے لیے بنے گی جس کسان نے اپنی زمین کو' اس قانون کے مطابق' زراعت کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ یہ **رحمة للذین اٰمنوا منکم** (9:61) ان میں سے ان کے لیے ہوگی۔ اگر آپ مجھے پانچ دس منٹ اور دیدیں تو یہ سورۃ ختم ہوجاتی

---

[1] گوبر کے ڈھیر پر بھی بارش برستی ہے اس سے اس کی بدبو اور بڑھ جاتی ہے۔

ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن سورۃ کے آخری حصہ میں پوری سورۃ کے مضامین کو سمٹا کے رکھ دیتا ہے۔ یہاں کہا کہ قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (21:108) اے رسول! اعلان کردو کہ میری طرف تو وحی کے ذریعے یہ ایک ہی اصول نازل ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اقتدار اور اختیار اور قانون صرف ایک خدا کا ہے جو چل رہا ہے۔ آخری تت کڈیا ہویا جنوں کیندے نیں [1] وہ یہ ہے۔ لبِ لباب یہ ہے کہ ایک خدائے واحد کا اقتدار و اختیار ہے۔ اور اس کے بعد ان سے پوچھو کہ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ (21:108) کیا تم اس کے اقتدار کے سامنے جھکتے ہو یا نہیں؟ پوچھو ان سے کہ تم اپنی زمین کو اس رحمت کے لیے تیار کرتے ہو کہ نہیں کرتے اور فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ (21:109) اگر اس کے بعد بھی وہ روگردانی کرلیں، گریز کی راہیں نکالیں، پیٹھ موڑ کے چل دیں، اس پہ کان نہ دھریں تو پھر ان سے کہا کہ اٰذَنۡتُکُمۡ عَلٰی سَوَآءٍ (21:109) میں نے یکساں طور پہ پوری انسانیت تک اس پیغام کو پہنچا دیا ہے۔

عزیزانِ من! آسمان سے برسنے والے بادل نے زمین اور زمین میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ عَلٰی سَوَآءٍ (21:109) میں نے ہر ایک تک یہ بات یکساں طور پہ پہنچا دی ہے۔ اب یہ رہا کہ وہ جو کہا گیا ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے تو سن رکھو کہ وَاِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ (21:109) میں نہیں جانتا کہ تمہاری تباہی کے دن قریب آ گئے ہیں یا ابھی اس میں کچھ وقت ہے۔ یہ خدا کے حساب کے مطابق ہوگا۔ میرا کام تو اس چیز کو پہنچا دینا تھا سو پہنچا دیا۔ اگر تم منافقانہ روش اختیار کرلو، کہ دل میں کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرو، تو اس سے بھی وہ تباہی رک نہیں سکتی۔ اس لیے کہ اِنَّہٗ یَعۡلَمُ الۡجَہۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَیَعۡلَمُ مَا تَکۡتُمُوۡنَ (21:110) خدا کا قانونِ مکافات تمہاری پوشیدہ اور ظاہر ہر بات سے واقف ہے۔ مجھ سے آ کے تم کس قسم کی باتیں کرتے ہو، تمہارے دلوں میں کیا ہوتا ہے، یہ جو روش تم نے اختیار کی ہے، میں اس تک بھی نہیں جانا چاہتا۔ یہ خدا جانتا ہے کہ زبان سے تم کیا کہتے ہو اور دل میں کیا ارادے ہیں۔ پاکستان اسلام کا نظام قائم کرنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا مگر وہ قائم نہیں کیا۔ خدا کہتا ہے کہ اچھا! میں جانتا ہوں جو تم کہتے ہو۔

عزیزانِ من! دلوں میں کیا ہے یہ خدا جانتا ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے اگر اس تباہ کن گھڑی کے آنے میں وقت لگ رہا ہے، اس کے آنے میں ہنوز کچھ دیر ہے تو وَاِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ (21:111) مجھے اس کا بھی علم نہیں کہ یہ تاخیر تمہارے لیے مزید مصیبت کا موجب بن جائے گی یا اس سے صرف اتنا مقصود ہے کہ تم کچھ وقت کے لیے اور متاعِ زندگی سے فائدہ اٹھا لو۔ اور اگر اس میں کچھ وقت لگ رہا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ خدا کا قانون چلا ہوا کارتوس ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس مہلت کے وقفے کے اندر پھر تم ان چیزوں سے فائدہ بھی حاصل کر سکتے ہو۔ خوب عیش اڑاؤ اور زور سے پیؤ ٹھیک ہے۔ اور پھر وہ جو خبر آیا کرتی ہے کہ انہوں نے جی رات کو اتنی پی کہ صبح سارے ہی مر گئے۔ کہتا ہے کہ یہ مہلت کا وقفہ اس لیے ہوتا ہے کہ تم اور پیؤ۔

---

[1] جسے لبِ لباب کہتے ہیں۔

رسول نے، ہدایت خداوندی کے مطابق قوم سے یہ سارا کچھ کہہ دیا اور اس کے بعد **قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ** (21:112) بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ بارِالٰہا! اب تو (مجھ میں اور ان لوگوں میں) حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔

نبی اکرم ﷺ کا ایک سبق آموز فرمان

عزیزانِ من! آپ ﷺ نے عرض کیا کہ اے میرے پرودگار! میں کچھ نہیں چاہتا تو حق کے ساتھ اپنا فیصلہ کر دے، میں کوئی رعایت نہیں مانگ رہا۔ کیا بات ہے! ایتھے حضرت صاحب رات نوں جا کے تقدیراں موڑ لے اوندے ہیگے نیں ❶ کہ جی، ہم نے تقدیر کے اوپر دیکھا تھا کہ فلاں فقیر صاحب نے کہا تھا کہ تمہارے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگی اور آپ نے تو کہا تھا، لڑکا پیدا ہوگا۔ یہ کیا تھا؟ ان کے علم میں نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ نہیں علم میں تھا: تمہاری تقدیر کی تختی پہ تو یہی لکھا ہوا تھا، لڑکی پیدا ہونی تھی تو پھر کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے کہ ہمارے منہ سے لڑکا نکل گیا تو ہم نے جا کے پھر کہا کہ ساڈی گل رکھ لے۔ فیر یار جے ہوئے اوہدے لنگوٹیا یار جیویں ہونداہیگا اے اسی۔ منالیا اونوں۔ ❷ **قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ** (21:112) اے میرے نشوونما دینے والے! حق کے ساتھ، جو فیصلہ ہے، کر دے۔ مجھے منظور ہے۔ جو بھی تیرا فیصلہ ہوگا اگر ہمارے خلاف بھی ہوگا تو بھی ہم بگڑیں گے نہیں کہ ہمارے خلاف ہے۔ اس کے بعد بھی **و ربنا الرحمٰن المستعان علیٰ ما تصفون** (21:112) ہم تیری ہی طرف رجوع کریں گے کہ ہم سے کوئی غلطی رہ گئی ہے، اس کو دُور کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما دے۔ جو کچھ یہ ہمارے خلاف کہہ رہے ہیں، اس سے بچنے کے لیے، اس کا جواب دینے کے لیے، ہم میں اگر کوئی تدبیری غلطی رہ جائے تو اس کو دُور کرنے کے لیے بھی ہم تیری ہی طرف رجوع کریں گے، تیرا فیصلہ نہیں بدلوائیں گے، فیصلہ تو تیرا حق کے ساتھ ہوگا" اے بارِالٰہا! ہمارا نشوونما دینے والا تو ہی خدائے رحمٰن ہے۔ ہم اس سے اس امر کی توفیق طلب کرتے ہیں کہ وہ ہماری صلاحیتوں کو ایسی بھرپور نشوونما عطا کر دے جس سے ہم تمہاری ان باتوں کا اچھی طرح مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں (1:4)۔"

عزیزانِ من! یہاں سورۃ الانبیاء کی آخری آیت آ گئی۔ آئندہ درس میں ہم سورۃ الحج 22 ویں سورۃ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ یہاں تو حضرت صاحب رات کو بدرگاہِ رب العزت جاتے ہیں اور تقدیر کا لکھا ختم کرآتے ہیں۔

❷ ہماری بات رکھ لو۔ پھر دوست جو ہوئے اس کے، لنگوٹیا دوست، اس سے اپنی بات منوالی۔

کتابیات (حصہ اردو)

۱۔ پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۵۵ء

۲۔ پرویز: لغات القرآن جلد اول، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰ء

۳۔ پرویز: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰ء

۴۔ پرویز: لغات القرآن جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱ء

۵۔ پرویز: لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱ء

۶۔ پرویز: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۹۴ء

۷۔ پرویز: شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۹۴ء

۸۔ پرویز: برق طور، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۹۳ء

۹۔ پرویز: ابلیس و آدم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۰۔ پرویز: مجلس اقبال (شرح مثنوی اسرار خودی و رموز بے خودی)، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۶

۱۱۔ پرویز: مجلس اقبال (حصہ دوم) (شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۷ء

۱۲۔ پرویز: جہان فردا، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۳۔ پرویز: کتاب التقدیر، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۸۶ء

۱۴۔ پرویز: مطالب الفرقان جلد اول تا ششم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۸۷، ۱۹۸۳، ۱۹۷۹، ۱۹۸۱، ۱۹۸۲، اور ۱۹۸۵ء

۱۵۔ پرویز: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۶۔ پرویز: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۴۹ء

۱۷۔ پرویز: مفہوم القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور

۱۸۔ پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۶ء۔

۱۹۔ پرویز: سلیم کے نام جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۸۶ء

۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (ادارت) مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور ۲۰۰۴

۲۱۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)، مطالب القرآن فی دروس الفرقان: سورۃ الکہف اور مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور ۲۰۰۴

۲۲۔ محمد اشرف ظفر: مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی (اضافہ شدہ ایڈیشن)، اشرف پبلی کیشنز، لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۲۳۔ تمنا عمادی: امام زہری و امام طبری، تصویر کا دوسرا رخ، الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، کراچی (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۲۴۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوان غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور ۲۰۰۲ء

۲۵۔ شعبہ اردو: تحقیق، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۹۵-۱۹۹۴

۲۶۔ مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم: وضع اصطلاحات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء

۲۷۔ انوار ہاشمی: تہذیب کی کہانی، کراچی بک سنٹر، کراچی ۱۹۷۹ء

۲۸۔ عزیز احمد صدیقی (مؤلف): ہندو مذہب کی تاریخ اور ہندی مسلمان، پوسٹ بکس نمبر ۸۱، کراچی، ۲۰۰۰

۲۹۔ حفیظ گوہر: پاکستانی شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، گوہر پبلی کیشنز، لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۳۰۔ حالی، مولانا الطاف حسین: مسدس حالی، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور (سن اشاعت درج نہیں ہے)

۳۱۔ مولانا عنایت اللہ اثری وزیر آبادی: حصول تیسیر البیان (اعلیٰ) اصول تفسیر القرآن، گجرات، ۱۹۵۵ء

۳۲۔ شبیر احمد: تعلیم کی کہانی، کفایت اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۴ء

۳۳۔ مجلّہ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۵ء، لاہور

۳۴۔ طلوع اسلام جنوری ۱۹۸۳ء، فروری ۱۹۸۳ء

۳۵۔ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۸ء ادارہ طلوع اسلام لاہور

۳۶۔ طلوع اسلام جنوری ۱۹۶۸ء ادارہ طلوع اسلام لاہور

۳۷۔ ابوالاعلیٰ مودودی: مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ۱۹۴۱ء ایڈیشن

۳۸۔ روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم

۳۹۔ روزنامہ امروز یکم دسمبر ۱۹۵۵ء

۴۰۔ تسنیم ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

۴۱۔ ترجمان القرآن کی پہلی پاکستانی اشاعت بابت جون ۱۹۴۸ء اگست ۱۹۴۸ء

۴۲۔ فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن)، فیروز سنز لمیٹڈ، کراچی

۴۳۔ ازھر ازھری، ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال: قرآن اور حدیث، مرکز تحقیقات اسلامی، کراچی، ۲۰۰۴

۴۴۔ اکبر الہ آبادی: دیوان اکبر، مشتاق بک کارنر، لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۴۵۔ اقبال: ارمغان حجاز اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۶۔ اقبال: ضرب کلیم نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۷۔ اقبال: بال جبریل نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۸۔ اقبال: بانگ درا نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۹۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ''مطالعہ پاکستان'' (لازمی) یونٹ ۹-۱، جدید بک ڈپو لاہور (تاریخ اشاعت درج نہیں ہے)

۵۰۔ سید تصدق حسین: لغات کشوری (سال اشاعت درج نہیں ویسے مؤلف نے ۱۸۷۲ء میں اس پر کام شروع کیا)

۵۱۔ اخبار سیرت لاہور، بابت ۳۰ مئی ۱۹۶۸ء

۵۲۔ خلیق الزمان چوہدری: شاہرہ پاکستان (اشاعت اول)، انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی ۱۹۶۷ء

English Section

1. Chaudhry, Muhammad Ali: The Emergence of Pakistan, Research Society of Pakistan, Lahore.
2. Covey, Stephen R. : The Sever Habits of Highly Effective People, Simon & Schuster, London, 1994.
3. Fromm, Erich: The Sane Society, Holt, Rinehart and Winston, Canada, 1983.
4. Fullright, J. William: The Arrogance of Power, Vintage Book, NY, 1966.
5. Haroon-ur-Rasheed: Pakistan: The Successful Culmination, Publishers Euporian, Lahore, 1996.
6. Iqbal, Alama Muhammad: Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy Pakistan Lahore, 1989.
7. Lane, Edward W. : An Arabic-English Lexicon, Librairie Du Liban, Beirut, 1968.
8. Morris, Desmond : The Naked Ape, Mclgraw Book Company, NY, 1969.
9. Munir Muhammad : The Universe Beyond, Pangraphies (Private) Ltd. Islamabad, 1994.
10. Reader's Digest: Universal Dictionary, 1990
11. Rauf, Abdur Dr.: Illustrated History of Islam, Ferozsons (Pvt.) Ltd, Lahore, 1994
12. Skinner, B.F.: Beyond Freedom & Dignity, Vintage Books, NY, 1972.
13. The Illustrated Encyclopaedia of Knowledge, Volume 8, The Educational Book Guild, Inc., USA, 1955.

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)